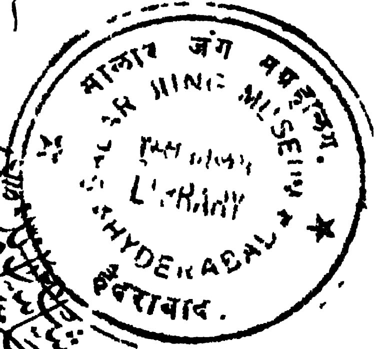
بسم اللہ الرحمن الرحیم ۰

۱۲۱



ہفتہ وار

بشیر و نذیر

ترتیب

مدیر

سید علی عباس موسوی



جلد (۱) ★ شمارہ (۳)

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ، سالانہ ۵۰ روپے

رجسٹرڈ نمبر 47283/20/5/AL/88.TC

اداریہ

اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی دین ہے (ان الدین عند اللہ الا اسلام) رسولؐ مقبول نے کامل دین پیش کیا جسمیں، قانون، معاشرہ، اخلاق، فلسفۂ عمل، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر و عبادات پر مشتمل ہے اور اسلام نے انسان کو اعلیٰ اقدار کے زیور سے سنوارا تاکہ وہ فرد کی صلاح و فلاح پر توجہ دے اور فرد اور قوم کی تعمیر کرے اللہ کو حاکم مانے اور شریعت محمدیؐ پر عمل کرے اور قومیت و رنگ و نسل کے فلسفہ کو مسترد کرے۔

یقیناً بصیرت سے کام لیکر انسان اسلام کے ذریعہ حرکت بیداری احساس اور خود اعتمادی پیدا کر سکتا ہے۔

پروردگار عالم نے دیگر عبادتوں کے علاوہ حج کو صاحبان استطاعت پر واجب گردانا مگر حج کے ارکان کی ادائیگی کے دوران کسی فرد کو برتری یا عظمت نہیں دی بلکہ ایک مقام ایک وقت اور ایکساں لباس کی پابندی کے ذریعہ بتادیا کہ خدا کے نزدیک ایام حج میں خدا کے شہر میں سب برابر ہیں احکامات کی پابجائی میں امیر و غریب میں کوئی فرق نہیں کسی کو مارنے، برا بھلا کہنے کا اختیار نہیں بلکہ خواہشات کو ترک کرکے، ریت پر پیشانی خم کرکے، توبہ، مناجات، طلب مغفرت، امید عطا، سب سے دوری اور اللہ سے قربت کے ذریعہ حج میں جو منازل مسلمان طے کرتے ہیں وہ کہیں نہیں ملتے گویا حج میں اسطرح تزکیہ نفس کی عملی تعلیم دی جاتی ہے۔

حج سے واپسی پر یقیناً ہر مسلمان کو رسولؐ مقبول کا وہ آخری حج یاد آتا رہیگا جو ۲۳ سالہ محنت و مشقت کے بعد بجالاکر رسولؐ اکرم واپس ہو رہے تھے اور جب ۱۸ ذی الحجہ ۱۰ھ کو یہ قافلہ غدیر خم پر پہونچا تو ارشاد پروردگار بموجب قرآن ہوا۔

"اے رسولؐ پہونچادو اس امر کو جو تم پر نازل کیا گیا ہے اگر تم نے یہ نہیں پہونچایا تو گویا تم نے کار رسالت ہی انجام نہ دیا اللہ تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا"

اس وحی کے نازل ہوتے ہی رسولؐ نے قافلہ کو روکا جو آگے تھے انہیں واپس بلایا اور جو پیچھے تھے انکا انتظار کیا اہتمام نماز ہوا حسنینؑ کو بازو اور علی مرتضیٰؑ کو اپنے سامنے کھڑا کیا حمد و ثنا الٰہی کے بعد اپنے رحلت کی خبر سنائی گمراہی سے نجات پالے کتاب خدا اور اہلبیتؑ سے منسلک رہنے کی تاکید کی اور پھر اپنی رسالت اور مولائیت کا اقرار لیا اور حضرت علیؑ کو ہاتھوں پر بلند کرکے کہا کہ "مَن کُنت مولاہ فھذا علی مولاہ" یعنی میں جسکا مولا ہوں یہ علیؑ بھی اسکا مولا ہے اور دعا کی پروردگار دوست رکھ اُسے جو علیؑ کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اس سے جو علیؑ سے دشمنی رکھے مدد کر اُسکی جو علیؑ کی مدد کرے اور چھوڑدے اسکو جو علیؑ کا ساتھ چھوڑ دے، اور اپنے خطبہ میں تمام حاضرین کو حکم دیا کہ وہ اس اعلان کو قیامت تک آنیوالوں کو پہنچادیں۔ جب یہ اعلان ہوا تو آیت نازل ہوئی کہ آج دین کامل ہوگیا رسالت کی تکمیل ہوئی اور نعمتیں تمام ہوئی اور اسکے بعد حضرت علیؑ، ابن ابی طالبؑ کو ایک خیمہ میں بٹھوایا تمام مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت علی کی خدمت میں جائیں اور ایک ایک جماعت سلام و بیعت کرے اس موقع پر مسلمانوں نے بیعت کی مبارکباد دی اور کہا کہ مبارک ہو مبارک یا علیؑ آپکو کہ آج سے آپ ہمارے اور ہر مومن و مومنہ کے مولاؑ ہوگئے۔

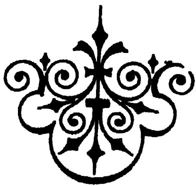
[اس واقعہ کو مسند امام احمد جلد ۴ تاریخ حبیب السیر جلد ۱، ۳، معارج النبوت رکن چہارم ماکنز العمال جلد ۸ ریاض نضرہ جلد ۲ مسند ابوداود۔ تاریخ طبری ابوالفداء صواعق محرقہ روضۃ الاحباب تفسیر در منثور تفسیر فتح البیان وغیرہ میں نقل کیا گیا ہے۔]

یہ اعلان غدیر حضرت علیؑ کی اُن خدمات کا جو اُنہوں نے دعوت ذوالعشیرہ سے لیکر مسجد کوفہ میں شہادت تک مسجد میں راستوں پر مدینہ میں مکہ اور جنگوں اور انجام دی اُنکا گویا ظاہری اعتراف تھا۔ اور مسلمانوں کو صراط مستقیم پر گامزن رکھنے کیلئے یہ اعلان رسالت بحکم خدا ہوا۔ لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیئے کہ احکام خدا اور رسولؐ کی روشنی میں حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کے عمل کو اپنے لئے مشعل راہ بنالے تاکہ اسکی زندگی اسلامی اصولوں کے آئین کے مطابق حقانیت کے زیر سایہ بسر ہو۔

ہم عید غدیر کے اس مبارک موقع پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں اس اعلان غدیر پر صدق دل سے عمل آوری کا ہم میں جذبہ پیدا ہو۔

نوٹ۔ قارئین سے امید ہیکہ وہ اپنی رائے اور اہل قلم حضرات اپنے مضامین سے ہماری ہمت افزائی کرینگے۔ اپنی رائے یا چندہ روانہ فرماتے وقت سلسلہ نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

(ادارہ)



سید علی عباس موسوی کی ادارت میں سرور آفسٹ پرنٹنگ پریس حیدرآباد میں چھپ کر ہفتہ وار خیبر نذیر 13-6-822/1 لنگر حوض حیدرآباد اے پی پن کوڈ نمبر ۵۰۰۰۰۸ سے شائع کیا۔

آیت اللہ العظمیٰ منتظری
ترجمہ: جناب ممتاز علی

معرفتِ خدا

عالم مادہ (ناسوت) اتنا کمزور ہے کہ اس میں لغزندگی پائی جاتی ہے اور یہ حرکت اسی لغزندگی کا اثر ہے اور لغزندگی معلول کا نقص ہے اسی لئے عالم مادہ ارتقاء اور رفتہ رفتہ ترقی و کمال تک پہونچنے کا محتاج ہوتا ہے لیکن عالم مجردات میں کوئی کمی نہیں پائی جاتی وہاں جو کچھ ہے وہ کمال ہی کمال ہے۔

لہٰذا زمانہ، عالم مادہ سے متعلق ہے اس عالم مادہ سے جسمیں حرکت پائی جاتی ہے اور خدا، خالق زمانہ و مادہ وحرکت ہے اس وجہ سے اس کی ذات اقدس میں زمانہ کا گذر ناممکن ہے۔

مرحوم سید حبیب اللہ خوئی شرحِ نہج البلاغہ کی گیارہویں جلد میں اس مناسبت سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت نقل فرماتے ہیں۔ ہم متن روایت نقل کررہے ہیں۔

"روی فی البحار عن التوحید والامالی عن ابی بصیر عن ابی عبداللہ الصادق علیہ السلام قال: ان اللہ تبارک وتعالیٰ لا یوصف بزمان ولامکان ولاحرکۃ ولا انتقال ولاسکون بل ھو خالق الزمان والمکان والحرکۃ والسکون والانتقال"

ابوبصیر امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: خداوند عالم زمان ومکان وحرکت وسکون وانتقال سے متصف نہیں ہے بلکہ وہ ان تمام چیزوں کا خالق ہے۔

زمانہ انسان اور جسم کا خاصہ ہے۔

"لاتصحبہ الاوقات" کوئی بھی زمانہ، چاہے وہ ماضی ہو حال ہو مستقبل ہو خدا کی معیت اور مصاحبت میں نہیں ہے ___ ہم اکثر یہ کہتے ہیں کہ 'خدا ہمیشہ ہے' یہ صرف اس لئے کہتے ہیں کہ ہم خود زمانہ میں زندگی بسر کررہے ہیں لہٰذا مجبوراً ہم یہ جملہ اپنی زبان پر جاری کرتے ہیں ورنہ لفظ "ہمیشہ" کا اس مقام پر کوئی زمانی معنی نہیں ہے ___ یہاں لفظ 'ہمیشہ' کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذات میں فنا نہیں ہے اور زمانہ کی معیت بھی نہیں ہے اس لئے کہ زمانہ اس عالم مادہ کا امتیاز ہے زمانہ وجود انسان کا ایک رخ ہے انسان کی خصوصیات اور شان میں سے زمانہ ہے۔ جس طرح انسان کا امتیاز ہے کہ وہ ایک طول وعرض وعمق رکھنے والا جسم ہے، جس طرح انسان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ پوست اور رنگ رکھتا ہے اسی طرح اس کی ایک خصوصیت ایک شان اور ایک رخ زمانہ بھی ہے۔ لیکن زمانہ اس کا تدریجی پہلو ہے۔

اسی وجہ سے صدر المتألہین اسفار میں تحریر فرماتے ہیں کہ ہر جسم میں دو امتداد پائے جاتے ہیں۔

۱۔ امتداد زمانی   ۲۔ امتداد مکانی

درحقیقت انسان میں چار امتداد پائے جاتے ہیں، ایک تو زمانہ ہے اور دوسرے تین امتداد، یعنی طول وعرض وعمق کو صدر المتألہین سمیٹ کر "امتداد مکانی" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

"ولاترفدہ الادوات"

آلات اور اوزار اس کی مدد نہیں کرتے۔

خدا، اوزار یا آلہ کا محتاج نہیں ہے۔ بس اس کا ارادہ ہی چیزوں کو وجود میں لانے کیلئے کافی ہے، محض اس کے ارادہ سے ساری چیزیں زیور وجود سے آراستہ ہوجاتی ہیں ___ انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون (سورہ یٰس/۸۲)۔ چونکہ تمام اوزار اور آلات مخلوق خدا ہیں اس لئے خدا ان سے بے نیاز ہے۔

۲

سبقتِ تکوینی

سبق الاوقات کونہ

وجودِ خدا زمانوں سے پہلے ہے

خدا کا وجود ماضی، حال، مستقبل تمام زمانوں سے پہلے ہے لیکن یہ سبقت ___ سبقتِ زمانی ___ نہیں ہے بلکہ یہ سبقت۔ سبقتِ تکوینی ___ اور علت ومعلولی سبقت ہے۔

سبقتِ زمانی: جیسے کوئی کہے کہ ہمارے آباء واجداد کو ہم پر یا ہمارے باپ دادا اور ہماری اولاد کو فلاں پر سبقت حاصل ہے۔ یا فلاں تو اس کی اولاد اور اس کے پوتوں پر پوتوں پر سبقت حاصل ہے تو یہ سبقت 'سبقت زمانی' ہے خط میں اس مقام پر یہ سبقت مراد نہیں ہے۔

سبقتِ تکوینی: آپ آئینہ میں اپنے عکس پر غور کریں۔ آپ جب تک آئینہ کے سامنے کھڑے رہیں گے آپ کا عکس اسمیں نظر آئے گا۔ یہاں آپ کی ذات آپکے عکس پر سبقت رکھتی ہے۔ اس سبقت کو "سبقتِ تکوینی" یا علت ومعلولی سبقت کہتے ہیں یعنی جب تک آپ آئینہ کے سامنے نہ ہوں گے آپ کا عکس آئینہ میں نہیں دکھائی دے گا۔

۲۔ وہ قوی نور جو صحن خانہ میں ہوتا ہے اسی کا جلوہ کمروں میں نظر آتا ہے۔ وہ قوی نور ان جلووں کی بہ نسبت سبقت رکھتا ہے لیکن سبقت کا مطلب سبقت زمانی نہیں ہے۔ چونکہ یہاں سرے سے زمانہ ہی نہیں ہے، یہاں جو کچھ ہے وہ نور قوی اور اس کا کمروں میں بکھرنے والا جلوہ ہے اگر وہ نور نہ ہوتا تو کمروں میں جلوہ بھی نہ ہوتا۔

۳۔ آگ جلاتی ہے لہٰذا آگ حرارت پر سبقت رکھتی ہے۔ لیکن یہاں بھی سبقت زمانی نہیں ہے بلکہ سبقتِ علی ومعلولی ہے۔ اس لئے کہ حرارت، آگ کا معلول ہے۔ اس سبقت کو "سبقت شیئی وفیئی" بھی کہتے ہیں۔ یعنی کسی چیز کی سبقت اور اس کا سایہ۔ یہاں گویا حرارت آگ کا سایہ اور پرتو ہے۔ اسی طرح آئینہ میں جو آپ کا عکس نظر آتا ہے وہ آپکا سایہ اور جلوہ ہے یہ سایہ واقعی سایہ نہیں ہے یہ آپ کے سایہ کی طرح ہے۔ لہٰذا اس کو سبقت "شیئی وفیئی" کہتے ہیں۔

بنابرایں زمانوں پر خدا کی سبقت، سبقت علی اور معلولی ہے۔ اس لئے کہ تمام زمانے مخلوق اور معلول خدا ہیں خدا کے یہاں دراصل کوئی زمانہ ہی نہیں جس کی وجہ سے سبقت زمانی ثابت ہوسکے!

"والعدم وجودہ"

خدا کا وجود عدم پر سبقت رکھتا ہے۔

دنیا کے تمام موجودات پہلے نہیں تھے خدا نے ان کو پیدا کیا عدم سے وجود میں لایا۔ یہ اس اعتبار سے خدا سے متاخر ہیں اور تمام موجودات معلول ذات خدا ہیں لہٰذا مولاؑ نے جو یہ فرمایا ہے کہ "خدا عدم پر سبقت رکھتا ہے" تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام موجودات عالم پر سبقت رکھتا ہے۔

ابتدا ___ زمانہ کی خصوصیت ___ ہے۔

"والابتداء ازلہ"

خداوند عالم کی ازلیت تمام موجودات کی ابتدا پر مقدم ہے

دنیا کے تمام موجودات چونکہ زمانہ رکھتے ہیں اس لئے ان کی ابتدا بھی ہے مثلاً اگر آپ کی عمر ستر سال کی ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ستر سال پہلے نہیں تھے یا آپ کے والدین مثلاً ایک سو بیس سال پہلے نہیں تھے۔ غرضکہ ہر چیز کی ایک ابتدا ہے لیکن خدا کی کوئی ابتدا متصور ہی نہیں ہے ___ اس لئے کہ وہ موجود ازلی ہے ___ ازلی یعنی وہ موجود جہاں ابتدا ہی نہیں ہے جس طرح ابدی ایسے موجود کو کہتے ہیں جس کی انتہا نہ ہو۔ سرمدی ایسے موجود کو کہتے ہیں جس کا نہ اول ہو نہ آخر ہو (اسی طرح ازلی وہ موجود ہے جسکی ابتدا نہ ہو)

لہٰذا خدا جو ازلی ہے اس کو ان تمام موجودات پر سبقت حاصل ہے جن کی کوئی ابتدا ہے۔ اس کی ازلیت، موجودات حادث کی ابتدا سے مقدم ہے۔

ابتدا اور انتہا زمانہ کی خصوصیت ہے چونکہ خدا کے لئے زمانہ کا تصور ہی نہیں ہے۔

اس لئے اس کے یہاں ابتدا اور انتہا بھی نہیں ہے اور قرآن میں جو یہ ذکر آیا ہے کہ "ھو الاول و الآخر و الظاھر و الباطن" تو یہاں اول اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ زمانے کے اعتبار سے اول ہے بلکہ یہاں مراد یہ ہے کہ خدا ازلی ہے اور تمام موجودات اسی واجب الوجود کے معلول ہیں۔

یہاں تک اس عمیق خطبہ کے پہلے حصہ کی حتی الامکان تفسیر بیان کی گئی اب انشاءاللہ آئندہ دوسرے حصہ کی تفسیر اور توضیح پیش کی جائے گی۔

بتشعیرہ المشاعر عرف ان لا مشعر لہ

اس نے احساس و شعور کے مرکزوں کو ایجاد کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خود احساس و آلاتِ شعور نہیں رکھتا۔

میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہے میں اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ درس لوگوں کی فہم کے مطابق اور آسان ہو لیکن چونکہ اصل مسئلہ ہی مشکل ہے اس لئے خود آپ حضرات کو بھی غور و فکر سے کام لینا چاہئے اگر اس سلسلہ میں آپ تشنگی محسوس کریں تو میں معذرت کا طالب ہوں۔

ادراک کے مراکز

روح و نفسِ انسان ایسا موجود ہے جو مادی نہیں ہے (جیسا کہ گذشتہ بحثوں میں ثابت کر چکے ہیں) مادہ سے مجرد ہے۔ اگر نفس و روح عالم مادہ سے رابطہ پیدا کرنا اور عالم مادہ کی اطلاعات حاصل کرنا چاہیں تو یہ رابطہ مخصوص حواس کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے —— جیسے باصرہ —— قوت باصرہ کا مرکز آنکھ ہے۔ چیزوں کا عکس پہلے آنکھ کی پتلی پر پڑتا ہے اور پھر اعصابِ چشم کے ذریعہ انسان کے دماغ تک منتقل ہو جاتا ہے۔ منتقل ہونے کا یہ منظم عمل مقدمہ بنتا ہے تاکہ نفس انسان دیکھی جانے والی چیزوں کو دیکھ سکے۔

اسی طرح سنی جانیوالی آوازیں لہروں کی شکل میں ہوا میں بکھرتی ہیں، وہ قوت سامعہ کے ذریعہ جس کا مرکز کان ہے، دماغ تک منتقل ہو جاتی ہیں اور انسان ان آوازوں کو سن لیتا ہے (درک کر لیتا ہے) چیزوں کی خوشبو، بدبو، قوت شامہ کے ذریعہ۔ لذتیں قوت ذائقہ کے سہارے۔ نرمی، سختی، حرارت، برودت اس قوت لامسہ کے سبب جو تمام بدن میں موجود ہے، منتقل ہو کر دماغ میں پہونچتی ہے اور مذکورہ بالا چیزوں کا ادراک ہو جاتا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ حواس (لامسہ، باصرہ، سامعہ، ذائقہ، شامہ) خود درک نہیں کرتے بلکہ یہ ادراک کا مقدمہ ہیں جس طرح کیمرہ ادراک نہیں رکھتا اسی طرح آنکھوں کی قوت بصارت بھی ادراک نہیں رکھتی ادراک اس وقت ہوتا ہے جب چیزوں کا عکس آنکھوں پر پڑنے کے بعد منتقل ہو کر دماغ تک پہونچ جائے۔ دراصل دماغ (مغز) بھی ادراک نہیں کرتا اس لئے کہ وہ جسم ہے ادراک کرنے والا تو انسان کا نفسِ مجرّد ہے جو اس کے پس پشت موجود ہے۔ لیکن یہ نفس مجرّد عالم مادہ سے رابطہ پیدا کرنے کے لئے حواس خمسۂ ظاہری کا محتاج ہے۔ یہ حواس خمسہ جیسے آلات ہیں، نفس ان ہی کے سہارے عالم مادہ سے رابطہ قائم کرتا ہے۔ البتہ مرحوم صدر المتألہین ملا صدرا کا اس سلسلہ میں یہ نظریہ ہے کہ ابتدائی مرحلوں کو انجام دینے کے بعد قوت باصرہ کا کیمرہ اس تصویر کو دماغ تک منتقل کر دیتا ہے۔ اس وقت انسان کا نفس اپنے اندر اپنی تخلیقی قوت کے سہارے باہر سے آنیوالی صورت جیسی ایک صورت تخلیق کرتا ہے اور اسی صورت کا نفس ادراک کرتا ہے جس کو اس نے پیدا کیا ہے۔ باہر کے سارے آلات نفس کی تصویر کشی کے لئے مقدمہ بن جاتے ہیں تاکہ نفس اپنی دنیا میں باہر کی تصویر کے مشابہ تصویر بناتا ہے اور وہی تصویر براہِ راست قابل توجہ ہوتی ہے جو نفس میں بنتی ہے۔ اس تصویر کو مُدرَک بالذات اور خارج میں پائی جانیوالی تصویر کو مدرک بالعرض کہتے ہیں۔ مدرک بالذات وہ ہے جس کی ذات کو ہم براہ راست درک کرتے ہیں اور اس ذات کے درک کے نتیجہ میں خارج میں پائی جانیوالی چیز درک ہوتی ہے۔

بہر حال ان پانچوں (آنکھ، کان، ناک، زبان اور تمام بدن) حواس ظاہری کو جو انسان کے اعضاء و جوارح میں پائے جاتے ہیں مشاعر خمسہ کہتے ہیں۔ مشعر اسم مکان ہے۔ یعنی یہ حواس محل شعور ہیں یا یوں کہا جائے کہ یہ حواس وہ وسائل ہیں جن کے ذریعہ سے نفس انسان عالم خارج کا شعور و ادراک حاصل کرتا ہے۔

رہ گیا یہ سوال کہ انسان براہ راست بغیر حواس کی مدد کے عالم خارج کو کیوں نہیں درک کر سکتا؟ —— تو اس کا سبب یہ ہے کہ انسان چونکہ ایک کمزور وجود ہے، اگرچہ نفس انسان مجرد ہے، مگر ایسا ضعیف مجرد ہے جو حواس اور درک کرنے والے آلات کا محتاج ہے وہ ان ہی آلات کے سہارے باہر کی دنیا سے رابطہ پیدا کرتا ہے کیمرہ کے بغیر تصویر نہیں کھینچی جا سکتی یہ انسان کی مجبوری اور کمزوری ہے

حواس کی خاصیتیں

یہ حواس چار خاصیتوں کے حامل ہیں:

۱۔ آپ چیزوں کے ادراک کے لئے حواس کے محتاج ہیں۔

۲۔ حواس میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے یعنی جو عکس آنکھوں کے سامنے آتا ہے آنکھیں انہیں قبول کر کے محفوظ رکھتی ہیں۔

۳۔ چونکہ ان حواس کے مختلف شعبے ہیں اس لئے آپ کا علم کثرت کا حامل ہے۔

۴۔ مرکزِ شعور اجسام ہیں۔ قوت باصرہ خود بخود کسی چیز کو نہیں دیکھتی بلکہ آنکھوں کی مدد سے دیکھتی ہے۔ اسی طرح قوت سامعہ سننے میں کانوں کی محتاج ہے اور یہ سب جسم ہیں —— اسی طرح دوسری قوتیں بھی ہیں۔

یہ چاروں خاصیتیں نقص پر دلالت کرتی ہیں اور خداوند عالم نقص سے دور ہے لہٰذا حضرتؑ کے جملہ کا مفہوم واضح ہو گیا اور وہ اس طرح کہ خدا نے ہمارے لئے مراکز شعور پیدا کئے ہیں اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ خدا ہماری طرح کا شعور نہیں رکھتا یعنی خدا کا ادراک ایسا نہیں ہے کہ وہ آنکھ، کان، قوت ذائقہ، قوت شامہ یا قوت لامسہ رکھتا ہو۔ اس جملے سے، کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ خدا ہماری طرح کا شعور نہیں رکھتا؟ چونکہ خدا نے پانچ مراکز شعور ہم کو عطا کئے ہیں۔ ان حواس خمسہ میں غور و فکر کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان میں چار حالتیں پائی جاتی ہیں اور ہر حالت نقص پر دلالت کرتی ہے اور خدا میں کسی قسم کا نقص نہیں پایا جاتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب ہم خدا کو سمیع و بصیر کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی سماعت اور بصارت عین ذات ہے۔ ان میں سے کوئی چیز زائد بر ذات نہیں ہے۔ خدا سمیع و بصیر ہے مگر آنکھوں اور کانوں کی مدد سے نہیں بلکہ خدا تمام دیکھی اور سنی جانیوالی چیزوں کا علم رکھتا ہے۔ وہ ہماری طرح محتاج نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ کان رکھتا ہو اور ہوا کی لہریں آواز کو اس کے کانوں تک پہونچا لیں۔ یہ تمام ذرائع ادراک دراصل جسم ہیں اور خدا جسم نہیں رکھتا۔ اگر معاذ اللہ وہ بھی مواصلاتی آلات کے ذریعہ اطلاعات حاصل کرتا تو اس کا لازمہ یہ تھا کہ اس کی ذات محتاج اور مرکب ہوتی اور اس میں متاثر و منفعل ہونے کی حالت پیدا ہوتی اور وہ جسم والا ہوتا۔ لیکن یہ چاروں صفتیں خدا کی ذات میں نہیں پائی جاتیں۔

بہر حال یہ بحث بہت ہی عمیق ہے جو حضرات مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں وہ بزرگوں کی بیان کردہ توضیحات کا بغور مطالعہ فرمائیں —— مرحوم صدر المتألہین نے بھی اصول کافی کی شرح کی ہے اور کافی کے "باب جوامع التوحید" میں آپ نے اس خطبہ کی بڑی تفصیلی شرح فرمائی ہے، شائقین حضرات وہاں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ حضرت یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر خدا مراکز حواس کا حامل ہوتا تو اس کا لازمہ یہ تھا کہ وہ جسم ہوتا اور یہ ممکن نہیں کہ وہ جسم بھی ہو اور خالق جسم بھی۔ ہم اس بات کو ثابت کرنے کے لئے ذیل میں دو دلیلیں قائم کر رہے ہیں۔

جسم کی فاعلیت، فاعلیت حرکت ہے

دلیل اوّل، جسم کسی چیز کو عدم سے وجود میں نہیں لا سکتا اس لئے کہ جسم کی فاعلیت صرف فاعلیت حرکت ہے۔ اس لئے کہ جسم مؤثر ہونے میں ایک مخصوص وضع و محاذات کا محتاج ہے۔ جب وہ خاص وضع و محاذات حاصل کر لیتا ہے تب مؤثر ہوتا ہے جیسے آگ اگر کسی چیز کو جلانا چاہے تو اس کو اس شئے سے نزدیک ہونا پڑے گا تب اس شئے کو آگ جلا سکتی ہے۔

وضع اور محاذات

جسم اگر کسی چیز پر اپنا اثر ڈالنا چاہے تو اس کو مخصوص وضع و محاذات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب جسم دوسرے جسم سے قریب ہو گا تب اس میں حرکت پیدا ہو سکتی ہے جیسے آگ کا کسی چیز کو جلانا یہ اس جسم میں حرکت پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے اس لئے کہ آگ اس شئے کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیتی ہے۔

اگر اس معنی کو خدا کے بارے میں فرض کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ خلقت عالم سے پہلے اگر خدا جسم تھا اور اس نے عالم کو پیدا کرنا چاہا تو چونکہ کوئی چیز موجود نہ تھی، عدم ہی عدم تھا اور عدم محض میں وضع و محاذات کی گنجائش نہیں اور جسم کے اثر کے لئے وضع و محاذات ضروری ہے —— بفرض محال اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ خدا جسم ہے تو وہ عالم کا خالق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ معدوم عالم کے ساتھ وضع و محاذات کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا پھر وہ اسے خلق کیسے کر سکتا ہے، اسے لباس وجود کیسے عطا کر سکتا ہے؟ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ اجسام، اجسام ہی میں اثر ڈالتے ہیں۔ البتہ وہ ان کو عدم سے وجود میں نہیں لا سکتے بلکہ صرف اجسام کی صورت بدل دیتے ہیں۔ جو حضرات لوہے کو پہیے کی شکل میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ وہ لوہے کو اپنے قریب کر کے ہتھوڑے یا دوسرے وسائل کو کام میں لاتے ہیں اس عمل سے لوہا پہیے کی شکل میں ڈھل جاتا ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ جسم کی فاعلیت وضع و محاذات کی محتاج ہے اس لئے محال ہے کہ خدا جسم ہو ـــ ائمہ سے بہت سی روایتیں اس سلسلہ میں پائی جاتی ہیں کہ خدا جسم نہیں ہے ۔ اس کا جسم ہونا محال ہے ۔ چونکہ ائمہ کے زمانہ میں بہت سے ظاہر بیں افراد خصوصاً اہل سنت سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگ ایسے تھے جو آیہ "الرحمٰن علی العرش استوی" کے سلسلہ میں یہ خیال رکھتے تھے کہ خدا جسم ہے اور عرش پر بیٹھا ہے ! ! یا یہ کہتے تھے کہ خدا آسمان اوّل پر آتا ہے اور سب کو دیکھتا ہے وغیرہ، اس لئے ہمارے ائمہ سے ایسی روایتیں وارد ہوئی ہیں، انہوں نے چاہا کہ ایسے افراد کو سمجھا دیا جائے کہ تم خدا کے بارے میں غلط خیال رکھتے ہو خدا جسم نہیں ہو سکتا۔

جسم، جسم کی علت نہیں ہے ۔

دوسری دلیل ۔ یہ دلیل صدر المتالہین نے بیان کی ہے ۔ آپ فرماتے ہیں کہ کوئی طبیعت خود اس طبیعت کی علت نہیں ہو سکتی "لہٰذا جسموں کا خلق کرنے والا جسم" نہیں ہو سکتا ورنہ جسم، جسم کی علت ہوگی اور یہ ممکن نہیں ہے کہ جسم، جسم کی علت ہو ۔ کوئی آگ، آگ کی علت نہیں ہو سکتی ۔ کوئی آگ، آگ کو عدم سے وجود میں نہیں لا سکتی ۔ بہرحال علت و معلول ایک نہیں ہو سکتے ان کو الگ الگ ہونا چاہئے ۔

اگر یہ کہا جائے کہ ایک آگ دوسری آگ کے لئے علت ہے، تو میں پوچھونگا کہ یہ آگ اس آگ کے لئے علت کیوں ہے ؟ اس آگ کی وجہ علیت اور موثریت کیا ہے ؟ اگر یہ کہا جائے کہ اس آگ کا آگ ہونا علت ہے ۔ تو میں کہوں گا کہ اس دوسری آگ میں بھی جلانے کی قوت ہے لہٰذا اس (دوسری) آگ کو بھی علت ہونا چاہئے اگر آگ ہونا (ناریت) آگ کے لئے موثر اور مبدأ فاعلیت ہے تو معلول (جو آگ ہے) کو بھی مبدأ فاعلیت ہونا چاہئے ۔ اس طرح دونوں علت ہوں گے ۔ لہٰذا اگر یہ نظر آئے کہ ایک آگ دوسری آگ کے لئے علت بنی ہے تو پھر واضح ہے کہ آگ ہونا (ناریت) منشأ علیت نہیں ہے ۔ بلکہ اس میں کوئی دوسری ہی جہت ہے جو اس چیز میں اثر انداز ہو رہی ہے اور وہی دوسری جہت "منشأ علیت" ہے (یہ مرحوم صدر المتالہین کی دلیل کا خلاصہ ہے)

"وبمضادته بین الاموس عرف ان لاضد له"

اس نے چیزوں کو متضاد پیدا کیا اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ وہ ضد نہیں رکھتا۔

ضد کے دو معنی ہیں ایک ضد اصطلاحی ہے جو فلسفہ میں آتا ہے دوسرا ضد عرفی ہے جو عام ہے۔

تضادِ فلسفی،

فلسفیوں کی اصطلاح میں کہا جاتا ہے " الضدان امران وجودیان یتواردان علیٰ موضوع واحد ویشترکان فی جنس قریب وبینھما غایۃ الخلاف" ضدین دو صفت اور دو امر وجودی ہیں جو ایک جسم پر دوسرے کے بعد وارد ہوتے ہیں اور ان میں آپس میں بہت اختلاف ہے ۔ مثلاً ایک سفید چیز اگر سیاہ ہو جائے یا ایک شجاع اور بہادر انسان اگر بزدل ہو جائے تو سفیدی اور سیاہی یا شجاعت اور بزدلی دو حالت وجودی ہیں جو ایک ہی شئے پر ایک دوسرے کے بعد وارد ہو رہی ہیں ۔ ایک ختم ہوتی ہے تو دوسری آتا ہے ـــ مثلاً کسی انسان کا رنگ اگر سرخ و سفید ہے تو خوف کے موقع پر اچانک اس کا رنگ زرد ہو جاتا ہے جبکہ سرخی اور زردی کے درمیان بہت ہی تضاد اور اختلاف پایا جاتا ہے ۔ مگر دونوں رنگ ہی ہیں ۔ جنس کے (رنگ ہونے) اعتبار سے دونوں ایک ہیں ۔ اسی طرح شجاعت اور بزدلی دونوں انسانی کیفیتیں ہیں دونوں جنس میں ایک دوسرے سے قریب ہیں لیکن پھر بھی ان دونوں میں بڑا فرق ہے ۔ فلسفہ کی اصطلاح میں اس کو ضدین کہتے ہیں ۔

تضادِ عرفی

عرف میں تضاد ایک عام معنی کا حامل ہے ۔ چاہے دو امر وجودی آپس میں اختلاف رکھتے ہوں یا ایک امر وجودی ہو اور دوسرا عدمی ہو ۔ عرف عام میں ان کو ضدین کہا جاتا ہے ۔ جیسے کسی شئے کا "ہونا" اور "نہ ہونا" آج کا فلسفہ ان دونوں کو ضدین کہتا ہے اس میں ایک وجودی ہے اور دوسرا عدم ۔ درآنحالیکہ فلسفہ قدیم میں ضدین، ان دو وجودی چیزوں کو کہا جاتا تھا جن میں آپس میں اختلاف پایا جائے ۔ مثال کے لئے آپ نور و ظلمت کو لے لیں یہ عرف عام میں ضدین کہے جاتے ہیں درآں حالیکہ نور اور روشنی امر وجودی اور ظلمت اور تاریکی امر عدمی ہیں مگر تاریکی وہ امر عدمی ہے جس میں روشن ہونے کی صلاحیت تو پائی جاتی ہے لیکن فی الحال روشن نہیں بلکہ تاریک ہے ۔ "الظلمۃ عدم النور فیما من شانہ ان یکون منوراً" نور رکھنے والی چیز کا نور نہ رکھنا ظلمت ہے ۔ یہ امر عدمی تو ہے مگر عدم محض نہیں ہے بلکہ اس میں منور ہونے کی صلاحیت پائی جاتی ہے ۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ فلسفیوں کی اصطلاح میں ضدین دو امر وجودی ہیں اور عوارض میں سے ہیں ـــ لیکن عرف عام میں ضد، ان دو چیزوں کو کہتے ہیں جو ایک ساتھ جمع ہونے کے قابل نہ ہوں، چاہے یہ دونوں چیزیں وجودی ہوں یا ایک وجودی اور دوسری چیز عدمی ہو ۔ یہاں تک کہ اگر دو مستقل چیزیں ہوں اور آپس میں مشترک نہ ہوں جمع ہونے کے قابل نہ ہوں ان میں آپس میں بیر ہو تو عرف ان دونوں کو ضدین کہتا ہے جیسے پانی اور آگ ۔

اب چاہے ضد کے عرفی معنی لئے جائیں یا فلسفی دونوں صورتوں میں حضرتؑ کے جملہ کی تعبیر اس طرح ہوگی کہ ـــ خدا نے پانی اور آگ، سرخی اور زردی، شجاعت اور بزدلی کو پیدا کیا ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں اشیاء کے درمیان ضد قرار دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ضد نہیں ہو سکتی ـــ چاہے وہ "تضادِ فلسفی" ہو یا "تضادِ عرفی" اس لئے کہ زائد بر ذات دو خاصیتوں کا نام ضدین ہے یہ دو عرض ہیں اگر یہ کسی چیز پر عارض ہوں گی تو اس کے لئے ایک معروض کا ہونا لازمی ہے اور خدا پر کوئی چیز عارض نہیں ہوتی ۔ ممکن ہے عیاذاً باللہ کوئی کہے کہ "خدا خود عرض ہے" تو ایسی صورت میں وہ معروض کا محتاج ہوگا اور اس کا محتاج ہونا محال ہے اسی لئے ہم نے کہا تھا کہ صفات خدا زائد بر ذات نہیں ہیں بلکہ عین ذات ہیں ۔

دو ضد کا موازنہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ عرض کی قسم میں سے نہیں ہو سکتی اس لئے کہ خدا کا کوئی "دوسرا" فرض نہیں کیا جا سکتا جو وہ باہم مخالفت اور عناد رکھتے ہوں ـــ اس لئے کہ خداوند عالم حقیقت غیر متناہی ہے، اور غیر متناہی دو نہیں ہو سکتا اگر دو ہو جائے تو دونوں محدود ہوں گے (ایک اپنی مخصوص حد میں ہوگا اور دوسرا اپنی مخصوص حد میں) اور محدود ہونے کے بعد دونوں متناہی ہو جائیں گے، لیکن ذات باری تعالیٰ ہستی غیر متناہی ہے جس کے لئے کسی قسم کی نیستی اور دوئی نہیں ہے ۔

اگر ہم خدا کے لئے ضد و معاند فرض کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے دو مستقل حقیقتیں فرض کر لیں ایسی صورت میں دونوں محدود اور محتاج ہو جائیں گے ۔ لیکن خدا نہ محدود ہے اور نہ محتاج بلکہ وہ بے نیاز ہے ۔

اس مختصر گفتگو میں یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شئے خدا کی ضد ہو اس لئے کہ جمع نہ ہونا ضد کی خاصیت ہے اور جمع نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ضدین ایک دوسرے کی نفی کر رہے ہیں اور نفی کرنے کا لازمہ محدودیت ہے اور خدا محدود نہیں ہے ۔ اگر "تضاد فلسفی" فرض کیا جائے تو تضاد فلسفی از قبیل اعراض ہے اس طرح خدا "عرض" ہونے کے بعد محل کا محتاج ہو جائیگا ۔ مگر خدا کو کسی چیز کی احتیاج نہیں ہے در اصل سارا عالم خدا کے وجود کا پرتو اور جلوہ ہے اور کسی چیز کا جلوہ اس سے جدا نہیں ہوتا جس کی بنا پر تضاد لازم آئے ۔

توضیح :

وضع ـــ نو مقولات عرضی میں سے ایک مقولہ ہے ۔ یعنی اجزاء جسم کی ایک دوسرے سے نسبت اور پھر تمام اجزاء کی خارج سے نسبت کو وضع کہتے ہیں ۔

خواجہ فرماتے ہیں کہ وضع اس چیز کو کہتے ہیں جو بالقوہ یا بالفعل اشارۂ حسیہ کے قابل ہو ۔ قیام و قعود میں چیز کے اجزاء اور ان اجزاء میں آپس میں اور مختلف جہت میں نسبت ہو اور اس نسبت کے سبب ان سب کے لئے ایک ہیئت لازم ہوتی ہے، اس ہیئت کو وضع کہتے ہیں ۔

محاذات ـــ دو چیزوں کا دو مکان میں اس طرح ہونا کہ وہ دونوں مختلف جہت میں نہ ہوں ۔

(باقی آئندہ)

قال رسول اللہ (ص)

مَنِ الْتَمَسَ رِضَى اللهِ بِسَخَطِ النَّاسِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ وَأَرْضَى عَنْهُ النَّاسَ وَمَنِ الْتَمَسَ رِضَى النَّاسِ بِسَخَطِ اللهِ سَخَطَ اللهُ عَلَيْهِ وَأَسْخَطَ عَلَيْهِ النَّاسَ..

Whoever seeks the good pleasure of God by incurring the people's displeasure, God shall be pleased with him and make the people also (ultimately) pleased with him. But whoever seeks to please the people at the cost of displeasing God, God shall be wrathful at him and cause the people (ultimately) to be displeased with him.

The Prophet Muhammad (S)

The Imams and Leaders of Islam

The previous discussions lead us to the conclusion that in Islam after the death of the Holy Prophet, there has continuously existed and will continue to exist within the Islamic community (ummah) an Imam (a leader chosen by God) Numerous prophetic hadiths[33] have been transmitted in Shi'ism concerning the description of the Imams, their number, the fact that they are all of the Quraysh and of the Household of the Prophet and the fact that the promised Mahdi is among them and the last of them Also, there are definitive words of the Prophet concerning the imamate of Ali and his being the first Imam and also definitive utterances of the Prophet and Ali concerning the imamate of the Second Imam. In the same way the Imams before have left definitive statements concerning the imamate of those who were to come after them [34] According to these utterances contained in Twelve Imam Shi'ite sources the Imams are twelve in number and their holy names are as follows (1) 'Alī ibn Abī Ṭālib, (2) Ḥasan ibn 'Alī (3) Husayn ibn 'Alī, (4) 'Alī ibn Ḥusayn, (5) Muḥammad ibn 'Alī, (6) Ja'far ibn Muḥammad, (7) Mūsā ibn Ja'far, (8) 'Alī ibn Mūsā (9) Muhammad ibn 'Alī (10) 'Alī ibn Muḥammad, (11) Hasan ibn 'Ali, and (12) the Mahdī

A BRIEF HISTORY OF THE LIVES OF THE TWELVE IMAMS

The First Imam

Amir al mu'minin Ali[35] upon whom be peace was the son of Abu Talib, the Shaykh of the Banū Hāshim Abu Talib was the uncle and guardian of the Holy Prophet and the person who had brought the Prophet to his house and raised him like his own son After the Prophet was chosen for his prophetic mission, Abu Talib continued to support him and repelled from him the evil that came from the infidels among the Arabs and especially the Quraysh

According to well known traditional accounts Ali was born ten years before the commencement of the prophetic mission of the Prophet When six years old, as a result of famine in and around Mecca he was requested by the Prophet to leave his father's house and come to the house of his cousin, the Prophet There he was placed directly under the guardianship and custody of the Holy Prophet [36]

A few years later, when the Prophet was endowed with the Divine gift of prophecy and for the first time received the Divine revelation in the cave of Ḥirā', as he left the cave to return to town and his own house he met Ali on the way He told him what had happened and Ali accepted the new faith [37] Again in a gathering when the Holy Prophet had brought his relatives together and invited them to accept his religion, he said the first person to accept his call would be his vicegerent and inheritor and deputy The only person to rise from his place and accept the faith was Ali and the Prophet accepted his declaration of faith [38] Therefore Ali was the first man in Islam to accept the faith and is the first among the followers of the Prophet to have never worshiped other than the One God

Ali was always in the company of the Prophet until the Prophet migrated from Mecca to Medina On the night of the migration to Medina (hijrah) when the infidels had surrounded the house of the Prophet and were determined to invade the house at the end of the night and cut him to pieces while he was in bed Ali slept in place of the Prophet while the Prophet left the house and set out for Medina [39] After the departure of the Prophet according to his wish Ali gave back to the people the trusts and charges that they had left with the Prophet Then he went to Medina with his mother the daughter of the Prophet and two other women [40] In Medina also Ali was constantly in the company of the Prophet in private and in public The Prophet gave Fatimah his beloved daughter from Khadijah to Ali as his wife and when the Prophet was creating bonds of brotherhood among his companions he selected Ali as his brother [41]

Ali was present in all the wars in which the Prophet participated, except the battle of Tabūk when he was ordered to stay in Medina in place of the Prophet [42] He did not retreat in any battle nor did he turn his face away from any enemy He never disobeyed the Prophet, so that the Prophet said, "Ali is never separated from the Truth nor the Truth from Ali "[43]

On the day of the death of the Prophet, Ali was thirty three years old Although he was foremost in religious virtues and the most outstanding among the companions of the Prophet, he was pushed aside from the caliphate on the claim that he was too young and that he had many enemies among the people because of the blood of the polytheists he had spilled in the wars fought alongside the Prophet Therefore Ali was almost completely cut off from public affairs He retreated to his house where he began to train competent individuals in the Divine sciences and in this way he passed the twenty five years of the caliphate of the first three caliphs who succeeded the Prophet When the third caliph was killed people gave their allegiance to him and he was chosen as caliph

During his caliphate of nearly four years and nine months, Ali followed the way of the Prophet and gave his caliphate the form of a spiritual movement and renewal and began many different types of reforms Naturally these reforms were against the interests of certain parties that sought their own benefit As a result a group of the companions (foremost among whom were Ṭalḥah and Zubayr who also gained the support of A'ishah, and especially Mu'awiyah) made a pretext of the death of the third caliph to raise their heads in opposition and began to revolt and rebel against Ali

NEXT ISSUE (PART II)

CONTD.FROM PAGE (5)

Speech makes man superior to animals,
But misuse of the same can make animals excel him

11 In all cases in which a particular object guides us to another object, it is called *dalil* (proof, argument or evidence) Proofs or arguments are of different kinds One of them is linguistic argument (that is, a particular term has various implications) Such an argument is possible in three ways

First Argument by complete identity (*dalalat al mutabaqah*) a term or word indicates the totality of a thing that is, it includes in its domain all of its useful aspects For instance, when we say 'automobile', we mean to indicate the whole body of the machine, inclusive of all of its parts

Second Argument by implication, or partial identity (*dalalat al tadammun*) A term in this case refers to a specific meaning only For instance, when we say, 'there is an automobile', we understand that its chassis or its engine is also present there

Third Argument by necessity (*dalalat al iltizam*) Here a term or word leads us to the understanding of something which is not included in its domain of meaning For example, when we hear the name, 'Hatim', it immediately suggests 'generosity'

12 The source of various misconceptions that affected science during the last several centuries was the false notion held by some that the function of Aristotelian logic was also to prove the validity of the matter or contents of a demonstration Since this was beyond the power of Aristotelian logic, they gave the verdict of its ineffectualness Regretfully, this error has been repeated many times in our days also, which, of course, shows that those who commit it have neither any correct knowledge of Aristotelian logic, nor did they properly understand it Making use of the same allegory of construction of a building , we may say that the role of Aristotelian logic in determining the validity of an argument is exactly similar to that of a plumb in determining the straightness of a wall The plumb line cannot detect any adulteration in the cement used, nor can it indicate the presence or absence of desired qualities in the materials of its construction What a plumb indicates is just the straightness or irregularity in a wall The Aristotelian logic which has been improved by several later thinkers and has become much more developed, can merely judge the form of an argument and is silent regarding any approval or disapproval of its matter and content

13 This is the method laid down by Descartes in his work the *Rules for the direction of the mind* He will he says, confine his thinking to fields in which certain and undisputable knowledge seems possible of attainment He will not take other people's opinions, or accept as a starting point anything short of an intuition, or mental content, so clear and so distinct that there is no avoiding it Building upon this intuition, he will keep his superstructure anchored and riveted to its foundation by constant analysis and review and unification of his procedure No difficulties will be skirted or left unresolved The foundation will be frequently re examined and retested by subjecting even the seemingly self-evident to searching criticism Last, but not least, he will do his best to avoid what we today call "wishful thinking"

14 However we must notice that in issues from which probability cannot be excluded and in which certainty cannot be achieved, what is to be taken into consideration is the amount of probability However, conjecture and probability should be taken for what they are and must not be confused with certainty Taking probability for certainty is what leads to the second form of error

15 This idea also occurs in one of the essays of Bacon Unfolding the celebrated account of idols, or false images of the human mind, which distort the judgement in its search for truth, he named this class of idols as "idols of the tribe", by it he aims to point out this practice of blind imitation

16 The problem of following the ancestors and elders, or following the spirit and ethos of the age —things strictly forbidden by the Quran—should not be confused with the issue of following (*taqlīd*) an Islamic jurisprudent (*faqih*), which is a religious duty of every muslim based on the sound principle of utilizing the specialized knowledge of a specialist

The Difference Between Prophet and Imam

The previous argument about the reception of Divine injunctions and laws by the prophets only proves the basis of prophecy namely the receiving of Divine injunctions The argument does not prove the persistence and continuity of prophecy even though the very fact that these prophetic injunctions have been preserved naturally raises the idea of persistence and continuity That is why it is not necessary for a prophet (nabi) always to be present among mankind but the existence of the Imam who is the guardian of Divine religion is on the contrary a continuous necessity for human society Human society can never be without the figure whom Shi'ism calls the Imam whether or not he is recognized and known God the Most Exalted has said in His Book So if these disbelieve in it We have already entrusted it to a people [i e the Imams] who do not disbelieve in it (Quran VI 90) [26]

As mentioned above the functions of prophecy and imamate may be joined in one person who is then appointed to the functions of both prophet and Imam or to both the reception of the Divine law and its preservation and explanation And sometimes they can be separated such as in periods during which there is no prophet living but when there is a true Imam living among men It is obvious that the number of God's prophets is limited and the prophets have not been present in every period and age

It is also of significance to note that in God's Book some of the prophets have been introduced as Imams such as the Prophet Abraham about whom is said And (remember) when his Lord tried Abraham with (His) commands and he fulfilled them He said Lo! I have appointed thee a leader [imam] for mankind (Abraham) said And of my offspring (will there be leaders)? He said My covenant includeth not wrongdoers (Quran II 124) And God has also said And We made them chiefs [imams] who guide by Our command Quran XXI 73)

The Imamate and Its Role in the Esoteric Dimension of Religion

In the same way that the Imam is the guide and leader of men in their external actions so does he possess the function of inward and esoteric leadership and guidance He is the guide of the caravan of humanity which is moving inwardly and esoterically toward God In order to elucidate this truth it is necessary to turn to the following two introductory comments First of all without any doubt according to Islam as well as other Divine religions the sole means of attaining real and eternal happiness or misery felicity or wretchedness is by means of good or evil actions which man comes to recognize through the instruction of Divine religion as well as through his own primordial and God given nature and intelligence Second through the means of revelation and prophecy God has praised or condemned man's actions according to the language of human beings and the society in which they live He has promised those who do good and obey and accept the teachings of revelation a happy eternal life in which are fulfilled all desires that accord with human perfection And to the evildoers and the iniquitous He has given warning of a bitter perpetual life in which is experienced every form of misery and disappointment

Without any doubt God who stands in every way above all that we can imagine does not as we do possess thought moulded by a particular social structure The relations of master and servant, ruler and ruled command and prohibition reward and punishment do not exist outside our social life The Divine Order is the system of creation itself in which the existence and appearance of everything is related solely to its creation by God according to *real* relations and to that alone Furthermore as has been mentioned in the Holy Quran[27] and prophetic hadith religion contains truths and verities above the common comprehension of man which God has revealed to us in a language we can comprehend on the level of our understanding

It can thus be concluded that there is a real relationship between good and evil actions and the kind of life that is prepared for man in eternity, a relation that determines the happiness or misery of the future life according to the Divine Will Or in simpler words it can be said that each good or evil action brings into being a real effect within the soul of man which determines the character of his future life Whether he understands it or not, man is like a child who is being trained From the instructions of the teacher the child hears nothing but do's and don'ts but does not understand the meaning of the actions he performs Yet when he grows up as a result of virtuous mental and spiritual habits attained inwardly during the period of training he is able to have a happy social life If however he refuses to submit to the instructions of the teacher he will undergo nothing but misery and unhappiness Or he is like a sick person who when in the care of a physician takes medicine food and special exercises as directed by the physician and who has no other duty than to obey the instructions of his doctor The result of this submission to his orders is the creation of harmony in his constitution which is the source of health as well as every form of physical enjoyment and pleasure To summarize we can say that within his outward life man possesses an inner life a spiritual life which is related to his deeds and actions and develops in relation to them and that his happiness or misery in the hereafter is completely dependent upon this inner life

The Holy Quran also confirms this explanation [28] In many verses it affirms the existence of another life and another spirit for the virtuous and the faithful a life higher than this life and a spirit more illuminated than the spirit of man as we know it here and now It asserts that man's acts have inner effects upon his soul that remain always with him In prophetic sayings there are also many references to this point For example in the Hadith i mi raj (hadith of the nocturnal ascension) God addresses the Prophet in these words He who wishes to act according to My satisfaction must possess three qualities he must exhibit a thankfulness that is not mixed with ignorance a remembrance upon which the dust of forgetfulness will not settle and a love in which he does not prefer the love of creatures rather than My love If he loves Me I love him I will open the eye of his heart with the sight of My majesty and will not hide from him the elites of My creatures I will confide in him in the darkness of the night and the light of the day until conversation and intercourse with creatures terminate I will make him hear My word and the word of My angels I will reveal to him the secret which I have veiled from My creatures I will dress him with the robe of modesty until the creatures feel ashamed before him He will walk upon the earth having been forgiven I will make his heart possess consciousness and vision and I will not hide from him anything in Paradise or in the Fire I will make known to him whatever people experience on the Day of Judgement in the way of terror and calamity [29]

Abu Abdallah may peace be upon him has recounted that the Prophet of God may peace and blessing be upon him received Harithah ibn Malik ibn al Nu man and asked him How art thou Oh Harithah? He said Oh Prophet of God I live as a true believer The Prophet of God said to him Each thing possesses its own truth What is the truth of thy word? He said Oh Prophet of God! My soul has turned away from the world My nights are spent in a state of awakedness and my days in a state of thirst It seems as if I am gazing at the Throne of my Lord and the account has been settled and as if I am gazing at the people of paradise who are visiting each other in heaven and as if I hear the cry of the people of hell in the fire Then the Prophet of God said This is a servant whose heart God has illuminated [30]

It must also be remembered that often one of us guides another in a good or evil matter without himself carrying out his own words In the case of the prophets and Imams however whose guidance and leadership is through Divine Command such a situation never occurs They themselves practice the religion whose leadership they have undertaken The spiritual life toward which they guide mankind is their own spiritual life [31] for God will not place the guidance of others in someone's hand unless He has guided him Himself Special Divine guidance can never be violated or infringed upon

The following conclusions can be reached from this discussion

(1) In each religious community the prophets and Imams are the foremost in the perfection and realization of the spiritual and religious life they preach for they must and do practice their own teachings and participate in the spiritual life they profess

(2) Since they are first among men and the leaders and guides of the community they are the most virtuous and perfect of men

(3) The person upon whose shoulders lies the responsibility for the guidance of a community through Divine Command in the same way that he is the guide of man's external life and acts is also the guide for the spiritual life, and the inner dimension of human life and religious practice depends upon his guidance [32]

children of all prophets in their backbone but placed my children in the backbone of Ali [14]

Hadith-i haqq Umm Salmah has said I heard from the Prophet of God who said Ali is with the Truth (haqq) and the Quran and the Truth and the Quran are also with Ali and they will be inseparable until they come upon me at Kawthar

Hadith-i manzilah Sa'd ibn Waqqas has said The Prophet of God said to Ali Are you not satisfied to be to me what Harun was to Moses except that after me there will not be another prophet

Hadith-i da'wat-i 'ashirah The Prophet invited his relatives for luncheon and after the meal told them I know of no one who has brought to his people a better thing than I have brought to you God has commanded me to invite you to draw toward Him Who is there who will assist me in this matter and be my brother inheritor (wasi) and vicegerent (khalifah) among you All remained silent but Ali who was the youngest of all exclaimed I shall be your deputy and aide Then the Prophet put his arms around him and said He is my brother inheritor and vicegerent You must obey him Then the group began to depart laughing and telling Abu Talib Muhammad has ordered you to obey your son [17]

Hudhayfah has said The Prophet of God said If you make Ali my vicegerent and successor which I do not think you will do you will find him a perspicacious guide who will direct you toward the straight path [18]

Ibn Marduyah has said that the Prophet said Whoever wishes that his life and death be like mine and that he enter paradise should after me love Ali and follow my household for they are my descendants and have been created from my clay My knowledge and understanding have been bestowed upon them Therefore woe unto those who deny their virtues My intercession [on the Day of Judgement] will never include them [19]

Affirmation of the Previous Section

Much of the argument of Shi'ism concerning the succession to the Prophet rests on the belief that during the last days of his illness the Prophet in the presence of some of his companions asked for some paper and ink[20] so that something could be written which if obeyed by the Muslims would prevent them from going astray Some of those present considered the Prophet to be too ill to be able to dictate anything and said The Book of God is sufficient for us There was so much clamor raised over this matter that the Holy Prophet told those present to leave for in the presence of a prophet there should not be any noise or clamor

Considering what has been said above about hadiths concerning succession and the events that followed upon the death of the Prophet especially the fact that Ali was not consulted in the question of selecting the Prophet's successor Shi'ites conclude that the Holy Prophet had wanted to dictate his definitive views about the person who was to succeed him but was not able to do so

The purpose of the utterances of some of those present seems to have been to cause confusion and prevent this final decision from being clearly announced Their interruption of the Holy Prophet's discourse does not seem to be what it appears outwardly that is concern with the possibility that the Prophet might utter incongruous words due to the intensity of his illness For first of all throughout his illness the Holy Prophet was not heard to have uttered any meaningless or incongruous words and no such thing has been transmitted concerning him Moreover according to the principles of Islam the Prophet is protected by God from uttering delirious or senseless words and is inerrant

Secondly if the words mentioned by some of those present on that occasion before the Prophet were meant to be of a serious nature there would have been no place for the next phrase The Book of God is sufficient for us In order to prove that the Prophet might utter incongruous words under unusual circumstances the reason of his serious illness would have been used rather than the claim that with the Quran there was no need of the Prophet's words For it could not be hidden from any Muslim that the very text of the Book of God considers the obedience to the Holy Prophet to be obligatory and his words to be in a sense like the Word of God According to the text of the Holy Quran Muslims must obey the injunctions of both God and the Prophet

Thirdly an incident involving illness occurred during the last days of the life of the first caliph who in his last will and testament chose the second caliph as his successor When Uthman was writing the will according to the order of the caliph the caliph fainted Yet the second caliph did not repeat the words that had been uttered in the case of the Prophet according to the hadith of Pen and Paper [21] This fact has been confirmed in a hadith related by Ibn Abbas [22] And it has been recounted of the second caliph that he said Ali deserved the caliphate but the Quraysh would not have been able to bear his caliphate for had he become caliph he would have forced the people to accept the pure truth and follow the right path Under his caliphate they would not have been able to transgress the boundaries of justice and thus would have sought to engage in war with him [23]

Obviously according to religious principles one must force him who has deviated from the truth to follow the truth one must not abandon the truth for the sake of one who has abandoned it When the first caliph was informed[24] that some of the Muslim tribes had refused to pay religious tax he ordered war and said If they do not give me the tithes which they gave to the Prophet I shall fight against them Evidently by this saying he meant most of all that truth and justice must be revived at all costs Surely the problem of the legitimate caliphate was more important and significant than tithes and Shi'ism believes that the same principle applied by the first caliph to this matter should have been applied by the whole early community to the problem of succession to the Holy Prophet

The Imamate and Its Role in the Exposition of the Divine Sciences

In the discussion of prophecy it was mentioned that according to the immutable and necessary law of general guidance each created species is guided through the path of genesis and generation toward the perfection and felicity of its own kind The human species is not an exception to this general law Man must be guided through the very instinct of seeking reality and through thought concerning his life in society in such a way that his well being in this world and the next is guaranteed In other words to attain human happiness and perfection man must accept a series of doctrines and practical duties and base his life upon them

It has moreover already been said that the way to understand that total program for life called religion is not through reason but through revelation and prophecy which manifests itself in certain pure beings among mankind who are called prophets It is the prophets who receive from God through revelation the knowledge of men's duties and obligations as human beings and who make these known to men so that by fulfilling them men may attain felicity

It is evident that in the same way that this reasoning proves the necessity for knowledge to guide men to the attainment of happiness and perfection it also proves the necessity for the existence of individuals who preserve intact the total body of that knowledge and who instruct the people when necessary Just as the Divine Compassion necessitates the existence of persons who come to know the duties of mankind through revelation so also it makes it necessary that these human duties and actions of celestial origin remain forever preserved in the world and as the need arises be presented and explained to mankind In other words there must always be individuals who preserve God's religion and expound it when necessary

The person who bears the duty of guarding and preserving the Divine message after it is revealed and is chosen by God for this function is called the Imam in the same way that the person who bears the prophetic spirit and has the function of receiving Divine injunctions and laws from God is called the Prophet It is possible for the imamate[25] and prophecy (nubuwwat) either to be joined in one person or to be separate

The proof given previously to demonstrate the inerrancy of prophets also demonstrates the inerrancy of the Imams for God must preserve His true religion intact and in such a state that it can be propagated among mankind at all times And this is not possible without inerrancy without Divine protection against error

walayat and the hadiths of Ghadir, Safinah, Thaqalayn, Haqq, Manzilah, Da'wat-i 'ashirah-i aqrabin and others. But of course these hadiths, most of which are also accepted by Sunnism, have not been understood in the same way by Shi'ism and Sunnism. Otherwise the whole question of succession would not have arisen. Whereas these hadiths appear to Shi'ites as a clear indication of the Prophet's intention in the question of succession, they have been interpreted by Sunnis in quite another way so as to leave this question open and unanswered.

To prove the caliphate of Ali ibn Abi Talib Shi'ites have had recourse to Quranic verses including the following: "Your friend [wali] can be only Allah; and His messenger and those who believe, who establish worship and pay the poor due, and bow down (in prayer) [or, and this reading is accepted by 'Allamah Tabataba'i, pay the poor due while bowing down (in prayer)]" (Quran V, 55). Shi'ite and Sunni commentators alike [illegible] that this verse was revealed concerning Ali ibn Abi Talib and many Shi'ite and Sunni traditions exist supporting this view. Abu Dharr Ghifari has said: "One day we prayed the noon prayer with the Prophet. A person in need asked people to help him but no one gave him anything. The person raised his hands to the sky and said: Oh God! Be witness that in the mosque of the Prophet no one gave me anything. Ali ibn Abi Talib was in the position of genuflection in the prayers. He pointed with his finger to the person who took his ring and left. The Prophet, who was observing the scene, raised his head toward heaven and said: Oh God! My brother Moses said to Thee: 'Expand my breast and make easy my tasks and make my tongue eloquent so that they will comprehend my words, and make my brother Harun my help and vizier' [cf. Quran XXVIII, 35]. Oh God! I am also Thy prophet; expand my breast and make easy my tasks and make Ali my vizier and helper." Abu Dharr says: "The words of the Prophet had not as yet finished when the verse [cited above] was revealed."

Another verse which the Shi'ites consider as proof of the caliphate of Ali is this: "This day are those who disbelieve in despair of (ever harming) your religion; so fear them not, fear Me! This day have I perfected your religion for you and completed My favour unto you, and have chosen for you as religion AL-ISLAM" (Quran V, 3). The obvious meaning of this verse is that before that particular day the infidels had hopes that a day would come when Islam would die out, but God through the actualization of a particular event made them lose forever the hope that Islam would be destroyed. This very event was the cause of the strength and perfection of Islam and of necessity could not be a minor occasion such as the promulgation of one of the injunctions of religion. Rather, it was a matter of such importance that the continuation of Islam depended upon it.

This verse seems to be related to another verse which comes toward the end of the same chapter: "O Messenger! Make known that which hath been revealed unto thee from thy Lord, for if thou do it not, thou wilt not have conveyed His message. Allah will protect thee from mankind" (Quran V, 67). This verse indicates that God commanded a mission of great concern and importance to the Prophet which, if not accomplished, would endanger the basis of Islam and prophecy. But the matter was so important that the Prophet feared opposition and interference and in awaiting suitable circumstances delayed it until there came a definite and urgent order from God to execute this command without delay and not to fear anyone. This matter also was not just a particular religious injunction in the ordinary sense, for to preach one or several religious injunctions is not so vital that if a single one of them were not preached it would cause the destruction of Islam. Nor did the Prophet of Islam fear anyone in preaching the injunctions and laws of religion.

These indications and witnesses add weight to the Shi'ite traditions which assert that these verses were revealed at Ghadir Khumm and concern the spiritual investiture (walayat) of Ali ibn Abi Talib. Moreover, many Shi'ite and Sunni commentators have confirmed this point.

Abu Sa'id Khudari says: "The Prophet in Ghadir Khumm invited people toward Ali and took his arm and lifted it so high that the white spot in the armpit of the Prophet of God could be seen. Then this verse was revealed: 'This day have I perfected your religion for you and completed My favor unto you and have chosen for you as religion AL-ISLAM.' Then the Prophet said: 'God is great (*Allahu akbar*) that religion has become perfected and that God's bounty has been completed, His satisfaction attained and the walayat of Ali achieved.' Then he added: 'For whomever I am the authority and guide Ali is also his guide and authority. Oh God! Be friendly with the friends of Ali and the enemy of his enemies. Whoever helps him, help him, and whoever leaves him, leave him.'"[8]

In summary we can say that the enemies of Islam who did everything possible to destroy it, when they lost all hope of achieving this end, were left with only one hope. They thought that since the protector of Islam was the Prophet, after his death Islam would be left without a guide and leader and would thus definitely perish. But in Ghadir Khumm their wishes were brought to nought and the Prophet presented Ali as the guide and leader of Islam to the people. After Ali this heavy and necessary duty of guide and leader was left upon the shoulders of his family.[9]

Some of the hadiths pertaining to Ghadir Khumm, the investiture of Ali, and the significance of the Household of the Prophet are cited here.

Hadith-i ghadir: The Prophet of Islam, upon returning from the farewell pilgrimage, stopped in Ghadir Khumm, assembled the Muslims and after delivering a sermon chose Ali as the leader and guide of Muslims.

Bara' says: "I was in the company of the Prophet during the farewell pilgrimage. When we reached Ghadir Khumm he ordered that place to be cleaned. Then he took Ali's hand and placed him on his right side. Then he said: 'Am I the authority whom you obey?' They answered: 'We obey your directions.' Then he said: 'For whomever I am his master (*maula*) and the authority whom he obeys, Ali will be his master. Oh God! Be friendly with the friends of Ali and enemy of the enemies of Ali.' Then 'Umar ibn al-Khattab said to Ali: 'May this position be pleasing to you, for now you are my master and the master of all the believers.'"[10]

Hadith-i safinah: Ibn 'Abbas says: "The Prophet said: 'My household is like the ship of Noah; whoever embarks upon it will be saved and whoever turns away from it will be drowned.'"

Hadith-i thaqalayn: Zayd ibn Arqam has recounted that the Prophet said: "It seems that God has called me unto Himself and I must obey His call. But I leave two great and precious things among you: the Book of God and My Household. Be careful as to how you behave toward them. These two will never be separated from each other until they encounter me at Kawthar (in paradise)."[12] Hadith-i thaqalayn is one of the most strongly established hadiths and has been transmitted through many chains of transmission and in different versions. Shi'ites and Sunnis agree concerning its authenticity. Several important points can be deduced from this hadith and its like: (1) In the same way that the Holy Quran will remain until the Day of Judgment, the progeny of the Holy Prophet will also remain. No period of time will be without the existence of the figure which Shi'ism calls the Imam, the real leader and guide of men. (2) Through these two great trusts (*amanat*) the Prophet has provided for all the religious and intellectual needs of the Muslims. He has introduced his Household to Muslims as authorities in knowledge and has pronounced their words and deeds to be worthy and authoritative. (3) One must not separate the Holy Quran from the Household of the Prophet. No Muslim has a right to reject the "sciences" of the members of the Household of the Prophet and remove himself from under their direction and guidance. (4) If people obey the members of the Household and follow their words they will never be led astray. God will always be with them. (5) The answers to the intellectual and religious needs of men are to be found in the hands of the members of the Household of the Prophet. Whoever follows them will not fall into error and will reach true felicity; that is, the members of the Household are free from error and sin and are inerrant. From this it can be concluded that by "Members of the Household" and "progeny" is not meant all the descendants and relatives of the Prophet. Rather, specific individuals are meant who are perfect in the religious sciences and are protected against error and sin so that they are qualified to guide and lead men. For Shi'ism these individuals consist of Ali ibn Abi Talib and his eleven descendants who were chosen to the imamate one after another. This interpretation is also confirmed by the Shi'ite traditions. For example Ibn Abbās has said: "I said to the Prophet: 'Who are your descendants whose love is obligatory [upon Muslims]?' He said: 'Ali, Fatimah, Hasan and Husayn.'"[13] Jabir has transmitted that the Prophet has said: "God placed the

KNOWLEDGE OF THE IMAM

The Meaning of Imam

Imam or leader is the title given to a person who takes the lead in a community in a particular social movement or political ideology or scientific or religious form of thought Naturally because of his relation to the people he leads he must conform his actions to their capabilities in both important and secondary matters

As is clear from the preceding chapters the sacred religion of Islam takes into consideration and gives directives concerning all aspects of the life of all men It investigates human life from the spiritual point of view and guides man accordingly and it intervenes on the plane of formal and material existence from the point of view of the life of the individual In the same way it intervenes on the plane of social life and its regulation (i e on the plane of government)

Thus the imamate and religious leadership in Islam may be studied from three different perspectives from the perspective of Islamic government of Islamic sciences and injunctions and of leadership and innovative guidance in the spiritual life Shi'ism believes that since Islamic society is in dire need of guidance in each of these three aspects the person who occupies the function of giving that guidance and is the leader of the community in these areas of religious concern must be appointed by God and the Prophet Naturally the Prophet himself was also appointed by *Divine Command*

The Imamate and Succession

Man through his God given nature realizes without any doubt that no organized society such as a country or city or village or tribe or even a household consisting of a few human beings can continue to subsist without a leader and ruler who puts the wheel of the society in motion and whose will governs each individual's will and induces the members of that society to perform their social duty Without such a ruler the parts of this society become dispersed in a short time and disorder and confusion reign Therefore he who is the ruler and governor of a society whether it be great or small if he is interested in his own position and the continued existence of his society will appoint a successor for himself if he is to be absent from his function temporarily or permanently He will never abandon the domain of his rule and be oblivious to its existence or annihilation The head of a household who bid farewell to his house and household for a journey of a few days or months will appoint one of the members of the household or someone else as his successor and will leave the affairs of the house in his hands The head of an institution or the principal of a school or the owner of a shop if he is to be absent even for a few hours will select someone to represent him

In the same way Islam is a religion which according to the text of the Holy Book and the Sunnah is established upon the basis of the primordial nature of things It is a religion concerned with social life as has been seen by every observer near and far The special attention God and the Prophet have given to the social nature of this religion can never be denied or neglected It is an incomparable feature of Islam The Holy Prophet was never oblivious to the problem of the formation of social groupings wherever the influence of Islam penetrated Whenever a city or village fell into Muslim hands he would in the shortest time possible appoint a governor or ruler in whose hands he would leave the affairs of the Muslims [1] In very important military expeditions ordered for the Holy War (jihad), he would appoint more than one leader and commander, in order of succession In the war of Mu'tah he even appointed four leaders, so that if the first were to be killed the second would be recognized as the head and his command accepted and if the second were to be killed, then the third, and so on [2]

The Prophet also displayed great interest in the problem of succession and never failed to appoint a successor when necessary Whenever he left Medina he would appoint a governor in his own place [3] Even when he migrated from Mecca to Medina and there was as yet no idea as to what would occur, in order to have his personal affairs managed in Mecca for those few days and to give back to people what had been entrusted to him, he appointed Ali—may peace be upon him—as his successor [4] In the same way, after his death Ali was his successor in matters concerning his debts and personal affairs [5] The Shi'ites claim that for this very reason it is not conceivable that the Prophet should have died without appointing someone as his successor without having selected a guide and leader to direct the affairs of Muslims and to turn the wheels of Islamic society

Man's primordial nature does not doubt the importance and value of the fact that the creation of a society depends on a set of common regulations and customs which are accepted in practice by the majority of the groups in that society and that the existence and continuation of that society depend upon a just government which agrees to carry out these regulations completely Anyone who possesses intelligence does not neglect or forget this fact At the same time one can doubt neither the breadth and detailed nature of the Islamic Shari'ah nor the importance and value the Prophet considered it to possess so that he made many sacrifices for its application and preservation Nor can one debate about the mental genius perfection of intelligence perspicacity of vision or power of deliberation of the Prophet (beside the fact that this is affirmed through revelation and prophecy)

According to established traditions in both Sunni and Shi'ite collections of hadith (in the chapter on temptations and seditions and others) transmitted from the Prophet, the Prophet foretold seditions and tribulations which would entangle Islamic society after his death and the forms of corruption which would penetrate the body of Islam and later worldly rulers who would sacrifice this pure religion for their own impure, unscrupulous ends How is it possible that the Prophet should not neglect to speak of the details of events and trials of years or even thousands of years after him and yet would neglect the condition that had to be brought into being most urgently after his death? Or that he should be negligent and consider as unimportant a duty that is on the one hand simple and evident and on the other significant to such a degree? How could he concern himself with the most natural and common acts such as eating drinking and sleeping and give hundreds of commands concerning them yet remain completely silent about this important problem and not appoint someone in his own place?

Even if we accepted the hypothesis (which Shi'ism does not accept) that the appointment of the ruler of Islamic society is given by the Shari'ah to the people themselves still it would be necessary for the Prophet to give an explanation concerning this matter He would have had to give the necessary instructions to the community so that they would be aware of the problem upon which the existence and growth of Islamic society and the life of religious symbols and observances depended and relied Yet there is no trace of such a prophetic explanation or religious instruction If there had been such a thing those who succeeded the Prophet and held the reins of power in their hands would not have opposed it Actually the first caliph transferred the caliphate to the second caliph by bequest The second caliph chose the third caliph through a six man council of which he was himself a member and whose order of procedure he had himself determined and ordered Mu'awiyah forced Imam Hasan to make peace and in this way carried away the caliphate After this event the caliphate was converted into an hereditary monarchy Gradually many religious observances identified with the early years of Islamic rule (such as holy war, commanding what is lawful and prohibiting what is forbidden the establishment of boundaries for human action) were weakened or even disappeared from the political life of the community, nullifying in this domain the efforts of the Prophet of Islam

Shi'ism has studied and investigated the primordial nature of man and the continuous tradition of wisdom that has survived among men It has penetrated into the principal purpose of Islam which is to revivify man's primordial nature and has investigated such things as the methods used by the Prophet in guiding the community the troubles which entangled Islam and the Muslims and which led to division and separation and the short life of the Muslim governments of the early centuries which were characterized by negligence and lack of strict religious principles As a result of these studies Shi'ism has reached the conclusion that there are sufficient traditional texts left by the Prophet to indicate the procedure for determining the Imam and successor of the Prophet This conclusion is supported by Qur'anic verses and hadiths which Shi'ism considers as sound such as the verse on

for the first time in the history of human ideas, warning mankind against this kind of error

The second source of error in the reasoning process, which is particularly relevant in social issues, is imitation Most people are such that they accept whatever beliefs that are current in their society They adopt certain beliefs merely for the reason that they were followed by their preceding generation [15] The Quran bids people to carefully scrutinize all ideas and judge them by the criteria of reason—neither to follow blindly the conventional beliefs and traditions of their ancestors, nor to reject them totally without any rational justification It reminds us that there are many false doctrines that were introduced in the past, but were accepted by the people, and there are also certain truths that were presented in the distant past but people resisted them on account of their ignorance In accepting any ideas or principles men are advised to make use of their intellects and rational faculties, and not to indulge in blind imitation Very often, the Quran puts imitation of ancestors in direct opposition to reason and intellect

وإذا قيل لهم اتبعوا ما أنزل الله قالوا بل نتبع ما ألفينا عليه آباءنا أولو كان آباؤهم لا
يعقلون شيئاً ولا يهتدون

And when it is said to them Follow what God has sent down they say No but we will follow such things as we found our fathers doing What? Even if their fathers had no understanding of anything and if they were not guided (2 170)

The Quran constantly reiterates the view that the idea of antiquity of an idea is neither the evidence of its falsity nor is it a testimony of its truthfulness Antiquity affects material objects but the eternal truths of existence never become old and outmoded Truths like

إن الله لا يغير ما بقوم حتى يغيروا ما بأنفسهم

God changes not what is in a people until they change what is in themselves

are true for ever and ever The Quran asks us to face issues with the weapon of reason and intellect One should neither forsake a belief for fear of becoming the target of others ridicule and banter, nor should he accept a belief just because it is upheld by some important and well known persons We should ourselves study and investigate the roots of all matters and draw our own conclusions [16]

A Third effective source of error pointed out by the Quran is

[illegible]

Selfish motives tarnish virtue and merit
A cascade of curtains gallops from the heart towards vision

Unless one maintains objectivity and neutrality in every matter he is unlikely to think correctly Reason can function properly only in an atmosphere that is free of selfish desires and motives A well known anecdote of al Allamah al Hilli, can illustrate this point

A problem of *fiqh* was put before al Allamah al Hilli If an animal falls inside a well, and the carcass cannot be removed, what should be done with the well? Incidentally, during the same days an animal happened to fall into the well in his own house and it became inevitable for him to deduce an injunction to solve his own problem, too There were two possible ways to solve the issue Firstly the well should be totally closed, not to be used again, secondly a fixed quantity of water should be emptied from the well and the rest of well's water would be clean and usable The 'Allamah realized that he could not give a completely impartial verdict about the problem without interference from his own personal interest Accordingly, he ordered his own well be colsed Then, with an easy mind, free of the pressure of selfish motives he turned to deducing the details of verdict in the second case

The Quran contains a large number of warnings regarding the evil of submission to personal desires The following is just one instance of it

إن يتبعون إلا الظن وما تهوى الأنفس

They follow nothing except conjecture and what the self desires (53 25)

To be continued

NOTES

1 Various Eastern and Western scholars have spoken regarding this religious or spiritual consciousness in man Here I shall cite quotations from two of those thinkers of world renown One is from Einstein In one of his treatises he has expressed his views about religion In his view three types of religion exist in the world

a The religion of fear that is the religion of those people whose driving motive towards religion consists of a series of fears associated with nature and environment

b The religion of ethics by this he means the kind of religion which is based on moral expediencies

c Then he mentions another religion which he calls the religion of being This interpretation of religion by Einstein almost concurs with what we mean by the heart According to Einstein one sometimes attains a spiritual state when he liberates himself from the confinement of his limited self chained in the shackles of petty worldly desires and is successful in spontaneously elevating himself above the level of mundane physical existence which has entrapped him Then he is able to gain a panoramic view of the totality of being and perceives it as a single reality In such a state the greatness and grandeur that lies beyond the phenomenal existence are revealed to him That is the time when man is able to evaluate his own existence as an insignificant and infinitesimal fraction of the totality of being and becomes a part of it

This interpretation of Einstein reminds us of the episode of Hammam who once asked Amir al Mu minin Ali (A) about the attributes of the pious and Ali gave him a concise reply saying

يا همام اتق الله وأحسن فإن الله مع الذين اتقوا والذين هم محسنون

O Hammam fear God and perform good acts because verily God is with those who guard themselves against evil and those who do good (to others) (Nahj al balaghah sermon 193)

But Hammam would not be satisfied with this answer and wanted a more detailed and elaborate description Then Ali (A) took to describing the qualities of a believer in detail enumerating approximately 130 characteristics of the pious There he says

ولولا الأجل الذي كتب الله عليهم لم تستقر أرواحهم في أجسادهم طرفة عين

If there had not been a fixed period (of life) ordained for each their spirits would not have remained in their bodies even for the twinkling of an eye

This is the same state as Einstein refers to He says that a religious person feels himself as if in an imprisoned state and wants to get out of the cage of his physical existence in order to recover his vision of the unity of the totality of being This truth has been defined more intensely and colourfully by Ali (A) According to him it is as if the *mu min* accumulates the totality of being in his physical frame as a result his spirit spontaneously breaks its barriers and obtains liberty It is recounted that as Ali finished his speech Hammam gave a cry and his soul left his physical form

In the context of spiritual experience Iqbal too has said something interesting he says The spiritual reward of the prayer as a means of spiritual illumination is not at all puzzling it is a vital act by which the tiny island of our personality discovers its true situation within the vast ocean of existence

2 The Imams (A) used to chant the Quran in such a moving tone that the passers by stopped stood in awe and tears flowed from their eyes

3 Imam al Sajjad (A) mentions this point in his prayer meant for reciting on the occasion of completion of the Quran by someone

واجعل القرآن لنا في ظلم الليالي مونسا

And make the Quran a companion unto us in the darkness of the night

4 In our own times this truthful promise of God has been once again fulfilled and a single man a descendent of the Prophet (S) who like his holy ancestor had his sole reliance in the power of Quran and his faith brought about a deadly and crushing defeat on the militia of *kufr* and evil

5 Imam Ali (A) in one of the sermons of the *Nahj al balaghah* which is popularly known as *al Muttaqun* (sermon 193) enumerates many qualities of the pious and delineates their character behaviour their manner of speech how they spend their nights and so on

أما الليل فصافون أقدامهم

During nights they line up their feet (standing) for worship

تالين لأجزاء القرآن يرتلونها ترتيلا

reciting in a well measured way not like many of us who hastily recite the Quran without understanding its meaning)

يحزنون به أنفسهم

Creating through it feeling in their souls

If they come across a verse creating eagerness (for Paradise) they pursue it avidly and their spirits turn towards it eagerly and they feel as if it is in front of them And when they come across a verse which contains fear (of Hell) they turn the ears of their hearts towards it and feel as though they hear the raging of hellfire with their ears

6 *Ahl al kitab* or the People of the Book is a term used to designate the Jews and Christians as distinct from the idolaters

7 This verse is one of the most wonderful verses of the Quran At the time of its revelation the Prophet was in Mecca and his intercourse was limited to the people of this small town It seemed ludicrous to many that a man so alone among his own tribe should talk so confidently and calmly tell them that they would learn about the significance of this verse later on and would find out how this Book will change the world and its people in a short period of time

8 Because in that case the followers would not really aim at the goals of justice and truth but they would be after their own material gains and fulfilment of their desires

9 Here the term *dabbah* (beast) includes insects also but in Arabic the usage of this term is confined to four footed animals like the horse cow mule etc

10 The same idea has been put into verse in the following fine couplet of Sa di

به نطق آدمی بهتر است از دواب   دواب از تو به گر نگویی صواب

To be continued on P 1(

view is totally negated and refuted by the Quran.

2. References to the Law of Causality

The other argument that supports the view that the Quran approves of the ultimate authority of reason, is that it defines various problems in terms of cause-and-effect relationship. The cause-and-effect relationship, or the law of causation, is the foundation of rational thinking. This law is honoured by the Quran and is also employed by it. The Quran speaks on behalf of God, the Almighty, the Creator of the system of cause and effect. Despite the fact that His Word transcends the limitations of causality, the Quran is not oblivious of pointing out to the system of causality operating in the universe; it views all phenomena and events as being subservient to this system. The following verse supports this view

... إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ...

God changes not what is in a people, until they change what is in themselves (13 11)

The Quran intends to say that, although all destinies depend on the Will of God, He never imposes upon human beings such fate as is outside and alien to their determination, will and action. The destinies of societies also change according to their intrinsic system of functioning. God does not extravagantly alter the destiny of a nation without any specific reason, unless they themselves bring about a major change in their system of social and moral values and their manner of performing their individual duties.

The Quran urges Muslims to study the conditions and circumstances of societies of the past and to take lesson from their history. It is evident that if the destinies of races and nations were random, or dependent upon accidents, or were prescribed from above, the advice to study and draw a lesson would not have any sense. By laying emphasis on it, the Quran intends to remind us that a uniform system of laws governs the destinies of all the nations of the world. It also reminds us that if the conditions of a society in which we live, are similar to the conditions prevalent in a society of the past, the same fate awaits us too. Elsewhere, the Quran says:

فَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُعَطَّلَةٍ وَقَصْرٍ مَشِيدٍ ۝ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا...

How many a city We have destroyed in its evildoing, and now it is fallen down upon its turrets. How many a ruined well, a tall palace. What, have they not journeyed in the land so that they have hearts to understand with, or ears to hear with ? (22 45-46)

From this statement, we can infer that the affirmation of the law of causality and the approval of the cause-and-effect relationship, imply the acceptance of authority of reason.

3. Rational Basis of Divine Commands

Another argument which proves that the Quran believes in the ultimate authority of reason, is that the Quran always explains the rationale behind its commands, laws and precepts. The scholars of *uṣūl al-dīn* (the principles of the Faith) maintain that the harms and benefits caused by human deeds are among the reasons behind laws and commands. For example, while at one place the Quran ordains the performance of prayers, in another place it explains the philosophy of prayer:

... إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ...

...indeed prayer forbids indecency and dishonour (29 45)

It mentions the spiritual effects of prayer, and states how the prayer can edify man. It explains that it is on account of this exaltation that man can dissociate himself from indecencies. Elsewhere, after laying down rules for observing the fast, the Quran explains the rationale for its command:

... كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

...prescribed for you is the Fast, even as it was prescribed for those that were before you—haply you will be God-fearing (2 183)

Similarly, with respect to other commandments like those regarding *zakāt* (alms) and *jihād*, the Quran clarifies their necessity for individual, as well as for society. In this way, the Quran, not withstanding the transcendental nature of Divine commandments, clarifies fully their worldly and terrestrial relevance, and asks men to cogitate upon their rationale until their meaning becomes explicit, so that it may not be imagined that these laws are based on a series of occult notions beyond the power of human comprehension.

4. Combating Deviations of Reason

Another evidence in favour of the Quran's affirmation of the authority of reason which is more conclusive than that mentioned above—is the battle it launched against all those agents which obstruct the proper functioning of reason. For clarification of this point, we are forced to mention certain things in the way of an introduction.

The human mind can, in many cases, fall into error. This fact is acknowledged by all of us. However, this danger is not limited to the intellect alone, but can equally befall the senses, and feelings as well. Just for the sense of vision, scores of visual errors and optical illusions have been pointed out. In the case of reason, too, there are times when people frame an argument and rationale and draw an inference on its basis, but later on they realize that the basis of their conclusion was erroneous. Here the question arises, whether the faculty of reason should be suspended on account of its occasional failures, or whether we should employ other means for discovering the errors of the intellect and seek to avoid such errors. In answering this question, the Sophists said that reason should not be relied upon, and that, basically, argumentation and reasoning is an absurd practice. Other philosophers have given a fitting reply to the Sophists, and said that though the senses can also err like reason, but no one has ever recommended their suspension. Since it was not possible to discard reason, the philosophers resolved to find ways of making reason secure from error. During their efforts in this regard, they discovered that all arguments consist of two parts, namely, matter and form. Like a building which has various ingredients in its construction, like, lime, cement, steel, etc. (matter), to acquire a specific structure (form). In order to attain the permanence and perfection of its construction, it is essential to procure proper material as well as to draw a perfect and faultless plan. For the correctness and accuracy of an argument, too, it is essential that its content and form be both free of error and defect. For judging the validity of the form of any argument, the Aristotelian or formal logic came into existence. The function of formal logic is to determine the accuracy or inaccuracy of the form of an argument, and help the mind to avoid errors in the process of reasoning.[12]

But the major problem that remains is that solely formal logic is inadequate for this purpose, because it cannot alone guarantee the validity of an argument. It can give assurance about one aspect alone. To obtain the perfection of the material aspect, the use of material logic is also essential, that is, we need certain criteria for controlling the quality of the rational material.

Thinkers like Bacon and Descartes strove hard to evolve some kind of material logic similar to the formal logic of Aristotle, which was devised for formal reasoning. They did obtain certain criteria in this regard, though they are not as universal as those of Aristotelian logic, but are, to a limited extent, helpful in preventing the mind from committing errors in reasoning. Some may be surprised to know that the Quran has presented such principles for the prevention of any lapses in the process of reasoning, which surpass in merit and precedence the efforts of philosophers like Descartes and others.

The Quranic Viewpoint Regarding the Sources of Error

Among various sources of error mentioned by the Quran, one is that of taking conjecture and hypothesis for certainty and conviction.[13] If a person were to adhere to the principle of putting conviction only in certainties and of not confusing between conjectures and certainties, he would not fall into error.[14] The Quran lays great emphasis on this problem, and has clearly stated in one place that one of the biggest errors of the human mind is pursuit of conjectures and hypotheses. In another verse, which is addressed to the Prophet (S), the Quran says:

وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ۝

If thou obeyest the most part of those on earth, they will lead thee astray from the path of God. they follow only surmise, merely conjecturing (6 116)

In another verse, the Quran says:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ...

And pursue not that thou has no knowledge of (17 36)

This is the word of caution to mankind extended by the Quran,

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ۞ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ ۞

It is but a reminder unto all beings, and you shall surely know its tiding, after a while [7] *(38 87 88)*

Then, is this book meant for all the people of the world, or is it for the believers alone? In another verse, addressing the Prophet, God, the Most Exalted, says:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ ۞

We have not sent thee, save as a mercy unto all beings (21 107)

A more detailed explanation of this matter would be undertaken during the course of later discussion regarding the historical aspect of the Quran Here it is just sufficient to mention that the Quran is addressed to all the people of the world It does not single out any particular nation or group. Everyone who accepts the invitation of the Quran is assured of spiritual salvation. However, the verses which mention the Quran as the book of guidance for the believers and the God-fearing (*mu'minūn* and *muttaqūn*), clearly specify the kind of people who will be attracted towards it and others who will turn away from it The Quran never names any particular nation or tribe as being its devotees It does not take sides with a specially chosen people Unlike other religions, the Quran never associates itself with the interests of any specific class It does not say, for example, that it has come to safeguard the interests of the workers or the peasants. The Quran repeatedly emphasizes the point that its purpose is to establish justice. Speaking about the prophets, it says

... وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ...

and We sent down with them the Book and the Balance so that men might uphold justice (57 25)

The Quran advocates justice for all mankind, not merely for this or that class, tribe or nation It does not, for example, like Nazism and other such cults, stir up the passions of prejudice to attract people. Similarly, it does not, like certain schools of thought like Marxism, base its appeal upon the human weakness of interest-seeking and enslavement to material motivations to incite people,[8] because the Quran believes in the essential primariness of the rational consciousness of man and his intrinsic conscience It believes that it is on the basis of its moral potentialities and its truth conscious human nature that mankind is placed firmly on the path of progress and evolution This is the reason why its message is not limited to the working or farming class or exclusively to the oppressed and deprived. The Quran addresses both the oppressors as well as the oppressed, and calls them to follow the right path. Prophet Moses (A) delivers the message of God to both Bani Israel and Pharaoh, and asks them to believe in the Lord and to move in His path Prophet Muḥammad (S) extends his invitation both to the chieftains of Quraysh and to ordinary persons like Abu Dharr and 'Ammār. The Quran cites numerous examples of an individual's revolt against his own self and his voluntary return from the path of deviation to the straight one But, at the same time, the Quran is aware of the point that the restoration and repentence of those immersed in a life of luxury and opulence is comparatively more difficult than that of those familiar with the hardships of life: the oppressed and the deprived, who are, as a matter of fact, naturally more inclined towards justice; whereas the rich and wealthy, at the very first step, have to forgo their personal and class interests and abandon their wishes and aspirations.

The Quran declares that its followers are those who have a clear and pure conscience. They are drawn to it solely by the love of justice and truth, which is ingrained in the nature of all human beings—not under the urge for material interests and worldly desires and allurements.

Conception of Reason in the Quran

Heretofore we have discussed briefly the diction of the Quran, and said that, for the purpose of communicating its message, the Quran makes use of two types of languages, namely, the language of rational argument and the language of feeling. Each of these languages has a specific appeal. The first type addresses and appeals to the intellect or reason, while the second one is meant to appeal to the heart. Now we shall examine the point of view of the Quran regarding reason (*'aql*).

It is to be seen whether or not the Quran acknowledges the 'authority' (*ḥujjah*) of reason—as the scholars of *fiqh* (Islamic jurisprudence) and *uṣūl* put it. This means whether or not we should respect the judgements of reason and act according to them if they happen to be correct and rightly deduced by it. Moreover, if one acts according to the dictates of reason and occasionally falls into error, will God exonerate him for it, or whether He will punish him on account of that error? And, if one fails to act according to the ruling of reason, does he deserve punishment?

Evidence in Favour of the Authority of Reason

The issue of the authority of reason in Islam is certain. Since the earliest times until the present, none amongst the Islamic scholars—except for a very small number—has ever negated the authority of reason, they have counted it as one of the four sources of Islamic *fiqh*.

1. The Quran's Emphasis on Rationalism

Since our discussion is about the Quran, I think it necessary to produce arguments concerning the authority of reason from the Quran itself The Quran, in various ways, confirms the authority of reason. About sixty to seventy verses can be cited—and that, too, for just *one* of the various ways, as mentioned—in which the Quran indicates that such and such a matter has been mentioned for reason to reflect on. In one instance, the Quran refers to this issue in a striking statement:

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۞

Surely the worst of beasts in God's sight are those that are deaf and dumb and do not reason [9] *(8 22)*

Of course, it is obvious that the Quran does not mean the physically deaf and dumb, but those who do not want to listen to truth, or those who, when they hear, do not wish to admit it with their tongues. In the view of the Quran, the ears which are unable to listen to truth and which are only used for listening to absurd and nonsensical things, are deaf. The tongue which is merely used to utter nonsense, is dumb. The people who do not reason (... الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۞) are those who do not make use of their intellect and their faculty of thought. Such are not fit to be called human beings. The Quran includes them among the beasts.[10]

In another verse, while bringing up a subject related to Divine Unity (*al-tawḥid*), the Quran refers to the issue of unity of Divine Acts, and says:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ...

It is not for any soul to believe, save by the leave of God (10 100)

After stating this profound issue—a problem which is not easily comprehensible to every human mind—the Quran continues the verse like this:

... وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۞

. and He lays abomination upon those who do not reason (10 100)

In these two verses, which I quote here for the sake of example, the Quran, in the terms of logic, invites us to ratiocination. There are many other verses in the Quran which, on the basis of consequential signification, can be said to accept the authority of reason.[11] In other words, the Quran makes statements which cannot be accepted without accepting the authority of reason. For instance, an opponent is asked to forward rational argument in favour of his position.

... قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۞

Say Bring your proof if you are truthful (2 111)

This can only be inferred to mean the Quran's ratification of the authority of reason. In another place it uses syllogistic argument to prove the existence of the Necessary Being (*wājib al-wujūd*)

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ...

Were there gods in them [earth and heaven] other than God, they would surely disintegrate.. (21 22)

In these verses the Quran has framed a conditional proposition, which exempts or excludes the antecedent premise for arriving at a conclusion which is consequent upon it. Thus the Quran aims at emphasizing the role of reason and refutes the view of some of the religions that faith is alien to, or, is incompatible with reason, and that to embrace faith one has to suspend his rational faculty and concentrate upon heart alone, so that it may absorb the Divine light and become illuminated by it. This

his whole being, which is profoundly influenced This sort of influence can perhaps be illustrated by the example of music The various forms of music share the common quality which is stimulation of human feelings Music appeals to the human soul and immerses it into a specific world of feeling The nature of feelings, excited by different kinds of music, of course, varies Certain types of music may be associated with the passions of valour and bravery In the past, on the battlefield, the effects of martial music were evident Sometimes its effects were so strong that the frightened soldier who would not dare come out of their bunkers, were made to march in fervour despite fierce attacks from enemy's ranks It is possible that certain other kinds of music may excite sensual feelings and invite the listener to succumb to sensual vices The results of such music are noticeable in the moral waywardness of our own times Perhaps no other thing could have so effectively broken down the walls of morality and chastity to the extent of this kind of music Other kinds of instinctive feelings and passions, whether aroused by means of music or by some other means, can be controlled when addressed in the language that appeals to them

One of the most sublime instincts and emotions present in all human beings is the urge for religion and the natural quest for God It is in the same heavenly echoes that the Quran speaks to the Divine instincts of mankind [1] The Quran itself recommends that its verses be recited in fine and beautiful rhythms for it is in those heavenly rhythms that it speaks to the Divine nature of man [2]

The Quran, describing itself maintains that it speaks in two languages Sometimes it introduces itself as the Book of meditation, logic and demonstration, at other times as the Book of feeling and love In other words, it does not merely seek to nourish the intellect and thought, but also nurtures the human soul

The Quran lays great emphasis on its own specific quality of music, a music which more than any other music is effective in arousing the profound and sublime feelings of the human heart The Quran directs the believers to devote a few hours of the night to reciting its verses, and to recite them during their ritual prayers when their attention is turned towards God Addressing the Prophet the Quran says

يا أيها المزمل * قم الليل إلا قليلا * نصفه أو انقص منه قليلا * أو زد عليه ورتل القرآن ترتيلا *

O thou enwrapped in thy robes keep vigil the night except a little (a half of it or diminish a little or add a little) and chant the Quran very distinctly (73 1-4)

It asks the Prophet (S) to recite the Quran while standing for the prayers *Tartil* means to recite neither too hastily that words cannot be distinguished, nor too slowly that their connection be lost It commands the Prophet (S) to recite its verses rhythmically and at the same time to cogitate upon their meaning Again in a later verse of the same surah, the Prophet is reminded that he needs enough sleep to effectively perform the daily chores of business or jihad in the path of God nevertheless, he should not forget to seclude himself for worship

It were the same rhythms of the Quran that became the singular source of spiritual joy and strength, and the means of producing inner purity and sincerity among Muslims It was the same music of the Quran, which, in a very short period of time, converted the barbarous tribes of the Arabian peninsula, into a steadfast nation of committed believers, who could grapple with the greatest powers of the age and overthrow them

The Muslims did not merely view the Quran as a book of moral advice and instruction alone, but also, as a spiritual and ideological tonic They recited the Quran with devotion of heart during their intimate nightly supplications, and during the day, they derived from it the strength to attack the unbelievers like roaring lions [3] The Quran had just such an expectation of those who had found their faith Addressing the Prophet, it says

فلا تطع الكافرين وجاهدهم به جهاداً كبيراً *

Obey not the unbelievers, but struggle against them with it [the Quran] striving mightily (25 52)

The Quran advises the Prophet (S) not to pay heed to the words of the infidels and to stand firmly against them equipped with the weapon of the Quran It assures him that the ultimate victory shall be his The life of the Prophet (S) itself is a positive proof of this assurance He stood all alone against enemies without any support except the Quran, and the same Quran meant everything to him. It produced warriors for him, furnished arms and forces, until, ultimately, the enemies were totally subdued The Quran drew towards him individuals from the enemy's camp, and caused them to submit before the Messenger of God In this way the Divine pledge was fulfilled.[4]

When the Quran calls its language 'the language of the heart', it means the heart which it seeks to purify, enlighten and stimulate This language is other than the language of music that occasionally arouses sensual feelings It is also different from the language of martial music that arouses the spirit of heroism in the hearts of soldiers and strengthens and enhances their enthusiasm Rather it is the language which converted the Arab bedouins into inspired mujahidin for whom it was said

حملوا بصائرهم على أسيافهم

They carried their visions on their swords

Those people carried their vision their ideology their religion and spiritual discoveries on their swords, and used them in the defence of those ideals and ideas The notions of private and personal interest were alien to them Though they were not innocent and infallible and they did commit mistakes, yet they were those who rightly fitted the description

قائم الليل وصائم النهار

Standing in prayer during nights fasting during daytime

Every moment of day and night, they were in contact with the depths of Being Their nights were passed in worship and days in jihad '

It is on account of this characteristic that the Quran is a book of the heart and the soul Its appeal overwhelms the soul and brings tears flowing from the eyes and makes the heart tremble It stresses this point and considers it true even of the ' People of the Book

الذين آتيناهم الكتاب من قبله هم به يؤمنون * وإذا يتلى عليهم قالوا آمنا به إنه الحق من ربنا إنا كنا من قبله مسلمين *

Those to whom We gave the Book before this believe in it and when it is recited to them they say We believe in it surely it is the truth from our Lord even before it we were of those who surrender (28 52-53)

It describes a group of people who undergo a state of veneration and awe when the Quran is recited before them They affirm faith in all the contents of the Book declare everything in it to be nothing but truth and their veneration of it continues to increase In another verse the Quran affirms that among the *Ahl al Kitab* (The People of the Book) the Christians are closer to the Muslims than the idolaters and Jews Then a group of Christians who believed and became Muslims on hearing the Quran are described in these words

وإذا سمعوا ما أنزل إلى الرسول ترى أعينهم تفيض من الدمع مما عرفوا من الحق يقولون ربنا آمنا فاكتبنا مع الشاهدين *

And when they hear what has been sent down to the Messenger thou seest their eyes overflow with tears because of the truth they recognize They say Our Lord we believe so do Thou write us down among the witnesses (5 83)

In another place, while describing the believers the Quran says

الله نزل أحسن الحديث كتاباً متشابهاً مثاني تقشعر منه جلود الذين يخشون ربهم ثم تلين جلودهم وقلوبهم إلى ذكر الله

God has sent down the fairest discourse as a book consimilar in its oft repeated parts whereat shiver the skins of those who fear their Lord then their skins and their hearts soften to the remembrance of God (39 23)

In these, as well as in many other verses (such as 19 58 61 1 etc), the Quran tells us that it is not merely a book of knowledge and analysis but at the same time that it makes use of logical arguments that appeal to the intellect, it also speaks to the finer sensibilities of the human soul

The Quran's Addressees

Another point that has to be inferred from the Quranic text during its analytical study, is to determine the identity of those who are addressed by it There are certain expressions like هدى للمتقين (guidance for the God fearing), هدى وبشرى للمؤمنين (guidance and good tiding for the believers), لينذر من كان حياً (to admonish and caution him who is alive), which often recur in the Quran Here, the question may arise Of what need is guidance for those who are already guided, the pious and the righteous? Moreover, we see that the Quran describes itself in these words

Understanding the Uniqueness of the Qur'ān *Part 2*

by Martyr Murtaḍā Muṭahhari

translated from Persian by Mahliqā Qarā'ī

Issues in an Analytical Study of the Quran:

Now we shall proceed to study the contents of the Quran from an analytic viewpoint. Of course, if we were to deal with every subject of the Quran separately, it would call for—as Rūmi would say—seventy tons of paper. So we will confine our discussion mainly to general and then a few particular issues.

The Quran has dealt with a vast range of subjects, and in this process, it is more concerned with certain subjects and less with others. The universe and its Creator are among the most recurring themes of the Quran. We must try to see how it treats this theme. Is its outlook philosophical or gnostic? Is its treatment similar to that of other religious books like the Bible and the *Torah*? Is it similar to that of the religious books of Hinduism? Does it deal with this problem in its own independent manner?

The other problem that is repeatedly treated by the Quran is the problem of the universe or the world of creation. We must examine the outlook of the Quran about the universe. Does it regard the universe and all creation to be an exercise in vanity and futility or does it regard it as being based on coherent truth? Does it consider the state of affairs in the universe as being based upon a series of laws and principles, or does it regard it as a chaotic phenomenon in which nothing is the cause or condition of any other thing? Among the general issues dealt by the Quran is the problem of the human being. The Quranic outlook regarding the human being must be analyzed. Does the Quran possess an optimistic outlook of man? Does it speak of him in pessimistic and negative terms? Does the Quran consider man as a despicable creature, or does it acknowledge his nobility and dignity?

The other problem dealt with in the Quran is the problem of human society. We have to see if the Quran considers the society to be primary and the individual as secondary or whether it subordinates the society to the individual. Are societies, according to the Quran, subject to laws governing their life and death, their rise and decline, or are these conditions applicable to individuals alone? In the same way, its conception of history also needs to be clarified. What is the Quranic view regarding history? What are the forces that control the dynamics of history? To what extent can an individual's influence affect the course of history in the view of the Quran?

The Quran deals with numerous other issues. I shall enumerate some of them here. One of them is the point of view of the Quran about itself. The other issue is related to the Prophet (S) and its manner of introducing and addressing him. Another issue is its definition of a believer (*mu'min*) and his characteristics and so on.

Furthermore, each of these general issues possesses various branches and divisions. For example, when discussing mankind and its situation, it is natural to speak about morality. Or, when speaking about society, the problem of human relationships also unavoidably enters the discussion. The same is true of such notions as 'enjoining good and forbidding evil' (الأمْرُ بالمَعْرُوف والنَّهْيُ عَنِ المُنْكَر), and the problem of social classes.

How does the Quran Introduce Itself?

For the purpose of analysing Quranic themes, it is better to start by examining the opinion of the Quran about itself and its manner of self-introduction. The first and foremost thing that the Quran pronounces about itself is that all of its words, phrases and sentences are the Word of God. It makes clear that the Prophet (S) was not its author; rather the Prophet only related whatever was revealed to him through the agency of the *Rūḥ al-Qudus* (Gabriel) with the permission of God.

The Quran describes its other function as the presentation of the prophetic mission, which is aimed at guidance of humanity, by delivering it from *darkness* and leading it towards *light*:

... كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ

.. A Book We have sent down to thee that thou mayest bring forth mankind from the darkness into the light. (14 1)

Without doubt the darkness of ignorance is one of the vices from which the Quran emancipates humanity and leads it towards the light of knowledge and wisdom. However, if merely ignorance were regarded as darkness, then the philosophers could have accomplished this job. But there exist other evils more dangerous than the vice of ignorance, and to subdue them is beyond the power of sheer knowledge. Among them are the vices of worship of material benefits, egoism, enslavement to desires, and greed, which are considered to be personal and moral vices. Social vices like oppression and discrimination manifest the spiritual darkness of a society. In Arabic, the word *ẓulm* (injustice and oppression) is derived from the same root as *ẓulmah* (darkness), which shows that injustice is a form of social and spiritual darkness. To struggle against such forms of darkness is the responsibility and mission of the Quran and other heavenly books. Addressing Prophet Moses (A), the Quran says:

... أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ...

that thou mayest bring forth your people from the darkness into the light (14 5)

This *darkness*, this shadow, is the darkness of Pharaoh's oppression and injustice and that of his clique. The *light* is the light of justice and freedom.

The exegetists of the Quran emphasize the point that whenever the Quran mentions darkness, it always uses it in the plural form الظُّلُمات though it always uses light in its singular form. This means that the word الظُّلُمات (darkness) includes all sorts of darkness, all of the evil ways that lead towards darkness, and that النُّور (light) signifies one single right path—the path of righteousness, whereas the ways of deviation and perversion are many. In *Sūrat al-Baqarah*, the Quran says:

اللهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ...

God is the Protector of the believers, He brings them forth from the darkness into the light. And the unbelievers -their protectors are tāghut, that bring them forth from the light into the darkness (2 257)

The Quran determines its goal to be the breaking of the chains of ignorance, misguidance, moral and social corruption and destruction, or in other words, to dissipate all sorts of darkness, and to guide humanity in the direction of justice, goodness and light.

The Language of the Quran

The other issue is that of gaining familiarity with the language of the Quran and the recitation of it. There are some people who think that the Quran is to be read merely for the purpose of obtaining spiritual reward (*thawāb*) without need of understanding anything of its contents. They continuously recite the Quran, but if they are even once asked, "Do you understand the meaning of what you are reading?" they cannot answer. To recite the Quran is essential and good, being regarded as the first step necessary for comprehending its contents; and not merely as a means for gaining Divine reward.

The comprehension of the meaning of the Quran has certain peculiarities to which due attention must be paid. While other books are read for the purpose of acquiring the knowledge of novel ideas that merely involve reason and the rational faculties of the reader's mind, the Quran must be studied with the intention of educating oneself. The Quran itself clarifies this point:

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ

A book We have sent down to thee, blessed, that men possessed of mind may ponder its signs and so remember (38:29)

One of the functions of the Quran is to instruct and to teach. For this purpose, the Quran addresses human reason and speaks in logical and demonstrative terms. There is also another language that the Quran makes use of. But this language is not used to appeal to the faculty of reason, but to the heart. This is the language of feeling. Whosoever wants to acquaint himself with the Quran, should be familiar with both of the languages and be able to make use of both of them simultaneously. It is a grave mistake to separate one from the other.

That which is termed here as *the heart*, is the great source of profound feeling that resides within all human beings. This is sometimes also called "the sense of being", i.e. the feeling of relationship between human existence and the Absolute Being.

One who knows the language of the heart, when he addresses the human being in this language, can move the inner depths of his being. It is not merely the mind and the intellect alone which is affected, but

BASHEER-W-NAZEER
Weekly



(من كلام لأمير المؤمنين علي عليه السلام لكميل بن زياد النخعي)

يا كميل العلم خير من المال، العلم يحرسك وأنت تحرس المال. المال تنقصه النفقة والعلم يزكو على الإنفاق، وصنيع المال يزول بزواله.

Amir al-Mu'minin Ali (A) addressed Kumayl ibn Ziyad al-Nakh'i saying

'O Kumayl knowledge is better than wealth. Knowledge guards you while you have to guard the wealth. Wealth decreases by spending while knowledge multiplies by spending and the results of wealth die as the wealth decays.

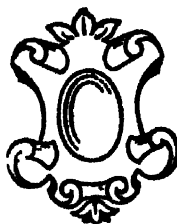
Imam Ali (A)

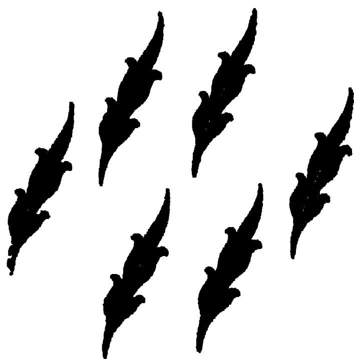
S. A. ABBAS MOOSVI
EDITOR.

VOLUME I NO.3. PRICE Rs. ONE
1st AUGUST 1988.

IF NOT DELIVERED PLEASE RETURN TO: BASHEER-W-NAZEER, HYDERABAD-500 006. INDIA.
POSTAL REGD.No.H/HD-47283 REGD.No.47283. TEL: 253877/253392. TLX: 425-6603 TTI-IN

طلوعِ اسلام





۱۰/-

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدل اشتراک
دس آنے (پاکستانی) بارہ آنے (ہندوستانی)	سعید احمد	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی) " غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۷	اگست ۱۹۵۴ء	نمبر ۸

فہرست مضامین

معارف القرآن

کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں لیکن ان میں سے پہلی تین جلدیں مدت سے نایاب ہیں۔ قرآنی ذوق رکھنے والوں کے پیہم تقاضوں کے پیش نظر جناب پرویز نے ان جلدوں پر نظر ثانی کی ہے اور (علاوہ دوسری تبدیلیوں کے) ان کی ترتیب کو بھی بدل دیا ہے۔ چنانچہ

معارف القرآن جلد دوم

اب اس سلسلہ کی پہلی کڑی قرار دی گئی ہے اور اس کا نام رکھا گیا ہے۔

ابلیس و آدم

اس میں انسانی تخلیق (نظریۂ ارتقاء)۔ قصۂ آدم۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی اور رسالت سے متعلق مباحث شامل ہیں۔

ایسے اہم عنوانات۔ قرآن کی تعلیم۔ اور جناب پرویز کا قلم

آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ کتاب کیا ہو گی!

یہ کتاب بڑی تقطیع (۲۲×۲۹/۸) کے ۴۰۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کتاب پریس میں ہے تاریخ اشاعت کا بعد میں اعلان کیا جائیگا اور جس ترتیب سے فرمائشیں آئینگی اسی ترتیب سے اسکی روانگی ہوگی۔ لہٰذا اپنی فرمائش بہت جلد بھیجئے۔

جن حضرات کا روپیہ ہمارے پاس جمع ہے ان میں سے وہی اطلاع دیں جنھیں یہ کتاب درکار نہ ہو باقی سب کو کتاب از خود بھیجدی جائیگی

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

یہ واقعہ ہے کہ پاکستان، ہندوؤں کی شدید ترین مخالفت کے علی الرغم وجود میں آیا تھا۔ ان کی مخالفت کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ اس سے ان کی مملکت کا رقبہ کم ہوجاتا تھا، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس سے ان کا وہ خواب پریشاں ہوجاتا تھا، جس میں وہ دیکھتے تھے کہ وہ کس طرح اپنی صدیوں کی غلامی کا انتقام مسلمانوں سے لیتے ہیں۔ ان کے ذہن میں آزادی کا مفہوم صرف اتنا ہی نہ تھا کہ وہ انگریزوں کو ملک بدر کردیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ وہ مسلمانوں کو اپنا محکوم اور غلام بنائیں اور ان کا خون چوس کر اپنی ہوسناکیوں اور تشنہ کامیوں کی تسکین کا سامان بہم پہنچائیں۔ لہٰذا پاکستان کا وجود میں آجانا ان کے لئے نہ صرف شکستِ پندار کا باعث تھا بلکہ ان کی ہوسِ اقتدار کی عدم تسکین کا موجب بھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی تنگ نظر قوم کو اس طرح شکست مل جائے اور اس کی مفاد پرستیوں کی روپہلی دنیا یوں اُجڑ جائے تو وہ قوم کس طرح سانپ کی طرح بل کھایا کرتی ہے۔ یہ سات سال کا عرصہ درحقیقت ہندوؤں کے اس قلبی اضطراب اور اس سے پیدا شدہ بل اور پیچ کی زہر آلود داستان ہے۔ وہ کونسا حربہ ہے جو انھوں نے پاکستان کی تخریب کے لئے استعمال نہیں کیا۔ اور وہ کونسا قدم ہے جو انھوں نے اس نوزائیدہ مملکت کی تباہی کے لئے نہیں اٹھایا۔ انہی انسانیت سوز حربوں میں سے ایک وہ تھا جو سات سال سے مسلسل آتشِ خاموش کی طرح سلگایا جارہا تھا اور جو بالآخر ۸ جولائی کو بھاکڑہ بند کی شکل میں اس طرح شعلہ انگیز ہوا کہ پاکستان کے لاکھوں مرفہ الحال کاشتکار اس کی لپیٹ میں آگئے، اور بے شمار سرسبز و شاداب رقبہ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گیا۔ پوری ہندو جاتی نے اپنے اس کارنامہ پر مسلسل جشنِ مسرت منایا۔ جس قوم کے دیوی دیوتا جیتے جاگتے انسانوں کو اپنے رتھ کے پہیوں کے نیچے کچل کر خوش، ان کے خون کی ہولی سے "پرسن" اور ان کے سوختنی گوشت کی خوشبو سے مست ہوتے ہوں اس قوم کے نیتا اپنی ہمسایہ قوم کا پانی بند کرکے گھی کے چراغ کیوں نہ جلائیں اور فتح کے شادیانے کیوں نہ بجائیں۔ آپ نے پڑھا اور سینما میں دیکھا ہوگا کہ جب افریقہ کے وحشی کسی انسان کو پکڑ کر زندہ جلاتے ہیں تو اس کے گرد ناچتے اور گاتے، ڈھول پیٹتے اور سرمستیاں کرتے ہیں۔ اس موقع پر ان کی خوشی اپنی انتہا پر ہوتی ہے۔ ہندو قوم ذہنی تربیت کے اعتبار سے زمانۂ قبل از تہذیب میں بستی ہے اس لئے وہ انسانوں کو ستا کر بہت خوش ہوتی ہے۔

ستلج کی نہروں کے پانی کا بند ہوجانا کوئی ایسا حادثہ نہیں جس کے اثرات ایک آدھ دن کے بعد مدھم پڑجائیں اور دو چار روز کے بعد ختم ہوجائیں۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ جس کے نتائج بڑے دوررس اور جس کے عواقب مستقل نقصانات کے حامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا حادثۂ عظیمہ بڑی گہری فکر کا محتاج اور وسیع تدبیری اقدامات کا مستحق ہوتا ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ اس قسم کے اہم اجتماعی مسئلہ کے مختلف گوشے اور متنوع زاویے ہوتے ہیں جن سے اس پر غور کیا جانا ضروری ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک نمایاں گوشہ تو یہ ہے کہ اس کے متعلق مملکت کے اربابِ نظم ونسق کیا سوچتے اور کیا کرتے ہیں، لیکن اس وقت اس مسئلہ کا جو پہلو ہمارے سامنے ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ایسے شدید، اہم اور گہرے ملّی حادثہ کا ردِّعمل قوم کی طرف سے کیا ہوا، اور ایسا کیوں ہوا؟ ہمارے نزدیک قومی زندگی میں یہی وہ مقامات ہوتے ہیں جہاں سے قوم کے مزاج، جذبات رجحانات، اجتماعی مسائل سے دلچسپی اور ان کے حل کے لئے قوتِ عمل کا صحیح صحیح اندازہ ہوجاتا ہے اور سطح سے نیچے اتر کر دیکھنے والی آنکھیں دیکھ لیتی ہیں کہ مملکت کے مفاد اور ملت کے مستقبل کے متعلق اس قوم سے کیا کیا توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

جہانتک اس واقعہ کے تباہ کن نتائج کا تعلق ہے، یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ قوم کے نچلے طبقہ تک کو بھی اس کا پورا پورا احساس ہے۔ جب ہندوستان کی طرف سے اس کا اعلان ہوا ہے تو آپ کو شاید ہی کوئی آدمی ایسا ملا ہو جس کی زبان پر اس کا ذکر اور جس کے لبوں پر یہ سوال نہ ہو کہ اب کیا ہوگا؟ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ نہ یہ سوال ہی لبوں سے کچھ آگے بڑھ سکا اور نہ ہی اس کا چرچا دو چار روز سے زیادہ دیر تک رہا۔ اس کے بعد لوگ پھر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے اور دوسری باتوں میں مشغول ہوگئے چنانچہ اب اس طبقہ میں شاید ہی کوئی ایسا ہو کہ جسے کسی وقت بھی یہ خیال آتا ہو کہ یہ کتنی بڑی مصیبت ہے جو پاکستان کے سر پر ٹوٹ پڑی ہے۔ ہم نے اس قوم کو سمرنا کے یتیموں اور ادرنہ کی بیواؤں کی مصیبتوں پر مہینوں آنسو بہاتے اور تہجد کے وقت اٹھ اٹھ کر اپنے خدا سے رو رو کر دعائیں مانگتے اور "غازی مصطفٰے کمال پاشا" کی خیر مناتے دیکھا ہے ہم نے اسے کانپور کی مسجد کے غسل خانہ کے انہدام پر آغشتۂ خاک وخون ہوتے اور بیڑیاں اور ہتھکڑیاں پہنتے بھی دیکھا ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ان کے قافلوں پر قافلے کس طرح اپنا سب کچھ لٹا کر، گھر بار اور عزیز واقارب کو چھوڑ کر (بزعمِ خویش) خدا کے راستہ پر ہندوستان سے ہجرت کرکے کسی نامعلوم منزل کی طرف چلے جا رہے تھے اور پیچھے سے پکارنے والوں کو پلٹ کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ ہم نے اسے مسجدِ شہید گنج کی بوسیدہ اینٹوں کی خاطر اس کی شکستہ دیواروں کے سامنے گولیوں اور سنگینوں کا نشانہ بنتے بھی دیکھا ہے۔ ان جذباتی شعلہ فشانیوں کے بعد ہم نے اس قوم کو آٹھ نو سال تک مسلسل حصولِ پاکستان کے لئے خاموش جنگ میں مصروف

تنگ و تاز بھی دیکھا ہے۔ پھر ہم نے اسے تقسیمِ ہند کے وقت خون کے دریاؤں کے پار اور آگ کی خندقوں کو عبور کر کے بہزار مشکل گرتے پڑتے سرزمینِ پاکستان تک پہنچکر سڑکوں کے کنارے، درختوں کے نیچے، نہایت خندہ پیشانی سے جان دیتے بھی دیکھا ہے۔ پھر اس کے بعد ہم نے اسے اپنے محلوں کے پُرفضا نشیمن کو چھوڑ کر مہاجروں کی مٹی کی جھگیوں اور خس و خاشاک کی جھونپڑیوں میں زمین پر سوتے اور رات رات بھر بارش کو اپنے سر پر برساتے بھی دیکھا ہے۔ غرضیکہ ہم نے اس قوم کو مسلسل پچاس سال سے مصیبتوں پر مصیبتیں اٹھاتے اور تکلیفوں پر تکلیفیں برداشت کرتے دیکھا ہے لیکن اسے اس طرح بے حس ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا جیسا کہ اب دیکھا ہے۔

ایسا کیوں ہوا ہے؟ اس قسم کی حرکت مجسم قوم میں یہ موت کا سا سکون کیوں پیدا ہو گیا۔ یہ شعلۂ جوالہ دیکھتے ہی دیکھتے راکھ کا ڈھیر بن کر کیوں رہ گیا؟ یہ کیا ہوا کہ اس نے خود اپنے آپ پر اس قسم کے عظیم اور ہولناک حادثہ کو آتے دیکھا ہے اور اس سے نہ اس میں کوئی حرکت پیدا ہوئی ہے نہ اضطراب۔ نہ کوئی چیخ نکلی ہے نہ کوئی پکار۔ نہ کوئی تڑپ پیدا ہوئی ہے نہ خلش۔ نہ اپنی جان دینے کا ولولہ پیدا ہوا ہے نہ دشمن کا گلا گھونٹ دینے کا جذبہ۔ بادی النظر میں یہ تبدیلی شاید کچھ زیادہ معنی خیز نہ دکھائی دے لیکن جن لوگوں کی نگاہیں قوموں کی نفسیات کا مطالعہ ذرا گہرائی میں جا کر کرتی ہیں ان کے لئے اس تبدیلی میں عبرت و موعظت کے ہزار سامان موجود ہیں وہ جانتے ہیں کہ قومیں اپنے مال و دولت کے لٹنے اور تخت و تاج کے چھننے سے نہیں مٹا کرتیں۔ وہ مٹا کرتی ہیں اس وقت جب وہ اپنے آپ کو قومی مصائب اور ملی نوائب سے اس طرح غیر متاثر اور غیر متعلق محسوس کرنے لگ جائیں کہ یہ کسی اور کی مصیبت ہے۔ وہ مٹا کرتی ہیں اس وقت جب قوم کے سر پر آنے والی مصیبت، نہ ان پر راتوں کی نیند حرام کرے نہ دن کا چین۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، رونے کا مقام وہ نہیں ہوتا جب متاعِ کارواں لُٹ جائے بلکہ وہ مقام ہوتا ہے جب کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہے۔ اس حادثہ نے یہ بتا دیا ہے کہ اب ہماری قوم کے دل سے احساسِ زیاں چلا گیا ہے۔ اور یہ وہ مقام ہے جس پر ہر دلِ دردمند کو خون کے آنسو بہانے پڑتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس کا سبب کیا ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے کسی تحقیقاتی کمیٹی کو بٹھانے کی ضرورت نہیں۔ جس قدر یہ سوال نمایاں ہے اس سے بھی زیادہ اس کا جواب نمایاں ہے۔ اس کا جواب ہمیں پنڈت جواہر لال نہرو کی اس تقریر میں ملتا ہے جس سے اس نے بھاکرا بند کا افتتاح کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک تجربہ کار و عیار شاطر کی طرح، پنڈت نہرو نے اپنی تقریر کے چار فقروں میں غم و غصہ کی وہ تمام لہر جو اہلِ پاکستان کے دل میں اس کے خلاف امنڈ رہی تھی، نہایت سادگی و پُرکاری سے اس کا رُخ خود پاکستان کے اربابِ حل و عقد کی طرف موڑ دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم پہلے سے بھی زیادہ بددل ہو کر رہ گئی۔

اس نے کہا کہ میں اپنی قوم کو درخورِ ہزار تہنیت سمجھتا ہوں کہ اس نے برسوں تک مسلسل کوشش کی جس کا ثمرہ اسے قدرت کی طرف سے اس جوئے شیر کی صورت میں مل رہا ہے۔ ہم ہزار دل سے چاہتے تھے کہ ہماری ہمسایہ قوم (پاکستان) بھی اسی طرح ملک کی ترقی میں ہمارے دوش بدوش چلتی لیکن اس کا کیا علاج کہ وہاں کے اربابِ بست وکشاد کے دل میں نہ ملک کی ترقی کا کوئی ولولہ ہے نہ کام کرنے کی کوئی امنگ، نہ ان میں ندرتِ فکر ہے نہ جوشِ کردار۔ ان میں جو کہیں تھوڑی بہت توانائی ہوتی ہے وہ آپس کی چپقلش کی نذر ہو جاتی ہے۔ ان کی قوم آگے بڑھے تو کس طرح۔ یہ ہیں پنڈت نہرو کی تقریر کے وہ چار فقرے جنھوں نے سحر خاموش کی طرح اہلِ پاکستان کی نگاہوں کا رخ دوسری طرف پھیر دیا۔ اور قوم افسردہ سے افسردہ تر ہو کر بیٹھ رہی۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ پنڈت نہرو نے یہاں کی صورتِ حالات کا (اپنے نقطۂ نگاہ سے) بڑی عمدگی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ ہم اسے گالیاں دیکر مطمئن ہو جائیں ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اس کا یہاں ایسا اثر کیوں لیا گیا؟ ہماری قوم نے بیک زبان کیوں نہ کہدیا کہ تم بکتے ہو۔ اس کے برعکس انھوں نے (الفاظ سے نہیں تو کم از کم اپنے طرزِ عمل سے) کیوں یہ کہدیا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ ہے وہ نکتہ جس پر غور کرنے کے لئے ہم نے اس قصۂ جگر سوز اور حدیث الم انگیز کو دل پر پتھر رکھکر چھیڑا ہے۔ بلا کسی تمہید و معذرت کے اس ناخوشگوار حقیقت کو بادلِ ناخواستہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ اس وقت قوم میں پوری طرح بددلی پھیل چکی اور اس پر ناامیدی چھا چکی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان میں ایسا تخریبی عنصر موجود ہے جس کا کام ہی بددلی پھیلانا اور ناامیدی پیدا کر دینا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ یہاں اس بددلی اور ناامیدی کے اسباب درحقیقت کوئی نہیں۔ یہ صرف تخریبی عنصر کا پیدا کردہ خیال ہے تو وہ نہ صرف اپنے آپ کو دھوکہ دیتا ہے بلکہ خود پاکستان سے بھی دشمنی برتتا ہے۔ تخریبی عناصر ان اسباب کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے اور اصلاح کی بجائے فساد انگیزی کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اس بددلی اور افسردگی کے حقیقی ذمہ دار ہیں وہ خود ہمارے اربابِ حل وعقد ہیں۔ وہی اس جیتی جاگتی قوم کو موت اور افسردگی کی اس حالت تک لے آئے ہیں کہ اب انھیں اتنا بڑا حادثہ بھی جھنجھوڑ کر اٹھا نہیں سکتا۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ یہ صورتِ حالات پیدا کس طرح سے ہوئی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کوئی قوم دوسروں کی محکومی کے بجائے اپنی حکومت کیوں چاہتی ہے اور کیوں (پہلے) اس کے حصول اور (پھر) اس کے تحفظ کے لئے اس قدر قربانیاں دیتی ہے۔ قوم میں ایک طبقہ تو وہ ہوتا ہے جس کے نزدیک ملک کی آزادی کسی بلند نصب العین کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اگرچہ اس طبقہ کی تعداد بالعموم تھوڑی ہوتی ہے لیکن قوم کا موثر عنصر یہی ہوتا ہے کیونکہ یہ طبقہ اربابِ فکر ونظر پر مشتمل ہوتا ہے اور قوموں کی زندگی فکر ونظر کے

پیمانوں ہی سے ناپی جاتی ہے۔ ہماری قوم کے اس طبقہ نے حصولِ پاکستان کے لئے اس لئے جدوجہد کی تھی کہ اس کے نزدیک پاکستان کی آزاد سرزمین ہی وہ خطہ بن سکتی تھی جس میں صحیح اسلامی نظام قائم کیا جاسکے اور جو نوعِ انسانی کو ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی ہوسناکیوں اور توہم پرستیوں سے چھڑا کر فلاح و فوز کے راستہ پر لے چلے۔ قوم کے دوسرے (اور کثیر التعداد) طبقہ کے نزدیک آزادی اس لئے ضروری ہوتی ہے کہ وہ سمجھتے اور جانتے ہیں کہ جب ان کی اپنی حکومت قائم ہوگی تو انھیں سکھ اور چین کی زندگی نصیب ہوجائے گی۔ ہمارے عوام نے اسی یقین کی بنا پر تحریکِ پاکستان کا ساتھ دیا تھا اور وہ انہی توقعات کو دل میں لئے اس سرزمین کی طرف کشاں کشاں چلے آئے تھے اگرچہ انھیں اس میں ہزار مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

یہاں صورتِ حالات یہ ہے کہ اول الذکر طبقہ دیکھ رہا ہے کہ ملک میں ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت دونوں کی جڑیں مضبوط ہوتی جارہی ہیں۔ اور یہ وہ خبائث ہیں جو صحیح اسلامی نظام کے شجرِ طیب کو کبھی پھولنے پھلنے نہیں دیا کرتے۔ ملوکیت کے معنی ہی نہیں ہوتے کہ ملک میں کسی ایک شخص کی بادشاہت قائم ہوجائے اور پھر وہ وراثتہً اس کی اولاد میں منتقل ہوتی چلی جائے۔ یہ تو ملوکیت کی ایک شکل ہوتی ہے۔ ملوکیت کی روح یہ ہوتی ہے کہ رزق کے سرچشمے (جو اللہ نے تمام انسانوں کی پرورش کے لئے کھلے رکھے تھے) چند افراد کے قبضہ میں آجائیں اور وہ، ان کے بل بوتے پر، دوسرے انسانوں سے اپنے فیصلے منوائیں اور اس طرح انھیں اپنی مفاد پرستیوں کا آلۂ کار بنالیں۔ یاد رکھئے، قرآن کی رو سے اس سے بڑھ کر انسانیت کی تذلیل اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کے مفاد کے حصول کا ذریعہ بن کر رہ جائے۔ غلامی کہتے ہی اس کو ہیں۔ پاکستان میں رزق کے سرچشمے سمٹ سمٹا کر چند خاندانوں کے اندر محدود ہوتے چلے جارہے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ زمامِ اقتدار انہی کے ہاتھوں میں آتی جارہی ہے۔ یہی وہ لباسِ نو ہے جس میں عصرِ حاضر میں ملوکیت جلوہ بار ہوتی ہے۔ لہٰذا یہاں ملوکیت کی جڑیں دن بدن مضبوط ہوتی جارہی ہیں۔ باقی رہی مذہبی پیشوائیت، سو (غیر منقسم) ہندوستان میں اس کی شکل انفرادی تھی لیکن یہاں اس نے جماعتی رنگ اختیار کرلیا ہے۔ اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ مذہبی پیشوائیت نے جب اور جہاں بھی ایک جتھے کی صورت اختیار کی ہے وہ انسانیت کی لہلہاتی کھیتیوں کے لئے ٹڈی دل بن گئی ہے۔ ملوکیت کو اپنی مفاد پرستیوں کے تحفظ کے لئے کسی قسم کی ملائیت سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے اور جب "کشتری اور برہمن" کا سمجھوتہ ہوجائے تو پھر باقی انسان "ویش اور شودر" بن کر رہ جاتے ہیں جن کی زندگی کا مقصد دونوں گروہوں کی اطاعت اور خدمت قرار پاجاتا ہے۔ پھر بادشاہ، ظل اللہ بن جاتا ہے اور علماء جانشینانِ رسول، اور ان کی اطاعت بطور رسول کی اطاعت کے قرار پاجاتی ہے۔ یہی وہ صورتِ حالات ہے جس کا تصور اس طبقہ کے لئے بالعموم وجہ یاس اور افسردگی بن رہا ہے جو سرزمینِ پاکستان میں یہ توقعات لیکر آئے تھے کہ یہاں صحیح اسلامی نظام قائم ہوگا جس میں انسانیت نشوونما پائے گی اور آدمیت پروان چڑھے گی۔

باقی رہا عوام کا طبقہ جو یہ سمجھتا تھا کہ پاکستان میں آرام کی زندگی نصیب ہوگی تو ان بیچاروں پر یہاں جو کچھ گذر رہی ہے اس کے لئے اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ صورت ہمیں، حالم مپرس۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ارباب بست و کشاد نے اپنے آپ کو عوام سے اس قدر الگ رکھ چھوڑا ہے اور وہ اس نچلے طبقہ سے اتنے دور اور بلند ہو چکے ہیں کہ انھیں اب غالباً اس کا احساس تک بھی نہیں رہا کہ عوام کس طرح زندگی کے دن گذار رہے ہیں۔ اجنبی حکومت کو اس لئے اجنبی نہیں کہا جاتا کہ وہ کسی دوسرے ملک کے لوگوں کی حکومت ہوتی ہے۔ وہ اجنبی اس لئے ہوتی ہے کہ اس میں عوام اور حکمران طبقہ میں اس قدر بُعد اور غیریت ہوتی ہے کہ لوگ اسے غیروں کی حکومت سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسوقت پاکستان میں بعینہ یہی حالت ہے کہ یہاں کے عوام حکومت کو اپنی حکومت نہیں بلکہ اجنبی حکومت سمجھ رہے ہیں ——— اس سے بھی زیادہ اجنبی جتنی وہ انگریزوں کی حکومت کو اجنبی سمجھتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی بعض شکایات ایسی بھی ہوتی ہیں جو صحیح حالات سے عدم واقفیت کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں۔ اور تخریبی عنصر انھیں اور زیادہ زہر آلود بنا دیتا ہے۔ لیکن ان کی شکایات کا بیشتر حصہ ایسا ہے جو بالکل جائز اور حقیقت پر مبنی ہے۔ جہانتک پہلی قسم کی شکایتوں کا تعلق ہے ارباب حکومت کی طرف سے کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ عوام تک صحیح حالات پہنچا دیئے جائیں تاکہ ان کی غلط فہمی رفع ہو جائے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ عوام کی ان غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے۔ ویسے تو اطلاعات اور نشر و اشاعت کے محکمے موجود ہیں لیکن کوئی نہیں جانتا کہ ان محکموں کا مقصد کیا ہے۔ کچھ بھی ہو ان کے پیش نظر یہ تو بالکل نہیں کہ عوام تک صحیح حالات پہنچا کر ان کی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے۔ اگر حکومت کے نزدیک ان محکموں کا مقصد یہی ہے تو وہ اس مقصد کے حصول میں بُری طرح سے ناکام رہے ہیں۔ اور پاکستان کے خزانۂ عامرہ کا اسقدر کثیر روپیہ بالکل ضائع جا رہا ہے۔ باقی رہیں عوام کی جائز شکایات تو ان کے متعلق ہار تھک کر یہی سمجھ لینا پڑتا ہے کہ ان حضرات کے پاس وہ آنکھیں ہی نہیں جو اس عذاب کو دیکھ سکیں جس میں یہ کروڑوں انسان بری طرح سے مبتلا ہیں۔ وہ کان ہی نہیں جن سے وہ اس چیخ و پکار کو سن سکیں جن سے اس وقت ساری فضا ماتم کدہ بن رہی ہے۔ اور اگر آنکھیں اور کان ہیں تو پھر ان کے سینہ میں وہ دل ہی نہیں جو جہنم کے ان شعلوں کے تمازت سے ذرا بھی پگھل سکے جس میں قوم اس بری طرح سے جھلس رہی ہے اور تو اور غالباً ان کے کندھوں پر وہ سر بھی نہیں جو اس خطرہ ہی کا اندازہ کر سکے جو ملک کے لئے (بلکہ خود ان کے اپنے لئے بھی) اس صورتِ حالات سے پیدا ہو رہا ہے اور اس تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ جہانبانی کے لئے دردمندی کو چھوڑیئے، کم از کم دانشمندی کی تو ضرورت ہوا کرتی ہے۔ لیکن یہاں تو درد ہے نہ دانش۔ ملک کے عوام (اور عوام سے مراد ہیں بڑے طبقہ کو چھوڑ کر باقی تمام اہلِ پاکستان) ایک عذابِ مسلسل سے گذر رہے ہیں۔ اور زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں کسی کو اطمینان کا سانس نصیب ہو۔ دردمندی کا تقاضا تھا کہ اس جہنم کو دیکھ کر

ذمہ دار حضرات کا دل خون بن کر آنکھوں سے بہہ نکلتا اوران پر دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو جاتی۔ لیکن ہمارے یہ جاندار ہیں کہ کیا مجال جوان کی عشرت سامانیوں میں ذرا سا بھی خلل پڑ جائے۔ اسے بھی چھوڑیئے، تخریبی عناصر (بالخصوص کمیونزم کے حامی) عوام کی اس ابتر حالت سے فائدہ اٹھا کر ملک میں ایسا انتشار برپا کر رہے ہیں جس میں بڑے مہیب خطرہ کے امکانات پوشیدہ ہیں۔ دانشمندی کا تقاضا تھا کہ یہ حضرات ملک کے نہیں تو کم از کم خود اپنے مفاد کے تحفظ کی خاطر ہی ان حالات کو اتنا بگڑنے نہ دیتے کہ یہ کوہِ آتش فشاں پھٹ کر دوسروں کے ساتھ خود ان کے لئے بھی سامانِ ہلاکت نہ بن جائے۔ لیکن حیرت ہے کہ یہ جذبہ بھی ان کے لئے اصلاحِ حال کا محرک نہیں بن رہا۔ ان حالات سے اگر عوام میں بددلی اور ناامیدی نہ پھیلے تو اور کیا ہو۔ اس بددلی اور افسردگی کے سب سے بڑے مراکز خود حکومت کے دفاتر ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ملک کے باشندوں کے لئے حکومت (یا ان کے الفاظ میں سرکار) نام ہے انہی دفاتر کا۔ ان دفاتر کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ کوئی شخص نہیں جسے ان سے کچھ واسطہ پڑے اور وہ وہاں سے روتا ہوا باہر نہ نکلے۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ لوگ اب مصیبتیں برداشت کر لینے اور نقصان اٹھا لینے کو اس پر ترجیح دیتے ہیں کہ وہ ان دفاتر میں جا کر اپنے حقوق کی دادرسی چاہیں۔ اس لئے کہ باہر تو صرف نقصان ہی ہوتا ہے لیکن یہاں آ کر نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے اور ذلیل بھی ہونا پڑتا ہے۔ اور طرفہ تماشہ یہ کہ یہ خداوندانِ دفاتر لوگوں کے اس نقصان سے خوش ہوتے اوران کی ذلت سے مزہ لیتے ہیں۔

مکانوں کی پگڑی اور سرکاری محکموں کی رشوت اب ایسا معمول قرار پا چکی ہے جسے نہ کوئی دیتے جھجکتا ہے نہ لیتے شرماتا ہے۔ ضروریاتِ زندگی کی چیزیں دن بدن کمیاب اور گراں بہا ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اول تو یہی پتہ نہیں چلتا کہ فلاں چیز دستیاب کہاں سے ہوگی اور اگر کسی کو اشاروں ہی اشاروں میں پتہ چل جائے تو پھر "اندھیر منڈی" میں اس کی قیمت اتنی ہوتی ہے کہ خریدنے والا اپنی جیب ٹٹول کر رہ جاتا ہے۔ بے شمار لوگ وہ ہیں جنھیں تلاش اور جستجو کے باوجود کوئی کام ہی نہیں ملتا کہ وہ کما کر لائیں اور بچوں کی پرورش کر سکیں۔ جو کما کر لاتے ہیں انھیں کھانے پینے کی کوئی خالص چیز دستیاب نہیں ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی صحت دن بدن گرتی چلی جا رہی ہے۔ لاتعداد بچے ایسے ہیں جن کے لئے اسکولوں میں کوئی جگہ نہیں اور جن خوش نصیبوں کو داخلہ مل جاتا ہے انھیں وہاں تعلیم نہیں ملتی۔ بے شمار مریض ایسے ہیں کہ جنھیں ہسپتالوں میں باریابی نہیں ہوتی۔ جنھیں شرف باریابی حاصل ہو جاتا ہے انھیں دوائی نہیں ملتی۔ لوگ بیچارے رو رہے ہیں، چیخ رہے ہیں، پکار رہے ہیں لیکن اس صحرائے اعظم میں کوئی سننے والا ہی دکھائی نہیں دیتا۔ کیا اس کے بعد بھی آپ لوگوں سے توقع رکھتے ہیں، کہ وہ بددل اور ناامید نہ ہوں۔ بددلی اور ناامیدی تو ایک طرف رفتہ رفتہ لوگوں نے زندگی کے سیدھے اور واضح طریقے چھوڑ کر ہر معاملہ میں پیسہ اور چوربازاری کے پرپیچ و خم راستے اختیار کرنے شروع کر دیئے ہیں۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ ملک کے اندر تخریبی عناصر موجود ہیں جو پاکستان بننے سے پہلے بھی تحریکِ پاکستان کے خلاف تھے اور اب بھی اس کے درپئے تخریب ہیں۔ باہر سے ایک طرف ہندوستان ہے جو مسلسل اسی فکر میں ہے کہ کسی نہ کسی طرح پاکستان کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ دوسری طرف کمیونزم کا سیلاب ہے جو آتشیں لاوے کی طرح بڑھتا چلا آرہا ہے آپ سوچئے کہ ان حالات میں ملک کے اندر بزدلی اور ناامیدی کے وجوہ و اسباب کا بڑھتے چلے جانا کس قدر مہیب خطرہ کا موجب ہے۔ ہار تھک کر انسان لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ہمارے ذمہ دار حضرات کو یا تو

(۱) ان حالات کا علم ہی نہیں جو ملک میں پیدا ہو چکے ہیں ——— یا

(۲) وہ ان کے علاج کی طرف دانستہ متوجہ نہیں ہوتے ——— اور یا

(۳) ان کا علاج ان کے بس کی بات ہی نہیں۔

ان میں سے کوئی سی بھی صورت ہو ملک کے لئے اس کا نتیجہ ہر حال میں یکساں ہے اور بالکل واضح۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ملک کی موجودہ قیادت اس باب میں (دانستہ یا نادانستہ) کچھ نہیں کرتی یا کچھ کر سکنے کی اہل نہیں تو کیا ملک کے دوسرے لوگوں کا فریضہ فقط اتنا ہی ہے کہ وہ ان پر تنقید کر کے مطمئن ہو جائیں؟ اگر کشتی کے ملاح سو جائیں یا چپو رکھ کر مچھلیاں پکڑنے میں مصروف ہو جائیں تو کیا اہلِ کشتی کا اتنا ہی کام ہے کہ وہ یہ کہہ کر کہ یہ ملاح کیسے نااہل لوگ ہیں خود حقہ پینے بیٹھ جائیں؟ کیا کشتی کے ڈوبنے سے فقط ملاحوں کا نقصان ہوگا، اہلِ کشتی کا کچھ نہیں بگڑے گا؟ سوچئے کہ یہ سوچنے کی باتیں ہیں۔ ملک میں یقیناً ایک ایسا طبقہ موجود ہے جن میں سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت ہے اور وہ دل سے چاہتے ہیں کہ پاکستان کو ہر طرح کی سرفرازی اور سربلندی نصیب ہو۔ اس طبقہ کے حصولِ پاکستان کی تحریک کے لئے بڑی ہمت اور جفاکشی سے کام لیا اور یہاں آنے کے بعد بھی وہ شروع شروع میں بڑا گرم جوش تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اب رفتہ رفتہ ان لوگوں کی بھی یہ حالت ہو چکی ہے کہ وہ حالات کا جائزہ نہایت صحیح انداز سے لیتے ہیں اور موجودہ خرابیوں کے اسباب و علل کی صحیح تشخیص بھی کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہ کہہ کر اٹھ جاتے ہیں کہ حالات اتنے بگڑ چکے ہیں کہ اب ان کا سدھرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ ہم اس قسم کے مخلص احباب سے اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ وہ کبھی تنہائی میں بیٹھ کر سوچیں کہ ان کا یہ اندازِ فکر (شعوری نہیں بلکہ غیر شعوری طور پر) کہیں بے عملی اور سہل انگاری کا بہانہ تو نہیں بن رہا۔ کہیں یہ تو نہیں ہو رہا کہ ان کی عقل بہانہ تراش یہ کہہ کر کہ اب مرض لاعلاج ہو چکا ہے ان کی بے عملی کے لئے دلائل وضع کر رہی ہے۔ قرآن نے اس قسم کی عقل فریب کار کا نام ابلیس رکھا ہے۔ اس لفظ کا مادہ بَلَسٌ ہے اور بَلَسٌ کے معنی ہیں ناامیدی۔ یعنی ابلیس کا کام یہ ہے کہ وہ ناامیدی پیدا کر دیتا ہے۔ اور ناامیدی، بے عملی کا نہایت اطمینان بخش بہانہ بن جاتی ہے۔ مثلاً اگر آپ یہ کہیں کہ

مریض اچھا ہو سکتا ہے تو پھر آپ کو اس کے علاج کے لئے تگ ودو کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اگر آپ یہ فیصلہ کرلیں کہ مریض بچ نہیں سکتا، اس کا مرض لاعلاج ہو چکا ہے تو اس کے بعد آپ کو کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا۔ یہی وہ ابلیسی حربہ ہے جو آپ کو عمل سے بیگانہ بنا دیتا ہے۔ اور اس بے عملی کے لئے نہایت خوش آئند دلیل تراش کر دیتا ہے کہ جب مرض لاعلاج ہے تو پھر علاج کے لئے کوشش بے معنی ہے۔ اس کے برعکس قرآن اپنے ماننے والوں کو کبھی ناامید نہیں ہونے دیتا۔ لہٰذا آپ سوچئے کہ کہیں آپ بھی اس ابلیس کا شکار تو نہیں ہو رہے۔ جب آپ کا ذہن یہ کہے کہ یہاں کے حالات اس قدر بگڑ چکے ہیں کہ ان کے سنورنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تو آپ اپنے دل سے پوچھئے کہ میں نے ان حالات کے سنوارنے کے لئے کیا عملی کوشش کی ہے جس کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ حالات سدھر ہی نہیں سکتے۔ یہی سوال آپ ہر اس شخص سے کیجئے جو یہ کہہ کر اٹھتا ہے کہ یہاں کے حالات ناقابلِ علاج ہو چکے ہیں۔ قرآن نے اصلاح احوال کے لئے پہلا قدم ہی یہ تجویز کیا ہے کہ تم زمانہ کی رو میں یونہی بہتے نہ چلے جاؤ۔ تم ایک ایک لمحہ کے لئے رُکو ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا اور پھر سوچو کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یا کر رہا ہوں اس کے لئے میرے پاس دلیل کیا ہے؟ میں اس نتیجہ پر کس طرح پہنچا؟ میں یہ کچھ کیوں کہہ رہا ہوں؟ میرے اس فیصلہ کی بنیاد کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ جب تم نے اس طرح رک کر سوچنا شروع کر دیا تو تم نے درحقیقت تبدیلیٔ حالات کی محکم بنیاد رکھدی۔ لہٰذا آج جبکہ ہمارے ارباب حل وعقد کی کوتاہ نگہی، اور مفاد پرستی اور تخریبی عناصر کی بداندیشی اور مفسدہ پردازی نے ملک میں بددلی اور ناامیدی کی وبا عام کر دی ہے، اس طبقہ کے لئے جو اپنے دل میں اصلاحِ حال کی سچی تڑپ رکھتا ہے سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ ناامیدی کے اس ابلیسی طلسم کو توڑے اور دل کے پورے یقین کے ساتھ اس کا اعلان کرے کہ دنیا کی کوئی مشکل ایسی نہیں جس پر قابو نہ پایا جا سکتا ہو، اس لئے یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہمارے حالات ایسے ہو چکے ہیں جو کسی طرح سنور نہیں سکتے۔ لہٰذا، ہماری سب سے پہلی درخواست یہ ہے کہ آپ اپنے حلقۂ اثر میں ان خیالات کو عام کرنا شروع کیجئے اور اس طرح ان لوگوں کا ایک دائرہ بناتے چلے جائیے جو اس حقیقت پر محکم یقین رکھیں کہ حالات سنور سکتے ہیں اور ضرور سنور سکتے ہیں۔ خرابیاں دور ہو سکتی ہیں اور ضرور دور ہو سکتی ہیں۔ آپ مسلمان سے پوچھئے کہ اس کا یہ ایمان ہے یا نہیں کہ قرآن نوعِ انسانی کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے؟ جب وہ نوعِ انسانی کی تمام مشکلات کا حل پیش کرنے کے قابل ہے تو کیا وہ ہماری اس مشکل کا حل کوئی نہیں بتا سکتا؟ ایسا سمجھنا تو قرآن کی عالمگیر رہنمائی سے انکار کرنے کے مرادف ہوگا۔ جب اس قسم کا یقین رکھنے والے دس بیس آدمی بھی سر جوڑ کر بیٹھیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ اصلاح حال کے لئے آغاز کار کی کوئی نہ کوئی شکل ان کے سامنے ضرور آجائے گی۔ اسوقت جو ہمیں کچھ نہیں سوجھتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے تحت الشعور میں اس یقین کو لیکر نہیں بیٹھتے کہ حالات ضرور سدھر سکتے ہیں۔ جب آپ اس یقین کو لیکر بیٹھیں گے تو آپ کو

ضرور کوئی نہ کوئی راستہ نظر آجائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اصلاح حال کی جو تدبیریں آپ کے سامنے آئیں ان میں کچھ خامیاں ہوں۔ لیکن خامیوں سے کبھی گھبرانا نہیں چاہیئے۔ تجربہ ان خامیوں کو خود بخود دور کر دیگا۔ البتہ آپ جو تدبیریں بھی سوچیں ان میں ایک اصول کو ضرور پیش نظر رکھیں اور وہ یہ کہ حکومت اور مملکت میں بنیادی فرق ہوتا ہے۔ حکومتیں آتی ہیں اور جاتی ہیں۔ وزارتیں بنتی ہیں اور ٹوٹتی ہیں لیکن مملکت اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے۔ آپ اصلاحِ حال کے لئے غلط کار حکومت کو ضرور بدلیئے۔ آپ ملک اور نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے نقصان رساں نظام کی جگہ منفعت بخش اور انسانیت ساز نظام کو قائم کیجئے۔ لیکن اس تبدیلی کی کوشش میں کوئی قدم ایسا نہ اٹھایئے جس سے مملکت کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو اصلاحِ حال کے لئے آپ کی اس کوشش کی مثال اس ڈاکٹر کے علاج کی سی ہوگی جس نے بڑے فخر سے اعلان کیا تھا کہ آپریشن بہت کامیاب رہا۔ بس اتنا ہوا کہ مریض نہ بچ سکا۔ اس بنیادی نکتہ کو سامنے رکھکر ہر غلط نظام کو بدلنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اب رہا یہ کہ غلط نظام کی جگہ صحیح نظام کونسا ہو سکتا ہے سو ہم لوگوں کے لئے اس کا فیصلہ بھی کچھ مشکل نہیں۔ مسلمانوں کی مملکت کے لئے صحیح نظام وہی ہو سکتا ہے جسے قرآن کی سند حاصل ہو۔ (یاد رکھئے "مذہب" کی سند نہیں، بلکہ قرآن کی سند۔ مذہب انسانوں کا بنایا ہوا راستہ ہوتا ہے۔ مذہب کے معنی ہی راستہ ہیں لیکن خدا کی طرف سے دیئے ہوئے دین کی سند قرآن ہے۔) لہٰذا اسلامی نظام کے لئے سند صرف قرآن کی ہونی چاہیئے۔ آپ کہیں گے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ قرآن کی سند کس نظام کو حاصل ہے اس لئے کہ ہر شخص اپنے پیش کردہ تصور کے متعلق یہی دعوٰی کرتا ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہے۔ آپ یہ سوچیئے کہ اگر قرآن ایسی ہی کتاب ہے کہ جو ہر غلط اور صحیح تصور کو سند عطا کر دیتا ہے تو اس قسم کی کتاب اس قابل ہو ہی نہیں سکتی کہ اسے راہنمائی کے لئے قبول کیا جا سکے۔ قرآن نے تو اپنے من جانب اللہ ہونے کی دلیل ہی یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس لئے اس سے دو مختلف نظریوں کو کبھی سند نہیں مل سکتی۔ قرآن صرف ایک ہی نظامِ حیات اور ایک ہی تصورِ زندگی پیش کرتا ہے۔ اس کے سوا وہ ہر نظام اور ہر تصور کی تردید کرتا ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا غلط ہے کہ ہر شخص جو دعوٰی کرتا ہے کہ میرا نظریہ قرآن کے مطابق ہے اسے ضرور قرآنی سند حاصل ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھیئے کہ قرآن کوئی گپت وِدّیا (مخفی علم یا باطنی تعلیم) کا مجموعہ نہیں۔ اس کی تعلیم بڑی واضح اور کھلی ہے اور سمجھنے کے لئے بہت آسان ہے۔ اس لئے یہ بات آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ کس نظام کو قرآن کی سند حاصل ہے۔ طلوع اسلام نے جو نظام پیش کیا ہے اس کی ایک ایک شق کو قرآن کی سند کے ساتھ پیش کیا ہے اور آج تک کوئی شخص قرآن کی رو سے اس کی تردید نہیں کر سکا۔ اس نظام کی تفصیلات تو

طول طویل ہیں. لیکن اس کا ملخص یہ ہے کہ

(۱) رزق کے سرچشمے کسی فرد کی ملکیت قرار نہیں پا سکتے. انھیں تمام افراد معاشرہ کی نشوونما کے لئے کھلا رہنا چاہئے۔

(۲) ہر فرد معاشرہ کا فریضہ ہے کہ وہ دوسرے افراد کی نشوونما اور پرورش و تربیت کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔

(۳) حکومت کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی کے بہم پہنچانے کی ذمہ دار ہو. جس مملکت میں کوئی ایک فرد بھی اپنی اور اپنی اولاد کی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جائے وہ نظام اسلامی نہیں قرار پا سکتا. اور چونکہ اسلامی نظام میں رزق کے سرچشموں پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی باقی نہیں رہتا اس لئے اس میں لوٹ کھسوٹ، سلب و نہب اور ظلم و استبداد خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔

یہ ہے وہ قرآنی نظام جس کے قیام سے معاشرہ کی تمام خرابیاں خود بخود رفع ہو جاتی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ پاکستان میں اس نظام کے قیام کے لئے کیا کیا جائے؟ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اس تبدیلی کے لئے موجودہ قیادت کی تبدیلی ضروری ہے. یہ تبدیلی بہر حال آئینی ہوگی. یہ امر موجب اطمینان ہے کہ مجلس آئین ساز پاکستان کے دستور کی تدوین کو جلد از جلد مکمل کر رہی ہے. اس دستور سے ہمیں کچھ خوشی نہیں. خوشی یہ ہے کہ اس سے پورے ملک میں جدید انتخابات کا موقع پیدا ہو جائے گا. یہ جدید انتخابات پاکستان کے مستقبل کے لئے ایک آخری موڑ ہوں گے. اگر ان انتخابات میں اکثریت ان لوگوں کی آ گئی جو اس اسلامی نظام کے تصور کے حامی ہوں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے تو پھر اس طبقہ کی آرزو بھی پوری ہو جائے گی جو یہاں صحیح اسلامی نظام کے قیام کا متمنی ہے. اور عوام کی یہ آرزو بھی پوری ہو جائے گی کہ زندگی سکھ اور چین سے بسر ہونی چاہئے اور جب یہ ہو جائے گا تو پھر ہندوؤں کو بھی بتایا جا سکے گا کہ ہمسایہ اقوام کے ساتھ کس قسم کا سلوک شایانِ انسانیت ہوتا ہے. ہندو صرف تلوار کی زبان سمجھ سکتا ہے اور ہم یہ زبان اس وقت بول سکتے ہیں جب ہمارے عوام یہاں کی زندگی کو اپنے اور اپنی آل و اولاد کے لئے جنت کی زندگی سمجھتے ہوں۔

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اسے مختصر الفاظ میں دہرا لیجئے کہ آپ کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ

(۱) اپنے دل میں یہ یقین پیدا کر لیجئے کہ ہمارے حالات یقیناً سنور سکتے ہیں لہذا ہمارے لئے ناامید ہونے کی کوئی وجہ

نہیں ہے۔ جس قوم کے پاس قرآن جیسا راہنمائی کا ضابطہ ہو اس کے لئے مایوسی کفر ہے۔

(۲) اپنے حلقۂ اثر میں اس خیال کو عام کیجئے کہ ہمارے حالات سدھر سکتے ہیں۔ اور جو لوگ اس یقین کو اپنے دل میں پیدا کرتے جائیں اُن کا ایک حلقہ قائم کرتے چلے جائیے۔

(۳) یہ تہیہ کر لیجئے کہ آپ نے آنیوالے انتخابات میں ان لوگوں کو کامیاب کرانا ہے جو قرآن کے نظام ربوبیت کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتے ہیں۔ قرآن کا نظام ربوبیت یہ ہے کہ رزق اور دولت کے سرچشمے کسی کی ذاتی ملکیت نہ رہیں بلکہ یہ تمام افرادِ معاشرہ کی پرورش اور نشوونما کے لئے کھلے رہیں گے۔

آپ ان خیالات کو عام کرتے جائیے اور طلوعِ اسلام اس نظام کے مختلف گوشوں کو آپ کے سامنے روشن کرتا چلا جائے گا۔ اگر آپ اس مختصر سے پروگرام کے دیئے کو لیکر اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ نے چلنا شروع کر دیا تو آپ دیکھیں گے کہ راستہ کی تمام تاریکیاں کس طرح چھٹتی جاتی ہیں اور دنیا کس طرح اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھتی ہے۔

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار ہر زماں پیش نظر لا یخلف المیعاد دار

طلوعِ اسلام نے آج تک

نہ کسی سے مالی مدد مانگی ہے۔ نہ اب مانگ رہا ہے۔ البتہ اس کی ایک اسکیم ہے جس کی رو سے آپ اسے ایک پیسہ بھی مفت نہیں دیتے لیکن اسے قرآنی لٹریچر کی اشاعت میں سہولت بہت ہو جاتی ہے۔ اسکیم یہ ہے کہ اگر آپ ایک سو روپیہ (یک مشت یا چار مساوی ماہانہ اقساط میں) ادا کر دیں تو آپ کا حساب کھول لیا جائے گا اور اس حساب میں ہم آپ کو رسالہ طلوع اسلام اور اس کی شائع کردہ کتابوں میں سے جو بھی آپ کو مطلوب ہوں بھیجتے چلے جائیں گے تاآنکہ آپ کا ایک سو روپیہ پورا ہو جائے۔ اس کے بعد آپ پھر اسی طرح پیشگی روپیہ جمع کرا سکتے ہیں۔ اگر ہم کسی وجہ سے اس سلسلہ کو جاری نہ رکھ سکیں تو آپ کا بقایا روپیہ آپ کو واپس کر دیا جائے گا۔

یہ اسکیم قریب ایک سال سے جاری ہے اور اس عرصہ میں ہم ایک درجن سے زائد کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ سابقہ ماہ تک ان

پیشگی خریداران

کی تعداد ۲۲۴ تک پہنچ گئی تھی۔ اب ان میں حسب ذیل مزید اضافہ ہوا ہے:۔

درگئی	۲۲۵	اعجاز حسین صاحب	کراچی	۲۳۰	ڈاکٹر حبیب الرحمٰن صاحب
گجرات	۲۲۶	زبیدہ خانم صاحبہ معرفت میاں برکت علی صاحب	دھران	۲۳۱	محمد آصف صاحب
			ملیر چھاؤنی	۲۳۲	نام کی اشاعت نہیں چاہتے۔
لاہور	۲۲۷	چوہدری محمد حسین صاحب	ڈھاکہ	۲۳۳	بیگم شیخ عبدالحمید صاحب
کویت	۲۲۸	محمد جہانگیر صاحب	دھران	۲۳۴	اشرف درانی صاحب
سیالکوٹ	۲۲۹	اہلیہ محمد صدیق صاحب	کراچی	۲۳۵	کپتان عتیق احمد صاحب

اگر آپ ابھی تک "پیشگی خریداران" کی اسکیم میں شامل نہیں ہوئے، تو اس پر غور فرمائیے کہ اس اسکیم کی رو سے آپ ایک پیسہ بھی زائد نہیں دیں گے اور قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں ہمیں بہت آسانی ہو جائیگی بات صرف اتنی ہے کہ آپ قیمت پیشگی دیدیتے ہیں۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

کراچی کی ایک شام[1]

شروع جولائی کا ذکر ہے۔ اتوار کی ایک شام میرے ہاں کچھ احباب جمع تھے۔ یونہی بلا تقریب۔ ان میں ارشد، حامد اور فیضی خاص طور پر قابلِ تعارف ہیں۔ تینوں تعلیم یافتہ اور شریف، ذوق نہایت پاکیزہ اور طبیعت بڑی ... ۔ ارشد فوج میں افسر ہے اور حامد اور فیضی سول میں۔ ارشد اور حامد کی مذہبی معلومات کم ہیں لیکن دل میں مذہب کا بڑا احترام ہے۔ چونکہ روشن خیال ہیں اس لئے مذہبی توہم پرستیوں کو پسند نہیں کرتے۔ جن باتوں سے اسلام کے نام پر دھبہ آتا ہو یا مسلمان بدنام ہوتے ہوں ان سے انھیں سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ فیضی کی ابتدائی تعلیم مذہبی رنگ میں ہوئی ہے اس لئے مذہب کے متعلق اس کی معلومات کافی ہیں لیکن چونکہ یہ تعلیم اس مذہب کی تھی جو ہمارے دورِ جمود و تعطل کی یادگار ہے، اور فیضی بڑا ذہین اور نقاد واقع ہوا ہے، اس لئے اس تعلیم کا جو ردِ عمل ہونا چاہئے تھا وہ ظاہر ہے۔ وہ اس مذہب کے خلاف یکسر طنز بن چکا ہے۔ دوسری طرف ملازمت کے سلسلہ میں اس پر کچھ ایسی زیادتیاں ہوئی ہیں جن کی وجہ سے اسے موجودہ نظم و نسق کے خلاف سخت شکایات پیدا ہو چکی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ حکومت کو جلی کٹی سناتا رہتا ہے۔ دل میں مسلمان اور پاکستان دونوں کا درد ہے لیکن دونوں کی طرف سے اس طرح کا زخم خوردہ ہے کہ اب اس کی بات بات میں طعن و تشنیع اور طنز و اعتراض ہوتا ہے۔ میں اپنے حلقۂ احباب میں ملا جی مشہور ہوں اس لئے کہ میری الماریوں میں کتابوں کا بیشتر حصہ مذہب سے متعلق ہوتا ہے۔

اس شام، مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اب مجھے یاد نہیں پڑتا کہ بات میں سے بات کیسے نکلی کہ ارشد نے کہا "رات ہمارے محلہ کی مسجد میں وعظ تھا۔ کوئی بہت بڑے مولوی صاحب تشریف فرما تھے۔ لاؤڈ اسپیکر لگ رہا تھا اس لئے اڑوس پڑوس والوں کو مسجد میں جانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وعظ خود بخود ان کے گھروں کے اندر پہنچ رہا تھا۔"

فیضی نے بات کاٹتے ہوئے کہا، "اپنا اپنا نصیب ہے۔ کسی کے کانوں میں سرودِ خانۂ ہمسایہ" خود بخود پہنچتا ہے جو حلال بھی ہوتا ہے اور نزدِ شرع درست بھی۔ تمہارے کانوں میں از خود کچھ پہنچا بھی تو مولوی صاحب کا وعظ جو نزدِ شرع درست ہو تو ہو لیکن اس کے حلال ہونے کے متعلق کم از کم میں تو فتویٰ دے نہیں سکتا۔

ارشد: ذرا سن تو لو۔ وعظ بڑے مزے کا تھا۔ حضور سرورِ کائنات ؐ کے معراج کا ذکر تھا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ جبریل ایک جانور لایا جو خچر جتنا بڑا تھا۔ حضورؐ اس پر سوار ہونے لگے تو وہ بدکا۔ جبریل نے اس کے کان میں کچھ کہا تب وہ بصد ندامت مجسم تعظیم بن گیا۔ آپ اس پر سوار ہو کر آپ بیت المقدس تشریف لے گئے۔ وہاں اسے ایک بہت بڑے پتھر سے باندھ دیا اور خود آسمان پر تشریف لے گئے۔ اس کے

---

[1] نام اور مقام فرضی ہیں۔

بعد مولوی صاحب نے جو وہاں کا نقشہ کھینچا ہے تو یقین مانو میں بستر پہ لیٹے تلملا رہا تھا۔ کسی کا سر پتھروں سے کچلا جا رہا تھا، کسی کی زبان لٹکی ہوئی تھی۔ کسی کے ہونٹ کٹ رہے تھے۔ کسی کو آگ سے داغ دیا جا رہا تھا۔ آخر میں کہا کہ جب حضورؐ واپس تشریف لائے ہیں تو حضرت موسیٰؑ نے پوچھا کہ خدا نے کیا حکم دیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پچاس نمازیں فرض کی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ آپ کی امت سے یہ کبھی پوری نہیں ہوں گی۔ ابھی جا کر ان میں تخفیف کرالاؤ۔ چنانچہ آپ تشریف لے گئے اور اللہ میاں نے انھیں پچیس کر دیا۔ حضرت موسیٰؑ نے پھر کہا کہ یہ بھی بہت زیادہ ہیں۔ اس پر آپ پھر واپس گئے۔ چنانچہ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ آپ جاتے۔ اللہ میاں کچھ کم کر دیتے۔ آپ واپس تشریف لاتے تو حضرت موسیٰ پھر کہتے کہ یہ بھی زیادہ ہیں۔ آپ پھر تشریف لے جاتے۔ اسی طرح ہوتے ہوتے بات پانچ نمازوں پر آگئی۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ یہ بھی زیادہ ہیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ اب تو مجھے بار بار جاتے شرم آتی ہے۔ چنانچہ اس طرح پانچ نمازیں فرض ہوئیں۔ میں اپنے کمرے میں لیٹے لیٹے یہ سب کچھ سن رہا تھا اور جی ہی جی میں کہہ رہا تھا کہ اگر کوئی غیر مسلم ان باتوں کو سن لے تو وہ اسلام کے متعلق کیا کہے! میں تو اس وقت سے سوچ رہا ہوں کہ اگر کوئی ان باتوں کے متعلق مجھ سے پوچھ بیٹھے تو میں اس کا کیا جواب دوں۔

حامد: ہمارا جواب صاف ہے کہ یہ سب باتیں ان قصہ گو واعظوں کی خود ساختہ ہیں۔ اسلام کو ان سے کچھ واسطہ نہیں!

فیضی: ذرا اس قسم کی باتیں سنبھل کر کیا کرو۔ آج تو تم نے زبان کھول دی۔ کل کو جب یہاں نظام شریعت رائج ہو گیا تو اس وقت کہیں ایسا کچھ نہ کہہ دینا۔

حامد: کیوں! اس وقت کیا ہو گا؟

فیضی: بھیڑ کی طرح سر اڑ جائے گا۔

حامد: وہ کیوں؟

فیضی: اس لئے کہ شریعت میں مرتد کی سزا قتل ہے اور مرتد وہ ہے جس کے عقائد درست نہ ہوں۔ جس کسی کے متعلق ملّا نے فتویٰ دے دیا کہ اس کے عقائد باطل ہیں وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا اور اسلامی حکومت پر لازم آجائیگا کہ اس کا سر قلم کر دے۔

رشید: نہیں تو شریعت کے نام سے اسقدر چڑھ ہو گئی ہے کہ اب جو جی میں آتا ہے شریعت کے سر تھوپ دیتے ہو۔

فیضی: میری طرف مخاطب ہو کر کیوں بھئی ملا جی! کیا تمہاری شریعت کا یہی حکم ہے یا میں اسے خواہ مخواہ اس کے سر تھوپ رہا ہوں؟
میں نے مسکرا کر کہا کہ اس وقت تو تم ٹھیک کہتے ہو۔

اس پر ارشد اور حامد دونوں چونک اٹھے اور ارشد نے بے ساختہ کہا کہ کیا کہا آپ نے؟ میں نے پھر آہستہ سے کہا کہ فیضی صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس پر حامد نے کہا کہ اگر مجھے مجبور کیا گیا کہ میں اسی کو اسلام سمجھوں جسے مولوی صاحب نے اپنے وعظ میں بیان کیا تھا تو آپ بھلا مانیں یا برا، میں تو ایسے اسلام کو سات سلام کر دوں گا۔

فیضی: لیکن موت سے تو آپ پھر بھی نہیں بچ سکیں گے۔ آپ کو پھر بھی قتل کر دیا جائے گا۔

حامد: یعنی میں اگر مسلمان نہ رہنا چاہوں تو بھی مجھ پر مُلّا کی شریعت ہی کا حکم نافذ ہوگا؟
فیضی: یہی تو آپ کا جرم ہوگا۔ آپ مسلمانوں کے گھر پیدا ہو کر اپنا مذہب تبدیل نہیں کر سکتے۔ ایسا کریں گے تو آپ واجب القتل ہوں گے۔
حامد:۔ (نہایت تعجب سے) یعنی میں اگر عیسائی ہوں تو عیسائیت چھوڑ کر مسلمان ہو سکتا ہوں۔ لیکن اگر مسلمان ہوں تو عیسائی نہیں ہو سکتا؟ اگر یہی صورت ہے تو پھر وہ مذہبی آزادی کیا ہوئی جس کا اسقدر چرچا کیا جا رہا ہے اور جس کے متعلق ہر اسٹیج اور منبر سے غلغلہ بلند ہوتا ہے کہ اسلام نے دنیا سے غلامی کو مٹایا اور انسانوں کو سچی آزادی اور حریت عطا کی؟
فیضی: جی! غلامی کو مٹایا!!! اسے اگر میں نے کچھ اور کہدیا تو پھر یہ بے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جاؤ گے کہ تم نے شریعت کے سر یہ بھی تھوپ دیا؟ حضور! آپ کی شریعتِ حقہ میں یہ بھی موجود ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا جاتے۔ اور ان لونڈیوں کو بغیر نکاح کے۔ اور جتنی جی چاہے، گھروں میں ڈال لیا جائے۔
ارشد: جب ایک دفعہ تمہارا رستہ کھل جائے تو پھر اس شتر بے مہاری کی کوئی حد نہیں رہتی۔
فیضی: جی سرکار! بجا فرمایا آپ نے۔ میرا تو بھلا رستہ کھل چکا ہے۔ ذرا ان سے پوچھیے جو گاڑی پچھاڑی سے بندھے ہوئے ہیں۔ کیوں بھئی مُلّا جی؟ غلام اور لونڈیوں کے متعلق جو کچھ اس دریدہ دہن، عنان گسیختہ گستاخ نے کہا ہے وہ درست ہے یا شریعت پر بہتان ہے؟
میں نے مسکرا کر کہا کہ ہے تو درست!
ارشد اور حامد بیک زبان، کیا کہا آپ نے؟
میں: یہی کہ فیضی صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔
ارشد: یعنی شریعت کا حکم ہے کہ دشمن کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا جائے اور پھر انہیں بلا نکاح۔ اور بلا تعداد جتنی جی چاہے گھروں میں ڈال لیا جائے۔
"اور جب کسی سے جی بھر جائے تو اسے کسی دوسرے کے ہاتھ بیچ بھی دیا جائے۔" فیضی نے نہایت طنز آمیز لہجہ میں کہا۔
ارشد: بس بھئی! میں اس سے زیادہ سن نہیں سکتا۔
فیضی: آپ کے نہ سننے سے شریعت بدل جائے گی کیا؟
ارشد: تو کیا یہ کچھ قرآن میں لکھا ہے جو بدلا نہیں جا سکتا؟
فیضی: یہ شریعت میں لکھا ہے۔
ارشد: شریعت کہتے کسے ہیں!
فیضی: جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے، اسے شریعت کہتے ہیں۔
حامد: یعنی؟
فیضی: یعنی یہ کہ آپ کے اسلاف میں سے جو فیصلہ کسی نے کر دیا اس کا نام شریعت ہے۔ وہ اب کسی کے بدلنے سے بدل نہیں سکتا!

حامد: خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو؟
فیضی: وہ غلط ہو ہی نہیں سکتا۔
حامد: کیوں؟
فیضی: اس لئے کہ آپ کے اسلاف غلطی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ غلطی بھی کر سکتے تھے سخت گستاخی ہے۔
حامد: لیکن اگر ان کا کوئی فیصلہ صریحاً قرآن کے خلاف ہو تو۔
فیضی: تو بھی یہی سمجھنا چاہئے کہ وہ بالکل صحیح ہے اسلئے کہ قرآن کو جیسا وہ سمجھ سکتے تھے تم نہیں سمجھ سکتے!
ارشد: تو گویا اب ہمارے لئے قرآن بے بیکار ہو گیا؟ ہم اسے سمجھ ہی نہیں سکتے؟
فیضی: جی ہاں۔ آپ نہیں سمجھ سکتے۔ جتنا کچھ قرآن سمجھا جا سکتا تھا سمجھا جا چکا۔ اب آپ اس سے الگ ہٹ کر کچھ اور نہیں سمجھ سکتے!
حامد: یعنی ہماری عقل، فہم، علم سب بیکار ہیں؟
فیضی: بیکار ہی نہیں۔ عقل و بصیرت سے کام لینے والوں کو مخبوط الحواس قرار دیا جاتا اور ملحد و بے دین بتایا جاتا ہے۔

بات یہاں تک پہنچی تھی کہ ریڈیو سے خبریں نشر ہونے لگیں۔ ایک خبر میں یہ بتایا گیا کہ آج مجلس آئین ساز نے پندرہ منٹ میں آئین کی سات دفعات منظور کر لیں۔ اس پر فیضی نے اس زور سے قہقہہ مارا کہ خبروں کی لہریں اس کے طوفان میں گم ہو گئیں۔ جب فضا میں ذرا سکوت ہوا تو اس نے اتنی ہی بلند آواز میں کہا "یہ ہے وہ آئین جس کے متعلق امریکہ تک میں ڈھنڈورا پیٹا گیا تھا کہ وہ بے مثل و بے نظیر آئین ہو گا۔ اور جب اعتراض کیا گیا تھا کہ اس کی تدوین میں اسقدر دیر کیوں ہو رہی ہے تو نہایت فخر و مباہات سے فرمایا گیا تھا کہ یہ آئین ایک اسلامی مملکت کا آئین ہے۔ عام انسانی مملکتوں کا آئین نہیں کہ جس طرح مناسب سمجھا مرتب کر لیا۔ اس آئین کو اسلام کے غیر متبدل اصولوں کے فریم کے اندر تشکل ہونا ہے۔ اسلئے اسے یونہی نہیں بنایا جا سکتا۔ ہماری مجلس آئین ساز عام کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلیوں جیسی نہیں۔ یہ تو ایک لیبارٹری ہے جس میں یہ ثابت کیا جائے گا کہ اسلام دنیا کو کس طرح ایک ایسا ضابطۂ حیات عطا کرتا ہے جس کے بغیر انسانی زندگی کے مسائل کا حل ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ "

حامد نے بات کاٹتے ہوئے کہا کہ اسی لئے تو انھوں نے اوبجیکٹیو ریزولیشن میں یہ لکھا تھا کہ ہمارا آئین "کتاب و سنت" کے تابع رہے گا۔
فیضی: جی ہاں۔ اور یہ ہیں ناں وہ مفتیانِ عظام جو اب اسمبلی میں بیٹھے اس کا فیصلہ فرما رہے ہیں کہ کتاب و سنت کا صحیح مفہوم کیا ہے اور ہمارا آئین کس طرح اس کے مطابق ہو گا!
ارشد: میرا تو خیال ہے کہ پاکستان میں ایک ہی شخص اس کا اہل تھا کہ وہ ہمیں صحیح اسلامی آئین مرتب کر کے دیدیتا یعنی مولانا مودودی صاحب۔
فیضی: لیکن اسے تو چودہ سال تک کے لئے گانٹھ مار کر رکھ دیا گیا ہے۔
ارشد: میں اس پوزیشن میں تو نہیں ہوں کہ مودودی صاحب کی سزا کے متعلق کوئی رائے ظاہر کر سکوں۔ لیکن مجھے اس کا بڑا قلق ہے کہ ہم ایسے وقت میں اس شخص کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہ گئے جب کہ ہمارے مستقبل کا سوال زیر غور تھا۔ میں تو

سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت تھی جو اس نے اس قسم کا روشن خیال عالم پاکستان میں پیدا کر دیا۔
میں اس بحث کو خاموشی سے سن رہا تھا لیکن اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے ارشد سے کہا کہ کیا آپ نے مودودی صاحب کے خیالات اور معتقدات کا مطالعہ کیا ہے جس کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وہ نہایت روشن خیال عالم ہیں۔
ارشد: نہیں۔ میں نے خود تو مطالعہ نہیں کیا۔ لیکن ہمارے ہاں ایک اور افسر ہیں جنھیں اس کا جنون ہے۔ وہ دن رات انہی کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ان سے میں نے جو کچھ سنا ہے اس سے میں تو اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ واقعی بڑے روشن خیال اور ماڈرن عالم ہیں اور اگر آئین سازی کا کام ان کے ہاتھ میں دیدیا جاتا تو وہ ایسا دستور بنا دیتے جو کتاب و سنت کے بھی مطابق ہوتا اور ان لغویتوں سے بھی پاک ہوتا جنھیں عام طور پر اسلام کہہ کر پیش کیا جاتا ہے اور جنھیں ہم کسی طرح بھی دنیا کے سامنے پیش نہیں کر سکتے۔
میں: مثلاً کونسی لغویتیں؟
ارشد: تم کیا نہیں جانتے؟ اسی قسم کی لغویتیں جن کا ذکر ابھی یہاں ہو رہا تھا اور جن کے متعلق فیضی صاحب کہتے تھے کہ وہ سب ہماری شریعت میں موجود ہیں اور تم بھی ان کی تائید کرتے تھے۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ارشد بھائی! غالباً آپ کو معلوم نہیں کہ مودودی صاحب اسی شریعت کے علمبردار ہیں جس میں وہ سب کچھ موجود ہے جسے آپ "لغویتیں" قرار دے رہے ہیں!
حامد: کیا کہا آپ نے؟
میں: میں نے یہی کہا کہ مودودی صاحب اسی شریعت کے علمبردار ہیں جس میں وہ سب کچھ موجود ہے جسے آپ "لغویتیں" قرار دے رہے ہیں۔
ارشد: مودودی صاحب؟
میں: جی ہاں۔ مودودی صاحب
ارشد: یہ بات میری لئے بالکل نئی ہے۔
حامد: اور ناقابلِ تسلیم سی بھی!
میں: نہیں بھائی! نہ یہ نئی ہے اور نہ ہی ناقابل تسلیم۔ ابھی دیکھئے۔
یہ کہہ کر میں ایک الماری کی طرف بڑھا۔ اور فیضی نے پکارا کہ لوبھئی! چلے مُلّاجی پھر اسی سمندر میں ڈوبنے۔ یا مظہر العجائب! وہ ابھی فقرہ پورا نہ کرنے پایا تھا کہ میں دو تین کتابیں نکال کر پھر اپنی جگہ پر آبیٹھا۔
میں نے ارشد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے سلسلۂ کلام کا آغاز مسجد کے مُلّا کے اس وعظ سے کیا تھا جس نے معراج کے متعلق وہ کچھ کہا تھا جس پر آپ اس قدر تلملا اٹھے تھے۔ یہ ہے مودودی صاحب کے رسالہ ترجمان القرآن کا اگست ۱۹۵۱ء کا پرچہ۔ اس میں مودودی صاحب کی ایک ریڈیو کی تقریر درج ہے جس میں انھوں نے معراج کے متعلق گفتگو فرمائی ہے۔ اسمیں وہ فرماتے ہیں:

> حضرت محمدؐ کو پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہوئے ۱۲ سال گذر چکے تھے۔ آپ حرمِ کعبہ میں سو رہے تھے کہ یکایک جبرئیل فرشتے نے آپ کو آکر جگایا۔ نیم خفتہ اور نیم بیدار حالت میں اٹھا کر زمزم کے پاس لے گئے۔ سینہ چاک کیا۔ زمزم کے پانی سے اسے دھویا۔ ۔ ۔ ۔

اس کے بعد آپ کو سواری کیلئے ایک جانور پیش کیا جس کا قد خچر سے کچھ چھوٹا تھا۔ جب وہ سوار ہونے لگے تو وہ چمکا۔ جبریل نے تھپکی دی اور کہا۔ دیکھ کیا کرتا ہے۔ . . . پھر آپ اس پر سوار ہوئے . . . . بیت المقدس پہنچکر آپ براق سے اترگئے اور اسے اسی مقام پر باندھ دیا۔ . . . . اس کے بعد ایک سیڑھی آپ کے سامنے پیش کی گئی اور جبریل اس کے ذریعے سے آپ کو آسمان کی طرف لے چلے۔

میں اتنا پڑھنے پایا تھا کہ ارشد صاحب نے فرطِ حیرت سے رسالہ میرے ہاتھ سے چھین لیا اور خود پڑھنے لگ گئے۔ وہ خاموشی سے پڑھتے جاتے تھے لیکن بعض بعض فقرے ان کے منہ سے بے ساختہ اونچی آواز سے نکل پڑتے تھے۔ مثلاً

پھر دیکھا کچھ لوگ ہیں جن کے سر پتھروں سے کچلے جا رہے ہیں۔ . . . پھر دیکھا کچھ لوگ ہیں جن کی زبانیں اور ہونٹ قینچیوں سے کترے جا رہے ہیں۔ . . . ایک جگہ دیکھا کہ پتھر میں ذرا سا شگاف ہے اس میں سے ایک موٹا سا بیل نکل آیا۔ پھر وہ بیل اسی شگاف میں جانے کی کوشش کرنے لگا لیکن نہ جاسکا۔ . . . پھر دیکھا کچھ لوگ ہیں جو اپنا اپنا گوشت کاٹ کر کھا رہے ہیں۔ . . . کچھ لوگ آگ کھا رہے ہیں۔ . . . کچھ عورتوں کو دیکھا جو اپنی چھاتیوں کے بل لٹک رہی ہیں۔

اس کے بعد ارشد نے وہ پچاس نمازوں والا قصہ بھی اسی پرچہ سے پڑھ کر سنایا۔ حامد یہ کچھ سن رہا تھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی ارشد کی طرف اور کبھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔

ارشد نے مضمون ختم کیا تو رسالہ کو ایک طرف رکھ کر بڑے تعجب انگیز اور افسوسناک لہجہ میں کہا — یہ ہیں مودودی صاحب!

میں: جی ہاں۔ یہی ہیں مودودی صاحب جنہیں آپ اس قدر روشن خیال عالم قرار دے رہے تھے۔

حامد: مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے خواب میں یہ باتیں سن رہا ہوں۔

ارشد: (میری طرف مخاطب ہو کر)۔ اور وہ مرتد کی سزا کے متعلق کیا فرماتے ہیں مودودی صاحب؟

میں: اس کے متعلق تو ان کی ایک الگ کتاب موجود ہے جس کا عنوان ہے "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں"۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

یہ بات اسلامی قانون کے کسی واقف کار آدمی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اسلام میں اس شخص کی سزا قتل ہے جو مسلمان ہو کر پھر کفر کی طرف پلٹ جائے۔ (ص۲)

اس کے بعد ارشاد ہے:-

ذرائع معلومات کی کمی کی وجہ سے جن لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ ہے کہ شاید اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہ ہو اور بعد کے مولویوں نے یہ چیز اپنی طرف سے اس دین میں بڑھا دی ہو ان کا اطمینان دلانے کیلئے میں مختصراً اس کا ثبوت پیش کرتا ہوں۔ (ص۱۲)

حامد: لیکن یہ لوگ پھر اس آیت کا کیا مطلب لیتے ہیں جس میں لکھا ہے کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں۔

میں: سن لیجئے۔ فرماتے ہیں:

لا اکراہ فی الدین کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی کو اپنے دین میں آنے کیلئے مجبور نہیں کرتے۔ . . . مگر جسے آکر واپس جانا ہو اسے ہم پہلے ہی خبردار کر دیتے ہیں کہ یہ دروازہ آمد و رفت کیلئے کھلا ہوا نہیں ہے۔ لہذا آتے ہو تو یہ فیصلہ کرکے آؤ کہ واپس نہیں جانا ہے ورنہ براہ کرم آؤ ہی نہیں۔ (ص۵۳)

حامد: لیکن جو شخص اپنی مرضی سے اسلام کے دروازے کے اندر نہ آئے بلکہ وہ پیدا ہی مسلمانوں کے گھر میں ہو تو اس کے متعلق کیا حکم ہے۔

میں: وہی قتل کا حکم! اور کیا؟ اعتبار نہ آئے تو سن لیجئے۔ ارشاد ہے:

مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہونے والی اولاد مسلمان ہی سمجھی جائے گی اور قانونِ اسلام کی طرف سے ان کیلئے ارتداد کا دروازہ ہرگز نہ کھولا جائے گا۔ اگر ان میں سے کوئی اسلام سے پھر گیا تو وہ بھی اسی طرح قتل کا مستحق ہوگا جس طرح وہ شخص جس نے کفر سے اسلام کی طرف آکر پھر کفر کا راستہ اختیار کیا ہو۔ (ص۶۲)

ارشد: اس رسالہ کو بھی مجھے دیدو۔

حامد: اور وہ جو غلاموں اور لونڈیوں کی بات تھی تو اس کے متعلق بھی انھوں نے اسی قسم کے گل کھلائے ہیں؟

ارشد: اس زمانہ میں ان باتوں کو کوئی نہیں مانتا۔

میں: کوئی اور زمانے یا نہ مانے۔ مودودی صاحب کے پیش کردہ نظام شریعت میں تو یہی حکم ہے کہ دشمن کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بناؤ۔

ارشد: کیا واقعی؟

میں: یہ ہے مودودی صاحب کی تفسیرِ قرآن کریم۔ جس کا نام ہے تفہیم القرآن) وہ اس میں فرماتے ہیں۔

حکومت کو اختیار ہے کہ (جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو) چاہے رہا کردے۔ چاہے ان سے فدیہ لے۔ چاہے ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کرلے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں اور چاہے تو انھیں سپاہیوں میں تقسیم کردے اور سپاہی انھیں اپنے استعمال میں لائیں۔ (ص۳۴۳)

حامد: کیا کہا آپ نے؟ مسلمان سپاہی دشمن کی عورتوں کو اپنے استعمال میں لے آئیں؟

میں: جی ہاں! اپنے استعمال میں لے آئیں۔ بلانکاح۔

حامد: بلانکاح!

میں: جی ہاں۔ بلانکاح۔ مودودی صاحب۔ (اپنی کتاب تفہیمات حصہ دوم) میں فرماتے ہیں کہ بلانکاح استعمال میں لانے میں جو کراہت نظر آتی ہے وہ محض ایک ذہنی کراہت ہے (ص۳۱۵)

ارشد: کس تعداد تک؟

میں: بلاتعداد۔ مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ

لونڈیوں کے تمتع کے لئے تعداد کی قید اس لئے نہیں لگائی گئی کہ ان عورتوں کی تعداد کا کوئی تعین ممکن نہیں (تفہیمات۔ حصہ دوم۔ ص۳۲۴)

حامد: تو ایک آدمی اتنی عورتوں کو کب تک رکھ سکتا ہے؟

میں: جب تک رکھ سکتا ہے رکھے۔ اس کے بعد کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کردے۔

ارشد: فروخت کردے؟

میں: جی ہاں۔ فروخت کردے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں؛

اس قسم کے لونڈی غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنوں میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اس کو وہ معاوضہ لیکر دوسرے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ (ص ۳۲۳)

حامد: خدا کے لئے اس سلسلہ کو بند کر دیجئے۔ میں اس سے زیادہ سن نہیں سکتا۔ توبہ۔ توبہ۔ استغفر اللہ۔ اگر غیر مسلم یہ کچھ سن پائیں تو ہمارے متعلق کیا کہیں۔ ہم تو دنیا میں منہ دکھانے کے بھی قابل نہ رہیں۔

ارشد: ذرا سنو حامد۔ (میری طرف مخاطب ہو کر) لیکن ان باتوں کی کوئی سند اور دلیل؟

میں: سند اور دلیل یہ کہ ہمارے اسلاف سے یہ کچھ اسی طرح چلا آ رہا ہے۔ اگلے دنوں یہ سوال زیر غور تھا کہ ہماری شریعت یتیم پوتے کو دادا کی وراثت سے جو محروم کر دیتی ہے تو اس کی سند کیا ہے۔ مودودی صاحب نے اس باب میں تحریر فرمایا تھا کہ

اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی صریح حکم ایسا نہیں ملا جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جاسکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت خلف سے سلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔

(ترجمان القرآن۔ مارچ ۱۹۵۳ء)

اور جن لوگوں نے قرآن کی رو سے ثابت کیا تھا کہ یہ فیصلہ غلط ہے ان کے متعلق مودودی صاحب نے فرمایا تھا کہ

اس قسم کے خبطیوں کی بات آخر کس التفات کی مستحق ہو سکتی ہے۔ (ترجمان القرآن۔ بابت جون جولائی ۱۹۵۳ء)

یہ ہے مودودی صاحب کے علم اور ان کی روشن خیالی کا حال۔ اور یہ ہے نمونہ اس نظام کا جسے وہ یہاں نافذ فرمانا چاہتے ہیں۔

فیضی اس تمام دوران میں آنکھیں بند کئے آرام کرسی پر لیٹے سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا چلا گیا۔ اس کی عادت تھی کہ جب اس کے سینے میں جذبات تلاطم خیز ہوں تو وہ بے تحاشا سگریٹ پیتا تھا۔ جب میں اس مقام تک پہنچا تو وہ آرام کرسی سے اٹھ بیٹھا اور کہنے لگا کہ

فیضی:۔ اسے چھوڑو کہ مودودی کس قسم کا عالم ہے اور اس کا نظام شریعت کیا ہے؟ تم اس سے تو متفق ہو گے کہ وہ ان ڈاکوؤں کے گروہ سے منصب اور اقتدار کی کنجیاں چھیننا چاہتا ہے جسے یہ اپنے باپ دادا کی وراثت بنائے بیٹھے ہیں۔ اس کا یہ جہاد اس کی سینکڑوں کوتاہیوں کا کفارہ ادا کر دیتا ہے۔ میں اس کی ایک عالم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک انقلابی کی حیثیت سے قدر کرتا ہوں۔ میرا تو یہ بھی خیال ہے کہ وہ جو مذہب کے معاملہ میں اس قسم کی باتیں کہتا رہتا ہے تو محض اس لئے کہ عام مسلمان اس کے ساتھ رہیں۔ ورنہ اس جیسا سمجھدار آدمی کبھی اس قسم کی لغویتوں کو دل سے نہیں مان سکتا۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جہاں وہ ایک طرف اس قسم کی باتیں کہتا ہے اس کے ساتھ ہی دوسری طرف توہم پرستی، تنگ نظری، ملائیت وغیرہ کی تردید بھی کرتا رہتا ہے۔ لہذا میرا خیال یہ ہے کہ اس نے اس چیز کو اپنے مقصد کے حصول کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے۔ اور میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں۔ "جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے"۔

ارشد:۔ میں اس سے متفق نہیں۔ میرا خیال ہے کہ مودودی صاحب ایمانداری سے ان چیزوں کو صحیح سمجھتے ہیں۔ وہ انہیں بطور سیاسی

حربہ کے استعمال نہیں کرتے۔

میں: بہر حال، بات دو صورتوں سے خالی نہ ہوئی۔ اگر فیضی صاحب ٹھیک کہتے ہیں تو میں ان سے پوچھتا ہوں کہ جو شخص آج مذہب جیسی مقدس چیز کو اپنے مقصد کے حصول کیلئے دیدہ و دانستہ بطور ایک حربہ کے استعمال کرنے میں کچھ جھجک محسوس نہیں کرتا اس کے متعلق یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کل کو جب اقتدار اس کے ہاتھ میں آجائے گا تو وہ کیا کچھ نہیں کرے گا۔ ہماری سب سے بڑی بھول یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی شخص کسی ایسے آدمی یا ادارے کے خلاف اٹھتا ہے جسے ہم اچھا نہیں سمجھتے تو ہم اس کی ہر حرکت کو جائز بلکہ مستحسن قرار دیتے چلے جاتے ہیں۔ محض اس لئے کہ اس سے ہمارے حریف کو زک پہنچتی ہے۔ بیکر یہ کبھی نہیں سوچتے کہ جو شخص اس قسم کا کیریکٹر رکھتا ہے کہ دشمن کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے ہر قسم کا حربہ استعمال کر لیتا ہے، اس کے ہاتھ میں قوت کی تلوار دیدینا کس قدر خطرناک ہے۔

اور اگر ارشد صاحب کا خیال صحیح ہے تو پھر آپ یہ سوچ لیجئے کہ اگر مودودی صاحب برسر اقتدار آگئے تو وہ نظام کس قسم کا ہوگا جسے وہ نظام شریعت کے نام سے ملک میں قانون بنا کر رائج کر دیں گے۔ ذرا اس پر بھی غور کر لیجئے گا کہ اسوقت ان کے موجودہ معتقدات ملک کے قانون کی حیثیت لے لیں گے اور جس انداز سے آپ آج ان پر تنقید کر رہے ہیں، اس وقت اس قسم کی تنقید، حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن قرار دی جائے گی۔ حکومت ہی کے خلاف ایجی ٹیشن نہیں، بلکہ "خدا اور رسول" کے خلاف بغاوت۔ اس لئے کہ یہ مخالفت ہوگی اس شریعت کی جسے "خدا اور رسول" کا حکم قرار دیکر نافذ کیا جائے گا۔ بالفاظ دیگر اسوقت مودودی صاحب کے کسی عقیدہ کے خلاف عقیدہ رکھنا یا ان کے کسی فیصلہ کے خلاف لب کشائی کرنا "خدا اور رسول" کی معصیت اور اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت ہوگی۔

حامد: تو کیا اسوقت حکم صرف مودودی صاحب ہی کا چلیگا؟

میں: جی ہاں! صرف مودودی صاحب کا۔

ارشد: وہ کیسے؟

میں:- وہ ایسے کہ

پاکستان کا آئین اور قانون کتاب و سنت (قرآن اور حدیث) کے مطابق ہوگا۔

مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ قرآن میں صرف اصول دیئے ہیں۔ ان اصولوں کے تفصیلی احکام احادیث رسول اللہؐ کے اندر ہیں۔ لہٰذا خدا اور رسول کی اطاعت کے معنی ہیں احادیث رسول اللہ کی اطاعت کرنا۔

لیکن۔ انھوں نے کہا ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں میں غلط احادیث بھی ہیں اور صحیح احادیث بھی۔ نیز بعض امور ایسے بھی سامنے آسکتے ہیں جن کے متعلق ان احادیث میں کچھ نہیں کہا گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ کونسی احادیث صحیح ہیں اور کونسی غلط۔ نیز یہ کہ جن امور کے متعلق احادیث خاموش ہیں ان کی بابت کیسے پتہ چلے کہ شریعت کا حکم کیا ہے۔

اس کے متعلق مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ یہ بات ایک مزاج شناس رسول ہی بتا سکتا ہے کہ احادیث کے ان مجموعوں میں صحیح احادیث،

کون کون سی ہیں۔ نیز جن امور میں احادیث خاموش ہیں ان کی بابت بھی وہی کہہ سکتا ہے کہ اگر رسول اللہ آج موجود ہوتے تو وہ اس باب میں کیا ارشاد فرماتے۔

اس سے واضح ہے کہ "مزاجِ شناسِ رسول" کا فیصلہ خود خدا اور رسول کا فیصلہ قرار پاجاتا ہے اور اس کے فیصلے کی اطاعت، خدا اور رسول کی اطاعت۔

ارشد۔ لیکن یہ تو کسی "مزاج شناسِ رسول" کی بات ہے۔ آپ نے یہ کیسے تصور کر لیا کہ اس سے مراد خود مودودی صاحب ہیں۔

میں: جماعت اسلامی کے موجودہ امیر، امین احسن صاحب اصلاحی نے پنجاب کے فسادات کی تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے (عدالت میں) کہا ہے کہ ان کے نزدیک یہ مزاج شناسِ رسول خود مودودی صاحب ہی ہیں۔

حامد: پھر تو معاملہ واقعی خطرناک ہے۔

(فیضی پھر آنکھیں بند کئے سگرٹ پئے جارہا تھا۔ ارشد نے اسے آواز دی اور کہا)۔

ارشد۔ کیوں بھئی فیضی! تم پھر چپ ہوگئے۔ کچھ بولتے کیوں نہیں؟

فیضی: میرے نزدیک یہ سب بحثیں فضول ہیں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ جو شخص بھی ان چوروں سے حکومت کی کرسیاں چھیننے کیلئے اٹھے اس کا ہر قدم جائز اور درست ہے۔ بقول اقبال

گر ز دستِ تو کارے نادر آید   گناہے ہم اگر باشد ثواب است

یہ محض نظری بحثیں ہیں کہ نظامِ شریعت کس قسم کا ہوگا اور اسلامی مملکت کا آئین کیسا ہوگا۔ جیسا میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، میرا پختہ یقین ہے کہ مودودی صاحب نے اسلامی نظام اور شرعی آئین کو محض ایک حربہ بنا رکھا ہے اس لئے کہ انھوں نے تو بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ اول تو پاکستان کا بننا ہی محال ہے اور اگر یہ بن بھی جائے تو اس کا ایک اسلامی مملکت بننا قطعاً ناممکن ہے۔ کیوں بھئی ملاجی، کچھ ایسے ہی تھے ناں ان کے الفاظ؟

میں: ہاں انھوں نے کہا تھا کہ

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہوجائے۔

اور یہ بھی کہ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک دفعہ غیر اسلامی نمونہ کا ہی سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم ہوجائے تو پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے۔ اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں۔ اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہوجائے تو میں اسے ایک معجزہ سمجھوں گا۔ (ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۴۰ء)

فیضی :- یہ دیکھ لو۔ بات صاف ہے۔ جس شخص کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس میں کچھ دلچسپی ہی نہ ہو کہ پاکستان بنتا ہے یا نہیں۔ اور جس شخص کی بصیرت اسے یہ بتلائے کہ اس مملکت کا اسلامی بن جانا ممکنات سے ہے، اس کا سر پھرا ہے کہ وہ اس میں اسلامی نظام رائج کرنے کیلئے اس قدر مصیبتیں اٹھاتا پھرے؟ مودودی صاحب نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ ہمارا مقصد حکومت کی کرسی حاصل کرنا ہے اور اسی کیلئے ان کی تمام جدوجہد ہے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے جو طریق کار انھوں نے اختیار کیا ہے اس کی داد تو تم بھی دو گے۔ میں تو محض اس لئے اس جماعت کی حمایت کرتا ہوں۔

میاں : یہ ہے ارشد صاحب ساری بات۔ مودودی صاحب کی حمایت کرنے والے دو ہی قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ٹائپ جیسے (معاف فرمائیگا) آپ اور حامد صاحب۔ یعنی وہ لوگ جنھیں ذاتی معلومات کچھ نہیں۔ وہ محض دوسروں سے سن کر یہ خیال قائم کئے بیٹھے ہیں کہ مودودی صاحب ایک روشن خیال عالم ہیں جن کا مقصد اس قسم کا شرعی نظام نافذ کرنا ہے جس سے ہم ساری دنیا کی قوموں کی قیادت کے مستحق بن جائیں گے۔ اس باب میں ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کی عدم معلومات کا یہ عالم ہے کہ اگلے دنوں کالج کا ایک طالب علم مجھ سے کہہ رہا تھا کہ یہ بڑے بڑے جاگیردار اور زمیندار جو ہزاروں ایکڑ زمین مفت میں سنبھالے بیٹھے ہیں اور غریب کاشتکاروں کی محنت پر عیش اڑا رہے ہیں، جب مودودی صاحب کا شرعی نظام رائج ہو گیا تو ان کے ہوش ٹھکانے لگ جائیں گے۔ کیونکہ اس میں کسی کو اجازت نہیں ہوگی کہ وہ اتنے اتنے رقبوں کے مالک بنے رہیں۔ اور وہ برخوردار اپنی ضد پر اڑا رہا کہ وہ بالکل ٹھیک کہتا ہے، جب تک میں نے اسے خود مودودی صاحب کی کتاب (مسئلہ ملکیتِ زمین) سے یہ الفاظ پڑھ کر نہیں سنا دیئے کہ :-

> اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار، رکمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے ہیں بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ (ص۵۲)

ہاں! تو ایک تو یہ طبقہ ہے جو ذاتی طور پر کچھ نہیں جانتا لیکن مودودی صاحب کے پراپیگنڈا سے متاثر ہو کر نہایت نیک نیتی سے سمجھے بیٹھا ہے کہ ان کا نظام شرعی فی الحقیقت اسلام کا ایک روشن اور تابناک مرقع ہوگا جس کے سامنے ساری دنیا کی گردنیں جھک جائیں گی۔ اور دوسرا طبقہ ہے فیضی صاحب جیسے لوگوں کا جو حُبِّ علیؓ نہیں بلکہ محض بغضِ معاویہؓ کی وجہ سے مودودی صاحب کے حامی ہیں یعنی وہ ان کی تائید صرف اسلئے کرتے ہیں کہ یہ حکومت کو گالیاں دیتے ہیں اور برسراقتدار طبقہ کے ہاتھ سے منصب و اقتدار چھیننا چاہتے ہیں۔ غلط! کن برسراقتدار طبقہ کے ہاتھ سے اقتدار یقیناً چھین لینا چاہیئے۔ بُری حکومت کو ضرور بدل دینا چاہیئے ہم میں سے کون ہے کہ جو موجودہ نظم و نسق کی خرابیوں کا مداح اور برسراقتدار طبقہ کا قصیدہ خواں ہے؟ لیکن سوال تو یہ ہے کہ جو لوگ موجودہ نظام کو الٹ کر اس کی جگہ دوسرا نظام مسلط کرنا چاہتے ہیں وہ نظام کس قسم کا ہے؟ وہ نظام، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، توہم پرستی کورانہ تقلید، آمریت اور استبداد پر مبنی ہے۔ توہم پرستی ایسی کہ آپ کو ماننا پڑے گا کہ رسول اللہ واقعی ایک سیڑھی پر چڑھ کر آسمانوں پر [illegible] گئے تھے۔ تقلید ایسی کہ کسی مسئلہ کی تائید میں خواہ آپ کو قرآن و سنت سے کوئی سند [illegible] [illegible] اس لئے [illegible] [illegible] سالہا سال سے [illegible] سے متواتر چلا آرہا ہے۔ آمریت ایسی کہ بڑے سے بڑے معاملہ [illegible] شخص کی [illegible] [illegible] کا

جسے مزاج شناس رسولؐ قرار دیا جائے گا اور استبداد ایسا کہ اس کے فیصلہ کے خلاف لب کشائی کرنا، خدا اور رسول کی معصیت اور اس سے انکار، اسلام سے خارج ہوجانے کے مرادف ہوگا جس کی سزا قتل ہوگی۔ اگر آپ اس قسم کے نظام کو پسند کرتے ہیں تو آپ شوق سے مودودی صاحب کی تائید کیجئے۔ ان کا ساتھ دیجئے۔ لیکن اگر آپ اس نظام کو اچھا نہیں سمجھتے تو پھر غور کیجئے کہ آپ دانستہ یا نادانستہ ایسے شخص یا ایسی جماعت کی حمایت کرکے جو اس قسم کا نظام مسلط کرنا چاہتی ہے، کتنے بڑے خطرے کو مول لے رہے ہیں۔ اس وقت تو پھر بھی یہ ممکن ہے کہ ہم کوشش کریں تو کسی نہ کسی طرح صحیح اسلامی نظام رائج ہوجائے۔ لیکن اگر یہاں ایک دفعہ وہ نظام رائج ہوگیا جسے مودودی صاحب، اور ان کے ہم نوا نظامِ شرعی کے نام سے آگے بڑھا رہے ہیں تو اس نظام کی جگہ صحیح اسلامی نظام کا لے آنا سخت مشکل ہوجائے گا۔ اسلئے کہ اس وقت عوام کی ساری تائید ان لوگوں کو حاصل ہوگی جنھیں وہ مذہبی پیشوا سمجھتے ہیں۔ باقی رہے ہمارے فیضی صاحب، سو جو حمایت حبِ علیؓ کی وجہ سے نہیں بلکہ علی بُغضِ معاویہؓ ہو، تو یہ خالص جذباتی روش ہے جس کا توڑ کوئی عقلی دلیل نہیں کرسکتی۔

فیضی:۔ اب اس لیکچر کو ختم بھی کروگے یا نہیں۔ ہم نے سینما بھی جانا ہے۔

اس طرح یہ دلچسپ صحبت ختم ہوگئی۔ ارشد صاحب یہ کہہ کر کتابیں ساتھ لے گئے کہ میں آج قائل ہوگیا کہ پروپیگنڈا کسی چیز کو کیا سے کیا کچھ بنا کر دکھا سکتا ہے۔

"فکری"

"یتیم پوتے کی بحثیں دیکھ کر..."

'ابنِ آدم'

کچھ کم نصف صدی پہلے خواجہ احمد دین صاحب امرتسریؒ نے "یتیم پوتے" کا مسئلہ چھیڑا تھا جس کے بعد یہ مسئلہ چل پڑا کیونکہ دلائل کے لحاظ سے اس میں زور موجود تھا۔ خواجۂ موصوف کے بعد مولانا اسلم جیراجپوری، مولانا غلام احمد پرویز اور مولانا تمنا پھلواروی نے اس مسئلے کو آسمان پر پہنچا دیا جس سے پاکستانی مجلس دستور ساز تک متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ دلیل کی جو قوت مجھے ان تحریروں میں نظر آئی وہ ان لوگوں کے دلائل میں نہ نظر آسکی جو یتیم پوتے کی محجوبیت کے قائل ہیں۔ بایں ہمہ بعض ضروری نکات اس پورے سلسلۂ بحث میں نہ دکھائی دیئے جن کو دیکھنے سننے کا میں متمنی تھا۔

طلوع اسلام سو بار اس دعوے کو دہرا چکا ہے کہ احادیث (نیز فقہ) کوئی وحی نہیں اور اس کا کوئی جزئیہ غیر متبدل قدر نہیں، بخلاف اس کے قرآن کا ہر کلیہ اور ہر جزئیہ ابدی اور غیر متبدل اقدار میں داخل ہے۔ طلوع اسلام اس دعوے پر اس سختی سے قائم ہے کہ اس کے اندر بھی بایں ہمہ روشن خیالی وہی جمود پیدا ہو گیا ہے[۱] ـــــ ذرا اونچی سطح پر ـــــ جو حدیث و فقہ کو مستقل اقدار ماننے والوں کے اندر عرصے سے موجود ہے۔ اس کی بہت سی بحثوں کے بین السطور میں وہ متقدم (PROGRESSIVE) تصور، جو ہم عرض کرنا چاہتے ہیں، جھلکتا ہے لیکن برملا ہنوز سامنے نہیں آیا ہے۔

حقیقت یوں ہے کہ قرآن پاک انسان کے تمام گوشہائے زندگی کے لئے کچھ ضابطے دیتا ہے قانونی و سیاسی بھی اور اخلاقی و روحانی بھی۔ یہ سارے ضابطے اسے ہر ہر سمت سے گھیر کر ایک خاص مرکز و مقصد کی راہ پر لگا دیتے ہیں۔ ابدی اقدار (ETERNAL VALUES) دراصل یہی مرکز و مقصد ہوتا ہے۔ آگے چلنے سے پہلے یہاں رسول کا موقف بھی سمجھ لینا چاہئے۔ رسولؐ صدق اور صفا کی اس بلند ترین چوٹی پر کھڑا ہوا ہوتا ہے جہاں اس کی نگاہیں ایک طرف ابدی و غیر متبدل اقدار پر گڑی ہوتی ہیں اور دوسری جانب دامنِ کوہ میں کھڑے ہونے والوں کی کمزوریوں، مجبوریوں اور ناچاریوں پر بھی جمی ہوتی ہیں۔ اقدار حیات کا جو عشق رسول کو بے چین کئے ہوئے ہوتا ہے اس کا تقاضا تو یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی جست میں زمان و مکان کی حدود کو پھاند جائے مگر جو قوم اس کے حوالے کی جاتی ہے اس کی اکثریت ایسی بیمار ہوتی ہے کہ دو قدم چلنا بھی اس کے لئے دشوار ہوتا ہے۔ رسول خود تو اسی بلند مقام پر ہوتا ہے جہاں ایک گری ہوئی بیمار و ناتواں قوم کو لے جانا مقصود ہوتا ہے بلکہ اس بیمار کی خاطر اسے کبھی کبھی خود نیچے اتر کر سہارا دینا پڑتا ہے۔

وحی صرف اتنا ہی نہیں کرتی کہ عملی اقدار کو دور سے دکھا کر الگ ہو جائے بلکہ اس کے دو بڑے احسان اور بھی ہیں [illegible] رسول کی

۱؎ استدراک ملاحظہ فرمائیے۔ [illegible]

زندگانی جو سب سے آگے آگے ہونے کے باوجود ہر ہر قدم پر اپنی ناتواں امت کو پلٹ پلٹ کر دیکھتا ہے اور اسے پکڑ پکڑ کر آگے کھینچتا ہے۔ دوسرا احسان وحی کا یہ ہے کہ اس نے ابدی و مستقل اقدار تک پہنچنے کے لئے کچھ "عبوری ضابطے" بھی دیئے ہیں۔ قرآن کو ان عبوری ضابطوں سے خالی سمجھنا صحیح نہیں اور ان کو اصلی اقدار کی طرح ابدی و غیر متبدل فرض کر لینا بھی درست نہیں[1]۔

ایک دردمند طبیب کا اصل مقصد مریض کی تندرستی ہوتا ہے اور تندرستی آنے تک وہ جو دوائیں بھی استعمال کراتا ہے وہ عبوری دور ہی کی چیز ہوتی ہے۔ دوا کی کامیابی یہ نہیں کہ ہمیشہ مریض کے ساتھ چمٹی رہے اور کبھی جدا نہ ہو۔ اس کی اصل کامیابی یہ ہے کہ مریض کو تندرست کر کے خود الگ ہو جائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ وہ ایک الگ گوشے میں محض اس لئے محفوظ رہے گی کہ اگر خدانخواستہ پھر اس کی ضرورت پڑ جائے تو وہ کام آ جائے اور اس طرح چند تجربوں کے بعد آخر کار وہ مریض کو تندرست کر کے خود غیر ضروری ہو جائے۔ قرآن پاک کی بھی بالکل یہی صورت ہے۔ وہ بیمار معاشرۂ انسانی کیلئے مختلف علاج بتاتا ہے لیکن اس لئے نہیں کہ ہمیشہ یہ پروگرام اس کے ساتھ چپکا رہے بلکہ اس کی اصلی غرض یہ ہے کہ انسانیت اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ کر اس سے بے نیاز ہو جائے اور ان ضابطوں کی ضرورت نہ باقی رہے۔ وہ ضابطے ایک الگ گوشے میں محفوظ رہیں گے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ اپنے اندر کوئی ابدیت مقصود رکھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ شاید پھر کبھی انسانیت مائل بہ تنزل ہو جانے کی وجہ سے ان کی ضرورت محسوس کرے فطری قانونِ ارتقاء ایک مسلسل عمل کی طرح جاری ہے اور جاری رہے گا اور جب وہ انسانیت کو اصلی اقدار تک پہنچا چکے گا ——— خواہ کروڑوں سال میں ہو ——— تو وہ عبوری ضابطے اس لئے بے کار ہو جائیں گے کہ ان کا مقصد حاصل ہو گیا۔ اس وقت وہ ضابطے اپنی اصلی شکل میں ابدی نہیں رہیں گے بلکہ صرف اپنے نتیجہ و مآل کے لحاظ سے ابدی ہوں گے۔

ذرا جی کڑا کر کے چند مثالیں سن لیجئے:

(۱) قرآن نے حکم دیا کہ چور کا ہاتھ کاٹو اور زانی کو کوڑے لگاؤ۔ لیکن اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ دونوں جرم ختم ہو جائیں اور ان احکام کی ضرورت نہ آئے۔

(۲) قرآن نے لونڈی غلام کے بہت سے احکام دیئے ہیں لیکن مقصد اس رسم غلامی کی تصدیق (CONFIRM) کرنا نہیں بلکہ غرض یہ ہے کہ غلامی کی لعنت اور اس کے متعلق یہ تمام عبوری قوانین ختم ہو جائیں۔

(۳) قرآن نے بارہا کہا کہ محتاجوں کی امداد کرو، بھوکوں اور ننگوں کی روٹی کپڑے سے مدد کرو۔ لیکن مقصد یہ نہیں کہ ان نیکیوں کو جاری رکھنے کیلئے دنیا میں غربت اور فاقہ و محتاجی کو باقی رکھو بلکہ اس کی غایت یہ ہے کہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ یہ ننگِ انسانیت داغ معاشرے کی پیشانی سے دور ہو جائیں۔

(۴) قرآن قتال پر بھی بار بار ابھارتا ہے لیکن مقصد خونریزی کی فراوانی نہیں بلکہ ایسے امن و امان کا قیام ہے جہاں جنگ کا نام نشان بھی نہ رہے۔

(۵) امیر و مامور وغیرہ کے بھی بہت سے احکام قرآن میں موجود ہیں لیکن حکومت وغیرہ کا قیام کوئی اسلامی مقصود نہیں۔ مقصد ایسے صالح معاشرے کا قیام ہے جس میں حکومت کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ خدا اور بندے کے درمیان کسی سیاسی و قانونی واسطے کا دباؤ نہ رہے۔ طاعتِ الٰہی براہِ راست ہو اور اقدارِ حیات کی طرف خوشدلانہ اور رضاکارانہ بے چینی کے ساتھ ارتقا ہوتا رہے۔

---

[1] استدراک ملاحظہ کیجئے۔ (طلوعِ اسلام)

(۶) کہنا یہ ہے کہ قانونِ وراثت بھی اسی نوع کا ایک ضابطہ ہے۔

مجھے ایک محترم دوست کا ایک رسالہ پڑھ کر تعجب ہوا جس میں انھوں نے ملکیتِ زمین ثابت کرنے کیلئے قرآن سے کوئی دلیل نہیں دی۔ صرف ایک دلیل یہ مل سکی کہ اگر ملکیت نہ تسلیم کی جائے تو قرآن کا سارا قانونِ وراثت ختم ہوجاتا ہے۔ سبحان اللہ وبحمدہ۔ گویا وہ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ:

اگر دنیا سے چوری اور زنا ختم ہوگئے تو قطع وجلد کی قرآنی سزا ختم ہوجائے گی۔

اگر غربت ومحتاجی کو باقی نہ رکھا گیا تو اعانتِ فقرا کے ثواب سے ہم سب محروم ہوجائیں گے۔

اگر لونڈی غلام کا رواج نہ رہا تو تحریرِ رقبہ کا حکم پیدا نہ ہوسکے گا۔ [1]

یہی صورت کچھ یتیم پوتے کی وراثت میں بھی ہوئی ہے۔ اس موضوع پر خامہ فرسائی کرنے والوں میں کسی نے اس بات کی طرف اشارہ بھی نہیں فرمایا کہ قانونِ وراثت ملکیت کی تصدیق کرنے کیلئے نہیں بلکہ یہ ایک عبوری دور کیلئے ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ملکیت کے قصے کو رفتہ رفتہ ختم کردیا جائے۔

قرآن کے یہ عبوری قوانین درحقیقت چند بلند اقدار کی طرف لے جاتے ہیں۔ مثلاً زکوٰۃ کا نظام اسلئے ہے کہ مالی نظام "انفاقِ عفو" پر جاکر دم لے۔ لونڈی غلام کے ضوابط اس لئے ہیں کہ انجام کار کوئی کسی کا مملوک ومحکوم نہ رہے۔ اسی طرح ہر شعبۂ زندگی میں مختلف عبوری احکام چند اعلیٰ اقدار تک پہنچا کر خود الگ ہوجاتے ہیں اور پھر یہ سب اعلیٰ اقدار مل کر کسی اور بنیادی قدر کی طرف لیجاتے ہیں اور انجام کار یہ سب ایک آخری نصب العین —— اللہ —— میں جاکر گم ہوجاتے ہیں۔ [2] یہ حقیقت معلوم نہیں کیوں اب تک بہت سے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکی ہے۔

بہرحال یتیم پوتے کی ہی وراثت نہیں بلکہ پورا قانونِ وراثت بھی کوئی مستقل قدر نہیں۔ اس کی تہ میں اس سے بالاتر ایک اور قدر ہے جو اس کی روح اور اس کا مقصود ہے اور وہ یہ ہے کہ معاشرے میں کوئی فرد بھی ننگا بھوکا نہ رہے اور کوئی فرد اپنے پاس ضرورت سے زیادہ نہ رکھے۔

ہم نے ابھی اوپر بتایا ہے کہ رسولؐ خود اعلیٰ اقدارِ مقصودہ کے مقام پر کھڑا ہوتا ہے اور نیچی سطح کے انسانوں کے لئے ان کی گوناگوں کمزوریوں کے پیش نظر کچھ عبوری قوانین بھی دیتا ہے اور ان کمزوریوں کے ساتھ اسے بھی چلنا پڑتا ہے۔ یہ ایک بڑی سخت ڈیوٹی ہے جو اس کے سپرد کی جاتی ہے۔ چند مثالیں اس کی بھی سنئے:

پیغمبرؐ نے قتال پر ابھارا لیکن خود اپنے ہاتھ سے غالباً ایک انسان کو بھی قتل نہیں کیا کیونکہ قتال ایک عبوری ضابطہ ہے اور مقصودِ اصلی خود رسولؐ کا طرزِ عمل ہے جو عین منشائے قرآنی ہے۔

رسولؐ نے زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید کی لیکن اس کا جو سسٹم لوگوں کو بتایا اس پر خود کبھی عمل نہیں فرمایا۔ زکوٰۃ (ایک معین مقدارِ مال) تو وہ ادا کرے جس کے پاس مال جمع ہو۔ جس نے اپنے اوپر جمع مال ہی کو حرام کرلیا ہو اس کیلئے معین نظامِ زکوٰۃ کی پابندی کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے؟ وہ تو "انفاقِ عفو" سے بھی آگے ہوتا ہے جہاں "انفاقِ کُل" کا جذبہ اسے بے چین کئے رہتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح سمجھئے کہ نبیؐ نے ساری امت کو تقسیمِ ترکہ کا سبق دیا لیکن خود —— صاف لفظوں میں اعلان کردیا کہ "لا نورث ولا نورث" ہم نہ وارث ہیں نہ مورث۔

---

[1] اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر انسان گناہ کرنا چھوڑدے تو خدا کی صفت غفور رحیم بیکار ہوکر رہ جائے۔ (طلوعِ اسلام)

[2] آخری نصب العین کا نقطہ وضاحت چاہتا ہے۔ اس کے متعلق طلوعِ اسلام کے صفحات میں پہلے بحث ہوچکی ہے۔ (" ")

ہم نے بعض دوستوں کے مضامین دیکھے ہیں جن میں وہ لکھتے ہیں کہ حدیث لا نرث ولا نورث اس لئے غلط ہے کہ قرآن کے خلاف ہے حالانکہ حقیقت یوں ہے کہ یہ عین منشائے قرآنی کے مطابق ہے۔ ہم خود ایسی تمام احادیث کو قابل رد سمجھتے ہیں جو قرآن کے خلاف ہوں لیکن خلافِ قرآن ہونے کا مطلب لفظوں کے خلاف ہونا نہیں بلکہ روح و معنی کے خلاف ہونا ہے۔ آیئے چند مثالیں اس کی بھی ملاحظہ فرمایئے۔

قرآن پاک میں مملوک کو کئی جگہ "عبد" کہا گیا ہے۔ مثلاً وانکحوا الایامی منکم والصالحین من عبادکم وامائکم۔ اور الحر بالحر والعبد بالعبد۔ اسی طرح مالک کیلئے رب کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اذکرنی عند ربک ــــــ اس کے بالمقابل حضورؐ کا ارشاد ہے کہ:

لا یقولن احدکم عبدی وامتی ولا یقولن المملوک ربی وربتی، لیقل المالک فتای وفتاتی ولیقل المملوک سیدی وسیدتی فانکم المملوکون والرب اللہ تعالیٰ (رواہ الشیخان وابوداؤد عن ابی ہریرہؓ)

تم میں سے کوئی شخص اپنے مملوک کو عبد وامہ (لونڈی غلام) نہ کہے اور نہ مملوک اپنے مالک کو رب وربہ کہے۔ مالک فتی وفتاۃ (BOY & MAID) کہے اور وہ سید وسیدہ (SIR, MADAME) کہے کیونکہ دراصل تم سب ہی مملوک ہو اور رب اللہ تعالیٰ ہے۔

ایک سطحی نگاہ رکھنے والا فوراً کہہ اٹھے گا کہ قرآن جسے عبد وامہ یا رب وربہ کہتا ہے حدیث اس سے روکتی ہے لہٰذا یہ حدیث غلط ہے لیکن اس دعوے سے پہلے اسے یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف نہیں جا رہی ہے بلکہ عین منشائے قرآنی کو پورا کر رہی ہے ــــــ اسی طرح ابوداؤد ونسائی میں عباد بن شرحبیل سے ایک روایت ہے جس کا ہم صرف ترجمہ درج کرتے ہیں:

مجھے ایک بار قحط کا سامنا کرنا پڑا تو میں مدینے کے ایک باغ میں داخل ہوا۔ ایک خوشے کو مل کر کھا لیا اور کچھ خوشے اپنے کپڑے میں رکھ لئے۔ اتنے میں باغ کا مالک آپہنچا۔ اس نے مجھے مارا بھی اور میرا کپڑا بھی چھین لیا پھر مجھے حضورؐ کے پاس پکڑ کر لے گیا اور تمام واقعہ کہہ سنایا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ نادان تھا تم نے اسے کوئی تعلیم نہ دی، یہ بھوکا تھا، تم نے اسے کچھ کھلایا نہیں۔ پھر حضورؐ کے حکم سے اس نے مجھے کپڑا بھی واپس کر دیا اور ایک یا نصف وسق غلہ بھی دیا۔

اس روایت کو سن کر ایک کوتاہ نظر فوراً شور مچا دیگا کہ قرآن میں تو چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے اور اس حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے چور کا ہاتھ نہیں کٹوایا بلکہ الٹا اسے اور انعام دلوایا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ حدیث غلط ہے لیکن معترض کو پہلے اس پر بھی غور کر لینا چاہیئے کہ قرآنی قانونِ قطع کا مقصد صرف ہاتھ پر ہاتھ کٹواتے چلے جانا نہیں بلکہ ایسے معاشرے کا قیام ہے جہاں نہ کوئی بھوکا ہو اور نہ چوری ہو۔ یہ حدیث اسی منشائے قرآنی کو پورا کر رہی ہے۔

مثالیں اور بھی بہت مل سکتی ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ حدیث لا نرث ولا نورث کو بھی اسی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ یہ فرمان عین اسی مقامِ نبوت سے صادر ہوا ہے جہاں ــــ ان عبوری قوانین وراثت کے ذریعے ــــ انسانیت کو لے جانا ہے یعنی زمین اور رزق کے تمام سرچشمے خدا کی ملک ہوں اور ان کا انتظام ایسے بندوں کے ہاتھ میں ہو جو ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق اس کا حق پہنچاتے رہیں۔ بلاشبہ یہ معاشی منزل ابھی دور ہے اور یہ اس وقت آئے گی جب افراد کے اندر جو جذبہ آج اپنی ذات یا اپنے خاندان کے لئے کمانے پر ابھارتا ہے اس سے زیادہ وہ اسے پورے معاشرۂ انسانی کے لئے کسبِ دولت پر ابھارے۔

بہرکیف یہ حدیث لا نرث ولا نورث قانونِ وراثت کی روح کو ہی بتاتی ہے۔ قانونِ وراثت ایک عبوری ضابطہ ہے اور یہ حدیث

اس کا آخری نتیجہ و منزل۔ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ ایک طرف حدیث و فقہ کے ایک ایک جز کو غیر متبدل اقدار کا درجہ دیا جا رہا ہے اور دوسری جانب قرآن کے عبوری قوانین پر بھی اس انداز سے بحث کی جا رہی ہے کہ گویا یہی اصل اور ابدی اقدار ہیں۔ جمود دونوں ہی میں ہے۔ ایک میں ذرا بڑے پیمانے پر اور دوسرے میں کچھ چھوٹے پیمانے پر۔[۱]

اسی طرح تمام غلط فہمیوں کا اصلی سبب وہ غلط فہمی ہے جو عرصۂ دراز سے پورے اسلام کے متعلق قائم ہے۔ اسلام محض پابندیٔ قوانین کا نام نہیں۔ اسلامی احکام خواہ وہ نماز روزے کے ہوں یا وراثت و تعزیرات کے، یہ سب کے سب مل جل کر انسان کو ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں اور ایک خاص راستے پر لگا دیتے ہیں۔ یہی راستہ دراصل اسلام ہے جو درحقیقت صرف ایک رجحان (ATTITUDE) اور ایک اندازِ فکر و عمل ہے نہ کہ الفاظِ قانون کی پیروی یا اشکال وصور۔ اشکال وصور صرف ایک خاص رجحان پیدا کرنے کیلئے ہوتے ہیں خود مقصود نہیں ہوتے نماز فحشا و منکر سے بچنے کیلئے ہے، روزہ حصول تقویٰ کیلئے ہے، زکوٰۃ و انفاق صحیح تقسیم دولت کیلئے۔ وھلم جرا۔ اگر یہ رجحانات نہیں پیدا ہوتے تو نری پابندیٔ احکام کو اسلام قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔ اس مضمون کی وضاحت کیلئے ایک مثال سن لیجئے۔

فرض کیجئے ایک تحصیلدار کو کہیں بھیجا جاتا ہے اور اسے ہدایت یہ دی جاتی ہے کہ جس طرح ممکن ہو کاشتکاروں کو ابھارو، اٹھاؤ، بیدار کرو اور ان کا معیار بلند کرو۔ یہ ایک رجحان ہوا جو ایک خاص پالیسی کے طور پر اس میں ڈال دیا گیا۔ اب چارج لینے کے بعد اسے بیسیوں مواقع سے سابقہ کرنا پڑتا ہے۔ کہیں جلسے اور جلوس کی شرکت ہے، کہیں مالیے کی وصولی۔ کہیں فصل خصومات ہے اور کہیں تقریبات شادی وغم کی حاضری۔ غرض زندگی کے بیسیوں معاملات سامنے آتے ہیں اور وہ تحصیلدار ہر موقع پر اسی رجحان اور اسی روح کو پیش نظر رکھ کر الگ الگ انداز اختیار کرتا ہے۔ ہر عمل کی شکل الگ ہے لیکن سب میں روح ایک ہی ہوتی ہے یعنی کاشتکاروں کو بلند کرنا۔ بعینہٖ اسی طرح سمجھئے کہ قرآن انسانوں میں ایک خاص رجحان (ATTITUDE) پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہی رجحان روزے کے قانون میں ہے، یہی نماز میں، یہی قتال میں، یہی زکوٰۃ میں اور ــــ یہی قانون وراثت میں اور یہی سارے احکام قرآنی میں۔ اس رجحان کو توحید کہئے، تقویٰ کہئے، احسان کہئے، حسن وعشق کہئے، انسانیت کہئے، اقدار حیات کی محبت کہئے، جو جی چاہے کہہ لیجئے، ہمیں سردست اس سے بحث نہیں۔ کہنا فقط یہ ہے کہ اسلام دراصل وہی رجحان ہے جو ان سارے احکام کی مدد سے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ صرف پوتے کو وراثت دلوانا اس کا مقصد نہیں اور اس پر اس انداز سے بحث کرنا بھی کہ گویا سارا اسلام اور ابدی قدر یہی ہے، درست نہیں۔

وہ دادا کیسا بدبخت ہے جو اپنے پوتے کو یتیم دیکھتے ہوئے بھی اس کے لئے کوئی وصیت نہیں کرتا اور اپنی زندگی میں اس کے لئے کوئی حصہ الگ نہیں کرتا۔ کیا ازروئے قرآن اس بدبخت پر وصیت فرض نہیں؟ پھر وہ معاشرہ کتنا سنگدل ہے جس کے کچھ افراد اپنے بھتیجے کو ننگا بھوکا دیکھتے ہیں اور اس پر کوئی ترس نہیں کھاتے اور دوسرے افراد ایسے بے غیرت ہیں کہ اسے ظالم چچا سے صرف اس لئے کچھ نہیں دلوا سکتے کہ ان کے خیال میں قانون وراثت کے اندر اس کی کوئی لفظی گنجائش موجود نہیں۔ قرآن کی کس آیت میں لکھا ہے کہ (تمہارے خیال میں) آیات وراثت میں جس کا ذکر نہ ہوا سے کچھ مت دو؟

---

[۱] استدراک ملاحظہ کیجئے۔ (طلوع اسلام)

یہ ساری خرابیاں صرف اس لئے پیدا ہوئیں کہ قانون وراثت کو عبوری دور کی چیز نہ سمجھا گیا اور اس پر غور نہ کیا گیا کہ یہ نرا لفظی اور خشک قانون نہیں بلکہ اس کا ایک مقصد اور ایک روح بھی ہے اور وہی اصلی قدر ہے جہاں اس قانونِ وراثت کے عبوری زینوں سے لے جانا مقصود ہے۔ اس قانون سے اگر وہ رجحان ہی نہ پیدا ہو جو پیدا کرنا مقصود ہے تو یتیم پوتے کو حصہ دلوا کر بھی کون سا تیر مار لیا جائے گا؟

اس قانونِ وراثت سے جو آخری رجحان پیدا کرنا مقصود ہے وہ فقط یتیم پوتے کی وراثت نہیں بلکہ وہ فرمانِ مصطفوی ہے جو لا نرث ولا نورث کے بعد ہی موجود ہے اور وہ ہے ماترکنا صدقۃ۔ ہم جو کچھ چھوڑیں وہ اسٹیٹ کا ہے، کارِ خیر کیلئے ہے جس کا حقدار ہر ضرورتمند ہے۔ بغیر سارے معاشرۂ انسانی کو اسی مقام پر لانا چاہتا ہے جہاں رزق کے سارے سرچشمے مشترک ملکیت بن جائیں اور وہ سواءً للسائلین (تمام ضرورتمندوں کیلئے یکساں) ہوں۔ یہ فرمانِ رسول عین منشائے قرآنی کے مطابق ہے اور یہ ان آخرکار وراثت کے تمام عبوری قوانین اس طرح گم ہو جاتے ہیں جس طرح سمندر میں ٹپکنے والے قطرے۔

سچ پوچھئے تو اس طرح کے تمام عبوری قوانین پست انسانوں کے لئے ہوتے ہیں[1] انھیں بھی بہرحال ساتھ لے کر چلنا ہے لیکن انھیں ساتھ لیکر چلنے کے معنی یہ نہیں کہ ان کو انہی عبوری دور کے زینوں ہی الجھا کر رکھ دیا جائے۔ غرض اصلی یہ ہے کہ اس سطح سے نکال کر دوسری بلند تر سطح پر لایا جائے جو اسی کا دوسرا ارتقائی زینہ ہے۔ بیارتقاء ایک مسلسل اور غیر منقطع عمل ہے اور اس سے قرآن کی ابدیت خطرے میں نہیں پڑتی بلکہ منشائے قرآنی پورا ہی اس سے ہوتا ہے۔ کیا عجب کہ "نسخ آیات" کا یہی مطلب ہو۔ انسان جب نیچی سطح سے بلند سطح کی طرف جاتا ہے تو پہلی سطح قدرۃً اس کیلئے منسوخ ہو جاتی ہے[2] پہلی سطح کے مختلف انداز اس کیلئے "مثلھا" ہوتے ہیں اور دوسری سطح خیر منھا۔ پست انسانوں کیلئے عبوری قوانین بھی اسی وحی نے دیئے ہیں اور بلندی کی طرف جانے والوں کیلئے ارفع اقدار بھی اسی نے بخشے ہیں قرآن میں یہ دونوں ہی موجود ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ایک کتاب ہے اور دوسری ام الکتاب۔ صرف کتاب میں الجھے رہنا کافی نہیں۔ ام الکتاب کی طرف بھی صعود کرتے رہنا چاہئے۔

ہماری اس گفتگو کو وہ لوگ خصوصاً ناپسند کریں گے جو فقہی جزئیات تک کو ابدی اور غیر متبدل اقدار مان چکے ہیں لیکن ہمیں ان سے الجھنا نہیں۔ فطرت کا نہ رک سکنے والا ارتقا آخر کار ان کو وہیں لے آئیگا جہاں قرآن لانا چاہتا ہے اور اس نوع کے نسخ آیات سے کسی کو مفر نہیں۔

استدراک فاضل مقالہ نگار نے اپنے مضمون میں جس مرکزی خیال کو پیش کیا ہے، قارئین طلوعِ اسلام کیلئے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ان کے سامنے یہ چیزیں ایک عرصہ سے آرہی ہیں۔ مثلاً مارچ ۱۹۵۰ء کے طلوعِ اسلام میں اس موضوع پر گفتگو کرنے کے بعد کہ اسلام کے نظامِ ربوبیت میں ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ جب قرآن کریم میں وصیت کا حکم اور تقسیم وراثت تک کا قانون موجود ہے تو پھر کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ قرآنی نظامِ اجتماعیہ میں ذاتی ملکیت کا تصور نہیں۔" اس کے جواب میں یہ

---

[1] یوں کہنا بہتر ہوگا کہ "جب معاشرہ ہنوز قرآن کی آخری منزل تک نہ پہنچا ہو۔" [2] استدراک ملاحظہ فرمائیے۔ (طلوعِ اسلام)

لکھا گیا تھا کہ "قرآن ان حالات کو بھی سامنے رکھتا ہے جن میں ہنوز نظام اجتماعیہ اپنی مکمل شکل میں قائم نہ ہوا ہو ..... وصیت و میراث کے احکام اسی عبوری دور سے متعلق ہیں۔" (طلوع اسلام بابت مارچ سنہ ۱۹۵۰ء ص ۱۵-۱۴)

حقیقت یہ ہے کہ (اور اس کا اظہار بطور تحدیث نعمت کیا جاتا ہے کہ) یہ آواز اٹھی ہی طلوع اسلام کی طرف سے ہے کہ قرآن میں ذاتی ملکیت کا تصور نہیں اور نظام قرآنی کا مقصود تمام نوع انسانی کی ربوبیت ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ اس آواز کو طلوع اسلام نے اٹھایا ہے بلکہ یہ بھی کہ شاید یہ آواز قرون اولیٰ کے بعد مسلمانوں میں اٹھائی ہی پہلی مرتبہ گئی ہے۔ حالانکہ جس قرآن سے اس تصور کو لیا گیا ہے وہ مسلسل ہمارے ساتھ رہا ہے۔ طلوع اسلام اپنی اس سعادت پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ اندریں حالات یہ کہنا صحیح نہیں کہ طلوع اسلام نے وراثت کے احکام کی بحث کی لیکن یہ نہ بتایا کہ یہ احکام عبوری دور سے متعلق ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ فاضل مقالہ نگار اگر زیادہ نہیں تو کم از کم مارچ سنہ ۱۹۵۰ء کا پرچہ ہی دیکھ لیتے تو وہ اسے یہ طعن نہ دیتے کہ باایں ہمہ روشن خیالی اس میں بھی وہی جمود پیدا ہو گیا ہے اور یہ کہ متقدم تصورات بین السطور میں سے جھلکتے ہیں لیکن برملا سامنے نہیں آتے۔

(۲) مقالہ زیر نظر سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ محترم مقالہ نگار کا خیال ہے کہ چونکہ عبوری دور کے احکام محض عبوری دور کے احکام ہیں اسلئے ان کے متعلق کچھ بحث و تحقیق کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال بھی درست نہیں۔ عبوری دور میں یہی احکام قرآنی احکام ہونگے اور اسوقت ان کی ویسی ہی اہمیت ہوگی جیسے قرآن کے دیگر احکام کی۔ اس دور میں بھی یہ ضرورت ہوگی کہ امت کو یہ بتایا جائے کہ اس دور میں قرآن انہیں کیا راہنمائی دیتا ہے۔ یہ بات ایک مثال سے زیادہ واضح ہو سکیگی۔ قرآن میں وضو کا حکم ہے اور جب پانی نہ ملے تو تیمم ہے۔ لہذا تیمم کا حکم نہایت مختصر سے عرصہ کیلئے عبوری دور کا حکم ہے لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ ہمیں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ قرآن کی رو سے تیمم کا صحیح منشا کیا ہے اور اسکی صورت کیا۔ جب اب چھوٹا سا عبوری دور کا حکم بھی اپنے مقام پر اپنی اہمیت رکھتا ہے تو پھر وراثت جیسے احکام عبوری دور میں کیوں اہمیت نہیں رکھیں گے؟ آج ہماری صورت یہ ہے کہ قرآن کی آخری منزل تو ایک طرف ہم ہنوز عبوری دور میں بھی نہیں پہنچے۔ عملی طور پر ہم نے اپنے سفر کیلئے پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا۔ طلوع اسلام، ملت اسلامیہ کو اس آخری منزل کی نشاندہی بھی کرتا جاتا ہے جہاں قرآن کاروان انسانیت کو لیجانا چاہتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ عبوری دور کے قرآنی احکام سے بھی امت کو غافل نہیں رکھنا چاہتا۔ اس قسم کے احکام کی جو بحثیں آپ کو طلوع اسلام میں نظر آتی ہیں اس کی وجہ یہی ہے۔

(۳) فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ جب قرآن کی آخری منزل آجائیگی تو عبوری دور سے متعلق آیات منسوخ ہو جائیں گی۔ اس مقصد کیلئے "منسوخ" کا لفظ اچھا نہیں ہے۔ یہ آیات اس وقت بھی منسوخ نہیں ہونگی ساقط العمل (SUSPEND) ہوں گی جس طرح پانی مل جانے کی صورت میں تیمم کا حکم منسوخ نہیں ہوتا، ساقط العمل ہوتا ہے یعنی جب تک پانی موجود نہ تھا تیمم کا حکم پیچھے ہٹ گیا تھا اور وضو کا حکم آگے بڑھ آیا تھا۔ جب پانی نہ رہا تو وضو کا حکم پیچھے ہٹ گیا اور تیمم کا حکم آگے بڑھ آیا۔ اسی طرح جب قرآن کا نظام ربوبیت قائم ہو جائیگا تو وصیت، وراثت، قرض، بیع و شرا، وغیرہ کے احکام پیچھے ہٹ جائیں گے۔ اگر یہ نظام پھر بگڑ گیا (جیسے کہ قرون اولیٰ کے بعد ہوا) تو یہ احکام پھر نافذ العمل ہو جائیں گے۔ اور اگر وہ معاشرہ ہمیشہ کیلئے قائم ہو گیا تو پھر ان عبوری دور کے احکام کے آگے بڑھنے کی نوبت نہیں آئیگی۔ ان تمام امور کی تشریح آپ کو محترم پرویز صاحب کی تصنیف "نظام ربوبیت" میں ملے گی جو ایک عرصہ سے اشاعت کیلئے تیار رکھی ہے لیکن گوناگوں موانع کے باعث ابھی تک شائع نہیں ہو سکی جس کا ہمیں بجد رنج ہے۔ توقع ہے کہ اب یہ عنقریب ہی شائع ہو جائے گی۔

(طلوع اسلام)

غذا اور سائنس

(جناب محمد احسن جابلی صاحب ایم۔ اے، ایل ایل بی)

انسان دنیا میں آتا ہے تو اس کی تمام زندگی کا انحصار اس غذا پر ہے جو کسی نہ کسی شکل میں بالواسطہ یا بلاواسطہ زمین سے حاصل کی جاتی ہے۔ انسان کی آبادی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا زمین میں اتنی استعداد ہے کہ وہ اسقدر بڑھنے والی آبادی کا پیٹ بھر سکے۔ یہ سوال تھا جسے سب سے پہلے منظم طور پر اٹھارھویں صدی کے انگلستانی ماہر اقتصادیات پادری مالتھوس (MALTHUS) نے موزوں طور پر اٹھایا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر انسان کی آبادی اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو وہ دن دور نہیں جب یہ فقط فاقوں ہی سے مرجائے گی۔ اس نے اس نظریہ کو اپنی کتاب (THE ESSAY ON POPULATION) میں واضح کیا۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۷۹۸ء میں شائع ہوا۔ اس نظریہ نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا اور اس سے جو نتائج انسانوں کے لئے پیدا ہوئے انکا موجب بن گئے۔ یہ نظریہ اسوقت سے آجتک ماہرین اقتصادیات کے نزدیک بحث و تمحیص کا مرکز بنا ہوا ہے۔

خطرہ سے مدافعت کی ایک صورت یہ سوچی گئی کہ انسانی بچوں کی پیدائش کی روک تھام کی جائے۔ اسے برتھ کنٹرول یا ضبط تولید کہتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرا ایک خیال ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ انسانی آبادی کو کم کرنے کے بجائے زمین سے زیادہ سے زیادہ خوراک حاصل کرنے کے وسائل کیوں نہ اختیار کئے جائیں۔ زیر نظر مضمون میں جسے ہم دہلی سے شائع ہونے والے رسالہ ''[illegible]'' کی جون ۱۹۵۲ء کی اشاعت سے اخذ کر رہے ہیں یہ بتایا گیا ہے کہ ہمارے دور میں اس قسم کے سائنٹفک وسائل اختیار کئے جا رہے ہیں جن سے خوراک کی مقدار بہت بڑھ گئی ہے اور اگر یہ وسائل اسی طرح آگے بڑھتے گئے تو انسان کیلئے بھوک سے مرجانے کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ اس مضمون کو ہم اس مقصد کے پیش نظر شائع کر رہے ہیں کہ یہ بتایا جائے کہ جو قومیں فطرت کے خزائن و عجائب کی جستجو میں سائنٹفک طریق سے مصروف جد و جہد ہیں، فطرت انھیں کس طرح مالامال کر رہی ہے۔ ان قوموں کا عمل قرآن کی تعلیم کے مطابق ہے جس نے بار بار اس حقیقت کو دہرایا ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے انسان کیلئے قوانین کی زنجیروں میں باندھ دیا گیا ہے۔ لہذا جو قوم بھی اس قانون سے واقفیت حاصل کر کے تسخیر فطرت میں مصروف ہو جائے گی فطرت کے خزانے اس کے سامنے کھل جائیں گے۔ خدا کی ربوبیت عامہ اپنے عطایا کے دروازے کسی پر بند نہیں کرتی۔ جو انہیں حاصل کرنا چاہے اسے وہ دے دیتی ہے۔ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا (۱۷/۲۱) البتہ جس مقام پر جا کر فرق پڑ جاتا ہے وہ فطرت سے حاصل شدہ رزق کی تقسیم کا سوال ہے۔ قرآن اس رزق کو تمام نوع انسانی کی پرورش کے لئے کھلا رکھنا چاہتا ہے۔

واضح رہے کہ برتھ کنٹرول کا مسئلہ اتنی سی بات سے حل نہیں ہو جاتا کہ ہم محنت کر کے زیادہ خوراک زیادہ حاصل کر سکیں۔ اس کے اور بھی کئی گوشے ہیں۔ مثلاً عورتوں اور بچوں کی صحت کا سوال، بچوں کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ، دوسری طرف جنسی تعلقات کا نازک مسئلہ، اور اس کے نفسیاتی اثرات۔ ہمارے پاس اس موضوع پر بہت سے استفسارات آرہے ہیں لیکن جب تک ہم ان تمام گوشوں کے متعلق پوری پوری معلومات بہم نہ پہنچا لیں ہم اس اہم سوال پر قلم نہیں اٹھانا چاہتے۔ یوں کہنے کو تو بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

طلوع اسلام

دنیا کی آبادی اوسطاً [illegible] فی سال، یا ساٹھ ہزار فی دن کی رفتار سے بڑھ رہی ہے اور یہ مسئلہ کہ دنیا کی غذائی [illegible] کے لئے کافی ہے [illegible] باہم بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے غذائی [illegible] بڑھانے کی صلاحیت [illegible] [illegible] حصہ لینے والا [illegible] MALTHUS [illegible] کا یہ خیال [illegible] سے زیادہ ہے [illegible] اگر اس بڑھتی ہوئی آبادی کا معقول انسداد [illegible] آبادی کا [illegible] خیال ہے کہ دنیا کی غذائی پیداوار اس رفتار سے نہیں بڑھائی جا سکتی جس رفتار سے بڑھتی ہوئی آبادی [illegible] بحران کا حل صرف یہ ہے کہ آبادی کی سرفزائش روک دی جائے [illegible] گذار سکیں۔ اس کے برعکس دوسرے فریق [illegible] کا یہ [illegible] کی مدد سے انسان میں تسخیر فطرت کی صلاحیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ دنیا نہ صرف موجودہ آبادی کا پیٹ بھر سکتی ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے غذا کی بہتات کا انتظام بھی [illegible] ہے۔

پروفیسر ڈڈلے سٹمپ (PROF DUDLEY S[illegible]) نے ایک مضمون میں جو (RURAL INDIA) میں شائع ہوا ہے لکھتے ہیں "سائنس کی مدد سے اب ہم جہاں گھاس کی ایک پتی اگتی تھی وہاں دو اگا سکتے ہیں، یہ پیداوار حاصل کرنا [illegible] کیڑوں اور نباتاتی امراض پر قابو پانا، فصل پکنے سے قبل اس کو مختلف جڑیوں، چوہوں اور جوؤں سے بچانا اور زراعت کے جانوروں کو مختلف امراض سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ مگر سوء سائنس نسل انسانی کی [illegible] ساتھ نہیں دے رہی ہے۔"

یہ ہے سائنس کے کرشموں کا اعتراف جو ایک عظیم ہستی نے اس بات کے متعلق کیا ہے جس کے لئے ہمارے [illegible] کہہ سکتے تھے۔ مگر اس فقرہ کے آخری جملہ سے ایک قسم کی تنوطیت اور مستقبل کے متعلق ایک خوف کا اظہار ہوتا ہے [illegible] کہاں تک درست ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے حاصل کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ ہم زراعت کے میدان میں سائنس کے [illegible] تمامی بلکہ سائنس آئندہ کیا کر سکتی ہے اس کا بھی اندازہ لگائیں ہمیں مختلف ترقی یافتہ ممالک کی [illegible] ان سے مستقبل کے متعلق کیا کیا پیشین گوئیاں ہو سکتی ہیں۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں کہ مختلف ممالک میں زراعت کے [illegible] چاہیے ہم اس کی مکمل فہرست بنائیں بلکہ چند اصولوں پر اور مستقبل کے امکانات پر ہی سرسری غور کر لینا کافی ہے۔

چنانچہ مملکت روس میں نظریہ مالتھوز (MALTHUSIAN THEORY) کو پہلی مرتبہ غلط ثابت کیا گیا ہے اور روس [illegible]

لوگ حصول چکے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں جہاں شرح پیدائش تمام دیگر ممالک سے زیادہ ہے غذا کی پیداوار اس سے بھی کہیں زائد ہے۔ اس ملک میں لوگ مستقبل سے خوفزدہ نہیں ہیں لہٰذا وہ بجائے بڑھتی ہوئی پیدائش کی رفتار کو روکنے کے ماؤں کی ہمت افزائی کی جاتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کریں چنانچہ ایک مقررہ تعداد تک کسی ماں کے اگر بچے پیدا ہو جائیں تو اسے مدر ہیروئن (MOTHER HEROINE) کا خطاب ملتا ہے علاوہ ازیں حکومت کی طرف سے بچوں کی تعداد کے مطابق ان کی امداد بھی کی جاتی ہے۔

روس میں اناج کی پیداوار ۱۹۱۳ء میں چھ کروڑ پچاس لاکھ ٹن تھی اور آج وہی پیداوار تقریباً گیارہ کروڑ پچاس لاکھ ٹن ہے اور یہ حقیقت سب پر عیاں ہے کہ روس نہ صرف اپنی کل آبادی کا پیٹ بھرتا ہے بلکہ دیگر ممالک کو بھی اناج فروخت کرتا ہے۔

یہ سب کچھ حاصل ہوا ہے جدید سائنس کی مدد سے نئی سائنس۔ اس سائنس کا موجد (I. V. MICHURIN) جو روس کا سائنسدان ہے کہتا ہے کہ ہم قدرت کی طرفداری کا انتظار نہیں کر سکتے۔ ہمارا کام ہے کہ اپنی ضرورت کے مطابق توڑ لانا ہے۔ یہی وہ ذہنی کیفیت ہے جس سے تجربہ ... دنیا کے سامنے ... پیش کر دیا۔ (N. PLAVILSCHIKOV) نے اپنے مضمون OUTSTANDING DISCOVERIES OF AGRICULTURAL SCIENCE IN RUSSIA میں جو کہ ماسکو کے ایک رسالے "AGRICULTURAL ECONOMICS" میں شائع ہوا تھا لکھا ہے "روس کی زرعی سائنس جس نے پیداوار کے بڑھانے میں وہ مدد کی جو کبھی نہ سنی گئی تھی۔ دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ سائنس ہے۔ ... روس کے کسان اور سائنسدان قدرت کی طرفداری کا انتظار نہیں کرتے اور نہ وہ ان کی خیرات پر بسر کرتے ہیں بلکہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں قدرت سے لے لیتے ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ قدرت سے مانگتے ہیں اور اسے اپنا سب کچھ دیدینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ سرزمین روس میں قدرت کو دیکھا جاتا ہے اور ضرورت کے مطابق اس میں تبدیلیاں بھی کی جاتی ہیں۔" وہاں قدرت میں اس قدر تبدیلیاں کی گئی ہیں کہ نئے نئے قسم کے پودے اور نئے نئے قسم کے جانور جو نہ کبھی دیکھے نہ سنے گئے تھے وہاں پیدا کئے جاتے ہیں یہ سب اسی وقت ممکن ہوا جب روسیوں نے میچورین اور لائسنکو (MICHURIN & LYSENKO) کے نظریات کو عملی جامہ پہنایا۔ انھوں نے سکھایا تھا کہ "انسان نئے پودے اور نئے جانور پیدا کر سکتا ہے اور اسے پیدا کرنے بھی چاہئیں بلکہ ان سے بھی بہتر جو قدرت نے پیدا کئے ہیں۔" آج کل سائنسدانوں کی ایک بڑی تعداد پر اس سے زندہ پلانٹ فیکٹریوں (PLANT FACTORIES) میں انہی نامور سائنس کے نظریات پر تحقیقات کرنے میں مشغول ہے اور انھیں عملی جامہ پہنا رہی ہے۔ ان کی تحقیقات کی مدد سے آج روسی لوگ سنٹنرس (SENTNERS) فی ہیکٹر (HECTORE) گندم پیدا کر رہے ہیں۔ اس سے قبل گندم کی اتنی اچھی فصل کہیں پیدا نہیں کی گئی تھی۔ پہلے اکثر فصلیں کہرے اور تمازت آفتاب سے خراب ہو جاتی تھیں اور قدرت کے ان مصائب کا مقابلہ نہ کر پاتی تھیں مگر اب کچھ ایسی بھی فصلیں وہاں ہوتی ہیں جو ان چیزوں کا مقابلہ کرتی ہیں مثلاً روسیوں نے ایک قسم کا گیہوں ایجاد کیا ہے جو گندم اور ایک گھاس کی ملاوٹ سے پیدا کیا گیا ہے جس کی فصلیں پہلی مرتبہ بونے کے بعد مسلسل تین سال تک ہوتی رہتی ہیں یا وہاں ... کی ایک بیل ہوتی ہے جس کی شاخیں اور پتیاں زمین پر پھیلتی ہیں اور ان کو برف کی ایک موٹی تہ ڈھانک لیتی ہے اور اس طرح وہ موسم سرما کے اثرات سے محفوظ رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی ایجادات ہیں مثلاً نئی نئی اقسام کے گلاب اور دیگر پھولوں کے پودے نئی نئی اقسام کے ربڑ کے درخت اور رنگین روئی (COLOURED COTTON) علاوہ ازیں کچھ نئی اقسام کے جانور بھی پیدا کئے ہیں

جو مختلف مقامات اور مختلف آب و ہوا میں کار آمد ہیں۔ گایوں سے وہ لوگ ۱۶۲۶۲ لیٹرس (LETRES) دودھ نکال لیتے ہیں۔

بایں ہمہ جو کچھ اہل روس نے اب تک کیا وہ ان کے شاندار مستقبل کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ حال ہی میں حکومتِ روس نے ایک نئی اسکیم نیچر پر مزید قابو حاصل کرنے کے لئے پیش کی ہے۔ اس اسکیم میں قطع نظر کئی دیگر چیزوں کے پانچ آبپاشی کے ذرائع کی تعمیر ہے۔ ان پر برابر کام ہو رہا ہے اور ان سے بہت کچھ فائدہ بھی اٹھایا جا چکا ہے۔ ان عظیم تعمیرات کا ذکر ڈاکٹر ایس۔ ایم مینٹن (S. M. MENTON) (برطانیہ کے بین الاقوامی شہرت یافتہ سائنسداں) نے روس کی سیاحت کے بعد کیا ہے۔ آیئے ہم بھی ان پر ایک نظر دوڑالیں۔

۱۔ ان میں سے ایک والگا ڈان کینال ہے (VOLGA DON CANAL) جس کی تکمیل جولائی ۱۹۵۲ء میں ہوئی ہے اور جس نے ماسکو کو "پانچ سمندروں کا ساحل" بنا دیا ہے۔ یہ ترسٹھ (۶۳) میل لمبی نہر جس میں کہ ۱۳ جہاز رانی کے باندھ، کئی زبردست ڈام (DAM) گھاٹ اور (TSIMLYANSKAYA) بجلی کا اسٹیشن (جو کہ ۱۲۵ میل لمبی اور ۲۵ میل چوڑی ایک مصنوعی جھیل پر واقع ہے) کل تین سال کے قلیل عرصہ میں مکمل ہوئی تھی۔ اگرچہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ساؤری (MISSOURI) پر واقع فورٹ پیکس ڈام (FORT PECK DAM) دنیا کا سب سے بڑا ڈام تصور کیا جاتا تھا مگر (TSIMLYANSKAYA) پر واقع ڈام اس سے دگنا بڑا ہے۔

۲۔ مین ترکمانین کینال (MAIN TURKMANIAN) جو کہ ۶۳۰ میل لمبی ہوگی زیر تعمیر ہے اور یہ ۱۹۵۷ء تک مکمل ہو جائے گی۔ وسط ایشیا میں جمہوریت ترکمانی ۸۰ فیصدی صحرائے کارا کم (جو کہ دنیا کے سب سے بڑے ریگستانوں میں سے ہے) سے گھرا ہوا ہے۔ اس خطے کی آب و ہوا گرم ہے اور وہاں پانی کی بہت قلت ہے لہٰذا بہت غیر آباد بھی ہے۔ صحرائے کارا کم کے درمیان سے نہر نکالتے ہیں وہاں کاشت کرنے کی صورت پیدا ہو سکے گی۔ اس نہر میں دریائے امو (AMU) کا پانی آئے گا۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی نہر ہوگی اور امید کی جاتی ہے کہ وہ اس ریگستانی علاقہ کو زرخیز بنا دے گی۔ صحرائے کارا کم کے تقریباً ۷ لاکھ ہکٹر (HECTORS) حصہ کو آبپاشی چراگاہ بنانے کے لئے کی جائے گی اور ۵ لاکھ ہکٹر روئی کی پیداوار کے لئے۔ اس اسکیم کے ماتحت مستقبل قریب میں چھوٹی چھوٹی دیگر نہروں ڈام اور بجلی کے اسٹیشنوں کا ایک جال ہو جائے گا جو کہ اس عظیم ریگستان کو کاشتکاری کے لائق اور ایک اچھی چراگاہ بنا دے گا۔

(۳ و ۴) ان دو اسکیموں کے ذریعہ روسی دو زبردست بجلی کے اسٹیشن جن کے نام (KUIBYSHEV اور STALINGRAD اسٹیشن ہوں گے) تعمیر کئے جائیں گے۔ یہ دونوں اسٹیشن امریکہ کے گرانڈ کاؤلی (GRAND COULEE) (جو کہ موجودہ زمانے کا سب سے بڑا بجلی کا اسٹیشن ہے) سے کہیں بڑے ہوں گے۔ ان میں سے ایک ۱۹۵۵ء اور دوسرا ۱۹۵۶ء تک تیار ہو جائے گا۔ یہ دو کروڑ K.W.H بجلی پیدا کریں گے اور ۴۰ لاکھ ہکٹر زمین کی آبپاشی کریں گے۔

(۵) پانچویں اسکیم، کریمیا کی نہروں کا ایک جال ہے جو تقریباً پچاس میل کی ہیں اور یہ نہریں ۳۳ لاکھ ہکٹر زمین کی آبپاشی کریں گی۔

یہ تمام بجلی کے اسٹیشن اندازاً بائیس ہزار K.W.H سالانہ بجلی پیدا کریں گے۔ اتنی بجلی ڈنمارک، فن لینڈ، ہالینڈ، بلجیم اور سپین کے تمام اسٹیشن ملکر پیدا کرتے ہیں۔ ان نئی تعمیرات سے جتنی آبپاشی ہو سکے گی اس کے متعلق ڈاکٹر مینٹن (DR. MENTON) کہتے ہیں

روس میں ۲۰۰ لاکھ ایکڑ زمین کی آبپاشی کی جائے گی جو کہ وادیٔ نیل کی آبپاشی شدہ خطہ سے نوگنا زائد ہے۔ یہ خطہ ۱۰ کروڑ انسانوں کیلئے کافی غذا پیدا کرے گا۔ کناڈا سے زیادہ گیہوں اور مصر و پاکستان سے زیادہ روئی یہاں پیدا ہو گی"۔ اس خطہ کے کچھ حصوں میں گیہوں کی دو دو فصلیں ہر سال ہوا کریں گی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک اور اسکیم زیرِ غور ہے جس کے ذریعہ دریائے اوب (OB) اور دریائے ینسی (YENISIE) کے پانی کا رخ جنوب کی طرف موڑ دیا جائے گا۔ یہ پانی ۲۵۰۰ میل تک سفر کر کے وسط ایشیا کے ریگستان کو زرخیز خطوں میں تبدیل کر دے گا۔ ڈاکٹر ہنتش کہتے ہیں " یہ ۲۶۰ لاکھ ایکڑ زمین کو کاشت کے لائق بنا سکے گا اور ۸۷۰ لاکھ ایکڑ زمین چراگاہوں کے لئے۔ . . . . وسط ایشیا کے ممالک بجائے دو کروڑ کے اب بارہ کروڑ انسانوں کے لئے غذا پیدا کریں گے"۔

ان تمام حالات سے ہم کیا نتیجہ نکال سکتے ہیں؟ یہی کہ مملکت روس پانچ دس سال کے اندر زائد بیس[۲] کروڑ انسانوں کے لئے غذا پیدا کرنے کا انتظام کر رہی ہے۔ وریہی کہ روس کل دنیا کی ایک رقبہ میں بڑھنے والی آبادی یعنی بیس کروڑ انسانوں کو غذا مہیا کر سکے گا۔ ان امید افزا حالات کے ہوتے ہوئے ایک قنوطی ہی مستقبل سے خوف زدہ ہو سکتا ہے۔

ایک وہ بھی زمانہ تھا جب پچاس میل لمبی نہر بنانا ۲۵ سال میں تیار ہوتی تھی اور روس میں اب ۶۳ میل لمبی والگا ڈان نہر مع ۱۲۵ میل لمبی اور ۲۵ میل چوڑی مصنوعی جھیل کے صرف تین سال کے اندر تیار ہو گئی اور ۶۳۰ میل لمبی ترکمانین نہر سات سال کے اندر تیار ہو جائے گی۔ یہ ہیں موجودہ سائنس کے کرشمے۔ بغیر موجودہ سائنس کی امداد کے اتنے قلیل عرصہ میں اتنی بڑی تعمیرات کی تکمیل سوچی بھی نہیں جا سکتی تھی سائنس کی مدد سے۔ روس نے اتنی زبردست زمین کھودنے والی مشین بنائی ہے جو سات ہزار سے دس ہزار مزدوروں کا کام دیتی ہے اور (SUCTION DRUDGE) اتنا کام کرتا ہے جتنا ۲۵ ہزار آدمی یا ۱۵ ہزار گھوڑے کر سکتے ہیں۔ انہی مشینوں کے ذریعہ روس والوں نے بجلی پیدا کی ہے تاکہ انسان کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔

روس کے موجودہ پنج سالہ پلان (۱۹۵۰ – ۱۹۵۵) کے مطابق ۱۹۵۵ء میں ۱۹۵۰ء کے مقابلہ پر کل غلہ کی پیداوار ۴۰ سے ۵۰ فیصدی گوشت کی ۸۰ سے ۹۰ فیصدی، دودھ کی ۴۵ سے ۵۰ فیصدی مچھلی کی ۵۸ فی صدی مکھن کی ۷۲ فیصدی اور انڈے کی ۱۰۰ فیصدی بڑھ جائے گی۔ اور اس پانچ سال کے عرصہ میں قومی آمدنی ۶۰ فیصدی بڑھ جائے گی۔ سوچئے کہ اس رفتار سے موجودہ زمانے میں پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے ان حالات کو دیکھتے ہوئے مالتھوز کا نظریہ اب بے کار معلوم ہوتا ہے۔ یہ حالات اس نظریہ کو جھٹلانے اور غلط ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ اس کو بالکل بھلا دیا جائے۔ سائنس نے دکھا دیا ہے کہ انسان نیچر کا غلام نہیں بلکہ آقا ہے۔

چین چند سال قبل قحط سالی کے لئے مشہور تھا اور ہزاروں انسان ہر سال بھوک کا شکار ہو جاتے تھے۔ اس ملک کو بہت سا غلہ درآمد کرنا پڑتا تھا۔ ہر سال سیلاب اور قحط اس پابندی سے آتے تھے کہ انہیں چین کے لئے ایک فطری اور عام چیز سمجھا جانے لگا تھا مگر ۱۹۴۹ء میں نئی حکومت کے قیام کے تین سال کے اندر ہی اندر وہاں کے حالات بالکل بدل گئے اور نئے چین میں غذا کی کمی کا کوئی سوال نہیں رہا۔ آج چین نہ صرف اپنی کافی بڑی آبادی کو غذا مہیا کرتا ہے بلکہ دیگر ممالک کو بھی بھیجتا ہے۔ بالفرض ہم ۱۹۴۹ء کی

پیداوار کو ۱۰۰ مان لیں تو اس مناسبت سے ۱۹۵۱ء میں پیداوار ۱۲۸ ہوگئی تھی اور ۱۹۵۲ء میں ۱۴۰۔ اس طرح تین سال میں پیداوار ۴۰ فیصدی بڑھی۔ ۱۸۷۷ء کے بعد ۱۹۵۱ء میں یہ پہلا موقع تھا کہ چین کا توازنِ تجارت ملک کے حق میں رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چین میں غلہ کی درآمد کی بجائے برآمد ہونے لگی۔ وہاں کی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۴۹ء میں ایک ہزار لاکھ مو (مو ۱/۶ ایکڑ کی برابر ہوتا ہے) زمین سیلاب کے ہاتھوں تباہ ہوگئی تھی مگر ۱۹۵۲ء میں کل ۱۰ لاکھ مو ہی زمین تباہ ہوسکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۵۰ء و ۱۹۵۱ء میں تقریباً ۲۰۰ ہزار کیلومیٹر لمبے ڈیم تعمیر کئے گئے۔ چین کے قونصل جنرل یاؤ چنگ کیانگ نے پچھلے سال کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ہوائی اور ہنگ کا دریاؤں کے پروجیکٹس (PROJECTS) کی تکمیل نہایت شاندار کارنامہ ہے۔" انھوں نے بتایا کہ اب تک کل ارضی کام ۱۷ لاکھ کیوبک میٹر ہوا ہے اور یہ کام دس نہر پاناما اور ۲۰ نہر سوئیز بنانے کے سلسلے میں جس قدر ارضی کام کی ضرورت ہے اس کے برابر ہے۔ قابل غور ہے یہ رفتار جس سے پرانے غیر ترقی یافتہ چین میں تعمیری کام ہوسکتے ہیں اور غذا کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں پچھلے ۲۰ برس کے اندر غلہ کی پیداوار ۲۷ فی صدی فی ایکڑ بڑھ گئی ہے اور ایک فارم کا مزدور ۴۰ فی صدی زائد پیداوار کرسکتا ہے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ۱۹۵۲ء میں غلہ کا ذخیرہ ۲۵۴۰ لاکھ بشلس (BUSHELS) تھا۔ ۱۹۵۳ء میں ۵۵۰۰ لاکھ تھا اور ۱۹۵۴ء میں ۶۴۰۰ لاکھ ہوجائے گا مگر ریاستہائے متحدہ کے محکمہ زراعت نے اعلان کیا ہے کہ امریکہ میں گیہوں کی پیداوار مانگ سے زائد ہوگئی ہے (OVER PRODUCTION) لہذا کاشتکاروں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ ۱۹۵۳ء میں ۵۵ لاکھ ایکڑ گیہوں کی زمین کم کردیں۔ ہمارے لئے ضرورت کے باوجود اس چیز میں (OVER PRODUCTION) ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

ان حالات سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ریاستہائے متحدہ میں بھی پیداوار بہت بڑھ گئی ہے۔ دراصل اس میں نئی نئی مشینوں اور ترقی یافتہ سائنس کی مدد شامل حال ہے۔ مثلاً نئے نئے آلاتِ زراعت کا استعمال، نئے نئے قسم کے پودوں کی کاشت (جیسے کہ مخلوط اناج) اچھے قسم کے کھاد کا استعمال وغیرہ وغیرہ۔ مخلوط اناج نے پیداوار بڑھانے میں کس طرح مدد کی اس کے بارے میں ٹی جنکنس (T.JENKINS) نے کہا ہے کہ "پہلی جنگِ عظیم کے تین سال کے اندر اندر بلین (BILLION) بشلس غلہ ۳۱۱۰ لاکھ ایکڑ زمین میں پیدا کیا تھا مگر دوسری جنگ عظیم میں تین سال کے اندر ہم نے ۹۱ بلین بشلس غلہ محض ۲۸۱۰ لاکھ ایکڑ زمین میں پیدا کیا۔"

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایٹمی قوت بھی زراعت میں استعمال کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ریاستہائے متحدہ اٹامک انرجی کمیشن کے صدر ڈیوڈ۔ ای لیلنیتھل (DAVID.E. LILUNTHAL) نے ۱۹۴۹ء میں کہا تھا کہ "دو سال سے سائنسداں زراعت کیلئے بھی ایٹمی طاقت کے تحقیقاتی آلات استعمال کررہے ہیں" انھوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ زراعت کے میدان میں ایٹمی قوت کا استعمال کس طرح کیا جاسکتا ہے مختلف تحقیقاتی کام جاری ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں سائنسدانوں کی ایک میٹنگ میں اس پر بحث کرتے ہوئے کہ ایٹمی قوت کا استعمال زرعی پیداوار کے لئے کس طرح کارآمد ہوسکتا ہے انھوں نے کہا

"اب ہم اس قابل ہیں کہ دنیا کے سامنے مادہ اور امراض کی کنجی کھول کر رکھ دیں۔ ایٹمی سائنس کا یہ شاندار کارنامہ بھی ہے کہ
وہ نسلِ انسانی کے سامنے ایک نہایت مشکل مسئلہ کا حل پیش کرتی ہے اور وہ یہ کہ غذائی پیداوار [illegible]

آبادی کے ساتھ چلایا جائے۔

انھوں نے یہ سب ٹھیک کہا مگر جب تک (OVER PRODUCTION) کا مسئلہ حل نہ ہوگا موجودہ سائنس سے صحیح اور پوری مدد نہ لی جاسکے گی۔

کہا جاتا ہے کہ برطانیہ نے بھی جنگ عظیم سے پہلے کی پیداوار کے مقابلہ میں ۴۰ فی صدی زائد پیداوار کر لی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ملک میں اپنی پوری آبادی کے پیٹ بھرنے کے لئے کافی غذا ہے۔ حال ہی میں اگریکلچرل ریسرچ کاؤنسل نے زراعت پر تحقیقات شروع کر دی ہیں۔ بیج کو نائٹرنٹ (NUTRIENT) کے حل میں بھگو کر بونے سے بہت اچھی پیداوار ہوتی ہے۔ OATS پر بھی POTASSIUM کے حل میں بھگو کر تجربہ کیا گیا ہے اور دیکھا گیا ہے کہ سادے بیج بوئے گئے تو فی ایکڑ ۱۷ بشل، پانی میں جذب کئے ہوئے فی ایکڑ ۲۰ بشل اور PHOSPHATES اور PHOSPHATE میں جذب کئے ہوئے ۲۵ بشل پیدا ہوئے۔

ہیری فرگوسن کا خیال ہے کہ کھیتی کے جانوروں کی بجائے اگر مشین استعمال ہوں تو ۵۰ لاکھ ایکڑ زمین میں جو جانوروں کے لئے کاشت ہوتی ہے وہاں انسانوں کیلئے ہونے لگے اور ان کے خیال میں زراعت کو مشینی بنا دینے سے برطانیہ غذا کے سلسلہ میں درآمد سے آزاد ہو سکتا ہے۔

برطانیہ کے ایٹمی سائنسداں ڈاکٹر جان ایچ فرمین (DR JOHN H FRAMLIN) نے (ATOMIC SCIENTIST NEWS) میں لکھا ہے کہ مشرق وسطیٰ میں آبادی غذائی پیداوار سے زائد بڑھ رہی ہے لیکن روس اور مغربی ممالک میں غذائی پیداوار کی رفتار آبادی کی افزائش سے تیز ہے۔ انھوں نے اس پر زور دیا ہے کہ غیر ترقی یافتہ ممالک مثلاً ہندوستان و پاکستان ایٹمی طاقت کا استعمال کریں۔ انھوں نے کہا ہے کہ برطانیہ اور دوسرے مغربی ممالک میں معلومات کا اس قدر ذخیرہ ہے کہ یہ مسئلہ بآسانی حل ہو سکتا ہے۔ تعلیم یافتہ اور صنعتی ہندوستان کو موجودہ آبادی سے دگنی آبادی کو بھی غذا مہیا کرنے میں کوئی مشکل نہیں پیش آئے گی۔

البانیہ اگرچہ بہت چھوٹا ملک ہے مگر وہاں بھی پنج سالہ پلان (۱۹۵۱-۵۵ء) بنایا ہے جس کے مطابق امید کی جاتی ہے کہ قومی دولت سو فیصدی بڑھ جائے گی۔ ۱۹۵۰ء میں آبپاشی کی جو زمین ۳۹۰۰۰ ہیکٹرس تھی پانچ سال کے اختتام پر ۸۳۰۰۰ ہیکٹرس ہو جائے گی۔ اناج کی پیداوار ۵۰ فی صدی بڑھ جائے گی اور گنے کی پیداوار ۱۶ گنا زائد ہو جائے گی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایک چھوٹا ملک بھی غذا کا مسئلہ حل کر سکتا ہے۔

ہندوستان میں غذا کی کمی چالیس یا پچاس لاکھ ٹن ہے اور خیال ہے کہ اگر غذائی پیداوار دس فی صدی تک بڑھ جائے تو ہندوستان اپنی کل آبادی کو غذا مہیا کر سکتا ہے۔ عام خیال ہے کہ یہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے اور اس کے حصول کی کوششیں جاری ہیں۔ حال ہی میں صوبے کی فصلوں کا ایک مقابلہ ... ہوا تھا۔ اس میں گیہوں کی پیداوار ۵۴ من فی ایکڑ، چاول کی پیداوار ۸۳ من فی ایکڑ اور آلو کی پیداوار ۲۶۰ من فی ایکڑ ہوئی۔ حالانکہ گیہوں کی پیداوار یہاں اوسطاً آٹھ من فی ایکڑ ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ موجودہ حالت میں بھی سائنٹفک پیداوار زیادہ ممکن ہے۔ ... میں آبپاشی کے ذرائع بڑھائے جا رہے ہیں اور زیادہ سے زیادہ زمین میں کاشت کرنے کی کوشش کی جا رہی ... کوشش کی جا رہی ہے کہ ایف۔ اے۔ او (F. A. O) کے ماہرین کی

مدد سے اور سرزمین بھی زیر کاشت کر لی جائے۔ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ بہتر بیج استعمال کرنے سے پیداوار ۱۲ فی صدی بڑھ سکتی ہے اور اگر عمدہ کھاد بھی استعمال کی جائے تو ۲۵ فی صدی بڑھ سکتی ہے۔ زراعت کے ماہرین کا خیال ہے کہ اگر ہندوستان کے آدھے کھیتوں پر بھی نئے آلات کا استعمال کیا جائے تو دس فیصدی غذا کی جو کمی ہے وہ بآسانی پوری ہو جائے۔

غلہ کے علاوہ انسان نے غذا کے دوسرے ذریعوں میں بھی کافی ترقی کی ہے۔ سویڈن کی اطلاع ہے کہ وہاں دو سائنسداں عام خرگوشوں سے ڈھائی گنے بڑے پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ عام طور سے خرگوش وہاں ۵ ½ پونڈ کے ہوتے ہیں مگر سائنس کی مدد سے پیدا کئے ہوئے یہ خرگوش ۱۲ پونڈ کے ہیں، اس تحقیق نے دیگر جانور مثلاً مچھلیاں، مرغیاں، بکریاں وغیرہ وغیرہ بھی عام نسل سے بڑے پیدا کرنے کے دروازے کھول دیئے ہیں۔

ان تمام حقیقتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کافی غذا نہ صرف اپنے لئے پیدا کرنے کے قابل ہے بلکہ وہ ضرورت سے کہیں زیادہ پیدا کر سکتا ہے۔ اگر کسی ملک میں غذا کی کمی ہے تو اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ وہاں کی پیداوار اپنی حد کو پہنچ چکی ہے اور آگے کوئی گنجایش نہیں رہی بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں موجودہ ترقی یافتہ سائنس سے کام نہیں لیا جا رہا ہے۔ قرنوں سے انسان نیچر پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور جتنا وقت گزرتا گیا وہ نیچر پر زیادہ سے زیادہ حاوی ہوتا گیا۔ انتہائی قنوطیت پسند لوگ ہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان میں نیچر پر مزید قابو پانے کی صلاحیت نہیں، انسان دوسرے جانوروں سے اس معنی میں مختلف ہے کہ وہ بجائے دنیا کے مطابق ڈھل جانے کے دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ انسان میں نیچر کو اپنے آگے جھکا لینے کی طاقت ہے جس کے لئے اس کے پاس سب سے بڑا حربہ علم سائنس ہے۔ لہٰذا جب تک ہم ان حقیقتوں سے انکار ہی نہ کریں اس وقت تک ہم مالتھوز کے پیروؤں سے متفق نہیں ہو سکتے۔

حقیقتاً اصل مسئلہ صحیح پیداوار کا نہیں ہے بلکہ (OVER PRODUCTION) کا ہے ہم روز سنتے ہیں۔ امریکہ میں، کیوبا میں شکر اور ہندوستان میں چائے مانگ سے زائد پیدا ہوگئی حالانکہ دوسری طرف دنیا انہی چیزوں کی بھوکی ہے۔ اگر "آزاد دنیا" اس مسئلہ کو حل کرے تو پھر پیداوار بے حد و حساب ہوگی اور جب تک یہ لعنت دور نہ ہوگی موجودہ ترقی یافتہ سائنس کا پورا فائدہ زراعت کے میدان میں نہ اٹھایا جا سکے گا بلکہ اس کے استعمال میں ہمیشہ تکلف سے کام لیا جائے گا۔ (ترجمہ)

نقد و نظر

۱۔ ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام

مذہب (خدا کی طرف سے عطا فرمودہ دین نہیں بلکہ انسانوں کے خود ساختہ مذہب) کا آغاز ذہنِ انسانی کے عہدِ طفولیت کی تاریکیوں میں کچھ اس انداز سے ہوا کہ اس کے نام کے ساتھ ہی رموز و خفایا اور اسرار و باطنیت کی ایک پُر پیچ دنیا آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس نے ہولناک غاروں اور ظلمت انگیز خانقاہوں میں جنم لیا اور جنتر منتر، جادو، تعویذ، درود وظائف، کشف و کرامات "ولایات و مرموزات کی بھول بھلیوں میں سے گذرتا، گُرو سے چیلے، پیر سے مرید، معلم سے متعلم اور آمر سے مامور کے سینے میں "علم لدنی" بن کر آگے بڑھتا چلا آیا۔ (اور آج تک چلا آرہا ہے)۔ اس کے برعکس، خدا کا دین، درخشاں آفتاب کی طرح دنیا میں آیا اور اس نے سارے عالم کو بقعۂ نور بنا دیا۔ نور کا خاصہ ہے کہ وہ خود بھی روشن ہوتا ہے اور ہر شے کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے آتا ہے۔ اسنے آکر اعلان کر دیا کہ دین میں کوئی راز نہیں۔ کوئی اسرار نہیں۔ کوئی پردہ نہیں، کوئی باطنیت نہیں۔ اس نے رسول کو حکم دیا کہ بلغ ما انزل الیک۔ جو کچھ تیری طرف نازل کیا جاتا ہے اسے تمام انسانوں تک پہنچا دے۔ چنانچہ دین کی خصوصیت ہی بلاغ للناس اور بیان للناس قرار دی گئی۔ اس قدر روشن، سادہ، کھلا اور نکھرا، واضح اور ابھرا ہوا دین جس میں نہ کوئی ابہام تھا نہ تاویل۔ نہ ریب تھا نہ تشکیک۔ یہ تھا وہ دین جسے قرآن نے پیش کیا اور جسے محمد رسول اللہ والذین معہ، نے ایک جیتے جاگتے نظام کی شکل میں عملاً نافذ کر کے دکھا دیا۔ لیکن اس پر بہت تھوڑا عرصہ گذرنے پایا تھا کہ یہودیوں کے صومعوں نصرانیوں کی خانقاہوں، اور مجوسیوں کے آتشکدوں سے فوج در فوج سازشی گروہ نکلے اور مسلمانوں کے نقاب میں، ان کے نظام کے اندر داخل ہو گئے اور منوزان راہوں کی گرد بھی چھٹ کر بیٹھنے نہ پائی تھی کہ دنیا کی نگاہوں نے دیکھا کہ خدا کا وہی روشن اور تابناک دین، باطنیت کا طلسم ہوش ربا بن کر گیا۔ اس کی ابتدا شیعیت سے ہوئی جس کی ایک شاخ دنیا میں اسماعیلی مذہب کے نام سے متعارف ہے۔ اس مذہب کی ساری عمارت باطنیت کی بنیادوں پر استوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باہر کی دنیا ان کے اصلی معتقدات اور حقیقی تعلیم سے ناآشنا چلی آرہی ہے۔ باہر کی دنیا تو ایک طرف، خود ان کے اپنے اندر بھی ایک خاص حلقہ کے علاوہ، باقی لوگوں کی رسائی ان کی بنیادی کتابوں تک نہیں ہونے پاتی۔ مسلمانوں کو بالخصوص اور دنیائے علم و تحقیق کو بالعموم، ڈاکٹر زاہد علی صاحب سابق پروفیسر عربی اور وائس پرنسپل، نظام کالج، حیدرآباد (دکن) کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ انھوں نے بڑی جرأت اور حوصلہ سے کام لیکر، ان رموز و اسرار سے پردہ اٹھایا ہے۔ وہ خود اسماعیلی ہیں اور ان کی عمر اپنے مذہب کی کتابوں کی جستجو اور مطالعہ میں گذری ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ان کتابوں کے اصلی اقتباسات درج کر کے، اس مذہب کی تعلیم کو زیرِ نظر کتاب میں درج کر دیا ہے

اور ہر ایک شق کے بعد اپنے تبصرہ میں بتایا ہے کہ وہ تعلیم کس طرح اسلام کے صریحاً خلاف ہے۔ ہم نے اس سے پہلے ان باطنی مذاہب کے متعلق جو کچھ کہیں سے ملا اسے دیکھا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ اس کتاب میں دکھائی دیا ہے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد بھی یہ باور کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ یہ کسی ایسے فرقہ کے معتقدات و تصورات ہو سکتے ہیں جو اپنی نسبت اسلام کی طرف کرتا ہے!! پہلے ہمارا خیال تھا کہ اس کتاب پر تبصرہ کرتے وقت اس کے اقتباسات پیش کرتے جائیں گے تاکہ قارئین خود دیکھ لیں کہ اس مذہب کے پیروؤں کے معتقدات کیا ہیں۔ لیکن کتاب ختم کر لینے کے بعد محسوس ہوا کہ اگر ہم نے اقتباسات دینے شروع کر دیئے تو کم از کم آدھی کتاب نقل کرنی پڑے گی۔ مختصر الفاظ میں سن لیجئے کہ ان کے نزدیک (۱) لا الٰہ الا اللہ کے معنی ہیں لا امام الا امام الزمان۔ (۲) قرآن کی آیت لوکان فیہما آلہۃ الا اللہ لفسدتا میں اللہ سے اشارہ امام کی طرف ہے (۳) ھو الاول والآخر والظاہر والباطن سے مراد عقل اول یا امام الزمان ہیں۔ (۴) عالم الغیب والشہادت سے مقصود مولانا قائم ہیں جو قیامت کے دن ظاہر ہوں گے۔ (۵) سورۂ اخلاص میں آنحضرتؐ اور آپ کے اہل بیت کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ (۶) شرک کے معنی اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرنا نہیں بلکہ ایک امام کی دعوت کے ساتھ کسی دوسرے امام کی دعوت کو ملانا ہے۔ (۷) رسول اللہؐ کی حیثیت ایک مستودع کی ہے اور حضرت علیؓ مستقر۔ (۸) رسول اللہؐ کے بعد یک ساتواں رسول پیدا ہوا تھا جو اس مذہب کا بانی (محمد بن اسماعیل) ہے۔ (۹) انبیاء تمام (مع رسول اللہؐ کے) گنہگار ہیں اور صرف ان کے امام معصوم ہیں۔ (۱۰) حضرت علیؓ رسول اللہؐ کے ساتھ رسالت میں شریک تھے۔ (۱۱) حضرت علیؓ اور دیگر ائمہ کا رتبہ رسول اللہؐ سے چار درجے بڑا ہے۔ (۱۲) اذان میں اشھد ان محمد رسول اللہؐ سے ان کے مذہب کے اول امام محمد بن اسمٰعیل کی رسالت کی شہادت مراد ہے۔ (۱۳) قرآن کریم انجیل وغیرہ کی طرح محرف کتاب ہے (۱۴) شریعت اسلام ۳۳۲ھ میں ان کے امام اول کے ہاتھوں معطل ہو چکی ہے اور اب معطل ہی رہے گی۔ (۱۵) اب مذہب کی بنیاد باطنی شریعت پر ہے جس کے رازدار ان کے ائمہ ہیں۔ (۱۶) قرآنی آیات کے معانی وہ نہیں جو ان کے الفاظ سے سمجھ میں آتے ہیں بلکہ وہ ہیں جو تاویل کی رو سے ان کے ائمہ نے کئے ہیں۔ ان تاویلات کی بڑی عجیب و غریب مثالیں کتاب میں درج کی گئی ہیں۔ (۱۷) امام سے اگر فواحش و منکرات کا بھی ارتکاب ہو جائے تو بھی اس کی امامت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ساری کتاب میں اسی قسم کے معتقدات کی تفاصیل اور ان کی مثالیں درج ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے مذہب کا بانی کون ہے اور ان معتقدات کی سند کیا ہے؟ اس کا اصل بانی ہے، ایرانی نژاد جمون القداح۔ اور اس کی سند، جیسا کہ ظاہر ہے، روایات ہیں۔ ان روایات کے متعلق، ڈاکٹر زاہد علی صاحب کا نظریہ وہی ہے جو طلوع اسلام کا ہے۔ یعنی وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ روایات لوگوں نے خود وضع کیں اور انہیں منسوب کر دیا ان کے ائمہ، حضرت علیؓ اور رسول اللہؐ کی طرف۔ یہی وجہ ہے کہ طلوع اسلام کی طرح، ڈاکٹر صاحب نے بھی ان بزرگوں کی نسبت دامنِ ادب کو ہاتھ سے کہیں نہیں چھوڑا۔ اس کا علاج انھوں نے یہ بتایا ہے کہ ہمارے پاس قرآن کی کسوٹی موجود ہے۔ ہم سب کو اسی ایک مرکز پر جمع ہو جانا چاہئے۔

۱؎ ہم یہ کچھ دل پر جبر کر کے نقل کر رہے ہیں اور فقرے فقرے پر معاذ اللہ کہتے ہوئے اس کا اعلان کرتے ہیں کہ نقلِ کفر کفر نباشد۔

ہم محترم ڈاکٹر زاہد علی صاحب کو اس قابلِ فخر کتاب کی تصنیف اور اکادمی آف اسلامک اسٹڈیز، حیدرآباد (دکن) کو اس کی اشاعت پر در خورِ صد مبارکباد سمجھتے ہیں۔ کتاب کی ضخامت ۶۶۴ صفحات ہے اور ملنے کا پتہ ہے الہدیٰ بک ایجنسی۔ معظم بلڈنگ نظام شاہی روڈ۔ حیدرآباد (دکن) قیمت کتاب پر درج نہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس قسم کی کتابیں جس قیمت پر بھی مل جائیں سستی ہوتی ہیں۔ (مصنف کی دوسری کتاب "تاریخ فاطمیین مصر" ہے جس پر کسی آئندہ اشاعت میں تبصرہ کیا جائے گا۔)

حدیثِ دفاع

نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ ایک ایسے جگمگاتے ہیرے کی طرح ہے جس کے مختلف گوشے ہیں۔ لیکن ہیرے کو جس گوشے سے دیکھئے وہ ہیرا ہوتا ہے۔ میجر جنرل محمد اکبر خاں، ایک سپاہی ہیں جن کی ساری عمر عسکری جہات میں گذری ہے۔ انھوں نے حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ ایک سپاہی کی نگاہ سے کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ وہ ذاتِ اقدس جس نے انسانی زندگی کے تمدنی اور معاشرتی دوائر میں اس قسم کا عدیم النظیر انقلاب برپا کر دیا تھا، اس نے جنگ کے میدان میں ایک بالغ نظر اور کشادہ ظرف سپہ سالار کی حیثیت سے کیا کچھ کر دکھایا تھا۔ انھوں نے سیرتِ طیبہ کے اس گوشے کا نام "حدیثِ دفاع" رکھا ہے جو ۳۳۶ صفحات پر پھیلی ہوئی تصنیف ہے جسے میسرز فیروز سنز (لاہور) نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ کتاب کی قیمت (مجلد) پانچ روپے ہے۔ کتاب بہ ہیئتِ مجموعی اچھی ہے لیکن اس میں بعض باتیں ایسی ہیں جو نگاہِ بصیرت میں کھٹکتی ہیں۔ مثلاً اصحابِ فیل کا مشہور واقعہ بیان کرتے ہوئے جنرل صاحب فرماتے ہیں کہ "آسمان پر ابابیلوں کی فوج نمودار ہوئی جنھوں نے اپنی چونچوں سے اس قدر سنگریزے گرائے کہ ابرہہ کے ہاتھیوں کا لشکر بدحواس ہو کر بھاگ گیا۔" حیرت ہے کہ فوج کا ایک جرنیل بھی قصہ گو واعظوں کی اس داستان کو باور کر لیتا ہے کہ ابابیلوں کی کنکریوں سے ہاتھیوں کا لشکر بدحواس ہو کر بھاگ نکلا تھا؟ ایک مقام پر لکھا ہے کہ "ہمیں اس کا پورا احترام ہے کہ حضرتؐ کی فطری صلاحیتیں اور وہبی طاقتیں غیر معمولی تھیں۔ کسی معمولی انسان سے آپ کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں کی جا سکتی۔ لیکن میدانِ عمل میں آپ نے جو کچھ کیا وہ بہ حیثیت اس انسان ہی کے کیا جو عالمِ اسباب کے قانونِ علت و معلول کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتا۔" یہ بالکل بجا اور درست ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دوسرے مقام پر یہ عبارت بھی ہماری نظر پڑتی ہے کہ "دشمن کے حملہ کو دیکھ کر آپ نے آسمان کی طرف نظر کی اور مٹھی بھر خاک اٹھا کر دشمن کی طرف اڑائی اس کا اثر دیکھ کر آپ نے خدا کا شکر ادا کیا۔" جنرل صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ اس مٹھی بھر خاک کا کیا اثر ہوا تھا۔ نہ ہی یہ کہ یہ چیز سلسلۂ علت و معلول کی کونسی کڑی سے متعلق تھی؟ علاوہ ریں کتاب میں سیرتِ نبی اکرمؐ کے متعلق اس قسم کی روایات بھی درج کر دی گئی ہیں جو عام طور پر ہمارے ہاں مروج ہیں لیکن جو ایک رسول کے قطعاً شایانِ شان نہیں۔ فلہٰذا وضعی اور جھوٹی ہیں۔ مثلاً کعب بن اشرف کے قتل کا واقعہ۔ لیکن اس باب میں ہم مصنف کو معذور سمجھتے ہیں، کیونکہ وہ فوج کے جرنیل ہیں۔ آثار و سیرت کے محقق نہیں۔

کتاب کے نام (حدیثِ دفاع) اور ڈسٹ کور سے قطعاً معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس کا موضوع کیا ہے۔ اگرچہ کتاب کے اندر مختلف نقشے بھی دیئے گئے ہیں جن سے غزواتِ نبویؐ کے مقامات کا تعین ہو جاتا ہے۔

ISLAMIC SOCIAL FRAMEWORK | مصنفہ پروفیسر ریحان شریف صاحب۔ ناشر ORIENTALIA میکلوڈ روڈ۔ لاہور۔ ضخامت ۲۷۱ صفحات۔ قیمت (مجلد) چھ روپے۔

اس تمدنی چوکھٹے میں ان خطوط کو مختصر طور پر نمایاں کیا گیا ہے جن سے (مصنف کے نزدیک) اسلامی معاشرہ کی تصویر مرتب ہوتی ہے۔ ان میں سب سے اہم "اسلامک سوشلزم" کا باب ہے۔ ہم نے اس باب کو سب سے اہم اس لئے قرار دیا ہے کہ کچھ عرصہ سے یہ اصطلاح (اسلامک سوشلزم) بہت عام ہو رہی ہے لیکن ہم باوجود تجسس بسیار آج تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ اس سے مراد کیا ہے۔ آپ کسی سوشلسٹ سے پوچھئے کہ سوشلزم کیا ہے تو وہ اس کے متعلق واضح اور متعین انداز سے بتا دیگا کہ اس سے کیا مراد ہے۔ نیز وہ اس کے متعلق اس لٹریچر کی بھی نشان دہی کر دیگا جس سے اس اجمال کی تفصیل سمجھ میں آجائے۔ لیکن "اسلامک سوشلزم" کہنے والوں میں سے آپ جس سے بات کیجئے اول تو اس کے ذہن میں اس کے متعلق کوئی واضح مفہوم نہیں ہوگا اور پھر جو مفہوم کسی ایک کے ذہن میں ہوگا وہ دوسروں کے مفہوم سے مختلف ہوگا۔ زیر نظر کتاب میں بھی (اس موضوع پر دوسری کتابوں کی طرح) زکوٰۃ کو اسلامک سوشلزم کی اصل و بنیاد بتایا گیا ہے اور اس کے متعلق لکھا ہے کہ اس سے مراد ڈھائی فیصدی انکم ٹیکس ہے۔ اس کے بعد زکوٰۃ کے مصارف کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ کیا معاشرتی تحفظ کی کوئی اور اسکیم اس سے زیادہ جامع ہو سکتی ہے؟ پروفیسر صاحب کو چاہئے تھا کہ وہ ذرا تفصیل سے بتاتے کہ ۲½ فیصدی انکم ٹیکس کس طرح معاشرتی تحفظ کی سب سے زیادہ جامع اسکیم ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اسلام میں دولت جمع کرنے کی اجازت نہیں لیکن انھوں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا کہ اگر اسلام میں دولت جمع کرنے کی اجازت نہیں تو پھر زکوٰۃ کس روپے پر دی جائیگی۔ اسی طرح انھوں نے لکھا ہے کہ اسلام میں زمین پر انفرادی ملکیت روا نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی تحریر ہے کہ عرب میں اسلامی اصولوں کی رو سے زمین پر ذاتی ملکیت ناجائز نہیں تھی! اسلام میں اصولِ قانون کے ضمن میں اسی مروجہ خیال کو پیش کر دیا گیا ہے کہ قانون کے ماخذ چار ہیں۔ قرآن، سنت، اجماع، قیاس۔ لیکن اس مسلک کے لئے سند کوئی نہیں دی گئی۔ کتاب کی زبان صاف ہے اور لکھائی چھپائی اچھی۔

خضرِ راہ | علامہ اقبالؒ کی مشہور اردو نظم "خضرِ راہ" کا انگریزی ترجمہ از A.Q. NIAZ۔ ناشر FRIENDS IN COUNSEL میکلوڈ روڈ لاہور۔ چالیس صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

علامہ اقبالؒ کے کلام کا ترجمہ آسان نہیں۔ لیکن نیاز صاحب کا یہ ترجمہ بڑا کامیاب ہے۔ انگریزی نظم میں وہی روانی اور وہی جوش جھلکتا نظر آتا ہے جو اقبالؒ کے پیغام کی خصوصیت ہے۔ شروع میں مہر صاحب کا مختصر سا مقدمہ بھی ہے۔

اندلسی حکومت

۵ اگست ۷۵۰ء کو بنو امیہ کے آخری خلیفہ مروان ثانی کو عباسیوں کے ہاتھوں شکست ہوئی تو بنو عباس نے خاندانِ امیہ کے افراد کو چن چن کر ختم کرنا شروع کر دیا۔ پھر بھی ایک نوجوان لڑکا بچ نکلا۔ یہ تھا عبدالرحمٰن خلیفہ مروان کا بھتیجا اور خلیفہ ہشام کا پوتا جس نے پانچ سال کی تگ و دو کے بعد اکیس سال کی عمر میں ایک نشیمن کے لٹ جانے پر دوسرے نشیمن کی بنا ہسپانیہ میں جا ڈالی اور وہاں اس دور کا آغاز کیا جس پر آج کے اہل ہسپانیہ کو بھی فخر و ناز ہے۔

حال ہی میں لاہور سے ایک کتاب (بزبان انگریزی) چھپی ہے

FALCON OF SPAIN BY Dr. IRVING. PUBLISHERS: ORIENTALIA, LAHORE.

PAGES 158, PRICE Rs 6/-

مصنف کو اپنے تدریس و تحقیق کے دوران میں عربی اور ہسپانوی دونوں زبانوں سے شغف رہا ہے۔ بقول ان کے، انھوں نے اس کتاب میں زیادہ تر عربی نکتہ نظر کو پیش کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کتاب کے بعض حصوں یا مصنف کی آراء سے آپ اختلاف کریں لیکن کتاب ہمارے اندلسی دور کے ابتدائی ایام کا ایک اچھا خاصہ نقشہ پیش کرتی ہے۔ زمانہ دوسری صدی ہجری یا آٹھویں صدی عیسوی کا ہے۔ ہر باب کے آخر میں مفید نوٹ ہیں۔ خالص وقائع نگاری کے علاوہ طرز حکومت، تجارت، تہذیب و تمدن پر بھی مختصر باب ہیں۔

عام طور پر ہمارے ہاں ہسپانیہ کے متعلق قصے کہانیوں کی کتابیں ہیں اور ان میں بھی زیادہ تر اس دور کی باتیں ہیں جب وہاں مسلمانوں کی سلطنت دم توڑ رہی تھی۔ اس لحاظ سے اس قسم کی کتابیں زیادہ مفید ہو سکتی ہیں جو اس دور کا ذکر کریں جب مسلمان کچھ بنایا کرتے تھے۔ اور باوجود ان نقائص کے جو ان کے معاشرہ میں آ گئے تھے ان کے اندر اتنے جوہر باقی تھے کہ میزانِ عمل میں ابھی ان کے تعمیری کاموں کا پلڑا بھاری تھا۔

دیکھئے۔ اپنا خریداری نمبر تلاش کیجئے!

اگست ۱۹۵۴ء کی اس اشاعت کے ساتھ آپ حضرات کا چندہ (جن کے نمبر خریداری درج ذیل ہیں) ختم ہو گیا ہے۔ لہٰذا آئندہ ماہ ستمبر ۱۹۵۴ء کا پرچہ آپ کی خدمت میں وی پی بھیجا جائے گا۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو ۲۰ اگست ۱۹۵۴ء سے پہلے پہلے آپ اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دیں کہ اس میں ادارہ کو سہولت اور آپ کو کفایت ہے اور اگر کسی وجہ سے خدانخواستہ آپ رسالہ کی خریداری آئندہ جاری رکھنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں تو ۲۰ اگست سے پہلے پہلے ادارہ کو اپنے اس فیصلہ سے مطلع فرما دیں ورنہ ادارہ کی طرف سے مرسلہ وی پی کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہوگا۔ فہرست خریداران جن کا چندہ ماہ اگست میں ختم ہو گا:

۳۴ — ۷۵ — ۱۲۱ — ۴۵۸ — ۹۹۹ — ۱۰۶۰ — ۷۰۳ — ۲۱۳ — ۱۲۱۷ — ۱۳۳۴ — ۱۵۳۷ — ۱۵۴۴ — ۱۵۵۲ — ۱۵۶۵ — ۱۵۷۱ — ۱۵۷۶ —

۱۵۷۷ — ۱۵۸۲ — ۱۵۸۳ — ۱۵۸۴ — ۱۵۸۵ — ۱۵۸۷ — ۱۵۸۹ — ۱۵۹۰ — ۱۵۹۱ — ۱۵۹۳ — ۱۵۹۴ — ۱۵۹۵ — ۱۵۹۶ —

۱۵۹۷ — ۱۵۹۰ — ۱۵۹۹ — ۱۶۰۰ — ۱۶۰۲ — ۱۶۰۷ — ۱۶۰۸ — ۱۶۰۹ — ۱۶۱۰ — ۱۶۲۶ — ۱۶۲۷ — ۱۶۴۲ — ۱۶۴۳ —

باب المراسلات

ذوالقرنین

لائل پور سے ایک صاحب کا گرامی نامہ موصول ہوا ہے جسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ذوالقرنین کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے جو میرے لئے ایک عرصے سے الجھن کا باعث بنا ہوا ہے۔ میں نے اس سلسلہ میں معارف القرآن جلد سوم بھی دیکھی ہے اور بعض مفسرین کے حواشی بھی دیکھے ہیں لیکن میری تشفی نہیں ہو سکی۔ اور بار بار میرے لئے یہ بات کھٹک بن جاتی رہی ہے کہ خداوند پاک نے سورۂ کہف میں اس کا تذکرہ کیوں کیا اور پھر پورے قرآن پاک میں جس مقام پر یہ تذکرہ موجود ہے اس کا ربط مجھے سیاق و سباق سے سمجھ میں نہیں آیا مجھے امید ہے آپ میرے بعض اشکالات جو اس ضمن میں پیدا ہوتے ہیں اولین فرصت میں دور فرما کر مجھے شکر گذار فرماویں گے۔ میرے لئے سب سے پہلے اس شخص کا عدم تعین وجۂ الجھن ہے کیونکہ سوال کرنے والوں کو کوئی واضح جواب نہیں دیا گیا کہ ذوالقرنین کون ہے؟ آیا ذوالقرنین ذاتی نام ہے یا صفاتی۔ اگر یہ ذاتی نام ہے تو تاریخ میں اس نام کا کوئی فرد نہیں ہوا۔ اور اکثر مفسرین نے اسے ذاتی نام نہیں سمجھا اور آپ نے بھی اسے کیخسرو پر چسپاں کیا ہے۔ اس لئے اگر یہ صفاتی نام ہے تو صفاتی نام کیوں اختیار کیا گیا۔ اس سے تو سائلوں کے سوال کا جواب بے حد مبہم رہ گیا ہے وہ ابہام میں تو پہلے سے ہی تھے اور اسی بارے میں وہ ایک یقین تک پہنچنا چاہتے تھے۔ انھیں پھر سے ابہام میں ڈالنا تو جواب نہیں کہلا سکتا۔

اب اگر صفاتی نام ہی اختیار کیا گیا تھا تو پھر اس کی سلطنت کی حدیں مبہم بیان کر دی گئیں۔ مطلع الشمس اور مغرب الشمس تو کرۂ ارض پر کسی جگہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے بھی اس فرد کا کچھ علم نہیں ہو سکتا کہ وہ کون ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے؟ پھر ایک اور مبہم کردار اس کہانی میں INTRODUCE کرا دیا گیا ہے جسے یاجوج ماجوج کے نام سے پکارا گیا ہے۔ یہ کردار بھی آج تک تشنۂ تعبیر ہے۔ اگر یہ تمام کوئی تمثیل ہے تو تمثیل بالکل غیر ضروری۔ ذہنیت کے بامعنی ہونے۔ اور اگر یہ کوئی واقعہ ہے تو تاریخ میں یہ واقعہ صفاتی ناموں کی آڑ میں ڈھونڈنے کی کوشش کی بجائے توصفاتی ناموں کے استعمال کی آخر کیا مصلحت تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ابھی آثار قدیمہ پردے مزید پردے ہیں جو قرآن پاک نے اس واقعہ کو کمال صفائی سے بیان کر دیا ہے تو سوال مستقبل میں نہیں ہوگا بلکہ قرآن جب نازل ہو رہا تھا اس وقت ہو چکا ہے۔ اس لئے جب سائلوں کو اس کا جواب نہ ملا تو جواب دینے سے کیا حاصل۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس واقعہ میں رموزِ مملکت اور آئینِ جہانبانی بیان کئے گئے ہیں تو ابہام کا اشکال تو اپنی جگہ ہی قائم رہا۔ ایک غیر معروف و مجہول واقعہ سے جہانبانی کے رموز بیان کرنے کا کیا مطلب؟ سلیمان بھی بادشاہ تھے۔ داؤد بھی بادشاہ تھے۔ ان دونوں اسرائیلی بادشاہوں کا سابقہ بھی دشمنوں سے پڑا تھا۔ دونوں نبی بھی تھے

اور بے حد معروف و مشہور شخصیتیں تھیں۔ ان کا انتخاب خداوندانے کیوں نہ کیا؟ ان کا تذکرہ بھی کئی ایک مقامات پر قرآن پاک میں موجود ہے۔ یہ کام تو ان کے تذکروں سے بھی لیا جاسکتا تھا۔

طلوع اسلام | قبل اس کے کہ ذوالقرنین کے متعلق کچھ لکھا جائے ان اعتراضات کا دیکھنا ضروری ہے جنھیں محترم معترض نے اپنے خط میں بطور خدشات کے بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ

(۱) سوال کرنے والوں کو کوئی واضح جواب نہیں دیا گیا کہ ذوالقرنین کون ہے؟ اور آیا اس کا یہ نام ذاتی ہے یا صفاتی ہے؟

(۲) اگر یہ صفاتی نام ہے تو اسے کیوں اختیار کیا گیا؟ اس سے تو سائلوں کے سوال کا جواب بحد مبہم رہ گیا۔

(۳) جب سائلوں کو اس کا جواب نہ ملا تو جواب دینے سے کیا حاصل؟

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ سائلین کو ان کے سوال کا واضح، ور تشفی بخش جواب نہیں ملا۔ قرآن میں ایک گروہ کی طرف سے ایک سوال کا ذکر ہے اور اس کے بعد اس کا جواب دیا گیا ہے۔ نہ تو قرآن میں یہ لکھا ہے کہ اس جواب سے سائلین کی تسلی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی تاریخ میں سائلین کی طرف سے کہیں کہا گیا ہے کہ ہمارے نزدیک یہ جواب بالکل مبہم تھا۔ اس سے ہماری تشفی نہیں ہوئی۔ جب صورت حال یہ ہے تو ہمارے پاس کیا دلیل ہے جس کی بنا پر ہم یہ کہیں کہ اس جواب سے سائلین کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اور بات مبہم سے مبہم تر ہوگئی۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس جواب سے آپ پر بات واضح نہیں ہوئی۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس سے نبی اکرم صلعم کے مخاطبین پر بھی بات واضح نہیں ہوئی۔

اسی سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن نے یہ صفاتی نام کیوں استعمال کیا ہے، قرآن نے کہا ہے ویسئلونك عن ذی القرنین (تجھ سے ذوالقرنین کے متعلق دریافت کرتے ہیں) اس سے ظاہر ہے کہ یہ نام خود سائلین نے استعمال کیا تھا اور جس کے متعلق انھوں نے پوچھا تھا وہ اس صفاتی نام سے معروف تھا۔ قرآن نے اسی معروف شخصیت کے متعلق جواب دیدیا۔ اگر آج (کسی وجہ سے) یہ صفاتی نام ہمارے لئے غیر معروف ہوگیا ہو تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ نام سائلین کے نزدیک (یا اس دور میں بھی) غیر معروف تھا۔ بعض اوقات (بلکہ بڑی بڑی شخصیتوں بالخصوص بادشاہوں کے سلسلہ میں تو اکثر اوقات) صفاتی نام ایسے معروف ہوتے ہیں کہ اگر ان کی جگہ ذاتی نام لیا جائے تو لوگوں کو پوچھنا پڑتا ہے کہ اس سے کون مراد ہے۔ مثلاً اگر آپ کسی سے کہیں کہ ظہیر الدین بادشاہ نے یہ کہا ہے تو آپ سے ہر ایک پوچھے گا کہ کون ظہیر الدین؟ لیکن جب آپ کہیں گے کہ بابر! تو ہر ایک سمجھ جائے گا کہ اس سے کون مراد ہے۔ یا مثلاً آپ پنجاب میں اگر کسی سے کہیں کہ میں سید علی ہجویری کے مزار پر گیا تھا (تو چند پڑھے لکھے لوگوں کے سوا) کوئی نہیں سمجھے گا کہ اس سے کون مراد ہیں۔ لیکن اگر آپ کہیں کہ میں داتا صاحب کے دربار گیا تھا تو لکھے پڑھے اور ان پڑھ دونوں سمجھ جائیں گے کہ آپ کہاں گئے تھے۔ بہر حال مطلب یہ تھا کہ سائلین نے خود بھی صفاتی نام کے ساتھ سوال کیا اور اسی سوال سے یہ مترشح ہوتا ہے

کہ جس کی بابت سوال کیا گیا تھا وہ اپنے اس صفاتی نام سے عام طور پر مشہور تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ قرآن نے اس کا ذاتی نام، مقام اور تاریخ پیدائش اور دیگر اسی قسم کی تفصیلات کیوں بیان نہیں کیں۔ تو اس کا جواب تو ظاہر ہے کہ قرآن تاریخ کی کتاب نہیں ہے کہ وہ اس سوال کے جواب میں تاریخی تفصیلات بیان کرتا۔ سائلین نے جو کچھ معلوم کرنے کیلئے سوال کیا تھا، قرآن نے اپنے آپ کو انہی تفاصیل تک محدود رکھا ہے۔

اب یہ دیکھئے کہ ذوالقرنین کون تھا؟ یہودی نسل پرست قوم تھی جن کے نزدیک قابل فخر و ستائش شخصیت صرف یہودیوں کے اندر پیدا ہو سکتی تھی۔ لیکن ذوالقرنین ایک ایسا شہنشاہ ہے جو غیر یہودی ہونے کے باوجود یہودیوں کے ہاں بڑا واجب الاحترام ہے اس لئے کہ یہی وہ شہنشاہ تھا جس نے انہیں بابل کی المناک اسیری کے عذاب سے نجات دلائی تھی اور جس کے ہاتھوں دانیال، یسعیاہ اور یرمیاہ نبی کی پیشین گوئیاں پوری ہوئیں۔ یہ پیشین گوئیاں تورات میں آج بھی موجود ہیں۔ دانیال نبی نے اپنے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک مینڈھا ہے جس کے دو بڑے بڑے سینگ ہیں۔ جبرئیل نے انہیں اس خواب کی تعبیر بتائی کہ یہ میڈیا اور فارس کی دونوں سلطنتوں کا شہنشاہ ہے جس کے ہاتھوں یہودیوں کو اہل بابل کی غلامی سے نجات ملے گی۔ یہ تھے وہ دو سینگ جس سے یہ نجات دہندہ یہودیوں کے ہاں ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھا۔ یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں اس دو سینگوں والے کا نام خورس لکھا ہے جس کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ "وہ میرا چرواہا ہے وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا" چنانچہ جب میڈیا اور فارس کے شہنشاہ کیخسرو (خرس) نے بابل فتح کر کے یہودیوں کو نجات دلائی ہے تو دانیال نبی نے اسے یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی دکھائی جو اس واقعہ سے قریب ڈیڑھ سو سال پہلے کی گئی تھی۔ کوئی سو برس کا عرصہ ہوا اصطخر کے کھنڈرات سے اسی خرس کا ایک مجسمہ برآمد ہوا ہے جس کے سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شہنشاہ خود اہل فارس کے ہاں بھی دو سینگوں والا ہی مشہور تھا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ قرآن میں مطلع الشمس اور مغرب الشمس کے جو الفاظ آئے ہیں وہ کرۂ ارض پر ہر جگہ ہو سکتے ہیں اس لئے یہ جواب بھی متعین نہیں۔ اسے پھر دہرا لیجئے کہ سوال یہودیوں کی طرف سے تھا اور تورات میں پورب اور پچھم کے ممالک کے لئے سورج نکلنے کے ممالک" اور "سورج ڈوبنے کے ممالک" کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔ لہذا قرآن نے یہ بتانے کے لئے کہ وہ پہلے ایران سے مغرب کی طرف چلا اور خشکی کا تمام سفر طے کرتے ہوئے لیڈیا کے دارالحکومت سارڈس کو فتح کر کے سمندر کے کنارہ تک جا پہنچا جہاں شام کے وقت سورج ڈوبتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد اس نے مشرق کی طرف لشکر کشائی کی جسے باختر کا علاقہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کی تیسری لشکر کشائی سلسلۂ کوہ کاکیشیا کی طرف تھی جہاں اس نے درۂ کوہ میں دیوار بنائی تھی تاکہ شمالی علاقہ کے وحشی قبائل یاجوج و ماجوج وہاں سے حملہ آور ہو کر اس علاقہ کے باشندوں پر مزید ظلم نہ کر سکیں۔ واضح رہے کہ جس طرح اس زمانہ کے مخاطبین کیلئے ذوالقرنین کوئی غیر مانوس لفظ نہ تھا۔ اسی طرح وہ یاجوج اور ماجوج کے ناموں سے بھی ناآشنا نہیں تھے (اسوقت یاجوج و ماجوج کی تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ آپ کا بنیادی سوال ذوالقرنین ہی کے متعلق ہے)۔

ہمارا خیال ہے کہ ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ نہ تو قرآن کا جواب اپنے مخاطبین کیلئے مبہم تھا اور نہ ہی ایسا جس سے ان کا اطمینان نہ ہوا ہو۔ قرآن میں بیان کردہ تاریخی احوال و کوائف کے متعلق ہمارے دلوں میں اعتراضات اس لئے اٹھتے ہیں کہ قرآن نے ان باتوں کو اس طرح بیان نہیں کیا جس طرح ہم چاہتے ہیں کہ وہ ایک تاریخی کتاب کیطرح بیان کرتا۔ اور ان کے سمجھنے میں جو دشواری ہمیں پیش آتی ہے وہ اس لئے کہ ہمارے ہاں ابھی ایسا لٹریچر موجود نہیں جس میں دورِ حاضرہ تک کی تاریخی تحقیقات اور عصری انکشافات کی روشنی میں متعین طور پر بتایا جائے کہ ان واقعات کے تاریخی تعینات کیا ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ قرآن نے ذوالقرنین کے متعلق اپنے ہاں یہ کچھ درج ہی کیوں کیا ہے اور اس میں ہمارے لئے کونسی حکمت اور مصلحت ہے۔ سو پہلی چیز تو یہی کہ رسول اللہ صلعم کو جو کچھ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی علم دیا جاتا تھا وہ سب قرآن کے اندر درج ہوتا تھا۔ ذوالقرنین کے متعلق سوال کا جواب چونکہ رسول اللہ صلعم نے اپنی طرف سے نہیں دیا بلکہ وحی کی بنا پر دیا تھا اس لئے وہ قرآن میں درج ہوا۔ اور اس میں حکمت اور مصلحت یہ ہے کہ قرآن نسلی، جغرافیائی اور مذہبی گروہ بندیوں میں گھرا ہوا نہیں۔ اسے جہاں کہیں انسانی سیرت و کردار کے بلند نمونے ملتے ہیں وہ ان کی بلندی کا اعتراف کرتا ہے۔ سائرس، جناب زرتشت کا پیرو تھا اور اگرچہ قرآن نے زرتشت کو تصریحی طور پر زمرۂ انبیاء میں ذکر نہیں کیا لیکن ان کے پیرو کے عدل و انصاف اور انسان دوستی کی بلند صفات کا نہایت کشادہ ظرفی سے اعتراف کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جواب تو صرف یہودیوں کے سوال کا دیا جا رہا ہے لیکن ذوالقرنین کی اس بلندیٔ سیرت کو ہر مقام پر اجاگر کرکے دکھایا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ صفات بنی اسرائیل کے ان انبیاء میں بھی موجود تھیں جن کی حکمرانی کے تذکرے قرآن میں آئے ہیں لیکن جب کسی سلسلہ میں ایک دوسری قوم اور دوسری سرزمین کے حکمران کا تذکرہ آگیا تو قرآن نے اسی کشادہ نگہی سے اس کی محمودہ صفات کا بھی ذکر کردیا۔

امید ہے کہ ان اشارات سے آپ کا اطمینان ہو جائے گا۔

باسمہ سبحانہ

اختلاف اُمّتی رحمۃ

(میری امت کا آپس میں اختلاف رکھنا ایک رحمت ہے)

(علامہ تمنا عمادی۔ ڈھاکہ)

کہا جاتا ہے کہ یہ خلافِ عقل اور خلافِ قرآن مجید بات (نعوذ باللہ من ذلک) حدیث رسول ہے۔ باوجود اس کے کہ حدیث کی جو معتبر چھ[6] کتابیں ہیں بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ جن کو صحاح ستہ کہتے ہیں، اور حدیث کی سب سے پہلی کتاب امام مالکؒ کی موطا۔ ان میں سے کسی کتاب میں بھی یہ حدیث نہیں ملتی۔ اسی قدر نہیں بلکہ جن کتابوں کا درجہ ان سات کتابوں کے بعد ہے۔ جیسے امام شافعیؒ کی کتاب الام[1]، مسند امام احمد[2]، مسند امام شافعی[3] مسند امام امام ابوحنیفہؒ[4]، موطائے امام محمد[5]، سنن دارمی[6]، سنن دارقطنی[7]، مسند ابوداؤد الطیالسی[8] مستدرک حاکم[9]، سنن ابن جریج[10]، سنن ابن اسحٰق[11]، سنن ابن قرہ موسی بن طارق[12]، سنن عبدالرزاق بن ہمام[13]، جامع المسانید ابن جوزی[14]، جامع المسانید ابن کثیر[15]، مسند ابویعلی[16]، مسند بزار[17]، معجم کبیر طبرانی[18] مجمع الزوائد[19]، سنن کبریٰ نسائی[20] سنن کبریٰ بیہقی[21]، کنز العمال[22]، جمع الجوامع للسیوطی[23] اتحاف الخیرہ بزوائد المسانید العشرہ لاحمد بن ابی بکر البوصیری[24]، مسند حمیدی[25] مسند مسدد[26]، مسند ابن ابی عمر[27]، مسند اسحٰق بن راہویہ[28] مصنف ابن ابی شیبہ[29]، مصنف احمد بن منیع[30]، مصنف عبد بن حمید[31] مسند حارث بن محمد بن ابی اسامہ[32]، المختارہ لمحمد بن عبدالواحد المقدسی[33]، اور بحر الاسانید[34] حافظ احمد بن حسن السمرقندی وغیرہ احادیث کی مشہور کتابوں میں کہیں اس حدیث کا نام و نشان نہیں۔ مگر پھر بھی مخالف قرآن مجید و مخالف عقل سلیم ہونے کے باوجود یہ گمراہ کن قول ہمارے علماء کے نزدیک حدیث رسول ہے۔ اور اس کو اس طرح فرقہ پرستی کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے جیسے یہ قرآن مجید کی کوئی آیت ہی ہو، یا کم سے کم سلف سے خلف تک سارے علمائے دین کی ایک متفق علیہ کوئی حدیث متواتر ہے۔ جس کے سننے کے بعد ہر مسلمان کا فرض ہے کہ سر تسلیم خم کر دے۔

حافظ سیوطی کے ہاں

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ کی ایک کتاب "جامع صغیر" ہے جس میں یہ حدیث ملتی ہے مگر مجھے اس کا یقین ہے کہ یہ حدیث جامع صغیر میں داخل کر دی گئی ہے۔ جلال الدین سیوطی نے خود اس کو اپنی کتاب میں درج نہیں کیا ہے۔ اگر یہ سیوطی اس کو اس مختصر سی کتاب میں درج کرتے تو اپنی ضخیم کتاب "جمع الجوامع" میں بھی ضرور درج کرتے کیونکہ اس طویل و عریض کتاب کا نام ہی بتا رہا ہے کہ اس میں حافظ سیوطی نے حتی الوسع ساری حدیثوں کو جمع کر دیا ہے۔ پھر یہ حدیث اگر واقعی ان کے نزدیک حدیث رسول تھی تو اس ضخیم کتاب میں اس کو جگہ کیوں نہ دی؟

بہر حال اختلاف پسند و فرقہ پرست علماء چونکہ جامع صغیر ہی کے حوالے سے اس گمراہ کن قول کو حدیث رسول کہہ کر پیش کرتے ہیں اسلئے جامع صغیر کے حوالے کو تسلیم کرتے ہوئے ہی مجھ کو اس وقت بحث کرنا ہے، کیونکہ جامع صغیر میں اس کے وجود سے تو انکار

کہا نہیں جاسکتا۔ وضاعین وکذابین نے ایک حدیث بنا کر جامع صغیر میں داخل کردی ہے، صرف اتنا کہدینے سے روایت پرستوں کو خاموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہ سہی، جامع صغیر کی تو ضرور ہے۔ میں اسی حیثیت سے اس پر بحث کرتا ہوں۔

جلال سیوطی تو دسویں صدی کے آدمی ہیں، اس لئے یہ دیکھنا واجب ہے کہ اس حدیث کو یہ لائے ہیں کہاں سے؟ تو جامع صغیر میں خود حوالہ موجود ہے کہ اس کو نصر المقدسی نے اپنی کتاب الحجۃ میں، اور بیہقی نے رسالہ الاشعریہ میں اس کو معلق بغیر سند کے لکھا ہے پھر شارح جامع صغیر خود لکھتے ہیں ذکرہ البیہقی معلقا بلفظ روی، یعنی بیہقی نے اس کو یقینی طور سے نہیں لکھا ہے بلکہ لکھا ہے کہ روایت کی گئی ہے، یعنی اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے اور مشکوک طریقے سے بیان کیا ہے جس کو آخر میں خود ہی صاف طور سے لکھدیا ... الشیخ حدیث ضعیف، یعنی شیخ نے کہا کہ حدیث ضعیف ہے۔ یہ تو خود اس کے روایت کرنے والوں کا اعتراف ہے مگر تحقیق کی نظر سے کے جو حقائق معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف ضعیف ہی نہیں یہ بالکل موضوع حدیث ہے۔ ایک من گھڑت قول ہے ایک گمراہ کن مقولہ ہے جس کی نسبت کسی مفسد نے پہلے پہل رسول اللہ صلعم کی طرف کردی۔ اس کے بعد خلاف بند وفرقہ پرست طبائع نے اس کو اپنی تصنیفات میں درج کرنا شروع کردیا۔ پھر اس کی تائید میں بعض تابعین واتباع تابعین کے اقوال بھی بنا ڈالے۔

نصر مقدسی | اب سب سے پہلے تو نصر مقدسی ہی کو دیکھئے کہ ان کا ذکر نہ امام ذہبی اپنی کسی کتاب رجال میں کرتے ہیں نہ ابن حجر، نہ طبقات ابن سعد میں ان کا کہیں ذکر ہے نہ انساب سمعانی میں۔ یہانتک کہ ان کی کتاب الحجۃ جس کا حوالہ جامع صغیر میں ہے اس کتاب کا ذکر کشف الظنون میں بھی نہیں۔ اندازے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سمعانی وذہبی، وابن حجر سب سے متاخر ہیں۔ لیکن جلال سیوطی متوفی ۹۱۱ھ ہی نہیں بلکہ علامہ ابراہیم بن عثمان الزرکشی المصری متوفی ۷۹۴ھ بھی صرف انہیں کا حوالہ اس حدیث کے متعلق دیتے ہیں۔ اسلئے یہ اگر علامہ زرکشی سے متقدم نہیں تو ان کے ہمعصر ضرور ہیں یعنی ۷۹۵ھ سے پہلے یا شاید کچھ بعد ان کی وفات ہو۔ اس لئے سمعانی نہیں تو امام ذہبی اور حافظ ابن حجر کو تو ضرور ان کا ذکر کرنا تھا۔ سمعانی کی وفات ۵۶۲ھ میں ہے لیکن ذہبی کی وفات ۷۴۳ھ میں ہے۔ اور ابن حجر کی وفات تو ۸۵۲ھ میں ہوئی ہے یہ تو نویں صدی کے ہیں، ذہبی بھی زرکشی کا ذکر کرتے ہیں، اور ابن حجر بھی مگر جس کی کتاب کا حوالہ زرکشی اپنی کتاب میں دیں اس ... سمجھتے ہیں جو ان سے کچھ متقدم یا ان کا ہمعصر معتمد علیہ ہے، اس کا ذکر نہ ذہبی کرتے ہیں نہ ابن حجر۔ آخر اس کی کوئی وجہ ہونی چاہئے۔

قاضی حسین | ... سے پہلے جن صاحب نے دنیا کو اس گمراہ کن قول سے حدیث رسول قرار دے کر روشناس کرایا وہ قاضی حسین صاحب ہیں۔ جیسے کہ جامع صغیر میں قاضی حسین اور امام الحرمین کا ذکر کیا ہے کہ ان دونوں نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ قاضی صاحب ... اس کو بھی سن لیجئے ... سکے کہ یہ چوتھی صدی کے بزرگ ہیں یعنی قاضی حسین کی وفات ۴۶۲ھ کی ہے ان کا ذکر امام ذہبی متوفی ۷۴۸ھ اور ابن حجر متوفی ۸۵۲ھ اپنی کتابوں میں نہیں فرماتے۔ البتہ ابو محمد عبداللہ بن اسعد یافعی متوفی ۷۶۸ھ اپنی کتاب مرآۃ الجنان میں اور عبدالکریم بن السمعانی کتاب الانساب میں اور نواب صدیق حسن خاں اتحاف النبلاء میں ان کا

مختصر ذکر کرتے ہیں یعنی ان کا نام حسین بن اسمعیل بن محمد اور ابوعبداللہ کنیت ہے۔ ۹۵ برس کی عمر پائی۔ ساٹھ برس تک مسلسل کوفہ کے قاضی رہے۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اتحاف النبلاء میں ان کو "طبی" لکھا ہے۔ اتحاف النبلاء پر مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمہ اللہ نے زبردست نکتہ چینی اپنے رسالہ [illegible] میں کی ہے مگر تعجب ہے کہ ان کی اس غلطی پر نہیں [illegible] ضبی اور طبی یعنی بالفتح و بالکسر دو نسبتوں کا ذکر کیا ہے۔ شیخ [illegible] عیسیٰ بن سلیمان [illegible] اہواز کے درمیان [illegible] کے رہنے والے [illegible] کوئی نسبت نہیں [illegible] اس لئے ان کو ضبی لکھتے ہیں چنانچہ سمعانی نے [illegible] اسمعیل بن محمد بن [illegible] الضبی کا ذکر [illegible] خود ان کا نام [illegible] کے تحت نہیں کیا [illegible] محمد قاسم کا نام لکھا ہے [illegible] سعد بن [illegible] ۔ مگر تعجب ہے کہ وہاں [illegible] اسمعیل بن محمد بن [illegible] لکھتے ہیں [illegible] اسمعیل بن [illegible] صدیق حسن خاں مرحوم بھی اسمعیل بن محمد ہی لکھتے ہیں [illegible] ان کو ضبی المحاملی لکھا ہے [illegible] غالباً سعید غلط ہے، محمد ہی صحیح ہے۔ بہرحال ان کے [illegible] ان کے والد ان کے بھائی سب کوفی تھے اور یہ بھی کوفہ میں پیدا ہوئے اور کوفے ہی میں برابر رہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ دین اسلام میں جو فتنہ بھی اٹھا وہ عموماً کوفہ ہی سے اٹھا ہے الا ماشاء اللہ [illegible] اس گمراہ کن قول کو رسول اللہ صلعم کی طرف نسبت دینے کی ابتدا بھی کوفے ہی سے ہوئی۔

باقی رہے امام الحرمین یعنی ابوالمعالی عبدالملک بن عبداللہ بن یوسف ضیاء الدین الشافعی متوفی ۴۷۸ھ ہیں۔ ان کی تصنیفات میں رسالہ نظامیہ، مغیث الخلق لاتباع الحق، البرہان فی اصول الفقہ اور الارشاد فی الکلام مشہور کتابیں ہیں ان میں سے کسی کتاب میں امام الحرمین نے "اختلاف امتی رحمۃ" کو حدیث رسول قرار دیکر کسی جگہ بھی نقل نہیں کیا ہے۔ اور بالفرض اگر امام الحرمین نے اپنی کسی کتاب میں کہیں اس قول کا ذکر کر بھی دیا ہو تو قاضی حسین ہی کی تحریر سے متاثر ہو کر ان کے اعتماد پر لکھدیا ہوگا جس طرح خود جلال الدین سیوطی قاضی حسین اور امام الحرمین کے نام تو لکھ رہے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ ان لوگوں نے اپنی کس کتاب میں اس حدیث کا ذکر کیا ہے اگر جانتے ہوتے تو ضرور ان کی ان کتابوں کے نام بتاتے ہوتے جس طرح نصر مقدسی کی کتاب کا نام بیہقی کی کتاب کا نام بتایا۔ قاضی حسین اور امام الحرمین کی کتابوں کے نام کا ذکر نہ کرنا اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ حافظ سیوطی نے کسی سے سن کر ایسا لکھدیا تھا۔

اور حلیمی یعنی ابوعبداللہ حسین بن الحسن بن محمد بن حلیم الجرجانی الشافعی۔ یہ نیشاپور میں پیدا ہوئے ۳۳۸ھ میں اور یہیں تعلیم پائی یہیں پروان چڑھے اور پھر یہیں حدیث کی اشاعت کرتے رہے ۴۰۳ھ میں وفات پائی۔ نیشاپور کو تو آپ خوب جان چکے ہیں جو جھوٹی حدیثوں کی خاص اشاعت گاہ تھی۔ اس لئے اگر ان کو یہاں یہ حدیث کسی سے مل گئی ہو یا قاضی حسین ہی کی تحریر سے مل گئی ہو تو کیا تعجب ہے؟ مگر تعجب یہ ضرور ہے کہ یہ سب کے سب بغیر کسی سند کے بغیر راویوں کے سلسلۂ اسناد کے بغیر راوی صحابی کے ذکر کے اس گمراہ کن قول کو حدیث رسول تسلیم کر کے آخر اپنی کتابوں میں کس طرح لکھ گئے۔ اسی طرح بیہقی حافظ احمد بن الحسین الشافعی متوفی ۴۵۸ھ نے بھی اپنے رسالہ اشعریہ میں اس کا ذکر حدیث کی حیثیت سے کر دیا۔ اگر یہ قول ضعیف قرار دیکر یعنی "رُوِیَ" کہکر۔ شارح صاحب نے سبکی و دیلمی کا

بھی ذکر کر دیا۔ دیلمی ابوشجاع الہمدانی متوفی ۵۰۹ھ جن کی مسند الفردوس مشہور ہے۔ اور سبکی تقی الدین علی بن عبدالکافی الشافعی متوفی ۷۵۶ھ (بعضوں نے ۷۷۱ھ ان کا سال وفات لکھا ہے)۔

سیوطی کی توضیح

جلال سیوطی ان لوگوں کا نام لکھکر خود لکھتے ہیں کہ ولعلہ خرج فی بعض کتب الحفاظ التی لم تصل الینا یعنی شاید اس حدیث کی تخریج بعض حافظوں کی ان کتابوں میں کی گئی ہو جو ہم لوگوں تک نہیں پہنچیں۔ یہ لکھ کر حافظ سیوطی نے اس کانٹے کو نکالنا چاہا ہے جو خود ان کے اور ہر ایک انصاف پسند کے دل میں کھٹکتا ہے کہ اگر یہ واقعی حدیث رسول ہے تو کس صحابی نے اس کی روایت کی؟ اور پھر صحابی کے بعد والے راوی کون کون ہیں؟ اور پھر دوسری یا تیسری صدی کے کس شیخ الحدیث نے اس کو اپنی کتاب میں اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے؟ تو۔ ایک کانٹا جس کی تین تین نوکیں نشتر مانند ہیں۔ اس کے نکالنے کی یہ سبیل نکالی کہ سمجھ لیا جائے کہ بعض حفاظ حدیث نے اس کو اپنی کتاب میں ضرور صحابی کے نام اور سلسلہ اسناد کے ساتھ روایت کیا ہوگا مگر وہ کتاب ہم لوگوں تک نہیں پہنچ سکی اسلئے ہم لوگ اس کے سلسلۂ اسناد سے واقف نہ ہو سکے۔ اس کے راوی صحابی کے نام سے آگاہ ہو سکے۔ اگر یہ تعلی وہی طریقہ ہے جو ساختہ زبردست کرتا اس آسانی سے نکل جاتا ممکن ہے تو پھر سارے موضوعات کے دفتر کو بھی صحاح کا لقب دیا جا سکتا ہے ورنہ ہر موضوع ومکذوب حدیث کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ حدیث عالی اسناد سے کسی حافظ حدیث نے اپنی کتاب میں روایت کی ہو اور وہ کتاب ہم لوگوں تک نہ پہنچی ہو۔

اس حدیث کی ضرورت

اصل یہ ہے کہ تیسری صدی تک مسلمانوں میں دینی اختلافات بہت کافی حد تک پھیل چکے تھے۔ فرقہ بندیاں قائم ہو چکی تھیں۔ قرآن مبین میں اختلافات پیدا کرنے کی صریح ممانعتیں موجود تھیں۔ اور دین میں اختلاف پیدا کرنا اہل بغی کا کام بتایا گیا تھا۔ فرقہ بندی کی ممانعت اسقدر سخت تھی کہ اس کو شرک قرار دیا گیا۔ ان حالات میں اختلاف پسند طبائع اور فرقہ پرست عناصر کے لئے کوئی سہارا اپنے اختلافات کو برقرار رکھنے کا مل نہیں رہا تھا۔ ایسے بے بسی کے وقت میں جو گمراہ کن قول حدیث رسول کے نام سے قاضی حسین یا ان سے پہلے کسی نے پیش کر دیا تو بعد ان لوگوں کو بہت بڑا سہارا مل گیا۔ چاہے وہ ایک تکا بلکہ ایک تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہی کیوں نہ ہو۔ نہ انھوں نے اس کی پروا کی کہ اس کے راوی صحابی کا تو پتہ ہی نہیں ہے نہ اس کی پروا کی کہ دوسری تیسری صدی میں کسی جامع احادیث نے اس گمراہ کن قول کو حدیث رسول کہہ کر اپنی کتاب میں داخل نہیں کیا مگر تھی یہ ان کے کام کی اور ان کے جی کی بات اس لئے فوراً دانتوں سے اس کو پکڑ لیا۔ مگر محدث خود سے اس کیلئے اسناد گھڑ نہیں سکتے تھے۔ نہ اپنے جی سے کسی صحابی کی طرف اسکو منسوب کر سکتے تھے۔ اسلئے بیہقی نے رسالہ اشعریہ میں تو ایک قول ضعیف قرار دیکر قدوی کے ساتھ اس کا ذکر کر دیا مگر اپنی حدیث کی کتابوں میں خصوصاً سنن کبریٰ میں اس کا مطلق ذکر نہ کیا۔

شارح جامع صغیر نے اور کمال کیا۔ سیوطی نے جو لکھا کہ شاید بعض حفاظ حدیث کی کتابوں میں اس حدیث کی تخریج کی گئی ہو اور وہ کتابیں ہم لوگوں تک نہ پہنچ سکیں تو شارح صاحب نے اس گرتی دیوار پر ایک کھوکھلا پشتہ لگانے کی کوشش یوں فرمائی کہ لکھتے ہیں کہ یہ بات بھی یونہی ہے۔ چنانچہ بیہقی نے اپنی کتاب مدخل میں اور دیلمی ابوشجاع ہمدانی متوفی ۵۰۹ھ نے اپنی کتاب الفردوس میں

اس کی اسناد حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی طرف کی ہے۔ اس کے بعد پھر خود ہی محمودؒ تحریر فرماتے ہیں کہ "لیکن بیہقی نے مدخل میں اور دیلمی نے فردوس میں اختلاف اصحابی رحمۃ کے لفظوں کے ساتھ"۔ یعنی ان دونوں نے جو حدیث ابن عباس سے روایت کی ہے وہ اختلاف امتی رحمۃ تو نہیں ہے مگر اختلاف اصحابی رحمۃ ہے پھر آخر میں شارح صاحب اتنا اعتراف کر کے یہ بحث ختم کرتے ہیں کہ قال الشیخ حدیث ضعیف یعنی شیخ نے فرمایا کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ یعنی یہ اختلاف اصحابی رحمۃ بھی باوجود حضرت ابن عباس کی طرف منسوب ہونے کے حدیث ضعیف ہی ہے۔ اس کی وجہ شارح صاحب نے نہیں لکھی کہ یہ حدیث بھی ضعیف ہی ہے۔ اس کی تصریح آگے آتی ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ "قال الشیخ حدیث ضعیف" اختلاف امتی رحمۃ والی حدیث کے متعلق لکھا ہو۔ پہلی عبارت کی شرح بطور جملہ معترضہ بیان کرنے کے بعد جو اوپر ہی کے سلسلے کی بات بیان کی ہو۔ سے یہ ہیں نے پہلے قال الشیخ حدیث ضعیف کو اختلاف امتی رحمۃ ہی سے متعلق قرار دیا ہے۔ مگر چونکہ جو لوگ ان دونوں حدیثوں کو موضوع و کذب ۔ وانہ نہیں کہتے ان سبھوں کے نزدیک یہ دونوں حدیثیں ضعیف تو ضرور ہیں اس لئے یہ قول دونوں کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ اختلاف امتی تو محض ایک قول بے سند ہے اس لئے اس کا ضعف ظاہر ہے مگر اختلاف اصحابی بھی باوجود اس کے اسناد مذکور ہونے کے ضعیف ہی ہے اس کا اعتراف بھی تمام محدثین کو ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ اسلئے یہ نہ کہئے کہ پہلے تو قال الشیخ حدیث ضعیف کو اختلاف امتی سے متعلق قرار دیا اور اب یہاں اختلاف اصحابی والی حدیث سے متعلق قرار دے رہے ہیں۔ واقعہ یہی ہے کہ اس کے متعلق کہیں جب بھی صحیح ہے اور اس کے متعلق کہیں جب بھی صحیح ہے۔

یہ بھی آپ معلوم فرمالیں کہ یہ شرح جامع صغیر کونسی ہے اور شارح کا نام کیا ہے؟ اس شرح کا نام السراج المنیر ہے اور شارح علی بن احمد بن نور الدین محمد بن ابراہیم العزیزی متوفی ۱۰۷۰؁ھ ہیں۔

علامہ السخاوی جامع صغیر و شرح جامع صغیر ج ۱ صفحہ ۶۲ میں اس حدیث کی جو بحث تھی وہ تو آپ ملاحظہ فرماچکے۔ اب ایک دوسری کتاب کی بھی سیر فرمالیجئے۔ علامہ شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی متوفی ۹۰۲؁ھ اپنی کتاب "المقاصد الحسنہ فی الاحادیث المشہورۃ علی الالسنۃ" کے صفحہ ۲۶ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "البیہقی فی المدخل من حدیث سلیمان بن ابی کریمۃ عن جویبر عن الضحاک عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہما اوتیتم من کتاب اللہ فالعمل بہ لا عذر لاحد

---

[1] یہ حدیث چونکہ جویبر کوفی نے وضع کی تھی اسلئے شیعہ مذہب کے بعض متاخرین کی کتابوں میں موجود ہے چنانچہ علامہ باقر مجلسی مشہور شیعہ محدث نے اپنی کتاب "بحار الانوار" جلد اول صفحہ ۸۵ میں تھوڑے سے لفظی ردوبدل کے ساتھ تمام طبرسی کی کتاب الاحتجاج سے بروایت امام جعفر صادق یہ حدیث نقل کی ہے۔ مگر انھوں نے بھی اسناد کا ترک ہی مناسب خیال کیا۔ امام جعفر صادق سے شیخ طبرسی تک کتنے راوی تھے اور کون کون تھے کچھ نہیں معلوم۔ اور امام جعفر صادق اور رسول اللہ صلعم کے درمیان کون کون بزرگ تھے؟ اس کے پوچھنے کی انھیں کوئی ضرورت ہی نہیں۔ کسی امام کا صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ قال رسول اللہ صلعم لیکن شیعیت کی مناسبت سے آخر میں اتنا اضافہ بھی ہے کہ جب رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اختلاف اصحابی رحمۃ میرے صحابہ کا اختلاف تمہارے لئے رحمت ہے تو آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کے اصحاب کون لوگ ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ میرے اہل بیت۔ اس کے بعد علامہ مجلسی لکھتے ہیں کہ محمد بن الحسن بن بابویہ القمی نے کہا کہ اہل بیت باہم اختلاف نہیں کرتے ہیں مگر وہ شیعوں کیلئے فتوی دیتے ہیں حق جو تلخ ہوتا ہے اور بسا اوقات انھیں فتوے دیتے ہیں تقیہ کر کے تو ان کے اقوال میں باہم اختلاف ... [illegible] ... التقیہ ... [illegible] ... ۱۲ ... [illegible]

فی ترکہ۔ فان لم یکن فی کتاب اللہ فسنۃ منی ماضیۃ، فان لم تکن سنۃ منی فما قال اصحابی۔ ان اصحابی بمنزلۃ النجوم فی السماء فبایما اخذتم بہ اهتدیتم۔ واختلاف اصحابی لکم رحمۃ۔ ومن ھذا الوجہ اخرجہ الطبرانی والدیلمی فی مسندہ بلفظ سواء۔ وجویبر ضعیف جداً والضحاک عن ابن عباس منقطع۔ وقد عزاہ الزرکشی الی کتاب الحجۃ لنصر المقدسی مرفوعاً من غیر بیان لسندہ ولا صحابتہ وکذا عزاہ العراقی لآدم بن ابی ایاس فی کتاب العلم والحکم بدون بیان بلفظ اختلاف اصحابی رحمۃ لامتی وقال وھو مرسل ضعیف۔ وبھذا اللفظ ذکرہ البیہقی فی رسالتہ الاشعریۃ بغیر اسناد۔ وفی المدخل لہ من حدیث سفیان عن افلح بن حمید عن القاسم بن محمد قال اختلاف اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ لعباد اللہ۔ یعنی سخاوی شروع میں تو لکھتے ہیں "حدیث اختلاف امتی رحمۃ" مگر اس کے بعد جو کچھ لکھتے ہیں وہ اختلاف اصحابی کے متعلق ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ "بیہقی نے مدخل میں سلیمان بن ابی کریمہ کی حدیث جو یبر سے وہ ضحاک سے وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ ابن عباس نے کہا کہ فرمایا رسول اللہ صلعم نے کہ جب تک تم پاتے رہو اللہ کی کتاب سے (احکام) تو اسی پر عمل کرتے رہو، کسی کو اس کے ترک کرنے کیلئے کسی عذر کی گنجائش نہیں تو اگر (وہ مسئلہ) کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو میری سنت جو چلی آرہی ہے (اس میں ڈھونڈھو) اگر میری سنت میں بھی (وہ مسئلہ) نہ ملے تو جو کچھ میرے صحابہ کہیں۔ کیونکہ میرے صحابہ بمنزلہ ستاروں کے ہیں آسمان پر (یعنی جس طرح آسمان پر ستارے ہیں اسی طرح صحابہ زمین پر ہیں) تو ان میں سے جس کو بھی تم نے اتباع کے لئے لیا تم نے ہدایت پائی۔ اور میرے صحابہ کا باہمی اختلاف تمہارے لئے رحمت ہے۔ اور اسی صورت سے اس حدیث کو طبرانی اور دیلمی نے اپنے مسند میں روایت کیا ہے یکساں الفاظ سے۔ مگر جو یبر ضرور ضعیف راوی ہیں۔ اور ضحاک کی روایت حضرت ابن عباس سے منقطع ہے اور زرکشی نے اس کی نسبت کتاب الحجہ کی طرف کی ہے جو نصر مقدسی کی کتاب ہے مرفوعاً یعنی رسول اللہ صلعم کا قول قرار دے کر لیکن بغیر سند بیان کئے اور بغیر اس کے راوی صحابی کا نام بتائے ہوئے۔ اور اسی طرح عراقی نے اس حدیث کی نسبت کی ہے کتاب العلم والحکم میں آدم بن ابی ایاس کی طرف بغیر اسناد اور صحابی کا نام بیان کئے، ان لفظوں میں کہ "اختلاف اصحابی رحمۃ لامتی اور کہا کہ یہ حدیث ایک ضعیف مرسل ہے اور انھیں لفظوں سے اس حدیث کا ذکر بیہقی نے اپنے رسالہ الاشعریہ میں کیا ہے بغیر اسناد کے۔ اور بیہقی ہی نے مدخل میں سفیان کی حدیث لکھی ہے جس کو سفیان افلح بن حمید سے وہ قاسم بن محمد سے روایت کرتے ہیں، کہ انھوں نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا اختلاف ایک رحمت ہے اللہ کے بندوں کے لئے۔

اختلاف صحابہؓ

آخری حدیث جو سفیان ثوری سے مروی ہے وہ حدیث رسول نہیں بیان کی گئی ہے بلکہ قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق رض متوفی ۱۰۶ھ کا ذاتی قول ہے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا۔ اور اس کے بعد اور بھی بعض تابعین کے اقوال لکھے ہیں جن پر میں بعد کو بحث کروں گا۔

مجھ کو دکھانا یہ ہے کہ درحقیقت اختلاف امتی رحمۃ کو حدیث رسول قرار دے کر کسی نے بھی نہیں لکھا ہے۔ نہ نصر مقدسی نے کتاب الحجہ میں، نہ بیہقی نے رسالہ اشعریہ یا مدخل میں لکھا ہے اور نہ طبرانی و دیلمی نے لکھا ہے جن کے حوالے جامع صغیر میں منقول ہیں۔ سخاوی صاف طور سے لکھ رہے ہیں کہ ان سبھوں نے اختلاف اصحابی ہی کی روایت نقل کی ہے چاہے بغیر سند اور بغیر ذکر

صحابی کے لکھی ہو چاہے ابن عباس کی طرف سلیمان بن ابی کریمہ و جویبر و ضحاک کے سلسلہ اسناد کے ذریعے منسوب کر کے ان میں سے کوئی بھی اختلاف امتی روایت نہیں کرتا۔ سخاوی نے صاف طور سے بحوالہ زرکشی بتا دیا کہ نصر مقدسی نے بھی اختلاف اصحابی ہی کو لکھا ہے، اس کو بھی بیان کر دیا کہ بیہقی کے رسالہ اشعریہ اور مدخل دونوں میں اختلاف اصحابی ہی ہے دیلمی کے متعلق بھی واضح کر دیا کہ ان کی مسند فردوس میں بھی اختلاف اصحابی ہی ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک کتاب میں بھی کسی جگہ اختلاف امتی کا لفظ ہوتا تو سخاوی ضرور لکھتے۔ خصوصاً جب وہ شروع میں اختلاف امتی رحمۃ کو حدیث قرار دیکر لکھ چکے تھے۔ باقی رہ گئے قاضی حسین، حلیمی اور سبکی اور امام الحرمین کو بھی لے لیجئے۔ تو اگر واقعی ان لوگوں نے اپنی کسی کتاب میں اختلاف امتی رحمۃ کو حدیث نبوی کی حیثیت سے لکھا ہوتا تو سخاوی ان لوگوں کا اور ان کی ان کتابوں کا جن میں اس حدیث کا ذکر کیا گیا ہے ضرور ذکر کرتے۔ سخاوی اور سیوطی بالکل ہم عصر تھے۔ سخاوی کے سات برس بعد سیوطی کی وفات ہوئی ہے۔ سخاوی سے قاضی حسین، حلیمی، امام الحرمین اور سبکی کی تصنیفات پوشیدہ نہ تھی۔ اسلئے یقیناً ان لوگوں کی کتابوں میں اختلاف امتی رحمۃ ہے ہی نہیں، ان لوگوں نے بھی لکھا ہوگا تو اختلاف اصحابی رحمۃ ہی لکھا ہوگا۔ یا کچھ بھی نہ لکھا ہو۔ بلکہ زیادہ قرینہ یہی ہے کہ ان دو میں سے کوئی قول بھی ان لوگوں کے کتابوں میں منقول ہی نہ ہو۔ ورنہ سخاوی ان لوگوں کو ہرگز نظر انداز نہ کرتے۔ خصوصاً جب کہ یہ لوگ متقدم ہیں باعتبار بعض مذکورین کے اور قاضی حسین تو ان سب سے متقدم ہیں جن کے نام جامع صغیر و مقاصد حسنہ میں اس سلسلہ میں آئے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ قاضی حسین کی اس تصنیف کا ذکر ہے جس میں انھوں نے اس حدیث کو لکھا ہے۔ حلیمی کی تصنیف کا نہ امام الحرمین کی تصنیف کا اور نہ سبکی کی تصنیف کا۔ اور جن لوگوں نے اختلاف امتی نہیں اختلاف اصحابی ہی والی حدیث بھی اپنی کسی کتاب میں بلا سند یا کسی سند کے ساتھ لکھی تھی ان کے نام کے ساتھ ان کی اس کتاب کا بھی ذکر جامع صغیر میں موجود ہے۔ دیکھئے نصر مقدسی کی کتاب الحجۃ، بیہقی کے رسالہ اشعریہ اور مدخل دونوں کا ذکر تصریح کے ساتھ موجود ہے۔ شارح جامع صغیر نے وغیرہم کے شرح میں دیلمی اور سبکی کے نام تو لکھ دیئے مگر یہ نہیں بتایا کہ قاضی حسین و امام الحرمین و حلیمی و سبکی نے اپنی کن کن کتابوں میں اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ شارح کا یہ ایک فریضۂ منصبی تھا وہ سیوطی کے بتائے ہوئے محدثین کی کتابوں کے نام کیا بتاتے کہ خود سبکی کا نام صرف لکھ گئے مگر سبکی کی اس تصنیف کا نام نہیں بتایا جس میں سبکی نے یہ حدیث لکھی ہے۔ سبکی کی طبیعت سے وہ واقف تھے۔ قرینے سے سمجھے کہ سبکی نے ضرور یہ حدیث نقل کی ہوگی اس لئے سبکی کا نام بھی دیلمی کے ساتھ لکھ دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حافظ جلال الدین سیوطی کا علم و فضل اور ان کا تقویٰ و ورع خاص کے دینی امور میں اس سے بہت بلند ہے کہ وہ ایک جھوٹی حدیث کو زبردستی سچی ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ واقعہ در اصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث جامع صغیر میں داخل کر دی گئی ہے، جبھی تو اس طرح کی کمزوریاں اس میں نظر آ رہی ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

قرینہ سے یہ معلوم ہوتا ہے قرینہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے جویبر بن سعید الازدی الکوفی متوفی ۱۴۵ھ نے اس حدیث کو وضع کیا جس کا ذکر المقاصد الحسنہ میں سخاوی نے کیا ہے اور میں نے پوری عبارت نقل کر کے اس کا

ترجمہ بھی آپ کے سامنے پیش کردیا۔ پوری حدیث فلسفہ نفسیات کے ماتحت بنائی گئی ہے کہ جس مسئلے کے متعلق شریعت اسلامیہ کا حکم دریافت کرنا ہو سب سے پہلے قرآن مبین میں ڈھونڈھو، جب تک مسائل کے جوابات قرآن میں ملتے رہیں کسی اور طرف نظر دوڑانے کی ضرورت نہیں اور نہ قرآنی حکم چھوڑ دینے کے لئے کوئی عذر، کوئی حیلہ حوالہ نکالنے کی گنجائش ہے۔ ہاں کسی مسئلے کا جواب صریح طور سے قرآن میں نہ ملے تو پھر سنت رسول میں تلاش کرو۔ سنت رسول بھی نہ ملے تو اقوال صحابہ میں ڈھونڈھو، کیونکہ روئے زمین پر صحابہ کی حیثیت وہی ہے جو جیسے آسمان پر ستاروں کی ہے۔ ان میں سے جن کو بھی تم نے پالیا اور جن کا قول بھی تمہیں مل گیا اور تم نے ان کا اتباع کیا تو ہدایت پا گئے۔

یہاں تک تو جویبر صاحب نے ایسی بات کہی جو عام طور پر مانی جاسکتی تھی۔ اس کے بعد کہا کہ واختلاف اصحابی لکم رحمۃ۔ یعنی آخر میں آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ "اور میرے صحابہ کا باہمی اختلاف تمہارے لئے رحمت ہے"۔ اس گمراہ کن قول کو ایسے موقع سے رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب کر کے بیان کیا ہے کہ پہلے اقوال کو صحیح تسلیم کر لینے کے بعد عقل ظاہر بیں خواہ مخواہ اس قول کو بھی صحیح ہی تسلیم کرلیگی۔ کیونکہ صحابہ عہد نبوی و عہد خلفائے راشدین میں مختلف ملکوں میں عامۂ مسلمین کی تعلیم کے لئے امیر بنا کر بھیجے جاتے تھے تو ان دور دور کے ملکوں میں بسا بھی ہوتا تھا کہ ایک ہی جیسی صورت مسئلہ متعدد جگہ پیش آئی اور ان متعدد مسر کردہ صحابہ نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق مختلف طریقے سے اجتہاد کیا اور مختلف جوابات اسی ایک صورت مسئلہ کے متعلق انھیں ان کے ذہنوں سے ملے اور وہ باہم مختلف احکام صادر کرنے پر مجبور ہوئے اور اس حکم دینے کے وقت ایک صحابی کو دوسرے صحابی کے حکم کی کوئی خبر نہ مل سکی۔ بعد والوں کو اسی ایک صورت مسئلہ کے متعلق متعدد صحابہ کے باہم مختلف احکام ملتے ہیں[۵] اس صورت حالات میں وضع کردہ ٹکڑا آسانی سے نبھ سکتا تھا۔

جویبر صاحب کا مقصود دراصل واختلاف اصحابی لکم رحمۃ کا اضافہ کسی صحیح حدیث میں ایک اضافہ نہیں ہے بلکہ یہی اضافہ ہے، دیرکا معارف و مشہور مضمون بطور تمہید کے پہلے بیان کرکے عام مسلمانوں کے ذہنوں کو اس اضافے کو تسلیم کرلینے پر آمادہ ہونے کی کوشش کی گئی ہے۔ جویبر کا اصل مقصد واختلاف اصحابی لکم رحمۃ کو حدیث بنانا تھا، اگر وہ یہ کہہ دیتا کہ یہ قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، تو کوئی شخص بھی اس کو قبول نہ کرتا، پڑھنے والا اس کو جھوٹا سمجھتا۔ پھر چونکہ جویبر بن سعید ایک مشہور غیر ثقہ اور متروک الحدیث راوی تھے اسلئے صحاح ستہ والے ہی نہیں بلکہ تیسری صدی تک کے تمام محدثین نے ان کی ایسی من گھڑت حدیث کو قابل التفات نہیں سمجھا اور کسی نے بھی اس کو اپنی کتاب میں داخل نہ کیا اور اگر کسی سازشی نے کسی شیخ الحدیث کی کتاب میں اس کو داخل بھی کر دیا ہوگا تو اسی خلاف عقل اضافے کی وجہ سے نظر پڑتے ہی اس شیخ الحدیث نے پہچان لیا ہوگا کہ یہ حدیث میری کتاب میں داخل کردی گئی ہے، میری لکھی ہوئی نہیں ہے کیونکہ یہ مضمون ہی بالکل نیا ہے جو کبھی کسی سے نہیں سنا گیا۔ اسی لئے سازشی منافقین کو اس کی منا جتوں کے بنانے کا بھی موقع نہ ملا اور اگر کسی نے کوئی متابعت بنائی بھی ہوگی تو وہ مقبول نہ ہو سکی اور رواج نہ پا سکی۔

جویبر کون ہیں؟ جویبر بن سعید الکوفی کا ذکر مفید حدیث نزول عیسی بن مریم علیہما السلام کی چوتھی قسط میں دسمبر ۵۲ء کے طلوع اسلام میں آچکا ہے۔ مختصراً یہاں بھی سن لیجئے کہ یحییٰ بن سعید اور عبدالرحمن بن مہدی ان کو متروک الحدیث سمجھتے تھے اسلئے

---

[۵] اس کی تشریح کے لئے مضمون کا آخری حصہ ملاحظہ فرمائیے۔ (طلوع اسلام)

ان سے کبھی کوئی حدیث روایت نہیں کرتے تھے۔ یحییٰ بن معین ان کو ضعیف لیس بشئی کہتے تھے۔ علی بن المدینی کہتے ہیں کہ ان کے والد نے کہا کہ یہ تو قطعاً ضعیف ہیں ضحاک سے بہت منکر حدیثیں روایت کیا کرتے ہیں۔ یعقوب بن سفیان نے ان کا ذکر ان لوگوں میں کیا ہے جن سے روایت کرنا جائز نہیں۔ نسائی، علی بن الجنید اور دارقطنی نے ان کو متروک الحدیث قرار دیا ہے اور نسائی نے غیر ثقہ بھی کہا ہے۔ ابن عدی نے کہا کہ ضعف تو ان کی حدیثوں پر چھایا ہوا ہے۔ ابن حبان نے کہا کہ اس نے ضحاک سے الٹی سیدھی حدیثیں روایت کی ہیں۔ ابو احمد الحاکم نے کہا کہ یہ گئی گذری حدیث والے ہیں اور ابو عبداللہ الحاکم نے کہا کہ میں ان کی ذمہ داری سے اللہ کے سامنے اپنی برات کا خواستگار ہوں۔ کم و بیش ۱۴۰ھ میں ان کی وفات ہے۔ تہذیب التہذیب اور لسان المیزان وغیرہ میں ان کا تفصیلی حال موجود ہے! اور یہ بھی مذکور ہے کہ یحییٰ بن سعید القطان نے فرمایا کہ لوگوں نے تفسیری روایتوں کے لینے میں تساہل سے کام لیا، کہ ایسے لوگوں سے تفسیر لی جن کو وہ حدیثوں کے لینے کے وقت قابل وثوق نہیں سمجھتے مثال کے طور سے ضحاک۔ جویبر اور محمد بن السائب الکلبی کے نام لئے اور فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی حدیثیں قبول نہیں کی جاتیں، مگر ان کی بیان کردہ تفسیریں قبول کر لی جاتی ہیں۔ دیکھئے تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۲۳

ضحاک بن مزاحم

اسی ضمن میں ضحاک بن مزاحم کا حال بھی آپ کو معلوم ہو چکا کہ یحییٰ بن سعید القطان نے جویبر بن سعید اور محمد بن السائب الکلبی کے ساتھ ضحاک کا ذکر کر کے یہ بھی بتا دیا کہ یہ بھی انھیں دونوں جیسے ہیں اور ان کی بھی تفسیر تو لی جاتی ہے مگر ان کی حدیثیں قبول نہیں کی جاتیں مگر بہتر ہے کہ مختصر طور سے ان کا حال بھی سن لیجئے مگر اتنا ذہن میں رہے کہ ضحاک بن مزاحم صاحب خالص خراسانی تھے۔

ابن حجر تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۴۵۳ میں لکھتے ہیں کہ امام شعبہ ضحاک سے روایت نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ضحاک نے ابن عباسؓ سے کبھی ملاقات نہیں کی اور یحییٰ بن سعید نے کہا کہ ضحاک ہم لوگوں کے نزدیک ضعیف تھے اور ابن حبان نے کہا کہ تابعین کی ایک جماعت سے ضرور ملاقات کی مگر صحابی سے ان کی لقا ثابت نہیں۔ ابن عدی نے کہا کہ یہ صرف تفسیر کے متعلق معروف ہیں مگر ابن عباس اور ابوہریرہ سے جو کچھ روایت کرتے ہیں وہ سب محل نظر ہیں۔ عبدالملک بن میسرہ نے کہا کہ انھوں نے ابن عباسؓ سے ہرگز ملاقات نہیں کی۔ مشاش[1] نے کہا کہ انھوں نے ابن عباسؓ کو دیکھا تک نہیں سنہ ۱۰۵ یا ۱۰۶ھ میں وفات پائی۔ اتنی تفصیل کے بعد آپ اس روایت کو بھی دیکھ لیجئے کہ ضحاک صاحب حضرت ابن عباسؓ ہی سے اس حدیث کی روایت کر رہے ہیں۔

مگر میں جہاں تک سمجھتا ہوں اس میں قصور غریب ضحاک کا نہیں ہے بلکہ جویبر بن سعید، عبدالعزیز بن ابی رواد، ابو خباب یحییٰ بن ابی حیہ الکلبی وغیرہم کا ہے جن لوگوں نے حدیثیں بنائیں اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب کیں اور غریب ضحاک کے سر تھوپ دیں۔ اسی لئے جب خود ضحاک سے عبدالملک نے پوچھا کہ تم نے ابن عباسؓ سے کچھ سنا ہے؟ تو ضحاک نے کہا کہ نہیں۔ مگر ان کے کوئی متبعین اس کا شور مچاتے رہے کہ ضحاک نے ابن عباسؓ سے حدیثیں سنی ہیں۔ چنانچہ ابو خباب کلبی نے کہا کہ ضحاک نے کہا کہ میں ابن عباسؓ کے پڑوس

---

[1] مشاش ابو ساسان الخراسانی یہ ضحاک کے ہم وطن بھی تھے اور شاگرد بھی اور محدثین ان کو ثقہ لکھتے ہیں اسلئے ابو خباب الکوفی الکلبی جو غیر ثقہ متروک الحدیث مدلس تھے ان سے زیادہ یہ مشاش الخراسانی قابل اعتبار تھے۔ ۱۲ منہ عفرلہ

میں سات برس تک رہا ہوں (شاید بچپن میں سات برس تک پڑوس میں رہے ہوں مگر نہ ان سے کچھ سننے کا موقع ملا نہ ان کو دیکھنے کا کبھی موقع ملا۔ یہ بھی اس وقت کہا جاسکتا ہے کہ شاید بچپن میں دیکھا ہو جبکہ ضحاک خراسان سے اِس عمر میں مدینے یا کوفے میں آئے ہوں؟)

تو آپ اس جویبر والی حدیث کو جس میں ایک تمہید کے ساتھ اختلاف اصحابی رحمۃ والا مضمون ادا کیا گیا اس کے مفہوم اور اس کے راویوں کے حالات جان کر پوری طرح سمجھ گئے کہ یہ حدیث کیسی ہے اور آپ کو یہ بھی معلوم ہو چکا کہ اختلاف اصحابی رحمۃ ایک ایسا مفہوم ہے کہ جویبر کے سوا کبھی کسی نے اس مضمون کی کوئی حدیث کسی صحابی سے نہیں روایت کی اور نہ کسی حدیثیں گھڑنے والے کی یہ ہمت پڑی کہ اس مضمون کی کوئی حدیث گھڑ کر کسی محدث کی کتاب میں داخل کردے۔

سلیمان شامی جویبر کی اس حدیث کا بھی قاضی حسین متوفی ۳۳۰ھ سے پہلے کبھی کسی نے نہ اپنی کسی کتاب میں ذکر کیا اور نہ سلیمان بن ابی کریمہ کے سوا اور کسی نے جویبر سے اس حدیث کو لیا اور سلیمان بن ابی کریمہ شامی تھے اور اپنے استاد جویبر کے پورے شاگرد تھے، یعنی یہ بھی ضعیف الحدیث و منکر الحدیث ہی تھے ان کا ترجمہ ابن حجر نے لسان المیزان ج ۳ ص ۱۰۲ میں مفصل طور سے لکھدیا ہے اور سلیمان بن ابی کریمہ کے بعد کا نام کسی نے لکھا ہی نہیں ہے کہ یہ معلوم ہوسکے کہ سلیمان بن ابی کریمہ سے کس نے سنا؟ اور نہ سلیمان بن ابی کریمہ کا سال وفات کسی نے لکھا ہے مگر یہ دوسری صدی کے اواخر کے آدمی تھے۔ ممکن ہے کہ تیسری صدی کے اوائل میں ان کی وفات ہوئی ہو۔ اسلئے نہ بیہقی متوفی ۴۵۸ھ ان سے سن سکتے تھے نہ طبرانی متوفی ۳۶۰ھ اور نہ دیلمی متوفی ۵۰۹ھ۔ ممکن ہے کہ سلیمان بن ابی کریمہ کے بعد بھی کچھ نام ہوں جن کا ذکر ضروری نہ سمجھا گیا۔ اور واقعی سلیمان بن ابی کریمہ، جویبر بن سعید اور ضحاک بن مزاحم کے نام معلوم کرلینے کے بعد سلیمان کے بعد کے راویوں کا حال جاننا ضروری بھی نہ رہا مگر دوسری اور تیسری صدی کے اختلاف پسند طبائع کو اس کی فکر تھی کہ کسی طرح جویبر کی اس حدیث کو تقویت پہنچائی جائے تو وہ کوئی دوسری حدیث حیلہ نہ کرسکے تو کم سے کم بعض تابعین کے اقوال ہی گھڑ لئے گئے۔ چنانچہ بیہقی متوفی ۴۵۸ھ نے سفیان ثوری متوفی ۱۶۱ھ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ سفیان نے افلح بن حمید متوفی ۱۵۸ھ سے انھوں نے قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق رضی متوفی ۱۰۲ھ سے سنا کہ انھوں نے (یعنی قاسم نے) کہا کہ اختلاف اصحاب محمد رحمۃ لعباد اللہ یعنی اصحاب محمد صلعم کا اختلاف اللہ کے بندوں کیلئے رحمت ہے۔ قاسم بن محمد ایک تابعی ہیں بیہقی اور سفیان ثوری کے درمیان تقریباً تین سو برس کا فاصلہ ہے اسلئے دونوں کے درمیان تین چار ناموں کی گنجائش ہے جب تک وہ تین چار نام نہ معلوم ہوں اس روایت کی حقیقت کس طرح معلوم ہوسکتی ہے۔ درحقیقت یہ سفیان ثوری پر ایک بہتان ہے۔

پھر اسی طرح قتادہ متوفی ۱۱۷ھ سے ایک روایت مقاصد حسنہ میں سخاوی متوفی ۹۰۲ھ بلا حوالہ نام کتاب لکھتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز متوفی ۱۰۱ھ فرماتے تھے کہ اگر اصحاب محمد صلعم آپس میں اختلاف نہ کرتے تو ہمیں اس کی خوشی نہ ہوتی کیونکہ اگر وہ لوگ باہم اختلاف نہ کرتے تو اتنی وسعتِ رخصت نہ ہوتی۔ یہاں بھی قتادہ اور سخاوی کے درمیان سات سو چاسی برس کا فاصلہ ہے۔ دونوں کے درمیان کتنے راوی ہوں گے آپ اندازہ کرسکتے ہیں جب تک ہر ایک کی وثاقت معلوم نہ ہو، اس وقت تک اس روایت کے صدق و کذب کا حال کس طرح معلوم ہوسکتا ہے؟

سنن دارمی کی روایت

ہاں سنن دارمی میں ایک روایت اس قسم کی ہے جس کو دارمی نے یزید بن ہارون متوفی ۲۰۶ھ سے انھوں نے حماد بن سلمہ متوفی ۱۶۷ھ سے انھوں نے حمید الطویل متوفی ۱۴۲ھ سے سنا کہ انھوں نے بیان کیا کہ عمر بن عبدالعزیز رح کے سامنے کسی نے کہا کہ کاش سب لوگ ایک بات پر مجتمع ہوتے. تو عمر بن عبدالعزیز رح نے کہا کہ لوگ اختلاف نہ کرتے یہ میرے لئے کوئی خوشی کی بات نہیں ہے. پھر انھوں نے تمام شہروں میں حکمنامہ بھیجدیا کہ تمام لوگ فقہائے متفق علیہ قول کے مطابق فیصلے کیا کریں۔ (سنن دارمی ج۱ ص۱۵۱ مطبوعہ دمشق)

سنن دارمی کا درجہ عام محدثین کے نزدیک صحاح ستہ کے بعد ہے. بعضوں نے اس کو ابن ماجہ کے عوض میں رکھکر صحاح ستہ میں داخل کیا ہے مگر عام محدثین نے اس کو تسلیم نہیں کیا. بہرحال جب بخاری و مسلم میں یارانِ طریقت نے من گھڑت حدیثیں رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب کرکے داخل کردیں تو غریب ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمن بن الفضل بن بہرام الدارمی متوفی ۲۵۵ھ کی کتاب سنن دارمی جس کو متعدد محدثین نے مسند دارمی لکھا ہے. حالانکہ وہ مسند نہیں ہے (کیونکہ صحابہ کے ناموں سے اس کی ترتیب نہیں ہے بلکہ فقہی ابواب پر مشتمل ہے جس طرح بخاری و مسلم وغیرہ) یہ کیونکر لوگوں کی مداخلت سے محفوظ رہ سکتی تھی۔ اور یہ حدیث جو حدیث نبوی نہیں ہے بلکہ کسی صحابی کا بھی نہیں صرف ایک تابعی کا قول ہے، اگر سنن دارمی میں داخل نہیں کی گئی ہے تو دارمی کے شیخ یزید بن ہارون کی کتابوں میں تو ضرور داخل کی گئی کیونکہ ان کا کاتب جس کا نام بھی ہارون تھا وہ ان کی حدیثوں میں اپنی طرف سے حدیثیں داخل کردیا کرتا تھا. چنانچہ تہذیب التہذیب ج۱۱ ص۳۶۹ میں ہے کہ یہ اکثر اپنے مستملی یعنی کاتب سے کہا کرتے تھے کہ مجھ کو یہ خبر ہے کہ تو میری حدیثوں میں کچھ داخل کردیا کرتا ہے تو تجھ سے جو کوشش اس قسم کی ہوسکے کر تارہ اللہ تیری نگہبانی نہ کرے، میں ۲۳ ہزار حدیثیں زبانی یاد رکھتا ہوں۔

یہ تو انھوں نے اپنے مستملی یعنی کاتب سے صرف کہدیا تھا مگر ان کے حافظے کا یہ حال تھا کہ ابن حجر خود اسی تہذیب التہذیب ج۱۱ ص۳۶۸ میں لکھتے ہیں کہ ربما اذا سئل عن حدیث لا یعرفہ فیامر جاریۃ فتحفظہ من کتابہ یعنی جب وہ کسی ایسی حدیث کے متعلق پوچھے گئے جس کو انھوں نے نہیں پہچانا (کہ یہ ان کی حدیث ہے) تو حکم دیتے تھے اپنی لونڈی کو، وہ ان کی کتاب دیکھکر ان کو یاد دلایا کرتی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ابن حجر ان کے آغازِ ترجمہ ہی میں ص۳۶۶ میں لکھتے ہیں کہ کان قد عمی یعنی یہ نابینا ہوگئے تھے. اور خود ان کی بصیرت فی الحدیث کے متعلق اسی کتاب کے ص۳۶۵ میں ابن حجر لکھتے ہیں کہ یحیی بن معین کہتے تھے کہ یزید لیس من اصحاب الحدیث لانہ لا یمیز ولا یبالی عمن روی. یعنی یزید بن ہارون حدیث جاننے والوں میں سے نہ تھے کیونکہ یہ تمیز نہیں کرتے تھے اور بے پروائی برتتے تھے کہ کس سے روایت کی ہے تو خیال فرمائیے کہ خود بصیرت فی الحدیث میں بھی کمزور، آنکھوں کی بصارت بھی ندارد۔ ان کا کاتب ایسا جو ان کی کتاب میں اپنی طرف سے خدا جانے کیا کیا داخل کردیا کرتا تھا. اس پر حافظہ ایسا کہ اس پر پورا اعتماد بھی نہیں۔ ورنہ ایسی کوئی حدیث جب پیش کی جاتی جس کو یہ اپنی حدیث کی حیثیت سے نہیں پہچانتے تھے تو اس سے انکار کردیتے نہ کہ اپنی لونڈی سے کتاب منگوا کر پڑھواتے اور جب وہ کتاب کی عبارت پڑھکر یاد دلاتی کہ آپ کی کتاب میں یوں لکھا ہوا ہے تو اس کو صحیح تسلیم کرکے روایت کرنے لگتے۔ ممکن ہے کہ وہ ان کے کاتب کی داخل کردہ ہو۔ غرض یہ روایت اگر سنن دارمی میں داخل کردہ نہیں ہے تو یزید بن ہارون، ان کی کتاب اور ان کے کاتب کے حالات کی روشنی میں سو فی صدی قرینے کی

روسے ضرور یزید بن ہارون کی کتاب میں ان کے کاتب کی داخل کردہ ہے۔

اور ایک روایت حضرت سخاوی متوفی ۹۰۲ھ لیث بن سعد متوفی ۱۷۵ھ سے نقل کرتے ہیں کہ یحییٰ بن سعید نے کہا کہ "اہل علم وسعت پیدا کرنے والے ہوتے ہیں مفتی لوگ ہمیشہ آپس میں اختلاف کرتے ہیں۔ یہ ایک چیز کو حلال قرار دیتا ہے تو وہ اسی کو حرام کہتا ہے، اور نہ یہ اس پر کوئی الزام رکھتا ہے نہ وہ اس پر" اس قول کا بھی وہی حال ہے کہ سخاوی اور لیث بن سعد کے درمیان سوا سات سو برس سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ دونوں کے درمیان چھ سات راویوں کے نام بتانا چاہئیں جب تک ان نامعلوم راویوں کی وثاقت معلوم نہ ہو، اس وقت تک اس روایت کی توثیق اور اس قول کی تصدیق کس طرح کی جاسکتی ہے؟

آخر میں خود سخاوی صاحب اس کا اعتراف فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ نے کہا کہ یہ درحقیقت کوئی حدیث نہیں ہے بلکہ ایک بات ہے جو زبانوں پر مشہور ہوگئی ہے۔ لیجئے خود سخاوی صاحب نے اپنے شیخ کا فیصلہ اسی حدیث کے متعلق سنا دیا۔ اب بھی اگر کوئی اسکو حدیث رسول ہی کہتا ہے تو پھر اس سے خدا ہی سمجھے۔

(باقی آئندہ)

رفتارِ عالم

گزشتہ مہینے جب فرانس کی حکومت ٹوٹی تو جینوا کانفرنس میں ایسی بددلی پھیل گئی کہ اس کی کامیابی کے امکانات کالعدم نظر آنے لگے۔ ادھر فرانس کے نمائندے "بے حکومت" ہوئے اُدھر برطانیہ اور امریکہ کے نمائندے جینوا چھوڑ کر چلے گئے جس سے عام طور پر یہ فرض کر لیا گیا کہ کانفرنس اپنی موت مر گئی۔ لیکن عین اس حال میں کہ اس کی موت کا یقین سا ہو چلا تھا اس میں نئی جان پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ فرانس میں خلاف توقع بہت جلد نئی حکومت تشکیل ہو گئی اور جو نئے وزیر اعظم مسٹر مانڈیس فرانس ـــ برسر اقتدار آئے، انہوں نے بڑے شد و مد سے یہ وعدہ کیا کہ وہ تیس دن کے اندر یعنی ۲۰ جولائی تک ہند چینی میں صلح کرا دیں گے نیز یہ کہ اگر وہ صلح نہ کرا سکے تو وزارت سے دستکش ہو جائیں گے۔ اس وقت تو ان کا وعدہ ضد داری نظر آتا تھا لیکن رفتہ رفتہ انہوں نے دنیا کو یہ باور [illegible] کرا دیا کہ وہ اس تن مردہ میں جان رفتہ واپس لا سکتے ہیں۔ انہوں نے چین کے وزیر اعظم چو این لائی سے ملاقاتیں کیں اور مفاہمت کیلئے فضا سازگار کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہو گئے۔ اس سے دنیا بھر کی نظریں ایک مرتبہ پھر جینوا پر مرکوز ہو گئیں۔ کانفرنس کا یہ عجیب مرحلہ تھا۔ تنہا فرانس اشتراکیوں سے مصروف گفتگو تھا۔ اشتراکی ایک طرف میدان جنگ میں فرانس کو پسپا کئے چلے جا رہے تھے، دوسرے وہ فرانس کے نئے وزیر اعظم کے اس وعدے کا پورا پورا فائدہ اٹھانے پر مصر تھے کہ اگر وہ ۲۰ جولائی تک کامیاب نہ ہوئے تو انہیں وزارت چھوڑنا پڑیگی۔ چنانچہ اشتراکیوں کی کوشش یہ ہو گئی کہ جنگی فتوحات پر زور دیں اور مذاکرات کو کھینچتے جائیں تاکہ ۲۰ جولائی کے لگ بھگ مانڈیس فرانس سے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کر لیں۔ چنانچہ چو این لائی نے اپنے مطالبات یہ پیش کئے۔

(۱) ویٹ نام میں آزاد انتخابات منعقد کئے جائیں اور ان کے بعد اشتراکی اور غیر اشتراکی عناصر کی مخلوط وزارت مرتب کی جائے۔

(۲) لاؤس اور کمبوڈیا میں موجودہ (غیر اشتراکی) حکومتیں برقرار رہیں لیکن فرانسیسی اور ویٹ منہ فوجیں واپس بلا لی جائیں۔

صورت اول میں یہ خدشہ پایا جاتا تھا کہ اشتراکیوں اور غیر اشتراکیوں کی مخلوط حکومت ایک وقت کے بعد اشتراکی ہی ہو جائیگی اور ویٹ نام فرانس کے قبضے سے نکل جائیگا۔ صورت ثانی میں بھی یہی خدشہ تھا یعنی فرانس کی فوج کے انخلاء کے بعد لاؤس اور کمبوڈیا کی دونوں ریاستیں اشتراکیوں کے قبضے میں چلی جائیں گی۔

مذاکرات جینوا

ان مذاکرات میں فرانس کی پوزیشن واقعی مخدوش تھی اور عین ممکن تھا کہ فرانس ایسی شرائط تسلیم کر لے جن سے ہند چینی اشتراکیوں ہی کے قبضے میں چلا جائے۔ لیکن واقعات کی رفتار نے فرانس کو تنہا نہیں رہنے دیا جیسے کہ سابقہ تبصروں میں ذکر آ چکا ہے۔ جینوا کانفرنس نے اس دلخراش حقیقت کو پوری طرح نمایاں کر دیا کہ مغربی اتحادیوں میں اختلافات کی وسیع خلیج حائل ہے۔ نیز یہ کہ اشتراکیوں نے ان اختلافات کو ابھار کر مطلب براری کی پوری کوشش کی ہے۔ برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر ونسٹن چرچل نے ان اختلافات کو مٹانے کی بازی لگائی۔ وہ اپنے وزیر خارجہ مسٹر ایڈن کے ساتھ امریکہ گئے اور امریکی صدر سے بالمشافہ گفتگوئیں کیں۔ ان ملاقاتوں کو بین الاقوامی سیاست میں بہت اہمیت دی گئی اور گو وقتی طور پر ان کا نتیجہ چنداں خوش آئند نظر نہیں آتا تھا، بتدریج یہ صاف نظر آنے لگا کہ امریکہ نے برطانیہ سے بہت حد تک اپنی حکمت عملی پر صاد کرا لیا ہے۔ ہند چینی میں امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے اختلافات کی صورت یہ تھی۔ فرانس ہند چینی کی جنگ سے اس حد تک عاجز آ چکا تھا کہ اس کے نزدیک جنگ کا خاتمہ زیادہ وقیع تھا۔ امریکہ اس قسم کی صلح چاہتا تھا جو بالآخر ہند چینی کو اشتراکی ملک نہ بنا دے۔ اس کے علاوہ اس کی حتمی رائے یہ ہے کہ اشتراکی امن کے متمنی نہیں۔ وہ مذاکرات کو مطلب براری کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ان کا علاج یہ نہیں

کہ ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے جائیں بلکہ یہ کہ ان کے مقابلے کیلئے دفاعی تنظیمیں تشکیل کی جائیں۔ اس لئے اس نے ایشیا میں ناٹو NATO کے نمونے کا "سیٹو" (SEATO) کا منصوبہ پیش کیا۔ برطانیہ عجیب تذبذب میں تھا۔ وہ چین کو ناخوش نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس چین سے تجارتی تعلقات قائم کرنے کی غرض سے اس کیلئے بھی تیار تھا کہ امریکہ کو مجبور کیا جائے کہ وہ چین کو اقوامِ متحدہ کا رکن بننے دے۔ مزید برآں اس کی نظریں ہندوستان پر بھی تھیں۔ وہ ہندوستان سے مل کر ہندوستان میں اپنے اجاروں کا بھی تحفظ کرنا چاہتا تھا اور اس کی مدد سے ایشیا میں بھی مناسب مقام حاصل کئے رکھنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ "سیٹو" کی تجویز کا موید نہیں تھا۔ برطانیہ نے اس کی بجائے یہ تجویز پیش کی کہ جنوب مشرقی ایشیا میں لوکارنو معاہدہ کی طرح کا ایک معاہدہ کر لیا جائے۔ لوکارنو معاہدہ ۱۹۲۵ء میں برطانیہ، جرمنی، بلجیم، فرانس اور اٹلی میں طے ہوا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ معاہد قومیں بیرونی حملے کی صورت میں ایک دوسرے کی امداد کریں گی جنوب مشرقی ایشیا میں اس تجویز کا مطلب یہ تھا کہ متعلقہ اقوام بشمول اشتراکی چین بیرونی حملہ کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کو پہنچنے کا عہد کرتیں۔ یہ معاہدہ بداہتاً ناقابلِ عمل ہوتا کیونکہ اپنے خصوصی مزاج کی بدولت اشتراکی اور مغربی اقوام معاہد نہیں ہو سکتیں۔ نیز یہ معاہدہ اشتراکیت کے فروغ کے خلاف کوئی ضمانت نہ ہوتا۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آئزن ہاور اور چرچل کی ملاقات سے یہ اختلافات ختم ہو گئے ہیں، لیکن یہ پتہ چلتا ہے کہ اقوامِ مغرب کی حکمتِ عملی میں ہم آہنگی کے آثار ضرور پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کا اندازہ ایک تو اس سے ہوتا ہے کہ برطانیہ نے لوکارنو معاہدہ پر اصرار چھوڑ دیا ہے اور اب "سیٹو" کی تشکیل سے متعلق مذاکرات ہو رہے ہیں۔ دوسرے جنیوا کانفرنس جو کہ سمٹ سمٹا کر فرانس اور چین کے درمیان ملاقاتوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اس میں پھر سے برطانیہ اور امریکہ شریک ہو گئے ہیں۔ محض یہی نہیں بلکہ امریکہ اور برطانیہ نے باہمی طور پر سات شرائط طے کی ہیں جن کے مطابق فرانس کو ہند چینی میں صلح کرنی چاہیئے۔ ان شرائط کا اعلان نہیں ہوا لیکن فرانس نے انھیں منظور کر لیا ہے۔ گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہند چینی کے مذاکرات امریکہ کی منشا کے مطابق آگے بڑھیں گے۔ ظاہر ہے کہ امریکہ کوئی ایسی صورتِ حال پیدا نہیں ہونے دیگا جس سے ہند چینی بآسانی اشتراکی قبضہ میں چلا جائے۔ لیکن آثار و قرائن سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ہند چینی اشتراکی اور غیر اشتراکی حصوں میں بٹ جائے گا اور یہ تقسیم دائمی سی ہو جائے گی۔

فیصلہ کن تاریخ! لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ۲۰ جولائی سے پیشتر معاہدہ ہو سکے گا؟ ہرچند اب تک اشتراکی چین نے فرانس کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھانا چاہا ہے کہ اس کا نمائندہ ۲۰ جولائی تک جنگ بند کرانے میں کامیاب نہ ہوا تو وہ مستعفی ہو جائیگا لیکن اب ایسے نظر آتا ہے کہ چین بھی مفاہمت میں مصلحت دیکھتا ہے۔ چین کی زیادہ تر جدوجہد رہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طریق سے اقوامِ متحدہ کا رکن بن جائے۔ اب تک اقوامِ متحدہ اور اس کے متعدد اداروں میں کوئی ایک سو پچاس مرتبہ چین کیلئے یہ کوشش ہو چکی ہے کہ وہ اس کا رکن بن جائے مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ اب اسکی نظریں آنیوالی جنرل اسمبلی پر ہیں۔ وہ رکنیت حاصل کرنے کیلئے سر توڑ کوشش کرنا چاہتا ہے۔ اس کیلئے اسے دیگر ارکان کی تائید کی ضرورت ہے۔ وہ ہند چینی میں پوری ذمہ داری سے کام لیکر اقوامِ متحدہ کے ارکان کی اکثریت کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر ہند چینی میں لڑائی بند ہو جائے تو خود فرانس اور برطانیہ اس کے موید ہو جائیں گے اور اس طرح امریکہ کی مخالفت کمزور ہو جائیگی۔ یہ چین کی کمزوری ہے جس کے پیش نظر توقع کی جا رہی ہے کہ وہ آمادہ بہ مفاہمت ہو جائیگا۔ اندریں حالات ہند چینی کے جنگ بند ہو جانے کے امکانات روشن نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ چین اس قیمت پر رکنیت خرید سکے گا۔ امریکہ کا رویہ چین کے معاملے میں متشدد ہے ان دنوں جبکہ رکنیت کا چرچا ہونا شروع ہوا ہے تو امریکہ میں مخالفت کا طوفان امنڈ آیا ہے۔ بعض اعلیٰ امریکی قائدین نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اقوامِ متحدہ کو امریکہ اور چین میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اگر

چین رکن بن گیا تو امریکہ اقوام متحدہ کو چھوڑ دیگا۔ گو امریکہ کا اقوام متحدہ سے نکلنا قرین قیاس نہیں تاہم یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ جب بھی چین کی رکنیت کا سوال سامنے آیا وہ حق استرداد (ویٹو) ضرور استعمال کریگا۔

اقوام مغرب کے اختلافات باہمی کا اثر یورپ کی سیاست پر بھی پڑ رہا ہے۔ یورپ کے دفاعی سلسلہ کے متعلق جو معاہدہ دو سال پیشتر ہوا تھا اس کی دیگر اقوام نے تو تصدیق کر دی ہے لیکن فرانس اسے برستور ٹالتا چلا آرہا ہے۔ وہ جرمنی کے ڈر سے ایسا کر رہا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ جرمنی مسلح ہو جائے۔ اب فرانس کے نئے وزیر اعظم نے پھر اس معاہدہ کا ذکر چھیڑا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس سے برطانیہ اور امریکہ میں اضطراب پیدا ہو گیا چنانچہ دونوں ممالک فرانس کو دھمکی دے رہے ہیں کہ اگر اس نے جلد معاہدہ مذکور کی تصدیق نہ کردی تو جرمنی کو آزاد کر کے E.D.C. میں شریک کر لیا جائے گا۔ یہ کہا نہیں جا سکتا کہ امریکہ اور برطانیہ واقعی ایسا کریں گے لیکن جرمنی کو مسلح کرنے کیلئے معاہدوں کی رو سے انہیں فرانس کی رضامندی ضرور حاصل کرنا پڑیگی۔ ان دنوں اس سلسلہ میں تگ ودو ہو رہی ہے۔

"چین وہند بھائی بھائی"

جون کے آخر میں جبکہ واشنگٹن میں مسٹر آئزن ہاور اور چرچل کی ملاقاتیں ہو رہی تھیں، نئی دہلی میں پنڈت نہرو نے چین کے وزیر اعظم چو۔این لائی کو اپنے ہاں مدعو کر رکھا تھا۔ ان دو کانفرنسوں میں ایک ہی تاریخوں پر منعقد ہونا ایک "اتفاق" تھا جس کا ہندوستان کے منادوں نے خوب ڈھنڈورہ پیٹا اور نئی دہلی کی ملاقاتوں کو واشنگٹن کی ملاقاتوں کا درجہ دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ انہوں نے یہ بھی دنیا بھر کو جتایا کہ دونوں ملاقاتیں ایشیا کی قسمت سے متعلق ہو رہی ہیں لیکن نئی دہلی کے مذاکرات کا اثر دور رس ہوگا۔ ہندوستان نے چینی وزیر اعظم کے استقبال میں بڑے مبالغے سے کام لیا اور "چین ہند بھائی بھائی" کے نعرے لگا لگا کر یہ ثابت کرنا چاہا کہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے دوست ہیں اور وہی ایشیا کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ چو کو بلا کر در اصل پنڈت نہرو امریکہ پر یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ بین الاقوامی منڈی میں ان کا بھاؤ کیا ہے لیکن اس طرح انہوں نے اپنی قیمت کو اور گرا لیا ہے۔ ہندوستان چین کا حریف نہیں ہو سکتا مگر وہ اس خطرے کو ٹال بھی نہیں سکتا۔ اسکی البتہ ایک صورت ہے، اور وہ یہ کہ چین کی خوشامد کی جائے۔ ہندوستان یہی چال چل رہا ہے وہ اس سے دوسرا فائدہ یہ اٹھانا چاہتا ہے کہ امریکہ اسے چین کی طرف جھکتا دیکھ کر اس کی خوشامد کرے اور اسے زیادہ سے زیادہ مالی مدد دے۔

چو این لائی نے ہندوستان کی اس روش کو اپنے مفید مطلب بنانے کی بازی لگائی۔ اس سے پیشتر چین اور دیگر ایشیائی اقوام کے مابین معاہدہ عدم تعرض کا اشاروں کنایوں سے ذکر آ چکا ہے۔ ہندوستان کی ایسے معاہدے سے غرض کچھ بھی ہو یہ ظاہر ہے کہ چین سے جو معاہدہ ہوگا اس میں برتری چین ہی کو حاصل ہوگی۔ گویا نئی دہلی کی ملاقات چین کی طرف سے قیادت ایشیا حاصل کرنے کی ایک اہم کوشش تھی۔ نہرو اور چو کی سہ روزہ ملاقاتوں سے جو بات ابھر کر سامنے آئی وہ یہی تھی کہ ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے۔ ان کی سرحدات کو توڑا نہ جائے وغیرہ۔ اس ضمن میں تبت کے معاہدہ کا بھی ذکر آیا جو چین اور ہندوستان کے مابین طے پا چکا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اس معاہدہ کی رو سے ہندوستان نے نہ محض تبت کو چین کا حصہ تسلیم کر لیا بلکہ وہ وہاں سے پسپا بھی ہو آیا۔ اس موقع پر تبت کے معاہدے کے ذکر کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ چین ہندوستان سے ایک اور پسپائی کا مطالبہ کر رہا ہے۔

خلافِ پاکستان مساعی

ہندوستان عالمی سیاست میں اسقدر الجھا ہوا ہے مگر وہ پاکستان کی تخریب کے اساسی ذریعہ سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں۔ ان دنوں اس کی زیادہ تر توجہ پاکستان کو دریائی پانی سے محروم کرنے پر مرکوز رہی ہے ہندوستان نے پہلے پہل ۱۹۴۸ء میں دریاؤں کا پانی روکا تھا اور اس کے بعد پانی کی ہم رسانی سے متعلق پاکستان ... تشویش میں ہی رہا

تاہم پانی جاری رہا۔ یہ تنازع جاری تھا کہ ۱۹۵۲ء میں عالمی بنک کی معرفت پاکستان اور ہندوستان میں پانی کی تقسیم کے لئے مذاکرات شروع ہوئے مذاکرات کی طرح پڑی تو ہندوستان نے (کہ وہ دریاؤں کے سرچشموں پر قابض تھا) عالمی بنک سے یہ عہد کیا کہ وہ اس تنازع کا تصفیہ ہونے سے پہلے دریاؤں کے بہاؤ میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کریگا۔ یہ مذاکرات دو سال سے جاری ہیں لیکن تاہنوز کوئی تصفیہ نہیں ہو سکا۔ ہندوستان ایک طرف ان مذاکرات میں مصروف رہا اور دوسری طرف بھاکرہ ننگل منصوبہ کی تکمیل میں کوشاں رہا جو دریائے ستلج کا پانی نہروں کے ایک نئے جال میں منتقل کرکے ہندوستان کے صحراؤں کو سرسبز و شاداب بنا دیگا لیکن پاکستان کے سبزہ زاروں کو پھر سے صحراؤں میں تبدیل کر دیگا۔ ہندوستان چونکہ تصفیہ سے پیشتر ستلج کا پانی اپنا نہیں سکتا تھا اسلئے اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان نے عالمی بنک کی تجاویز کو مسترد کر دیا ہے جس سے مذاکرات کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے لہذا ہندوستان آزاد ہے کہ وہ اپنے منصوبوں کی تکمیل کرے۔ بعض ہندوستانی لیڈروں نے اسے عالمی بنک کا ثالثی فیصلہ تک کہہ دیا حالانکہ امر واقعہ صرف اس قدر تھا کہ عالمی بنک نے تجویز پیش کی تھی کہ ستلج، بیاس اور راوی کے دریاؤں کا پانی ہندوستان استعمال کرے اور چناب، جہلم اور سندھ کا پانی پاکستان استعمال کرے۔ یہ تجویز پاکستان نے رد نہیں کی بلکہ ابھی حکومت کے زیر غور ہے۔

بعض اطلاعوں سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ ہم اول الذکر تین دریاؤں سے اس وقت تک محروم نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہم آخر الذکر تین دریاؤں میں سے بہت سی نئی نہریں نہ کھود لیں جن سے اس کی تلافی ہو سکے۔ اس پر عالمی بنک نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان اس مطلب کیلئے پاکستان کو چھ کروڑ روپیہ ادا کرے۔ ہندوستان اس شرط پر آمادہ تو ہو گیا لیکن پھر سوال پیدا ہوا کہ کیا ہندوستان واقعی یہ رقم پاکستان کو ادا کر دیگا۔ اس سے پیشتر اس نے کئی رقوم بہ مطابق فیصلہ ادا نہیں کیں۔ اس پر پاکستان نے مطالبہ کیا کہ اس رقم کی ادائیگی کی ضمانت عالمی بنک دے لیکن بنک نے ایسا کرنے سے معذوری کا اظہار کیا۔ اب یہ معاملہ یہاں رکا ہوا ہے۔

ہندوستان نے اس مرحلہ پر عجیب روش اختیار کی۔ اس نے اول تو بنک کی مذکورہ بالا تجویز کو ثالثی فیصلہ کہنا شروع کر دیا جو بالکل غلط تھا پھر یہ کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان نے تجویز کو مسترد کر دیا ہے (حالانکہ یہ بھی خلاف واقعہ ہے) جس سے مذاکرات ختم ہو گئے ہیں اور ہندوستان اس پابندی سے آزاد ہو گیا ہے کہ وہ دریاؤں کے پانی میں مداخلت نہ کرے۔ یہ کہہ کے ہندوستان نے ۸ جولائی کو بھاکرہ نہر کا افتتاح کر دیا اور ستلج کا معتد بہ پانی اس کی طرف منتقل کر دیا۔ اس نہر کا منصوبہ تقسیم سے پیشتر کا ہے اور اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ اس سے پاکستان اور ہندوستان کے دونوں علاقوں کو سیراب کیا جائے لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ جہاں ہندوستان کے خشک علاقے سیراب ہونگے وہاں پاکستان کے زرخیز علاقے خشک ہو جائیں گے ہر چند اس نہر کا پاکستان کو علم تھا اور یہ بھی حکومت کو معلوم تھا کہ اس کا پاکستانی معیشت پر کیا اثر پڑیگا۔ عالمی بنک سے مذاکرات میں بھی اسے پیش نظر رکھا گیا تھا۔ یوں بھی پاکستان کو ۱۹۴۸ء میں اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ ہندوستان نے عین وقت پر پانی روک دیا تھا اور اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً پانی کے بہاؤ میں مداخلت کرتا چلا آ رہا تھا لیکن اس کے باوجود نہ تو مذاکرات کے ذریعہ اس کا حل تلاش کیا گیا اور نہ متبادل ذرائع آبپاشی کا ہی انتظام کیا گیا۔ چنانچہ جب نہر کا افتتاح ہوا اور خطرہ حقیقی ہو گیا اور جگہ جگہ سے یہ اطلاعیں آنے لگیں کہ ستلج کا پانی کم ہو گیا ہے تو کابینہ پاکستان کا ہنگامی اجلاس منعقد ہوا اور ہندوستان کو شدید احتجاج بھیجا گیا، ملک بھر میں زید، عمر، بکر نے بیانات سے اخبارات کے کالم کے کالم سیاہ کر دیئے۔ لیکن ستلج کا جو پانی ہندوستان نے ہٹا لیا ہے اس کا کچھ بھی بدل نہ مل سکا۔ ہندوستان نے جو صورت حال پیدا کر دی اس کے دو جواب ہو سکتے تھے۔ اول یہ کہ فوجی قوت کے زور پر ہندوستان کے اس ہاتھ کو روکا جائے اور دوسرے یہ (اور یہ اس کے باوجود ہونا چاہئے) کہ نئی نہریں کھودی جائیں جو ان علاقوں کو سیراب کریں جنہیں ہندوستان نے پانی سے محروم کر دیا ہے۔

جہاں تک فوجی کارروائی کا تعلق ہے اس کیلئے ہر چند بہت سے امور کو سوچنا پڑتا ہے لیکن قوموں کی زندگی میں بعض فیصلے ایسے ناگزیر ہو جاتے ہیں کہ نتائج و عواقب کو محض باتوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔ ہندوستان کا منصوبہ اگر کامیاب ہو جائے تو پاکستان صحرائے اعظم بن جائیگا۔ اس میں انسانوں کیلئے غذا پیدا ہو گی نہ مویشیوں کیلئے چارہ۔ اس سے بڑھکر اور کونسا سنگین موقع آسکتا ہے۔ اس وقت پبلک اور اخبارات میں فوجی کارروائی کا ضرور ذکر آرہا ہے لیکن حکومت نے مصالحت پسندی کا ہی ثبوت دیا۔ وزیر اعظم نے ہندوستان کو یہ پیشکش کی کہ ہرچند معاہدہ کی رو سے اسے ستلج کا پانی غصب کرنے کا حق نہیں ہے تاہم وہ اس کیلئے بھی تیار ہیں کہ ایسا فیصلہ کر دیا جائے جس سے بھاکرہ نہر کو بھی پانی میسر آسکے لیکن ہندوستان مصالحت کیلئے تیار نہیں وہ پاکستانی دریاؤں کے سرچشموں پر قابض ہے اور پاکستان کیلئے نت نئی مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔ لہٰذا وہ کیوں صلح کی بات کرے۔ چنانچہ نئی دہلی کی اطلاعات سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان پاکستانی احتجاج کو رد کر دیگا اور مزید گفتگو کیلئے تیار نہیں ہو گا۔

قول و فعل جہاں تک نئی نہروں کا تعلق ہے اس سلسلہ میں گو پنجاب میں کچھ کام ضرور ہوا ہے لیکن اب بھی ایسی سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا جا رہا جس سے معلوم ہو کہ مصیبت سر پر آجانے سے ہی قائدین ملک کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ ایک تازہ پریس کانفرنس میں وزیر اعظم نے اس تنازع پر تفصیلی گفتگو کی لیکن اس کا انداز وکیلانہ بحث کا تھا۔ پاکستان کا مقدمہ اپنی جگہ بجا لیکن ہندوستان سے معاملہ دلائل سے طے نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہاں دلائل ہی دلائل ہیں اور عمل کا نام نہیں۔ اس کانفرنس میں وزیر اعظم صاحب نے کہنے کو تو یہاں تک کہدیا کہ وہ نئی نہریں کھودینگے اور ضرورت پڑی تو خود جا کر کھودیں گے لیکن ان کے بیان سے کہیں پتہ نہیں چلتا کہ کچھ منصوبہ بندی کر لی گئی ہے اور اس کی تکمیل کے انتظامات ہو رہے ہیں۔ اس بیان سے عوامی افسردگی چھپل گئی۔ دلائل کے اعتبار سے بھی یہ بیان مؤثر ثابت نہیں ہوا۔ ایک موقع پر وزیر اعظم نے یہ شکایت کی کہ عالمی بنک نے نامکمل معلومات کی بنا پر فیصلہ کیا ہے لیکن جب بعض اخبار نویسوں نے پاکستانی نمائندوں پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے پاکستانی مقدمہ ٹھیک طرح پیش نہیں کیا اور ضروری اعداد و شمار مہیا نہیں کئے تو وزیر اعظم نے اس الزام کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا لیکن یہ بھی نہ بتا سکے کہ عالمی بنک نے کیوں نامکمل اعداد و شمار پر انحصار کیا۔ دوسرے مقام پر آپ سے یہ سوال کیا گیا کہ جب آپ کو معلوم تھا کہ بھاکرہ نہر کھودی جا رہی ہے اور بالآخر اس میں پاکستانی حصے کا پانی استعمال ہو گا تو آپ نے کیوں بروقت حفاظتی تدابیر اختیار نہ کیں؟ اس کے جواب میں وزیر اعظم نے فرمایا کہ وہ ہندوستان کی دیانت پر اعتماد کئے رہے اور یہ یقین رہے کہ ہندوستان معاہدوں کا پاس کریگا حالانکہ بچہ بچہ جانتا ہے کہ گذشتہ سات سال میں ہندوستان نے شاید ہی پاکستان سے کوئی ایسا معاہدہ کیا ہو جسے اس نے دیانتداری سے پورا کیا ہو۔ یہ ایک ناقابل تردید اور معلوم حقیقت ہے اس کے باوصف ہندوستان کی دیانت کا ذکر اپنی بے عملی کو چھپانا نہیں تو اور کیا ہو سکتا ہے۔

دریائی پانی سے کشمیر کا سوال ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ پانی کا مسئلہ دراصل کشمیر ہی کا پیدا کردہ ہے۔ اگر کشمیر پاکستان میں شامل ہو جائے تو پاکستانی دریاؤں کے سرچشمے پاکستان ہی کے قبضے میں آجائیں گے۔ اسوقت یہ کہنا مشکل ہے کہ حکومت کشمیر کے بارے میں کیا کر رہی ہے۔ گذشتہ سال وزیر اعظم نے پنڈت نہرو سے براہ راست مذاکرات شروع کئے تھے اور انھوں نے یہ طے کیا تھا کہ اپریل ۱۹۵۴ء تک ناظم استصواب کا تقرر ہو جائے گا۔ لیکن نہ صرف ایسا نہیں ہوا بلکہ پنڈت نہرو نے اس دوران میں شیخ عبداللہ کو معزول کر کے گرفتار کیا (محض ایک عبداللہ کا معاملہ ایسا تھا کہ اسی پر ہندوستان کا مقدمہ ختم کرایا جا سکتا تھا) بلکہ یہ کوشش کی کہ ناظم استصواب کے تقرر تک معاملہ پہنچنے نہ پائے۔ اندریں حالات اگر اپریل سے پہلے نہیں تو اپریل کے فوراً بعد یہ سوال سامنے آجانا چاہئے تھا کہ اب جبکہ ہندوستان سے براہ راست مذاکرات ناکام بنادیئے گئے ہیں تو کشمیر میں کیا کیا جائے۔ اس دوران میں کئی مرتبہ یہ کہا گیا کہ اب معاملہ پھر سے اقوام متحدہ میں پیش کیا جائیگا اور دراصل یہی ایک صورت بھی تھی۔ لیکن معلوم نہیں کہ حکومت کے مصالح کیونکر اس کی اجازت نہیں دیتے کہ کشمیر کے متعلق مزید اقدام کریں۔ اپریل کے بعد بھی تین ماہ گذر چکے ہیں اور ابھی تک فیصلہ نہیں ہو پایا۔ اب حالات جیسا بن جائے تو اسوقت بین الاقوامی

میں ہماری پوزیشن پہلے سے بہتر ہے۔ ہمارا امریکہ سے بھی فوجی معاہدہ ہو چکا ہے اور ترکی سے بھی۔ ہم امریکہ سے بھی اپنی تائید کی توقع رکھ سکتے ہیں اور ترکی سے بھی۔ اس صورت حال کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ بعض حلقوں میں یہ خدشہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ شاید یہی دوستی کشمیر کے راستے میں حائل ہے۔ ایسا ہے یا نہیں، حکومت پاکستان کے مذبذب سے کئی طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔

گلِ دیگر!

ہندوستان کے معاملے میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ انہی دنوں ہمارے وزیر اقلیت مسٹر غیاث الدین پٹھان دہلی تشریف لے گئے تاکہ ہندوستانی وزیر اقلیت سے ملاقات کریں اور اقلیتوں سے متعلق گفتگو کریں۔ یہ واضح رہے کہ ہندوستان میں نہ محض ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے ہیں بلکہ علانیہ طور پر مسلمانوں کو شدھ کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ان پر روزگار کی کئی صورتیں بند ہیں اور انھیں طرح طرح سے جائدادوں سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ کھوکھرا پار سے ہر روز مہاجرین پاکستان میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ بھی بند نہیں ہوا۔ اس کے باوجود ہمارے وزیر اقلیت ملاقاتوں کے بعد جس مشترکہ اعلامیہ پر دستخط کرتے ہیں اس میں ان امور کا تو ذکر نہیں ملتا اور صرف مشرقی بنگال کے متعلق اس میں تحریر ہوتا ہے کہ وہاں سے ہندو بھاگ رہے ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ ہندوستان سابق وزیر اعلیٰ فضل الحق کی حمایت کرتا رہا ہے حتیٰ کہ ان کی برطرفی کے بعد بھی یہ حمایت جاری ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ وہ فضل الحق حکومت کے ذریعہ اپنی مطلب براری کرا سکتا تھا۔ ان کی معزولی پر ہندوستان نے یہ پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا کہ ہندوؤں میں بھگدڑ مچ گئی ہے اور وہ اپنے آپ کو گورنری راج میں غیر محفوظ پا کر ہندوستان چلے آ رہے ہیں۔ چنانچہ نئی دہلی کے مشترکہ اعلامیہ میں یہ کہا گیا کہ جب دونوں وزراء کی توجہ اس کی طرف منعطف کرائی گئی تو پٹھان صاحب نے کہا کہ وہ اعداد و شمار دیکھ کر صورت حال کا تعین کریں گے۔ اول تو یہی بات ازحد قابلِ اعتراض ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہا ہے اور جس کا خمیازہ پاکستان بھگت رہا ہے اس کا کچھ پرچا نہ ہو۔ دوسرے ذکر ہو تو محض مشرقی بنگال کا جس میں کچھ صداقت نہیں۔ اس سے عام طور پر یہی رائے قائم کی جائیگی کہ پاکستان اور ہندوستان میں اگر کچھ ہو رہا ہے تو یہ کہ مشرقی بنگال سے ہندو ترکِ وطن کر کے ہندوستان بھاگ رہے ہیں اور یہ اتنے عظیم پیمانے پر ہو رہا ہے کہ اقلیتی وزراء جو عمومی باتوں کا جائزہ لیتے ہیں، وہ بھی مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس ایک واقعہ کا خصوصی ذکر کریں۔ تعجب ہے کہ ہمارے وزیر اقلیت کے پاس اتنے اعداد و شمار بھی موجود نہیں تھے کہ وہ اسی وقت اس بے بنیاد خبر کی تردید کر دیتے۔ نیز ہندوستانی وزیر اقلیت کو یہ بتاتے کہ مسلمانانِ ہندوستان پر کیا قیامت گزر رہی ہے۔ جب بین الاقوامی مذاکرات میں اس طرح کے نمائندے شریک ہوں اور ان کی معلومات کا یہ عالم ہو تو اس پر مطلقاً تعجب نہیں کرنا چاہئے کہ فیصلے ہمارے حق میں نہیں ہوتے۔

سیاسی زندگی

یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ پاکستان میں سیاسی زندگی ختم ہو چکی ہے، عہد حاضر میں سیاسی زندگی کا ثبوت فعال اور متحرک سیاسی پارٹیوں میں تلاش کیا جاتا ہے لیکن پاکستان میں صورت یہ ہو چکی ہے کہ مسلم لیگ مردہ جماعت ہو چکی ہے۔ اب تو اس کی مردنی کا یہ عالم ہے کہ اسکے احیاء کی تمام کوششیں بھی بے سود ثابت ہو رہی ہیں۔ مسلم لیگ کی بجائے ابھی تک کوئی نئی سیاسی جماعت تشکیل نہیں ہو سکی۔ لے دے کے بنگال کا جگتو فرنٹ معرضِ وجود میں آیا تھا لیکن وہ بھی صحیح معنوں میں سیاسی پارٹی نہ تھا کیونکہ وہ کئی پارٹیوں کا مرکب تھا اور پھر اس کا دائرۂ عمل اسمبلی کے اندر محدود تھا۔ مزید برآں اس کے عزائم و مقاصد سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سرے سے پاکستانی تصوری کا موید نہ تھا۔ موجودہ نظریات کے مطابق قوم اور حکومت کے مابین رابطہ سیاسی پارٹی سے قائم ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ رابطہ موجود ہی نہیں۔ ایسی صورت میں حکومت کو براہ راست عوام سے رابطہ قائم کرنا چاہئے لیکن حکومتی نمائندے اور کارندے نہ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور نہ اس کی اہلیت کا ہی انھوں نے ثبوت دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم اپنے

حال میں پریشان ہے اور حکومت دفاتر میں اپنا کاروبار چلا رہی ہے۔ قیادت و ملت کے درمیان خلیج اس وسعت کی حائل ہو جائے تو پھر اللہ ہی مالک ہے۔ ہمارے ہاں جو کچھ ہو رہا ہے ـــ یا جو کچھ نہیں ہو رہا ہے ـــ اس کی وجہ صرف یہی ہے۔ پاکستان اب عملاً ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں سیاسی پارٹیوں کے وجود کو یکسر ختم کر دینے کی ضرورت ہے۔ سیاسی پارٹیاں سرے سے موجود ہی نہیں اسلئے کسی قسم کی تخریب کی ضرورت نہیں بلکہ اپنی تمام مساعی کو اس پر مرکوز کرنا ہوگا کہ کس طرح حکومت کے کارندے عوام کے نمائندے بن جائیں اور ان دونوں کے مابین کوئی فاصلہ نہ رہے۔ اگر ملی مساعی کی سمت یہ ہو جائے تو موجودہ بے عملی بے یقینی اور افسردگی کا دور ختم ہو سکتا ہے۔

لیکن ایسے آثار بالکل نظر نہیں آرہے۔ ارباب سیاست کے فکر و نظر کی سطح کا قیاس اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مسلم لیگ کے ایک بنگالی رکن نے ان دنوں پارٹی میں یہ تجویز پیش کی کہ آئندہ ۲۱ سال تک کیلئے مسلم لیگ کے علاوہ دیگر سیاسی پارٹیوں کو ممنوع قرار دیا جائے ایک پارٹی کا تجربہ کمال اتاترک نے ترکی میں کیا تھا جو کامیاب رہا۔ روس میں بھی ایک ہی پارٹی کام کر رہی ہے لیکن یہ دونوں مثالیں پاکستان پر صادق نہیں آتیں۔ ترکی میں ـــ اور روس میں بھی ـــ جو انقلابات آئے وہ انہی پارٹیوں کے پیدا کردہ تھے جو بعد میں فائز حکومت ہوئیں۔ پاکستان کا معاملہ اس اعتبار سے ترکی اور روس سے ملتا ہے کہ یہاں بھی مسلم لیگ ایک ایسی جماعت موجود ہے جس نے پاکستان قائم کیا لیکن اگر مسلم لیگ تقسیم کے فوراً بعد قوم سے یہ مطالبہ کرتی کہ مسلم لیگ نے پاکستان بنایا ہے اور اب ایک مدت تک اسے ہی یہ اختیار ہونا چاہئے کہ وہ اس کی صحیح خطوط پر تربیت و استحکام کرے تو ملک و ملت کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ اسوقت مسلم لیگ کا وقار دلوں میں تھا اور عوام کو اس پر اعتماد تھا۔ نیز قائداعظم کی ذات گرامی موجود تھی۔ لیکن سات سال کے دوران میں مسلم لیگ نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ پاکستان کو مضبوط و منظم بنانے کی اہل نہیں۔ اس وقت جو خبیث پھل پاکستانیوں کے حصے میں آئے ہیں وہ اسی کی سیاست کا نتیجہ ہیں۔ بنگال میں جگتو فرنٹ کا عروج بھی مسلم لیگ کی سیاست ہی کا ثمر ہے۔ ان حالات میں تجویز مذکور کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا کہ "بایں بہانہ مگر عمر خود دراز کنم" بہ نظر غائر دیکھا جائے تو مسلم لیگ کے سامنے میدان اب بھی خالی ہے۔ وہ کوئی کام کر کے دکھائے تو ملک میں محترم بن سکتی ہے کیونکہ اس کے مقابلے میں کوئی دوسری جماعت اب تک ہردلعزیز نہیں ہو سکی۔

کیف تحی الموتیٰ!

لیکن جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے مسلم لیگ کا یہ حال ہو چکا ہے کہ اب اس کا احیاء بھی آسان نظر نہیں آتا۔ ایک عرصے سے یہ تجویز ہو رہی ہے کہ ایک کنونشن طلب کیا جائے جس میں مسلم لیگ کے نئے اور پرانے کارکن شریک ہوں اور اس طرح جماعتی احیاء کا کوئی لائحہ عمل مرتب کیا جائے پہلے اس کنونشن کیلئے اپریل کا مہینہ تجویز ہوا تھا، پھر جولائی کے آخر میں تین تاریخیں مقرر ہو گئیں اب اسے اکتوبر تک کے لئے ملتوی کر دیا گیا ہے اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ مشرقی بنگال سے جہاز بروقت نہیں چلے گا اور پھر عید ہے، محرم ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس قیادت کے کیا کہنے جو اصولی ملی مسائل کو ان معمولی اور بے کار وجوہات کی بنا پر ملتوی کرتی چلی جا رہی ہے یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب مسلم لیگ کے احیاء کا مسئلہ سامنے آیا تو فوراً یہ سوال سامنے آگیا کہ جماعت کا صدر کون ہوگا۔ یہ سوال اس لئے پیدا نہیں ہوا کہ صدارت کے لئے موزوں ترین فرد کو منتخب کیا جائے بلکہ اس سے یہ تنگ و دو شروع ہو گئی کہ صدر کون بنتا ہے کوئی نام سامنے پیدا ہوئے لیکن رفتہ رفتہ سب چھٹتے گئے۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں کسی ایسے شخص پر نظریں نہیں جم سکیں جو مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کے تقاضوں کو پورا کر سکتا۔ ان دنوں عمومی اعتبار سے محترمہ فاطمہ جناح پر اتفاق پایا جاتا ہے گو بعض حلقوں میں قابل فہم وجوہ کی بنا پر یہ کوشش ہو رہی ہے کہ وہ صدر نہ بنیں۔

ان دنوں سردار عبدالرب نشتر نے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ سے استعفا دیدیا ہے اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ وہ مسلم لیگ کا احیا فوری چاہتے ہیں لیکن ارباب لیگ اسے ملتوی کرتے چلے آتے ہیں۔ نشتر صاحب کا رویہ اپنی جگہ دلچسپ ہے۔ آپ برسوں سے مسلم لیگ سے متعلق ہیں اور اس اعتبار سے مسلم لیگ کی تباہی کے ویسے ہی ذمہ دار ہیں جیسے وہ دوسروں کو گردانتے ہیں۔ لیکن حکومت سے علیحدہ ہو کر انھوں نے یہ مہم شروع کردی کہ مسلم لیگ کے کرتا دھرتا وہی بن جائیں۔ کہیں نئے اور پرانے مسلم لیگیوں کو یکجا کرنے کے دعوے باندھے گئے اور کبھی مسلم لیگ میں واپس کردو کے مطالبے کئے گئے۔ لیکن معاملہ جہاں تھا وہیں رہا۔ کیونکہ عمل صفر تھا۔ جب اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا تو آپ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ میں شریک ہو گئے اور اس کا جواز یہ دیا کہ صدر مسلم لیگ نے ان سے کچھ عہد و پیمان کئے ہیں۔ کیا عہد و پیمان ہوئے؟ اس کا پبلک کو علم نہیں تھا۔ یہ عہد و پیمان پورے ہوئے یا نہیں اور نہیں ہوئے تو کیوں؟ یہ بھی کوئی نہیں جانتا۔ اب اچانک وہ مستعفی ہو گئے ہیں، مسلم لیگ سے نہیں، مسلم لیگ کی مجلس عاملہ سے۔ حالانکہ اگر انھیں یہ یقین ہے کہ ارباب لیگ جماعتی تنظیم کو ٹال رہے ہیں تو انھیں ایسی جماعت سے ہی علیحدہ ہو جانا چاہیے تھا۔ استعفیٰ کے وقت یہ بتایا گیا تھا کہ آپ وضاحتی بیان دینگے۔ یہ بیان ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا۔ اس ایک واقعہ سے مسلم لیگ کی حیات و ممات اور اس کے متعلقین کے کردار کا قیاس کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جو گروہ اپنی جماعت کی از سر نو تنظیم نہیں کر سکتا وہ اس انقلابی تصور کو کیسے قبول کر سکتا ہے کہ ملت میں پارٹیوں کی ضرورت نہیں۔ ملت بجائے خود ایک پارٹی ہے۔

مسلم لیگ کے احیاء کے سلسلہ میں ایک قابل قدر کوشش پنجاب کے وزیر اعلیٰ، ملک فیروز خاں نون نے کی ہے۔ انھوں نے برطانوی احزاب سیاسی کے آئین و نظام کا مطالعہ کر کے ایک مسودۂ آئین پیش کیا ہے۔ یہ مسودہ اس وقت ایک سب کمیٹی کے پیش نظر ہے۔ اس میں ملک صاحب نے کوشش کی ہے کہ جماعت کا آئین ایسا بنایا جائے کہ وہ جمہوری ممالک کی سیاسی پارٹیوں کے ہم پایہ ہو سکے۔ ملک صاحب کی یہ کوشش اس اعتبار سے قابل تحسین ہے کہ وہ اپنی پارٹی کو عام جمہوری تصور کے مطابق بنانا چاہتے ہیں۔ اس مسودے کی قابل ذکر خصوصیات یہ ہیں۔ اس کے مطابق جماعت کے صدر اور حکومت کے وزیر اعظم کو ایک شخصیت میں مجتمع نہیں کیا گیا۔ جماعت کے صدر کے لئے یہ پابندی لگائی گئی ہے کہ وہ ایک سال کے بعد بدلے اور زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ یعنی مسلسل دو سال تک صدر رہ سکے۔ صدارت چھوڑنے کے بعد وہ دو سال تک حکومتی عہدوں کا اہل نہیں ہو سکے گا۔ اس تجویز میں یہ فائدہ ہے کہ جماعت حکومتی مناصب حاصل کرنے کا زینہ نہیں بن جائیگی اور صدر کا وقت جماعتی تنظیم پر صرف ہوگا۔ لیکن اس کا یہ نقصان بھی ہو سکتا ہے کہ بہتر افراد اپنی توجہات جماعت پر صرف کرنے کی بجائے حکومتی ایوانوں میں داخل ہونے پر مرکوز کر دینگے۔ مجلس عاملہ کے متعلق یہ تجویز ہے کہ وہ منتخب ہو نہ کہ صدر کی نامزد۔ اس سے یہ فائدہ مترتب ہو سکے گا کہ عاملہ صدر کی جی حضوری نہیں رہے گی اور چونکہ منتخب ہو کر آئیگی اسلئے ارکان جماعت کی نمائندہ ہوگی۔ یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ ارکان سازی ہر سال ہو (اب تین سال کے بعد ہوتی ہے) تاکہ ہر سال نئے ارکان جماعت میں داخل ہوتے جائیں اور اسے نئی زندگی دیتے جائیں۔ ایک اہم تجویز یہ بھی ہے کہ انتخابات سے پیشتر ایک کنونشن منعقد ہو جو حکومت کے لئے پروگرام مرتب کرے۔ اس سے پارٹی اور حکومت کے دوائر بھی معین ہو جائیں گے اور دونوں اپنی جگہوں پر بے خوف کام کر سکیں گی۔

یہ تجاویز اپنی جگہ مستحسن ہیں لیکن کہا نہیں جا سکتا کہ انھیں منظور کر لیا جائیگا اور کس شکل میں۔ پھر آئین کتنا ہی خوش آئند کیوں نہ ہو اس کا نتیجہ تو چلانے والوں کے بس میں ہوتا ہے۔ جیسے چلانے والے ہوں گے ویسے نتائج برآمد ہونگے۔

وحدتِ پاکستان

آئین پاکستان پایۂ تکمیل کو پہنچتا جا رہا ہے۔ بنیادی اصولوں کی رپورٹ امروز و فردا میں مکمل ہو جائے گی اور تسوید آئین کا کام شروع ہو جائے گا۔ ابھی دو اہم معاملات ایسے ہیں جن سے متعلق کوئی تصفیہ نہیں ہو سکا۔ ایک مسئلہ صوبوں اور مرکز میں تقسیم اختیارات کا ہے، اور دوسرا ریاستوں کے خاتمہ یا بقا کا۔ صوبوں اور مرکز کا تعلق وفاقی آئین کے مطابق چنداں دشوار نہیں ہونا چاہیئے لیکن مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کا جو تنازع پیدا کر دیا گیا ہے اس نے اسے پیچیدہ مسئلہ بنا دیا ہے۔ ہمارے قائدین اسے کیسے حل کرتے ہیں اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ملک کے مستقبل کا دار و مدار اس فیصلہ پر ہو گا۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا ریاستوں کو ختم کر دیا جائے یا انہیں باقی رکھا جائے۔ اگر پاکستان کا مفاد سامنے رکھا جائے تو یہ مسئلہ بھی پریشان کن نہیں رہتا، لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اربابِ حکومت کی کوئی متعین پالیسی نہیں ہے۔ حال ہی میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ بلوچستانی ریاستوں کو ختم کر کے بلوچستان کو ایک صوبہ بنا دیا جائے۔ اگر بلوچستان میں ایسا ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسری جگہوں پر ایسا نہ ہو۔ لیکن معاملہ ابھی تک گومگو میں ہے۔ ایسے مفادات ہیں جو ادغام نہیں چاہتے اور وہ ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا رہے ہیں کہ ریاستوں کا وجود باقی رہے۔ اسمیں یہاں تک غلو کیا جا رہا ہے کہ مثلاً ریاست خیرپور کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ اس کا کلچر علیحدہ ہے لہٰذا اسے سندھ میں شامل نہیں کرنا چاہیئے۔ اس ریاست کی آبادی بیس لاکھ کے لگ بھگ ہے اور رقبہ ایک تحصیل کے برابر لیکن علیحدگی پسندوں نے اسمیں علیحدہ کلچر تک کا تصور پیدا کر دیا ہے۔ دیکھا جائے تو یہی ایک وجہ ریاستوں کو ختم کر دینے کیلئے کافی ہونی چاہیئے کیونکہ اس سے ملک و ملت کی وحدت پارہ پارہ ہوتی ہے۔ پاکستان کو زیادہ سے زیادہ متحد ہونے کی ضرورت ہے اس کیلئے ضروری ہے کہ ریاستیں تو ایک طرف صوبوں تک کا وجود ختم کر دیا جائے اس سے صوبائیتیں بھی ختم ہو جائیں گی۔ لیکن کرنیوالوں کا یہ حال ہے کہ انہی دنوں وزیر اعظم نے کہا ہے کہ اگر میرا بس چلے تو میں صوبوں کو ختم کر دوں۔ یہ عجب تماشا ہے کہ ملک کے وزیر اعظم کہہ رہے ہیں کہ اگر میرا بس چلے تو۔۔۔! پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ اسقدر بے بس کیوں ہیں؟ اگر صوبوں کا وجود ختم کرنے میں پاکستان کا بھلا ہے تو وہ کیوں اس جیسے کوئی اقدام نہیں کرتے۔ وہ کچھ کریں تو قوم کو پتہ چل جائیگا کہ کون راہ میں حائل ہے۔ ایک طرف یہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف مجلس دستور ساز میں یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ صوبوں کی حدود میں کمی بیشی کے مجاز گورنر جنرل نہیں بلکہ مجلس دستور ساز ہے۔ یہ فیصلہ درست ہو سکتا ہے لیکن بے وقت کیا گیا ہے جبکہ صوبوں کو ختم کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں اور ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے مفاد کی خاطر صوبوں کا وجود باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ انہی لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ یہ پخ لگا دی گئی ہے تاکہ صوبوں کا وجود بآسانی ختم نہ ہو سکے۔ اس طریق کار کو مزید پیچیدہ یوں بنا دیا گیا ہے کہ جب کسی صوبے کی حدود میں تبدیلی کا خیال ہو اس کیلئے پہلے متعلقہ صوبے کی رضامندی حاصل کر لینی چاہیئے۔ اس کا نتیجہ یہی ہو گا کہ کسی صوبے کی حدود میں کمی بیشی ناممکن نہیں تو بہت دشوار ہو جائیگی۔ حالانکہ صوبوں کا وجود و عدم وجود اس بنا پر ہونا چاہیئے کہ ان سے ملک کو کیا فائدہ پہنچتا ہے نہ کہ اس بنا پر کہ بعض لوگ اس کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ دراصل صورت یہ ہے کہ نااہل قیادت نے جمہوریت کا مفہوم غلط سمجھ لیا ہے اور جمہوری اصولوں کو ملکی مفاد کے تابع رکھنے کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی!

موجودہ قیادت سے اصلاحِ حال کی توقع رکھنا عبث ہے۔ اب تو یہی ہے کہ ملک کا آئین (جیسا کچھ بھی یہ بن رہا ہے) جلد از جلد تکمیل تک پہنچ جائے تاکہ اس کے ماتحت نئے انتخابات ہوں۔ ان انتخابات میں اگر قوم نے ہوش اور سمجھ سے کام لیا تو پاکستان کا کوئی مستقبل ہو سکتا ہے لیکن اگر اس وقت بھی وہی کچھ ہوا جو پہلے انتخابات میں ہوتا چلا آیا ہے تو پھر ——— خدا ایں سخت جاں را یار بادا!!

مولوی - صوفی - اور حدیث

(دوسری تیسری ہجری میں)

"ابنِ اسلام"

"طبقات الکبریٰ" صوفیوں کا تذکرہ ہے جس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے "تذکرہ جامعہ اولیاء اللہ و صوفیہ کرام از بدوِ اسلام تا قرن دہم"۔ اور مصنف کا تعارف اس طرح پر ہے "مصر کے مشہور مصنف محدث فقیہ و فقیر، عالم ربانی، غوث الصمدانی، قطب ربانی امام عبدالوہاب شعرانی علیہ الرحمہ"۔ یہ تذکرہ دو ضخیم جلدوں میں مکمل ہوا ہے۔ اسوقت میرے پیش نظر پہلے حصے کا اردو ترجمہ مترجمہ مولانا سید عبدالغنی صاحب وارثی اسسٹنٹ اکونٹنٹ جنرل سرکار عالی نظام ہے۔ یہ حصہ پہلی، دوسری اور تیسری صدی ہجری کے صوفیا کے ذکر پر مشتمل ہے امام شعرانی، امام ابن تیمیہؒ کے ہم عصر ہیں اور تصوف پر ان کی سخت تنقیدوں سے سخت بیزار معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ تصوف کا منکر محض متعصب ہے ۔ "جیسا کہ ہم اپنے زمانے میں ابن تیمیہ کا انکار اپنے اور اپنے بھائیوں (صوفیوں) کی نسبت دیکھ رہے ہیں جو عارفین میں سے ہیں۔ بھائیو! جس میں یہ صفت (انکارِ تصوف) پائی جائے اس سے پرہیز کرو اور جس طرح خونخوار درندوں سے بھاگتے ہو اسی طرح اس کی صحبت سے بھاگو"۔

علامہ ابن جوزی میرے نزدیک نہایت سلیم الطبع، دقیقہ رس اور فاش گو بزرگ گزرے ہیں۔ مصنف تذکرہ امام شعرانی نے تصوف کے متعلق ان کی تنقید بھی نقل کی ہے ۔ "ابن الجوزی نے امام غزالیؒ، بلکہ حضرت جنیدؒ و حضرت شبلی کی نسبت علانیہ لکھا ہے کہ میں بقسم کہتا ہوں کہ ان بزرگوں نے شریعت کو بالکل تہ کر کے رکھدیا ہے۔ اے کاش یہ لوگ صوفی نہ ہوئے ہوتے!"

"طبقات الکبریٰ" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیشہ ور علما دوسری صدی ہجری ہی میں عام طور پر عالم اسلامی میں پھیل چکے تھے اور مسلمانوں کو حقیقی اسلام سے منحرف کر رہے تھے۔ چنانچہ امام شافعی متوفی ۲۰۴ھ کا قول نقل کیا ہے ۔ "جو شخص چاہتا ہے کہ اللہ اس پر نورِ قلب کا دروازہ کھولدے اس کو لازم ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ جن علماء کا مقصود دنیا ہے ان کو دشمن سمجھے"۔

شعبہ ابن الحجاج رضی اللہ عنہ روایت و حدیث کے امیر المومنین سمجھے جاتے تھے۔ ان کا قول ہے کہ ۔ "خدا کی قسم شیطان مولویوں سے اسی طرح کھیلنے لگا، جس طرح بچے اخروٹ سے کھیلتے ہیں"۔

عبداللہ بن المبارک (ولادت ۱۱۸ھ) ان سے کسی نے پوچھا "کمینے لوگ کون ہیں؟" انھوں نے کہا "جو اپنے دین کو وجہ معاش بناتے ہیں"۔ یہ صحابہ و تابعین کے حالات سننے کو اپنے زمانے کے علما کے پاس بیٹھنے پر ترجیح دیتے تھے۔

محمد بن یوسف اصفہانی متوفی ۱۸۴ھ عالموں، محدثوں اور قاضیوں پر سخت تنقید کرنے کے بعد فرماتے ہیں ۔ "ہمارے اصحاب خدا ان پر رحمت کرے چلے گئے اور ہم کو اس دنیا کے بیت الخلاء میں چھوڑ گئے"۔

فضیل بن عیاض بہت مشہور صوفی بزرگ ہیں ۱۸۰ھ میں رحلت فرمائی۔ فرماتے ہیں "جہانتک ہوسکے مولویوں سے دور ہی رہو۔ کیونکہ اگر

یہ تم کو دوست کہیں گے تو تمہاری ایسی تعریف کرینگے جس کے تم لائق نہیں۔ اور اگر تم سے خفا ہونگے تو تمہارے خلاف جھوٹی گواہی دینگے اور وہ مان لی جائیگی۔"

اس زمانے کے ایک بزرگ عالم کو مخاطب کرکے فرمایا ۔" اے علما! تم پہلے شہروں کے چراغ تھے جن سے لوگوں کو روشنی پہنچتی تھی۔ مگر اب تم تاریک ہوگئے اور تم پہلے تارے تھے جن سے لوگ اپنا رستہ معلوم کرتے تھے مگر اب تم کالی گھٹا بن گئے الخ"

ان کا قول ہے کہ ۔" خدا کے مولوی منکسر اور رقیق القلب ہوتے ہیں اور دنیا کے مولوی غرور و تکبر والے اور عام لوگوں کو برا سمجھنے والے ․ ․ ․ ․ غیبت مولویوں کا شیوہ ہے ․ ․ ․ ․ دنیوی عالم کے ساتھ بیٹھنے سے پرہیز کرو کیونکہ یہ تم کو دنیا کے فریب اور چمک دمک میں پھنسا دے گا۔"

ذوالنون مصری بڑے پائے کے صوفی بزرگ سمجھے جاتے ہیں ۲۴۵ھ میں وفات پائی۔ اپنے زمانے کے علماء سے سخت بیزار رہتے تھے۔ ان کے منہ پر ان کی برائیاں بیان کرتے تھے اور کہتے تھے کہ تمہارے علم کا مقصد محض حصول دنیا ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ ۔" اس زمانے میں عابدوں، زاہدوں اور مولویوں نے گناہ کو معمولی بات سمجھ لیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے پیٹوں اور شرم گاہوں کی خواہشوں میں ڈوب گئے اور اپنے عیبوں کے مشاہدے سے روک دیئے گئے اور اسلئے وہ ہلاک ہوگئے مگر انھیں خبر نہیں۔ وہ حرام پر جھک گئے اور حلال کی جستجو کو چھوڑ بیٹھے ․ ․ ․ ان کے دل تو دراصل بھیڑیوں کے سے ہیں مگر انھوں نے اپنے آپ کو انسانی پوشاک کے غلاف میں چھپا رکھا ہے ․ ․ ․ اللہ کی مسجدوں کو ․ ․ ․ ․ اپنی بیہودہ باتوں اور لڑائی جھگڑوں اور اپنے شور و غل کا اکھاڑا بنا رکھا ہے اور علم کو دنیا کے پھانسنے کا جال بنایا ہے پس ان کی صحبت سے حذر کرو۔"

بشر حافیؒ متوفی ۲۲۷ھ فرماتے ہیں ۔" اے بگڑے ہوئے عالمو! تم نبیوں کے وارث ہو ․ ․ ․ تم نے اپنے علم کو روزی حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیا۔ کیا تم اس سے بھی نہیں ڈرتے کہ دوزخ کی آگ سب سے پہلے جس چیز سے سلگائی جائیگی وہ تمہیں ہوگے۔"

حاتم اصمؒ متوفی ۲۳۷ھ نے اپنے زمانے کے علماء کے خلاف بہت کچھ کہا ہے نمونتہً ایک قول ملاحظہ فرمایئے ۔" اے برے عالمو! تمہاری مثال تو ان جالیوں کی ہے جو دنیا میں پیچھے کاٹے ہوئے ہیں اور اس کی رغبت کرنے والے ہیں ․ ․ ․ تم عوام کو بگاڑنے والے ہو الخ"

عاصم انطاکیؒ فرماتے ہیں ۔" علماء و عباد درندے جانور اور اچک لینے والے بھیڑیئے ہوگئے ہیں ․ ․ ․ اے بصیرت والو عبرت حاصل کرو۔"

سید الطائفہ جنیدؒ متوفی ۲۹۷ھ فرماتے ہیں ۔" جب اللہ مرید کی بھلائی چاہتا ہے تو اس کو صوفیوں کی طرف پہنچا دیتا ہے اور مولویوں کی صحبت سے روک دیتا ہے۔"

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں "مولویت" ایک بیحد خطرناک وبائی صورت میں اسی قدیم زمانے میں پھیل چکی تھی اور ذہین لوگ اس کی مضرتوں سے آگاہ ہوکر عوام کو بھی متنبہ کرتے رہتے تھے لیکن عوام کی سادہ لوحی سے جیسے جیسے اس کا رواج بڑھتا گیا حقیقی اسلام پیچھے ہٹتا گیا یہانتک کہ بقول حسن بصریؒ "مسلمانی در کتاب" ہوکر رہ گیا ۔ اس کے ساتھ ہی اسی کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تصوف بھی ذریعہ معاش کے طور پر اسی زمانے میں استعمال ہونے لگا تھا۔ چنانچہ حضرت جنیدؒ ہی کا قول ہے "جب تم صوفی کو اپنے ظاہر کی آراستگی میں مشغول دیکھو تو سمجھ لو کہ اس کا باطن خراب ہے۔"

ابوبکر محمد بن عمر حکیم وراق کہتے ہیں کہ" عالموں میں خرابی آئی تو طاعتیں بگڑیں اور فقیروں میں خرابی آگئی تو اخلاق فاسد ہوئے۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ہی کی خرابیاں بڑھتی گئیں۔ اور ان خرابوں ہی کو عوام نے شرعی اور روحانی مقتدا سمجھ لیا۔ اور اگر کہیں کوئی بھلا آدمی پیدا ہوا کہ امت کو ان کی لوٹ کھسوٹ سے بچائے تو ان مقدس سوداگروں نے عوام و حکام کے ہاتھوں اس کو سخت سے سخت ایذائیں پہنچائیں اسکی تفصیل بھی "طبقات الکبریٰ" کے مقدمے میں ملتی ہے۔ اسکے علاوہ تاریخ و سیر کی کتابیں بھی ایسے روح فرسا مظالم سے جو مخلص مصلحین پر ڈھائے گئے بھری ہوئی ہیں۔

یہی دوسری تیسری صدی ہجری کا زمانہ جس میں مولویت اور صوفیت کے پیشے ایجاد ہوئے اسی زمانے میں ایک تیسرا مقدس پیشہ بھی ایجاد ہوا جس کی بنیاد پر غیر قرآنی مذہب اور حاکیت کا محل تعمیر کیا گیا۔ وہ تھا حدیث سازی کا فن اس پر تقدیس کے ایسے خوش نما غلاف چڑھائے گئے کہ عوام تو عوام بہت سے خواص بھی اسی میں مبتلائے فتنہ ہوگئے۔ تاہم ہر زمانے میں ایسے حقیقت شناس بزرگوں کے وجود کا سراغ مل جاتا ہے جنھوں نے حدیث کے خلاف آواز اٹھائی۔ "طلوع اسلام" میں امام ابوحنیفہؒ کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں کہ حدیث کے متعلق ان کی رائے کیا تھی۔ اور اسی بنا پر اصحاب حدیث نے ان کے خلاف زبان طعن دراز کی۔ "طبقات الکبریٰ" میں بعض مشہور ائمہ و صوفیہ ایسے ملتے ہیں جو روایت حدیث کی مضرتوں سے آگاہ ہو چکے تھے نمونے کے طور پر چند اقوال یہاں پیش کرتا ہوں۔

امام مالکؒ جو سب سے پہلے جامع مانے جاتے ہیں ان کے اساتذہ کی تعداد نو سو ہے جن میں سے تین سو تابعی تھے۔ ان کا قول ہے کہ "روایتوں کی کثرت سے علم نہیں آتا۔ وہ تو ایک نور ہے جو اللہ تعالیٰ قلب میں اتارتا ہے۔"

فضیل بن عیاض کہتے ہیں "جس نے قرآن کے معنی سمجھے اس کو حدیث لکھنے کی ضرورت نہ رہی" — اب یہ کہا جاتا ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن کوئی شے نہیں۔ بلکہ حدیث آگئی تو سب کچھ آگیا۔ قرآن کی الگ ضرورت نہ رہی — اسحٰق بن ابراہیم نے فضیل سے درخواست کی کہ مجھے کوئی حدیث سنایئے فضیلؒ نے کہا "اگر تو مجھ سے دینار مانگتا تو مجھ پر حدیث کی طلب سے زیادہ آسان تر ہوتا۔ اے غافل جو کچھ تجھے معلوم ہے اگر تو اس پر عمل کرتا تو تجھے حدیث سننے کی فرصت نہ ملتی۔" یعنی عمل کرنے والوں کو شغل حدیث کی فرصت ہی نہیں ملنی چاہیے۔

ذوالنون مصری سے کسی نے کہا "آپ حدیث میں کیوں مشغول نہیں ہوتے؟" انھوں نے کہا "حدیث کیلئے اور لوگ ہیں۔ ... الخ"

ابونصر بشر حافیؒ فرماتے ہیں "جو شخص دنیا میں عزت اور آخرت میں سلامتی چاہے وہ نہ حدیث بیان کرے نہ گواہی دے نہ کسی قوم کا امام بنے اور نہ کسی کا کھانا کھائے"۔ ایک شخص نے ان سے حدیث سنانے کے متعلق اصرار کیا انھوں نے انکار کیا آخر مایوس ہو کر اس نے کہا "اے ابونصر! جب قیامت میں خدا تم سے پوچھیگا کہ تم نے لوگوں کو حدیثیں کیوں نہ سنائیں تو کیا جواب دوگے؟" بشر نے کہا "میں کہونگا اے پروردگار تو نے مجھے نفس کی مخالفت کا حکم دیا تھا۔ میرا نفس حدیثیں بیان کرنے اور سردار بن بیٹھنے کو چاہتا تھا سو میں نے اسکی مخالفت کی (اور حدیثیں بیان نہ کیں) اس سے معلوم ہوا کہ لیڈر بننے کیلئے حدیث گوئی کا رواج تھا۔

نصر بن احمدؒ کہتے ہیں کہ تین چیزیں ہر بری کی آفتیں ہیں۔ بیاہ کرنا۔ حدیثیں لکھنا اور مخالف سے ملنا۔ (یہ جنید کے ہم عصروں اور مصر کے بڑے بزرگوں میں سے تھے)۔

ابوالعباس احمد بن مسروق متوفی ۲۹۹ھ کہتے ہیں کہ میں نے خواب دیکھا کہ قیامت بپا ہے اور دسترخوان بچھائے گئے ہیں اور میں نے اس پر بیٹھنے کا ارادہ کیا تو مجھے کہا گیا یہ صوفیوں کیلئے ہے میں نے کہا میں بھی صوفیوں میں سے ہوں۔ جواب ملا تو ان میں تھا لیکن حدیث کی کثرت اور دوسروں سے متمیز ہونے کی محبت نے تجھے صوفیوں کے ساتھ ملنے سے باز رکھا۔ میں نے کہا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے توبہ کی اور بیدار ہو گیا اور اس قوم (صوفیہ) کے طریق پر توجہ کی اور کہا کہ حدیث کیلئے میرے سوا اور لوگ ہیں:

غور کا مقام ہے کہ اگر یہ لوگ حدیث کو قرآن کی طرح وحی (مثلہ معہ) جانتے تو اس کے متعلق ایسے الفاظ زبان سے نکال سکتے تھے؟ اور سننے والے اسے برداشت کر سکتے تھے؟ — ہمارے جو معاصر شور مچاتے ہیں کہ انکار حدیث کا فتنہ اس زمانہ کی ایجاد ہے گزشتہ ۱۲ صدیوں میں کہیں یہ آواز نہیں آئی۔ ساری امت ہمیشہ حدیث کی دینی اور الہامی حیثیت کی قائل چلی آئی ہے۔ کیا وہ ان سطور پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟

اگر بنیاد کمزور ہے تو ۔

..... مکان کبھی پختہ نہیں بن سکتا ۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی قوم صحیح اسلامی کردار کی حامل ہو تو ....

اپنے بچوں کو صحیح اسلامی تعلیم دیجئے ۔

صحیح اسلامی تعلیم کے لئے ایسی کتاب کی ضرورت ہے جس میں اسلام کی صحیح صحیح تصویر پیش کی گئی ہو ۔

یہ کتاب ہے ۔

اسلامی معاشرت

جسے جناب پرویز نے بچوں عورتوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے خاص طور پر لکھا ہے ۔

اور جسے ادارہ طلوع اسلام نے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے ۔

ضخامت ۱۹۲ صفحات ۔ قیمت (مجلد مع گرد پوش) -/۲ روپے ۔

(علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ کراچی ۔

قرآن اور حدیث

دونو دین کے رکن ھیں !

~~کیا یہ~~ ٹھیک ھے ؟

ٹھیک ھے تو کسطرح - اور غلط ھے تو کیوں ؟

کیا ان دونوں کی حیثیت ایک جیسی ھے ؟

اگر نہیں تو پھر ان کی حیثیّت کیا ھے ؟

ان تمام اھم سوالات کے تفصیلی جواب کے لئے -

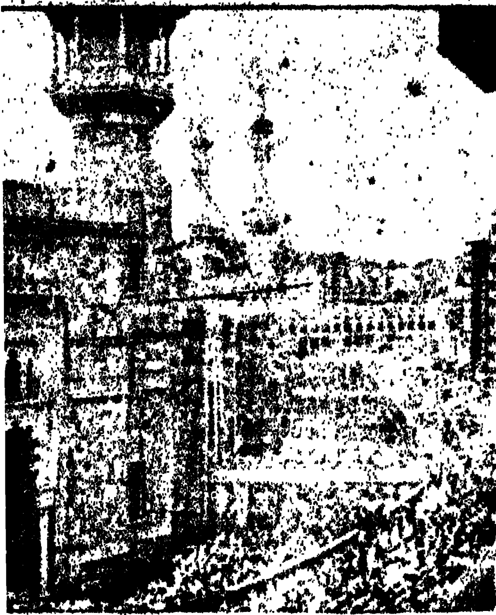
مقام حدیث

ملاحظہ کیجئے جس میں آپ کو احادیث کے متعلق اتنی معلومات حاصل ھونگی جو کسی اور جگہ یکجا نہیں مل سکینگی -

کتاب دو جلدوں میں مکمل ھوئی ھے - ھر جلد کی ضخامت قریب چارسو صفحات اور قیمت فی جلد (مجلد معہ گردپوش) چار روپیہ (علاوہ محصول ڈاک) -

ناظم ادارہ طلوع اسلام - کراچی -

Only Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Rd Karachi and Text at Adabi Press Robson Road, Karachi Published by Said Ahmed from Tulu-e-Islam Office Karachi







بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

۱۲۱



ہفتہ وار

بشیر و نذیر

مدیر

سید علی عباس موسوی



ترتیب

جلد (۱) ★ شمارہ (۲)
۲۵ جولائی ۱۹۸۸ء
قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ؛ سالانہ ۴۵ روپے
رجسٹرڈ نمبر 47283/20/5/AL/88.TC

سید علی عباس موسوی کی ادارت میں سرور آفسٹ
پرنٹنگ پریس حیدرآباد میں چھپ کر ہفتہ وار خیر نذیر
1/822-6-13 لنگر حوض حیدرآباد اے پی
پن کوڈ نمبر ۵۰۰۰۰۸ سے شائع کیا را

اِداریہ

حج اسلام کا ایک اہم جزو اور دین کا ایک رکن محکم ہے یہ اسلام کی ایسی عبادت ہے جس میں انفرادی اور اجتماعی زاویوں سے اس قدر جامع انداز میں اسلامی بنیادی اصول اجاگر ہیں۔ کہ اس میں لا الہ کی جلالت اور حج کثرت میں وحدت کا مرقع ہے۔ آئمہ طاہرین علیہم السلام نے حج کی ضرورت اور اہمیت اور اعمال حج کے اسرار و رموز کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے معارف و عرفان کے جو انکشافات کئے ہیں وہ قابل غور و فکر ہیں۔

ہر سال حج اور عید الضحیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کو یاد دلاتے ہیں۔ پروردگار عالم نے اس قربانی کو ذبح عظیم سے بدل دیا اور اس طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی جان بچ گئی مگر اس کے باوجود پروردگار عالم نے اس قربانی کو ایک یادگار قرار دیدیا اور ہر صاحب استطاعت پر اسے واجب بھی گردانا اور قیامت تک لاکھوں مسلمانوں کو ارکان حج بجالانے کی ہدایت بھی دی۔ اس یادگار کو ایک اور زاویہ سے بھی ہم دیکھ سکتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ،

حج کے موقع پر ساری دنیا کے مسلمانوں کا اجتماع آج بھی ساری انسانیت کو دعوت فکر دے رہا ہے کہ انسان خدا کے نزدیک برابر ہیں۔ اقتدار، طاقت، رنگ و نسل، ذات، پات، دولت اور غربت خدا کے نزدیک معیارات نہیں بلکہ نیت جذبہ اور یگانیت ہی قابل قبول عبادت کا شرف حاصل کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے یہ نقطہ فکر ہے کہ جب حج کے موقع پر سب ایک ساتھ بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز ہوتے ہیں تو کیا حج کے بعد ان کا اتحاد ممکن نہیں ان کی یہ مرکزی یگانیت انہیں کیا اس بات پر متوجہ نہیں کر رہی ہے کہ یہی اتحاد اگر سارے عالم میں اس طرح پھیل جائے تو دنیا ان کے زیر قدم ہو سکتی ہے ——؟

ارکان حج بجالاتے وقت جب صفا و مروہ کے درمیان اس یادگار سعی کو بجالاتے ہیں تو اسے اس زاویہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ دراصل تاسی ہے، مادر اسمٰعیل علیہ السلام کی جو بچے کی پیاس سے بے چین ہو کر ممتا کے تقاضے کی بنا پر صفا و مروہ کے درمیان دوڑ رہی تھیں —— پروردگار نے اس ماں کی تڑپ کو دیکھ کر ایسا چشمہ جاری کیا جو حضرت اسمٰعیلؑ سے لے کر قیامت تک آنے والے حاجیوں کو آب زمزم سے سیراب کرتا رہے گا۔ لیکن اس عمل کی تاسی لاکھوں مسلمانوں سے کروا کر گویا پروردگار عالم ان کو شاید یہ یاد دلا رہا ہے کہ

جب ممتا کی تڑپ کو وہ برداشت نہیں کرتا تو اس کے بندوں کو سعی کرتے وقت یہ سوچنا چاہیئے کہ کہیں کوئی ماں ایسی تو نہیں جو اپنی اولاد کی بھوک کو مٹا نہیں سکتی ہے اور تڑپ رہی ہے؟ کہیں کوئی ماں ایسی تو نہیں ہے جو اولاد کے علم کے حصول کی پیاس بجھانے کے قابل نہیں رہی ہے اور بے چین ہے؟ کوئی ماں ایسی تو نہیں جو اپنی اولاد کی شادی کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتی اور ممتا کی تمنائیں کسی سہارے کی متلاشی ہیں؟

تو صاحب استطاعت افراد کا حج سے پلٹتے وقت یا نماز عید الضحیٰ ادا کر کے لوٹتے وقت یہ فرض نہیں ہے کہ وہ ممتا کی ان آوازوں کو سنیں جو ان کے قریب بلند ہو رہی ہیں۔ اور ان ماؤں کی پیاس بجھانے کی سعی کریں!

حج کے موقع پر کنکریوں سے جب تک تین شیطانوں کو نہیں مارتے ارکان حج مکمل نہیں ہوتے گویا اس عمل کے ذریعہ پروردگار یہ یاد دلوا رہا ہے کہ ہر دور میں قیامت تک باطل کی طاقتیں سر ابھاریں گی تو تمہارا یہ عمل تمہارے حوصلوں کو بلند کریگا اور تمہیں باطل، ظالم، جابر کے خلاف صف آرا ہونے کی طاقت عطا کرے گا اور تم میں ہر دور کے شیطانوں پر قابو پانے کی صلاحیت پیدا ہو گی۔

گویا حج محبت یگانیت اتحاد ایثار قربانی کے علاوہ ہر دور کی تڑپتی پریشان ممتا کی آواز پر آگے بڑھنے اور اس کی مدد کرنے کی تلقین بھی کرتا ہے اور ہر دور کے شیطانوں کو فنا کرنے کا حوصلہ بھی عطا کرتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مکتوب قیصر روم کے نام

جناب مفتی سید طیب جزائری

کسی انسان کے "خط و خال، صورت و زیبائی کو دیکھنا ہو تو اس کی تصویر دیکھئے اور اگر خدوخال سیرت و شخصیت پر نظر کرنا ہو تو اس کی تحریر کا مطالعہ کیجئے۔ اہل نظر کے لیے تصویر بولتی ہے اور اہل دانش کے لیے تحریر۔ خاص کر خط و مکتوب تاریخ و تنقید میں بڑی معنی خیز دستاویز ہے۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نامہ ہائے مبارک اہل علم کے لیے خصوصی توجہ کا مرکز ہیں۔ یہ مکتوبات سیاست، ریاست، حکومت، انسان شناسی، دعوت و تبلیغ اور اسلامی روابط بین المللی کے مطالعہ میں سنگ میل ہیں۔ مکتوبات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلے میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے کہ نہیں؟ اگر جانتے تھے تو ایک "حیرت" ——— اور اگر نہیں جانتے تو ——— "صد حیرت"۔ جاننے پر حیرت اس لیے کہ اپنے قلم مبارک سے کچھ کیوں نہیں؟ ہمیشہ املا کروایا۔ اور اگر نہیں جانتے تھے تو ایسے نبی کو نہ ماننے کے بارے میں لوگوں نے جاہل ہونے کو دلیل کیوں نہ بنایا؟ تعجب ہے کہ کلمہ گو اس صفت سے منکر ہیں۔

منکرین کتابت کا استدلال اور اس کا جواب

ان لوگوں نے تین باتوں سے استدلال کیا ہے:

۱۔ آپ کا مشہور لقب "امی" تھا، اور امی اس کو کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔
۲۔ آپ نے کبھی کچھ نہ لکھا، اگر جانتے ہوتے تو کبھی نہ کبھی تو لکھتے!
۳۔ سورۂ عنکبوت کی اڑتالیسویں آیت: وماکنت تتلو من قبلہ من کتاب ولا تخطہ۔

(پہلی بات) کا جواب یہ ہے کہ امی ام القریٰ سے ہے جو مکہ کا دوسرا نام ہے جیسا کہ قرآن میں وارد ہوا ہے: ھوالذی بعث فی الامیین رسولا منھم (سورۂ جمعہ ۲) وہ خدا وہی ہے جس نے مکہ والوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا" اگر امی کے معنی ان پڑھ اور جاہل کے مراد لیے جائیں تو اس آیت کا کیا مطلب ہوگا؟ یعنی جاہلوں میں رسول بھیجا؟ حالانکہ مکہ میں پڑھے لکھے لوگ بھی تھے۔

اس کی مؤید امام محمد تقی علیہ السلام سے ایک روایت علل الشرائع وغیرہ میں منقول ہے جو ہمارے مدعیٰ پر صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں:

من ابی جعفر الجواد علیہ السلام قال الراوی جعفر بن محمد الصوفی قلت یا ابن رسول اللہ لم سمی النبی الامی، فقال ما یقول الناس؟ قلت یزعمون انہ انما سمی الامی لانہ لا یحسن ان یکتب فقال کذبوا علیہم لعنۃ اللہ انی ذلک واللہ یقول فی محکم کتابہ ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ۔ فکیف کان یعلم مالا یحسن واللہ لقد کان رسول اللہ یقرء ویکتب باثنین وسبعین لسانا، وانما سمی الامی لانہ کان من اھل مکۃ، ومکۃ من امہات القری وذالک قول اللہ عز وجل لتنذر ام القری ومن حولھا۔

امام ابوجعفر جوادؑ سے روایت ہے (راوی جعفر بن محمد صوفی کہتا ہے) میں نے حضرت سے پوچھا کہ تمہارے نبی کو امی کے نام سے کیوں پکارتے ہیں؟ فرمایا: لوگ کیا کہتے ہیں؟ میں نے عرض کی: وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ آپ چونکہ لکھنا نہیں جانتے تھے، اس لیے آپ کا نام امی پڑ گیا۔ حضرت نے فرمایا: وہ جھوٹ بولتے ہیں، ان پر اللہ کی لعنت ہو! بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ درآنحالیکہ اللہ اپنی کتاب میں فرماتا ہے: وہ اللہ وہ ہے جس نے امیوں میں ان میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اس (اللہ) کی آیتیں پڑھتا ہے اور ان کے باطن کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت پڑھاتا ہے۔ (اس کے بعد امام نے

علل الشرائع ص ۱۲۵ طبع تہران۔ اس کے علاوہ یہ حدیث معانی الاخبار، اختصاص، بصائر الدرجات میں بھی ہے۔

فرمایا) اگر نبی ان پڑھ (جاہل) تھے تو ان کو پڑھاتے کس طرح تھے؟ پھر فرمایا: خدا کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہتّر زبانوں میں پڑھ اور لکھ سکتے تھے (یا بہتّر زبانوں میں پڑھتے اور لکھتے تھے) آپ کو امی اس لیے کہا جاتا تھا کہ آپ اہل مکہ سے تھے اور مکہ ام القریٰ ہے، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: تاکہ تم (اے رسول) ڈراؤ ام القریٰ اور اس کے اطراف کی آبادیوں کو۔

(دوسری بات) کا جواب یہ ہے کہ آپ نے بمصلحت نہیں لکھا ورنہ لوگوں کو شک پڑ جاتا کہ آپ نے کہیں سے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہے جیسا کہ مذکورہ آیت میں ہے: اذاً لارتاب المبطلون" اصل بات یہ ہے کہ نہ تو آپ نے کسی مدرسے میں پڑھا نہ کسی انسان سے تعلیم پائی کیونکہ آپ سے بہتر کوئی تھا ہی نہیں، پڑھتے کس سے؟ اس کے بعد اتنا بڑا معجزہ "قرآن" پیش کر دیا۔ یہ فی الحقیقت "معجزہ در معجزہ" ہے کیونکہ قرآن بذات خود ایک معجزہ ہے، پھر اس معجزہ کو ایک ایسا شخص پیش کرتا ہے جس نے ایک حرف نہیں پڑھا، نہ کسی کے آگے زانوئے ادب تہ کیا، نہ تمام عمر اپنے قلم سے کوئی لفظ لکھا۔ اگر آپ عام لوگوں کی طرح سے لکھنا پڑھنا شروع کر دیتے تو شبہ ہوتا کہ آپ نے شاید پوشیدہ طور سے کسی سے سیکھا ہے۔ اس لیے آپ نے بحکم الٰہی اپنے ہاتھ میں قلم نہیں لیا دوسروں سے لکھوایا تاکہ آپ کی ذات اور قلم میں کسی طرح کی مغایرت ظاہر ہو جائے اور اس سے حقانیت قرآن و اسلام کی تقویت ہو، اور ذہن انسانی یہ ماننے پر مجبور ہو جائے کہ جس شخص نے نہ لکھنا سیکھا اور نہ اپنی زندگی میں کبھی کچھ لکھا اس نے اتنی بڑی کتاب اور اتنی جامع شریعت کیسے پیش کر دی؟ چونکہ ایسا نہیں ہو سکتا اس کے باوجود ہوا ——— لہٰذا یہ ایک معجزۂ برحق ہے!

(تیسری بات) آیت مذکورہ سے استدلال کا جواب یہ ہے کہ اس آیت (تم اس سے قبل نہ تو کوئی کتاب پڑھتے تھے نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے اگر ایسا ہوتا تو باطل والے شک میں پڑ جاتے) میں کہاں کہا گیا کہ آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، اس میں تو یہ کہا گیا ہے کہ لکھتے پڑھتے نہیں تھے" اور یہ واقعہ ہے کہ آپ نے اپنی عمر میں لکھا پڑھا نہیں۔ پھر وجہ یہ بیان کی گئی کہ اگر ایسا ہوتا تو اہل باطل شک و شبہ کر سکتے تھے، اس طرح یہ آیت برعکس ہمارے دعوے کو ثابت کرتی ہے نہ کہ دعوے مخالف کو۔

آنحضرتؐ کے کاتب:

بطور بات یہ معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ بمصلحت الٰہی خود نہیں لکھتے تھے بلکہ اپنی تحریر دوسرے لوگوں سے لکھواتے تھے، ان لوگوں کو رسول اللہؐ کا کاتب کہا جاتا ہے۔ جن کی تعداد بیالیس تک بتائی جاتی ہے۔ لیکن ان سب میں نمایاں حضرت علی علیہ السلام کی ذات ہے۔ کیونکہ آپ میں تین امتیاز پائے جاتے تھے:

۱۔ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب سے قدیمی کاتب تھے۔
۲۔ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایسے کاتب تھے جس نے وحی، عہود، خطوط وغیرہ تمام چیزوں کی کتابت کی جبکہ دوسرے لوگوں نے الگ الگ مطالب کی کتابت کی۔
۳۔ آپ نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا۔

شاہان وقت اور زعمائے عصر کے نام آپؐ کے مکتوبات

سنہ ۶ ہجری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کو صلح حدیبیہ کے موقع پر ایسی کامیابی حاصل ہوئی جو کسی جنگ میں حاصل نہیں ہوئی۔ دین حق کو پھولنے پھلنے کا موقع ملا، چونکہ آنحضرتؐ کو بھی سکون میسر آگیا تھا لہٰذا اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ نے عرب و عجم کے بادشاہوں، رؤسائے قبائل، بڑے بڑے راہبوں کو (جن کا مقام بادشاہوں

بھی اور پھر انہاں خطوط لکھوائے اور ان کو اللہ اور اس کے برحق دین کی طرف دعوت دی یہاں تک کہ ایک روز میں آپ نے چھ مکتوب لکھوائے اور انکو چھ سفیروں کے ذریعہ اطراف و اکناف میں روانہ کیا، اس کے عظیم نتائج برآمد ہوئے سب سے پہلے آپ نے شہنشاہ روم (قیصر)، ہنشاہ ایران (کسریٰ)، شاہ حبش (نجاشی) اور شاہ مصر قبطی کو خط لکھوائے۔

شہنشاہ روم قیصر کے نام آپ کا مکتوب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ من محمد بن عبد اللہ، الی ھرقل عظیم الروم،
سلام علی من اتبع الھدیٰ اما بعد فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام، اسلم تسلم
یؤتک اللہ اجرک مرتین فان تولیت فانما علیک اثم الاریسیین [ویا اھل
الکتاب] تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم۔ الا نعبد الا اللہ، ولا نشرک
بہ شیئا، ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا ا
اشھدوا بانا مسلمون۔" [سیرت حلبیہ ۳/۲۰۵، مسند احمد ۱/۲۶۳، تاریخ ابن عساکر ۱/۱۴۲
کنز العمال ۲/۲۷۲، صحیح بخاری کتاب الجہاد باب ۱۰۲، صحیح مسلم ۵/۱۶۵، در منثور ۲/۴۰، امیان الشیعہ ج ۲]

ترجمہ:

"اس اللہ کے نام سے جو مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ یہ خط محمد بن عبد اللہ کی طرف سے ہے ہرقل زعیم روم کی طرف، سلام ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے، اس کے بعد یہ کہ میں تم کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں، اسلام لے آ (ہمیشہ کے لئے سالم ہو جاؤ (سلامتی پا جاؤ) تم کو اللہ اس کا دوہرا اجر دے گا (ایک اجر تمہارے ایمان لانے کا دوسرا اجر ان لوگوں کے ایمان لانے کا جو تمہاری وجہ سے ایمان لائیں گے) اور اگر تم نے روگردانی کی تو تمہاری گردن پر تمہارے نوکروں چاکروں اور تمہاری رعایا کے گناہ کا بار بھی رہے گا، (اس کے بعد آپ نے اس آیت کا اضافہ کیا) اے اہل کتاب ایک ایسی بات پر ہم سے مل جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، وہ بات یہ ہے کہ ہم سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں، اس کا کسی کو شریک نہ بنائیں اور اللہ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو خدا نہ بنانے لگیں، پھر بھی اگر یہ منہ پھیریں تو ان سے کہہ دو کہ تم گواہ رہنا ہم مسلمان ہیں۔"

یہ خط آپ نے "دحیہ کلبی" کے ہاتھ "قیصر" کے پاس روانہ کیا جو اس وقت شام میں مقیم تھا، کیونکہ اس نے نذر کی تھی کہ اگر ایران پر اس کو فتح حاصل ہوئی تو وہ پا پیادہ بیت المقدس کی زیارت کرے گا جو اس وقت اس کی قلمرو میں داخل تھا۔ دحیہ کلبی کا پیشہ تجارت تھا، شام اور حجاز کے درمیان تجارت کرتے تھے، اتنے خوبصورت و وجیہ تھے کہ جبرئیل امین کبھی کبھی ان کی شکل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا کرتے تھے۔

"دحیہ" آنحضرت کا خط لے کر "عدی بن حاتم طائی" کے ہمراہ بادشاہ کے دربار کی طرف روانہ ہوئے جب قیصر روم کے عالیشان دربار میں پہنچے تو اس کا شاہی دبدبہ، بلند و بالا ایوانوں میں لاتعداد خوبصورت ستون، ستونوں میں جگمگاتے ہوئے پتھر، دروازوں میں حریر و دیبا کے پردے، سیڑھیوں پر مخملی فرش، ہر طرف دوڑتے ہوئے سینکڑوں زرین کمر غلام و کنیز، سب سے بڑے ایوان میں شہ نشین پر ایک زرنگار تخت رکھا ہوا تھا جس پر قیصر بڑے رعب اور دبدبہ کے ساتھ جلوہ افروز تھا، اور کوئی ہوتا تو اس کے اوسان خطا ہوجاتے۔ مگر جس کی آنکھوں میں جمال محمدی سمایا ہوا ہو، دماغ میں زلف رسول کی خوشبو بسی ہو، دل میں عشق حبیب کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو، جس پر دبدبہ ہو تو "اللہ" کا، رعب ہو تو رسول اللہ کا، اس پر "ماسوی اللہ" کا کیا اثر ہو سکتا ہے؟ کچھ لوگوں نے کہا اے کلبی! رکوع میں جھک جا! کچھ نے کہا کلبی! جلدی سے سجدہ میں گر جا، جب تک آواز ملوکانہ اٹھنے کی اجازت نہ دے اپنا سر نہ اٹھا، دحیہ نے بڑی نخوت سے کہا: لا افعل ھذا ابدا ولا اسجد لغیر اللہ۔ ایسا ہرگز نہ کروں گا، میں غیر خدا کا سجدہ نہیں کروں گا۔

جواب ملا: پھر بادشاہ ہرگز تم سے خط نہ لے گا۔ یہ سنکر دحیہ نے وہ خط آگے بڑھ کر تخت کے شہ نشین کی سیڑھی پر رکھ دیا۔ شاید قیصر کی عمر میں یہ پہلا واقعہ تھا۔ دحیہ کی اس جرأت نے قیصر کو مجبور کیا کہ جھک کر خط اٹھائے اور اس کو کھول کر پڑھے۔

خط کھولتے ہی قیصر کے دماغ کی کھڑکیاں کھل گئیں، اس نے کہا "ہائیں! یہ تو ایک انوکھا خط ہے جیسا سلیمان کا خط بلقیس کے نام تھا، کیونکہ اس کی نگاہ سب سے پہلے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پر پڑی، اس نے کہا: ان ہذا کتاب لم ارہ بعد سلیمان۔ "یہ ایک ایسا خط ہے جو میں نے سلیمان کے خط کے بعد کبھی نہیں دیکھا" پھر اس نے ترجمان کو بلوا کر پورا خط بغور سنا، اس کے بعد کہا اگر کوئی یثرب سے آیا ہوا ہو تو اس کو میرے پاس جلد حاضر کرو۔

شاہ روم کے دربار میں ابوسفیان کی پیشی:

وقت کی بات کہ اس وقت ابوسفیان لوگوں کے ہاتھ آگئے جو کسی تجارتی مقصد سے شام گئے ہوئے تھے۔ قیصر کے حکم سے ان کو دربار میں بلوایا گیا، تاکہ ان سے رسول اللہ کا حال پوچھے، ان کو رسول اللہ سے جو لگاؤ ہے اور جو کچھ انہوں نے اور ان کی اولاد بلکہ زوجہ محترمہ نے رسول اللہ اور ان کے خاندان کے ساتھ کیا ہے وہ سب پر روشن ہے، رسول اللہ کے خلاف قریش کی جتنی جنگیں ہوئیں، ان سب میں پیش پیش تھے۔ قیصر نے ان حضرت سے وہ سب کچھ اگلوایا جس طرح کسی تنگ منہ کی بوتل سے ٹھپک ٹھپک کر گھی یا شہد نکال لیا جاتا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

ابوسفیان بیان کرتے ہیں کہ جب میرے اور رسول اللہ کے درمیان صلح ہوگئی یعنی صلح حدیبیہ کا زمانہ، تو میں نے شام کا سفر کیا اتفاق سے اسی زمانہ میں رسول اللہ کا خط ہرقل کے نام پہنچا، خط پڑھ کر ہرقل نے کہا: کیا یہاں کوئی ایسا شخص ہے جو اس مرد کی قوم سے ہو جو اپنے کو نبی خیال کرتا ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں، اس پر مجھ کو کچھ قریشیوں کے ہمراہ دعوت دی گئی چنانچہ ہم سب ہرقل کے دربار میں داخل ہوئے، ہم نے دیکھا کہ قیصر بیٹھا ہوا ہے، اس کے سر پر تاج ہے، روم کے دوسرے حکمراں اس کے چاروں طرف ہیں، ہم اس کے سامنے بیٹھ گئے ہرقل نے پوچھا تم سب میں اس مدعی نبوت سے کون زیادہ نزدیک ہے؟ میں نے کہا "میں"۔ اس نے حکم دیا کہ میں آگے بیٹھوں، میرے باقی ساتھی میرے پیچھے بیٹھیں۔ پھر اس نے ترجمان کے ذریعہ ان قریشی لوگوں سے کہا جو میرے پیچھے بیٹھے تھے، کہ میں اس آدمی (ابوسفیان) سے کچھ سوالات کرتا ہوں اگر اس نے جھوٹ بولا تو تم اس کو ٹوک دینا، ابوسفیان نے کہا: خدا کی قسم اگر اس وقت مجھ کو جھوٹ کے کھلنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں صحیح بات کبھی نہ بتلاتا۔ اس کے بعد شاہ روم اور ابوسفیان میں یہ سوال جواب ہوئے:

ہرقل نے سب سے پہلے یہ سوال کیا۔

"تمہارے درمیان اس شخص کا حسب نسب کیسا ہے؟"

"وہ ہمارے درمیان بڑے حسب و نسب والے ہیں" میں نے جواب دیا

"کیا اس کے آباؤ اجداد میں سے کوئی بادشاہ گذرا ہے؟" ہرقل نے پوچھا

"نہیں۔"

"اس کے ادعائے نبوت سے پہلے کبھی وہ جھوٹ بولا ہے؟"

"نہیں" پھر ہرقل نے پوچھا:

"اس کا اتباع کرنے والے کون لوگ ہیں، اونچا طبقہ یا نیچا طبقہ؟"

"نیچا طبقہ"

"ان کی تعداد بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے؟"

"ان کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا ان میں سے کوئی شخص اس نبی سے روٹھ کر دوبارہ اپنے پہلے دین پر پلٹ گیا ہے؟"

میں نے کہا: "نہیں"

"کیا تم نے اس سے کوئی جنگ کی ہے؟" اس نے پھر سوال کیا، میں نے کہا:

"ہاں"

"تمہاری جنگ اس کے ساتھ کیسی تھی ؟ "

"ہمارے اور اس کے درمیان بڑی گھمسان کی جنگیں ہوئیں کبھی اس نے ہم کو نقصان پہنچایا اور کبھی ہم نے اس کو نقصان پہنچایا۔" پھر اس نے پوچھا :

"اچھا کبھی اس نے تمہارے ساتھ دھوکے سے بھی کام لیا ہے ؟ "

"نہیں تو ... لیکن ایک مدت سے ہم اس سے الگ ہیں لہذا معلوم نہیں اس نے اس مدت میں کیا کیا ہو۔"

ابو سفیان کہتا ہے : خدا کی قسم ہرقل نے مجھکو کہیں اس بات کا موقع نہیں دیا کہ میں اپنی مرضی کی بات کہہ سکوں، سوائے اس جگہ کے۔ ہرقل نے پھر سوال کیا :

"جو دعویٰ اس نے کیا ہے، اس سے پہلے تمہارے وطن میں کسی اور نے بھی ایسا دعویٰ کیا تھا ؟ "

"نہیں"

"اچھا یہ بتلاؤ اس کی عقل اور رائے کیسی ہے ؟ "

"ہم نے اس کی عقل و رائے کی کبھی مذمت نہیں کی" پھر اس نے پوچھا :

"وہ تم کو کس بات کا حکم دیتا ہے ؟ " میں نے کہا :

"وہ ہم کو نماز، زکوۃ، پاکدامنی کا حکم دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کرو اور وہ ہم کو وعدہ کی پابندی اور امانت داری کی تاکید کرتا ہے۔"

یہ سن کر ہرقل نے اپنے ترجمان سے کہا اس شخص سے کہدو کہ :

میں نے تم سے اس نبی کے حسب نسب کے متعلق سوال کیا، تو تو نے جواب دیا کہ اس کا نسب و نسب اچھا ہے، وہ ہمارے خاندان کا آدمی ہے، انبیاء کی یہی شان ہے کہ وہ خاندانی ہوتے ہیں اور سب سے پہلے اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتے ہیں۔

پھر میں نے تم سے پوچھا کہ اس کے اجداد میں کوئی بادشاہ گذرا ہے ؟ تم نے جواب دیا "نہیں" اگر اس کے آباؤ اجداد میں کوئی بادشاہ گزرا ہوتا تو میں یہ خیال کرتا کہ یہ شخص نبوت کے بہانہ اپنا آبائی تخت و تاج حاصل کرنا چاہتا ہے۔

پھر میں نے اس کے ماننے والوں کے متعلق سوال کیا تو تم نے کہا کہ نچلا طبقہ (غریب عوام) اس کا اتباع کرتے ہیں، بات بھی یہی ہے کہ رسولوں کا اتباع زیادہ تر غریب لوگ کرتے ہیں پیسہ والے کترا جاتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے سوال کیا کہ کیا تم نے اس سے کبھی کوئی جھوٹ دیکھا ہے ؟ تم نے کہا "نہیں" اس سے میں یہ سمجھا کہ جو شخص لوگوں کے معاملہ میں جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا کے معاملہ میں کیسے جھوٹ بول سکتا ہے !

پھر میں نے سوال کیا کہ کیا کوئی انسان اس سے ناراض ہوکر مرتد ہوا ہے ؟ تم نے کہا : نہیں، تو ایمان کا یہی حال ہے کہ جب وہ کسی کے دل کی گہرائیوں میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر نہیں نکلتا۔

اس کے بعد میں نے پوچھا کہ : اس کے پیرو کار گھٹ رہے ہیں یا بڑھ رہے ہیں ؟ تم نے کہا : وہ بڑھ رہے ہیں، تو ایمان کا یہی حال ہے کہ وہ روز بروز بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ اپنے کمال کو پہنچ جائے۔

میں نے یہ بھی تم سے دریافت کیا کہ، کیا تم نے اس سے جنگ کی ہے ؟ تم نے کہا : کی ہے، اور بہت سخت جنگ کی ہے۔ تو رسولان برحق کا یہی حال رہا ہے کہ وہ اپنی امت کے ساتھ سختیوں میں مبتلا رہے اور آخر میں ان کو فتح ہوتی ہے۔

میں نے تم سے پوچھا کہ : اس نے کبھی دھوکہ دیا ہے ؟ تم نے کہا : نہیں، تو رسول ایسے ہی ہوتے ہیں وہ کسی کو کبھی دھوکہ نہیں دیتے۔

پھر میں نے پوچھا : جو باتیں وہ کہتا ہے اس سے پہلے بھی کسی نے کہی ہیں ؟ تم نے کہا : نہیں ! میں نے سوچا کہ اگر اس سے قبل کسی نے یہ باتیں کہی ہوتیں تو ہوسکتا ہے اس کے دل میں بھی اس کی پیروی کا خیال آگیا ہو۔

آخر میں "قیصر" نے کہا : اے بھائی ! جو جوابات تم نے دیئے ہیں وہ اگر صحیح ہیں تو یہ شخص نبی برحق ہے، اگر میں اس کے پاس ہوتا تو میں اس کا پیرو ہوتا۔

اس کے بعد قیصر نے دوبارہ آنحضرت کا خط پڑھوایا اور اس سے محظوظ ہونے لگا پاس ہی اس کا بھتیجا بیٹھا ہوا یہ منظر دیکھ کر ڈر رہا تھا کہ یہ کیا ہونے والا ہے ؟ میرے چچا تو ہاتھ سے نکلے جا رہے ہیں، ایک بدو عرب کے لائے ہوئے خط پر ایمان لا کر اپنے تخت و تاج سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے، اس نے بڑے غصے کے ساتھ چچا سے کہا کہ : "ذرا آپ اس کی جسارت تو دیکھئے کہ اس نے اپنے خط میں پہلے اپنا نام (من محمد بن عبداللہ) لکھا ہے، حالانکہ پہلے آپ کا نام لکھنا چاہیئے تھا، پھر اسی توہین پر اکتفا نہیں کی، نہ تو ملک لکھا نہ قیصر لکھا، عظیم الروم" کے کلمہ سے خطاب کیا ہے ؟ قیصر نے جواب دیا : "میرے بیٹے ! خدا کی قسم تیری رائے بہت کمزور ہے، کیا تو چاہتا ہے کہ میں اس شخص کے خط کو پھینک دوں، جبکہ پاس ناموس اکبر (جبریل) آتا ہے، یقیناً یہ شخص اسی کا سزاوار ہے کہ اس کا نام پہلے ہو، اور یہ جو اس نے مجھکو لکھا "عظیم الروم" یہ بھی صحیح ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ابو سفیان اور اس کے ساتھیوں کو شاہی مہمان خانہ میں ٹھہرائیں، ابو سفیان جب مہمان خانہ میں آیا تو اس نے اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر مار کے کہا : "ابو کبشہ کے فرزند کا دین زور پکڑ گیا، شاہ روم بھی اس سے ڈرنے لگا۔" ابو سفیان ابھی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ باہر سڑک پر ایک منادی کی یہ آواز آئی : "لوگو ! آگاہ ہو جاؤ کہ ہرقل نے دین نصرانیت کو چھوڑ دیا ہے اور دین محمدی کو اختیار کرلیا۔"

یہ خبر سنکر لوگوں میں انتشار پیدا ہوگیا، اس کا لشکر بگڑ گیا اور اس نے مسلح ہو کر قیصر کے قصر کو گھیر لیا، قیصر نے لوگوں کا یہ رنگ دیکھا تو اپنی استادانہ سیاست سے کام لے کر منادی سے کہا کہ اب یہ اعلان کردے کہ : "قیصر کا مقصد اس اعلان سے صرف تمہارا یہ امتحان کرنا تھا کہ تم اپنے دین پر کس حد تک قائم ہو ؟ تو یہ معلوم ہوگیا اچھا تم پلٹ جاؤ بادشاہ تم سے راضی ہے۔

پھر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قاصد (دحیہ کلبی) کو بلا کر کہا کہ : مجھ کو یقین ہے کہ یہ شخص نبی مرسل ہے، اسی کا ہم انتظار کر رہے تھے، ہماری کتابوں میں اس کا تذکرہ ہے، لیکن مجھ کو اہل روم کی شورش کا ڈر ہے کہ مجھ کو قتل نہ کردیں، لہذا تم بڑے پادری "ضغاطر" کے پاس جاؤ اور اس سے اپنے اس نبی کی خبر بیان کرو، اس کی حیثیت روم میں مجھ سے بھی زیادہ اہم ہے، اس کی بات کو لوگ زیادہ مانتے ہیں، دیکھو وہ کیا کہتا ہے ؟

قیصر نے "دحیہ" کو بڑے احترام کے ساتھ رخصت کیا، ان کو کچھ مال اور قیمتی چادر دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کچھ تحفوں کے ساتھ حسب ذیل خط ان کو دیا کہ آنحضرت کی خدمت میں پیش کردیں :

"یہ خط ہے احمد رسول اللہ کی طرف جن کے آنے کی بشارت حضرت عیسیٰ نے دی تھی، قیصر شاہ روم کی جانب سے، میرے پاس آپ کے قاصد کے ذریعہ آپ کا خط آیا، میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں انجیل مقدس میں آپ کا ذکر ہے، عیسیٰ بن مریم نے آپ کی بشارت دی ہے، میں نے اہل روم کو آپ کی طرف دعوت دی کہ وہ آپ پر ایمان لائیں، مگر انہوں نے انکار کیا، اگر وہ اس معاملہ میں میری اطاعت کرتے تو ان کے لیے اچھا تھا، میری حالت تو یہ ہے کہ دل چاہتا ہے کہ آپ کی خدمت میں ہوتا اور آپ کے قدم مبارک دھونے کی سعادت حاصل کرتا۔"

یہ خط جب رسول اللہ کو ملا تو آپ نے ارشاد فرمایا : اس کا ملک اس وقت تک باقی رہے گا جب تک میرا خط اس کے خزانے میں باقی رہے گا۔

ادھر دحیہ قیصر کا خط لے کر روانہ ہوئے ان کے پیچھے اس نے اپنے ایک خاص آدمی کو مدینہ بھیجا جس کا تعلق قبیلۂ غسان سے تھا اور اس کو یہ تاکید کی کہ مدینہ جاؤ، محمد کی خبر لاؤ، تین چیزوں کو بغور دیکھنا :

۱۔ دیکھنا کہ وہ کس چیز پر بیٹھے ہیں ؟ ۲۔ ان کے داہنی طرف کون شخص ہے ؟
۳۔ اگر ممکن ہو تو ان کی انگوٹھی پر نظر کرنا کہ اس پر کیا لکھا ہے ۔ ؟

غسانی، قیصر کی حسب ہدایت مدینہ آیا، چونکہ خود عرب تھا اس لئے کسی نے اس پر شک بھی نہیں کیا کہ یہ "قیصر" کا فرستادہ ہے۔ مسجد میں پہنچا، حضرت کے دربار کی سادگی دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا۔ نہ تزک و احتشام، نہ حشم و خدم، نہ اونچی دیواریں، نہ بلند دروازہ، نہ حریر و دیبا کے پردے۔ نہ مخمل و کمخواب کے فرش، مسجد کی کچی دیوار۔ خاک کا قدرتی فرش جس پر خیر البشر سید المرسلین، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما تھے، پیشانی کے نور سے چاند ماند پڑ جائے، چہرہ کے جمال سے حوروں کو شرم آجائے، ہیبت و جلال سے دم سینوں میں رک جائے۔

غسانی آہستہ آہستہ آگے بڑھا، دل میں کہا: ایک بات تو معلوم ہوئی جو بالکل خلاف امید نکلی کہ آپ زمین کے خاکی فرش پر بیٹھے ہیں، دوسری خصوصیت تو دیکھوں کہ آپ کے داہنی طرف کون ہے؟ اب جو نگاہ ڈالی تو دیکھا ایک نوجوان جس کی آنکھوں سے جلال ٹپکتا، ہاتھوں میں دو دھاری تلوار، بھلا کس کو جرأت کہ نظریں ملائے۔ ساتھ کے ایک آدمی سے اس کا نام پوچھا، جواب ملا "ارے ان کو نہیں جانتے؟ یہی تو غالب کل غالب اسد اللہ علی بن ابی طالبؑ ہیں، رسولؐ کے ابن عم بھی ہیں، آپ کے امیر لشکر بھی ہیں، اس کے علاوہ داماد پیغمبر بھی ہیں، دل میں کہا دو باتیں تو معلوم ہوئیں دونوں علامتوں کو چپکے سے لکھ لیا۔ بہت گھبرایا ہوا تھا کہ عالم کہ تیسری بات بھول گیا۔ چاہا کہ مسجد سے باہر نکل جائے کہ ایک آواز کان میں آئی ایسی دلربا آواز جو دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی: اے غسانی۔ ادھر دیکھ: تیسری چیز جس کا تیرے ساتھی نے حکم دیا تھا وہ تو تو نے دیکھی ہی نہیں، یہ کہکر آپؐ اپنا ہاتھ اونچا کر دیا، انگشت مبارک میں "خاتم نبوت" صاف نظر آ رہی تھی جس میں لکھا تھا "محمد رسول اللہ" محمد نیچے، رسول بیچ اور اللہ سب کے اوپر۔

غسانی نے جب قیصر سے یہ واقعہ جا کر بیان کیا تو اس نے کہا: ھذا الذی بشر بہ عیسیٰ بن مریم انہ یرکب البعیر فاتبعوہ وصدقوہ۔ تشتر سوار کے نام سے مسیح نے جس کی بشارت دی تھی وہ یہی نبی ہے اس کی اطاعت کرنا چاہیے۔

اس مکتوب گرامی کے عظیم اثرات

جس قدر کوئی شے عظیم ہوگی اسی قدر اس کے اثرات بھی عظیم ہوں گے، اس خط کا بھیجنے والا چونکہ عظیم تھا لہٰذا اس کے اثرات بھی بہت عظیم تھے جن میں سے بعض یہ ہیں۔

۱۔ ہرقل چونکہ اس وقت نصرانیوں کا سب سے بڑا حکمران تھا، جس کی سلطنت کی حدود روم سے لیکر شام و اردن تک پھیلے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے بادشاہ اس کے باج گزار تھے بلکہ ایران سے لڑائی میں بھی اس کو غلبہ حاصل ہوا تھا اس لئے بلاد شام بھی اس سے مرعوب تھے۔ جب اتنا بڑا شہنشاہ اس خط سے مرعوب و متأثر ہوا تو سارا عالم نصرانیت کا متأثر ہونا یک لازمی امر تھا۔

۲۔ ہرقل چونکہ اس وقت شام آیا ہوا تھا لہٰذا اس خط کا واقعہ ان اطراف میں مشہور ہوا اور وہاں کے رہنے والے اس سے متأثر ہوئے۔ اس طرح اہل شام (یعنی سوریہ و اردن و لبنان و فلسطین) سب کے دلوں میں اسلام کی داغ بیل پڑی، کم از کم سب کو یہ معلوم ہو گیا کہ جس نبی کی پیشین گوئی انبیائے ماسبق کیا کرتے تھے اس کا ظہور ہو چکا ہے۔

۳۔ قیصر نے اپنا جو ایلچی معلومات حاصل کرنے کے لیے مدینہ بھیجا تھا، اس کا تعلق قبیلۂ غسان سے تھا جو اصل میں یمنی قبیلہ تھا لیکن سیلاب عرم کے بعد شام آ کے آباد ہوا تھا۔ ان میں بہت سے بادشاہ ہوئے جن کی حکومت تین سو سال تک رہی تھی لہٰذا اس خط اور معجزہ کا ذکر شام سے لیکر یمن تک پھیلا جس کی بنا پر غسانیوں میں اسلام کا چرچا عام ہوا۔ اور آگے بڑھ کر ان میں مشہور علماء پیدا ہوئے جیسے ابو علی حسین بن محمد غسانی اندلسی ۴۲۷ھ – ۴۹۸ھ جن کو علم حدیث کا امام مانا گیا ہے، اور قاضی رشید ابو الحسین احمد ۵۶۲ھ جو اپنے عصر میں علم ہندسہ و ادب و شرعیات میں اوحد الناس مانے جاتے تھے۔

۴۔ دحیہ کلبی جس شخص کے ہمراہ دربار قیصر میں پہنچے تھے اس کا نام "عدی بن حاتم" تھا یہ مشہور زمانہ سخی حاتم طائی کا بیٹا تھا۔ اپنے قبیلہ کا سردار، اپنے باپ کی سخاوت کی وجہ سے زمانہ میں مشہور و مقبول تھا، اس خط سے اس پر گہرا اثر پڑا اور کچھ عرصہ کے بعد یہ بھی مسلمان ہو گیا۔ اس کے اسلام لانے سے اسلام کو بہت تقویت پہنچی، اسلام بھی وہ جس میں ولایت کی روح بھی پڑی ہوئی تھی، کیونکہ اس شخص نے آخر تک اہلبیتؑ طاہرین کا ساتھ دیا، اپنی ایک آنکھ جنگ جمل میں حضرت علی علیہ السلام پر قربان کی، پھر تین جوان بیٹے طرفہ و طریف و طراف جنگ صفین میں قربان کیے۔

۵۔ اس خط میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کو پیش کیا: یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم الخ یعنی اے اہل کتاب آؤ ہم اور تم دونوں ایک مشترکہ نقطہ پر مل جائیں اور وہ نقطہ یہ کہ غیر خدا کی پرستش نہ کریں، شرک نہ کریں، کسی بندہ کو خدا نہ کہیں، یہ توحید کی طرف ایک ایسے انداز میں دعوت تھی کہ نصاریٰ کو بھی یہ احساس پیدا ہو گیا کہ شرک ایک نامعقول عقیدہ ہے۔ انہوں نے اس سے بچنے کے لیے شرک سے فرار کرنا شروع کیا اور کہنے لگے کہ ہم جس توحید کو مانتے ہیں وہ "التوحید فی التثلیث والتثلیث فی التوحید ہے"۔ یہ مقولہ اگرچہ ایک نامعقول مقولہ تھا، لیکن اگر تامل کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ بھی توحید حقیقی کی طرف ایک قدم تھا۔

۶۔ اس خط کے لے جانے والے صاحب کردار قاصد یعنی جناب دحیہ کلبی کے کردار نے بھی لوگوں پر بہت گہرا اثر چھوڑا کیونکہ قاصد فی الحقیقت صاحب خط کا ترجمان اور اس کی شخصیت کا عکاس ہوتا ہے، دحیہ کی شان سے شان نبی دوبالا ہو گئی، کیونکہ انہوں نے قیصر کی ملوکیت و جبروتیت کے سامنے اپنا سر جھکانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس طرح انکا سر بھی قلم کیا جا سکتا تھا، دحیہ کلبی کا یہ انکار مادہ پرستی کے منہ پر ایک طمانچہ تھا، جس نے دبدبہ شاہی اکبکبہ طاغوتیت اور طنطنۂ انانیت کے بہتے ہوئے دریا کا رخ موڑ دیا اور دیکھنے اور سننے والے یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ جب "نائب" ایسا ہے تو "منوب عنہ" کیسا ہوگا۔

۷۔ قیصر نے ابوسفیان سے رسول اللہؐ کے جو صفات کرید کرید کر پوچھے اور اس کو یہ بتانا پڑا کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولے، کبھی کسی سے غداری نہیں کی، کبھی خیانت نہیں کی۔ اس سے بھی لوگوں کے دل پر کافی اثر پڑا، جو لوگ مسلمان نہ بھی ہو سکے وہ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد اگر نبوت کی احتیاج ہے تو اس شخص کے سوا کوئی دوسرا نبی نہیں ہو سکتا۔

یہ تھا حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس خط کا مختصر حال اور اس کے اثرات کا ذکر جو آپؐ نے قیصر روم کو روانہ کیا تھا۔

مصادر

اس مقالہ کو لکھنے کے لیے حسب ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

صحیح بخاری کتاب جہاد باب ۱۰۲
صحیح مسلم ۵ ۱۶۳
مسند احمد بن حنبل ۱/ ۲۶۲۔
تاریخ کامل ۲ ۴۲ ۔
تاریخ طبری ۲ ۲۹۰
تاریخ ابن عساکر ۱ ۱۳۹
سیرت حلبیہ ۳ ۲۰۳۔
طبقات کبریٰ ۱ ۲۹۵۔
سیرت زینی دحلان برحاشیہ حلبیہ ۱ ۱۵۰۔
تاریخ ابو الفداء ۱ ۱۴۹

آیت اللہ العظمیٰ منتظری
ترجمہ جناب ممتاز علی

معرفتِ خدا

کلّ معروف بنفسہ مصنوع

جو چیز اپنی ذات سے پہچانی جاتی ہے وہ مصنوع ہے

ماہیتیں وجود کی حدیں ہیں :

جب کسی چیز کی ذات کی معرفت حاصل کرنا ہو تو اس کی جنس، فصل اور ماہیت کو سمجھنا چاہئے۔ جیسے انسان کی تعریف جب بیان کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ انسان حیوانیت اور ناطقیت سے مرکب ہے اس کی جنس حیوانیت اور فصل ناطقیت ہے —— یہاں انسان کی ماہیت کا تجزیہ دو حصوں میں کیا گیا ہے۔ جنس اور فصل اور ان دونوں چیزوں سے مل کر ایک ماہیت مرکبہ معرض وجود میں آئی ہے جسے انسان کہتے ہیں —— لہٰذا جب یہ کہا جاتا ہے کہ "انسان ایک ماہیت ہے" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان ایک حد وجودی رکھتا ہے۔ لیکن خدا ماہیت نہیں رکھتا انسان مرکب ہے اس لئے محتاج ہے اور خدا بے نیاز ہے۔

جب یہ معلوم ہو چکا کہ ماہیتیں "حد" وجود ہیں اور خدا غیر متناہی ہے۔ تو اس کے یہاں نہ ماہیت پائی جائے گی اور نہ حد ود —— اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ ماہیت جنس و فصل سے مرکب ہوتی ہے اور خدا ماہیت نہیں کہ جو مرکب اور محتاج ہو۔ وہ غنی علی الاطلاق اور بے نیاز ہے لہٰذا نہ تو خدا کو درک کیا جا سکتا ہے اور نہ اسکی کنہ حقیقت تک کوئی پہونچ سکتا ہے —— ماہیتیں جو کہ مخلوقات

خدا ہیں ان میں جنس و فصل پائی جاتی ہے۔ اس نے جنس و فصل کے ذریعہ ماہیتوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ بنابریں حضرت امیر المومنینؑ کے فقرہ "کل معروف بنفسہ مصنوع" سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس چیز کی ذات کو انسان پہچاننا چاہتا ہے اور اس کی کنہ ذات کو درک کرنا چاہتا ہے تو اس کی وہ کنہ ذات جو دماغ انسان میں موجود ہوتی ہے وہی اس کی ماہیت ہوتی ہے اور ہر شئے کی ماہیت میں جنس و فصل پائی جاتی ہے اس لئے وہ شئے مرکب ہوتی ہے اور ہر مرکب مصنوع ہے —— اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جو چیز آپکے ذہن میں ہے وہ آپکے ذہن کی پیداوار ہے —— لیکن حقیقت خدا وجود غیر متناہی ہے محال ہے کہ وہ ذہن میں سما سکے اس لئے کہ ذہن محدود ہے اور غیر محدود، محدود میں نہیں سما سکتا۔ ذہن مخلوق ہے خالق محدود مخلوق میں کسی بھی صورت سے نہیں سما سکتا۔

ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ خدا کو صفات سلبیہ اور صفات اضافیہ کے ذریعہ پہچانا جا سکتا ہے عین ذات کو سمجھنا محال ہے

لہٰذا اگر کسی چیز کی کنہ ذات کو سمجھنا چاہیں تو اسمیں ماہیت ہوگی اور ہر ماہیت جنس و فصل کی حامل ہوتی ہے وہ شئے مخلوق اور خدا کی پیدا کی ہوئی ہوگی۔ جو شئے انسانی دماغ میں سمائے گی وہ انسانی دماغ کی پیداوار ہوگی اور انسان کا دماغ بھی مخلوق خدا ہے اس میں آنے والی صورت ذہنی بھی خدا کی مخلوق ہے۔ خدا کی ذات کبھی بھی قابل درک نہیں ہے۔

و کل قائم فی سواہ معلول

جو چیز دوسرے کے سہارے قائم ہو وہ معلول ہے

ظرفیت کی قسمیں :

کسی کی ظرفیت کے معنی میں ہے یہ ظرفیت یا تو جسم کے لئے "ظرفیت مکانی" ہے جیسے آپ کہتے ہیں کہ پانی کوزہ میں ہے یعنی کوزہ، پانی کے لئے ظرف اور مکان ہے۔
یا ظرفیت "مادہ" سے صورت کے لئے اس مقام پر کہا جاتا ہے کہ مادہ میں صورت "حال" ہے جیسے کرسی —— کرسی کی شکل و صورت، مادہ یعنی لکڑی میں "حال" ہے یعنی لکڑی جو مادہ ہے اس کو کرسی کی شکل میں ڈھال لیا گیا ہے۔

یا ظرفیت معروض ہوتی ہے عرض کے لیے، جیسے سفیدی جو رنگ ہے وہ جسم میں حال ہے جیسے چونا۔ چونا ایک جسم ہے جس میں سفیدی حلول کئے ہوئے ہوتی ہے یہ بھی ظرفیت کی ایک قسم ہے۔ ظرفیت کی ان میں سے کوئی بھی قسم خدا کی ذات میں نہیں پائی جاتی کیونکہ وہ جسم نہیں ہے جسکی بنا پر اسے مکان یا جگہ کی ضرورت ہو۔ وہ بعنوان مادہ و صورت بھی نہیں ہے اس لئے کہ اگر صورت کی طرح مادہ میں حلول کئے ہوئے ہوتا تو وہ مادہ کا محتاج ہوتا اور محتاج واجب الوجود نہیں ہو سکتا۔ اگر عرض کی طرح ہوتا تو معروض کا محتاج ہوتا جیسے سفیدی جو چونے میں حلول کئے ہوتی ہے۔
سفیدی قائم بالذات نہیں ہے لہٰذا جو چیز کسی دوسرے کے سہارے قائم ہو وہ معلول ہے اور معلول موجودات کی علت نہیں بن سکتا۔ اور خداوند عالم علت العلل ہے۔ تمام موجودات کی علت ہے، پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ جسم کی طرح مکان میں صورت کی طرح مادہ میں یا عرض کی طرح معروض میں حال ہو۔

فاعلٌ لا باضطراب آلۃ

خداوند عالم فاعل ہے لیکن وہ کسی آلہ کا محتاج نہیں۔

فاعلیت خدا :

خداوند عالم کاموں کا انجام دینے والا اور فاعل ہے اور ہم بھی فاعل ہیں لیکن ہم بغیر اوزار و آلات کی مدد کے کسی کام کو انجام نہیں دے سکتے یعنی اگر ہم کسی چیز کو پکڑنا یا چھوڑ دینا چاہیں تو ہاتھ کا سہارا لینا پڑتا ہے یہاں ہمارا ہاتھ آلہ ہے اسی طرح چلنے کے لئے پیروں کا، دیکھنے کے لئے آنکھوں کا۔ زمین کو نرم کرنے کے لئے کدال، پھاوڑے اور آلہ زراعت کا ایک کرسی بنانے کے لئے آری رندہ اور کیل وغیرہ کا سہارا لینا پڑتا ہے یہ تمام چیزیں آلہ ہیں انسان ان آلات کے سہارے کام کو انجام دے سکتا ہے۔
لیکن خدا تمام آلات کا خالق ہے۔ اس لئے اس کی فاعلیت بس "ارادہ" ہے جب وہ ارادہ کرتا ہے تو چیزیں عدم سے وجود میں آ جاتی ہیں
اس مفہوم کو ذہن سے تھوڑا قریب کرنے کے لئے میں ایک مثال دینا چاہتا ہوں۔

تجرد اور خالقیت (۱)

آپ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے قند کے ایک تیس میٹر والے ٹکڑے کو اپنے ذہن میں فرض کر سکتے ہیں یہ قند کا ٹکڑا جو آپ کے ذہن میں آیا ہے یہ آپکے ذہن کی پیداوار ہے مخلوق ہے۔ آپ نے اس تیس میٹر کے ٹکڑے کے تصور کے لئے (جسے آپ نے اپنی قوت واہمہ میں ایجاد کر لیا ہے) کسی آلہ کا سہارا نہیں لیا چونکہ انسان ایک کمزور وجود ہے اس لئے اس کے اندر جنبۂ تجرد بہت ہی کمزور ہوتا ہے۔ لیکن جتنا اس میں جنبۂ تجرد پایا جاتا ہے اسی اعتبار سے اس میں خالقیت بھی پائی جاتی ہے
آپ کے ذہن میں جو تیس میٹر والے قند کے ٹکڑے کا خیال آیا ہے اس کی حیثیت ایک تصور سے زیادہ نہیں کیونکہ آپ صفت میں تیس میٹر کا ٹکڑا کھانے کے قابل نہیں ہے۔
انسان جب سوتا ہے تو خواب کی حالت میں اس کا تعلق عالم مادہ سے ایک حد تک منقطع ہو جاتا ہے اس حالت میں اس کے ذہن کی پیداوار بڑھ جاتی ہے اور اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس کے اثرات بھی ظاہر ہوتے ہیں خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ کسی سرسبز و شاداب باغ کی سیر کر رہا ہے۔ خراماں خراماں اس میں ٹہل رہا ہے اس کی صاف و شفاف نسیم سحری سے لطف اندوز ہو رہا ہے باغ کے میٹھے اور خوش ذائقہ پھلوں کو کھا رہا ہے —— خواب کی حالت میں وہ اس پھل کی شیرینی اور لذت کا احساس بھی کرتا ہے لیکن بیدار ہونے کے بعد وہ عالم مادہ کی طرف پلٹ آتا ہے لہٰذا فوراً وہ ساری لذتیں ختم ہو جاتی ہیں —— انسان کا باغ میں ٹہلنا، اس کے لذیذ اور میٹھے پھلوں سے لطف اندوز ہونا انسان کے ذہن کی پیداوار ہے۔
عالم برزخ چونکہ خواب سے قوی تر ہے اس میں مکمل طور پر انسان کا رابطہ عالم مادہ سے

منقطع ہو جاتا ہے اس لئے وہاں حالت تجرد اور قوی ہو جاتی ہے اور احساس لذت یا احساس عذاب بڑھ جاتا ہے۔

آخرت میں جب مومن بہشت میں داخل ہوگا تو اس کی حالت تجرد بہت زیادہ قوی ہو جائے گی اسی وجہ سے وہاں جو چیز اس کے ذہن میں آئے گی فوراً اس کے سامنے حاضر ہو جائے گی اور اس سے لطف اندوز ہوگا۔

قیامت کے دن خدا اپنے مومن بندوں سے کہیگا کہ اے میرے بندے میں نے تم کو اپنی

طرح قرار دیا ہے میں جب کسی چیز سے کہتا ہوں کہ "کن ہو جا فیکون" تو وہ موجود ہو جاتی ہے۔ یعنی تم بھی جب کسی چیز کا ارادہ کرو گے تو وہ تمہارے لئے فراہم ہو جائے گی۔ لہٰذا اگر اس دنیا میں خالقیت کا جذبہ ضعیف ہے تو آخرت میں یہ جذبہ قوی ہو جائے گا۔

بنابرایں انسان کے اندر بھی ایک بہت ضعیف، کمزور اور ناچیز سہی جذبہ خالقیت موجود ہے۔ لیکن خدا کے صرف ارادہ سے تمام چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں وہ ان آلات کا محتاج نہیں ہے جن کا وہ خالق ہے۔

آیت کریمہ میں خدا کہتا ہے " اذا اراد شيئا ان يقول له كن فيكون" تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لفظ "کن" کے ذریعہ چیزوں کو پیدا کرتا ہے بلکہ فقط اس کا ارادہ ہے جس سے چیزیں عالم وجود میں آتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ خدا کا ارادہ ازلی ہے۔ وہ ازل ہی سے ارادہ رکھتا ہے مگر دنیا میں چیزیں تدریجاً ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

بہرحال نفس انسان میں جتنا تجرد کا جذبہ پایا جائیگا اسی اعتبار سے اسمیں فاعلیت الٰہی پائی جائے گی اور تجرد آخرت میں بہت قوی ہو جائے گا جس طرح ایک مومن جنت میں اپنے ارادہ سے بہشت کی نعمتوں کو اپنے پاس حاضر کرے گا اسی طرح کافر بھی عذاب سے دوچار ہوگا۔ اس لئے کہ اس کے پاس ایک ڈسنے والی روح پائی جاتی ہے جو ڈنک اس نے دنیا میں لوگوں کو لگایا تھا آخرت میں وہی ڈنک سانپ، بچھو کی شکل اختیار کرے گا اور خود اس انسان کو ڈس لے گا۔

نفس کی قوت :

یہ بھی یاد دلانا ضروری ہے کہ اولیاء خدا میں سے کچھ افراد جیسے ائمہ معصومین علیہم السلام ہی دنیا میں قوی نفس کے مالک ہوتے ہیں اسی لئے ہم کو امام رضا علیہ السلام کے تذکرے میں ملتا ہے کہ آپ نے اپنے ارادے سے پردہ کے شیر کو حقیقی شیر میں (خدا کے اذن سے) بدل دیا۔ ہاں کچھ ریاضت کرنے والے بھی ریاضت کی بدولت اپنے نفس کو قوت کی اس منزل تک پہونچا دیتے ہیں کہ موٹر وغیرہ کو روک دیتے ہیں لیکن یہ خدا سے رابطہ کی بنا پر نہیں ہوتا جس طرح ائمہ معصومین علیہم السلام کو خدا سے ارتباط کی وجہ سے یہ بلند مقام حاصل ہے۔ بلکہ ان کے

یہاں صرف ریاضت نفس کی وجہ سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے۔ بہت سے افراد میں حسد کی قوت اتنی شدید ہوتی ہے کہ ان کی ایک تیکھی نظر سے تن ومند گائے سوکھ جاتی ہے یا رشک آلود نگاہ سے پھول سا بچہ مُرجھا کر بیمار پڑ جاتا ہے۔

لیکن خدا جو مجرد محض ہے وہ فقط اپنے ارادے سے نظام وجود کو ازل سے ابد تک ایجاد کرتا ہے، اس فاعل کو فاعل الٰہی کہتے ہیں۔ ملا ہادی سبزواری منظومہ میں تحریر فرماتے ہیں:

معطي الوجود في الالهي فاعل — معطي التحرك الطبيعي فاعل

یعنی الٰہی فلسفی، "وجود" کے عطا کرنے والے کو فاعل سمجھتا ہے لیکن طبیعی فلسفی "حرکت" عطا کرنے والے کو فاعل گردانتا ہے، ایک بڑھئی، جو "حرکت" کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں کرتا وہ طبیعی منطق کی نگاہ میں فاعل ہے لیکن الٰہی فلسفی کی نظر میں وہ خدا فاعل ہے جو اشیاء کو عدم سے وجود میں لاتا ہے۔

ارادہ الٰہی ازلی ہے :

یہ جو کہا جاتا ہے کہ خدا نے تمام چیزوں کو اپنے ارادے سے پیدا کیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ پہلے اس چیز کا ارادہ کرتا ہے پھر پیدا کرتا ہے اس کا ارادہ تو عین ذات ہے ـــ ہمارا ارادہ ہمارے علم کا معلول ہوتا اور ہم ہر آن ایک نیا ارادہ کرتے ہیں۔ مثلاً جب آپ روٹی کا ارادہ کرتے ہیں تو آپ کے ذہن میں تصور پیدا ہوتا ہے کہ آپ کو روٹی چاہئے پھر اس کے بعد آپ اپنے نفس میں یہ تصدیق کرتے ہیں کہ آپ کو روٹی کی ضرورت ہے اس وقت اشتیاق پیدا ہوتا ہے اور آپ نانبائی کی دکان کا رخ کرتے ہیں تاکہ روٹی خرید لیں۔ نانبائی کی دکان کی طرف رخ کرنا یہی ارادہ ہے۔ روٹی کا تصور، نفس میں اس کے فائدہ کی تصدیق، اس کا اشتیاق یہ اس کے ابتدائی مراحل ہیں، ان مرحلوں سے گذرنے کے بعد ارادہ کی منزل آتی ہے ـــ چونکہ آپ کے تصورات، تصدیقات، شوق سب حادث ہیں اور ارادہ ان حادث چیزوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے آپ کا ارادہ بھی حادث ہے ـــ لیکن خدا عیاذاً باللہ محل حوادث نہیں، اس کے وجود اقدس میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی بلکہ علم خدا اور ارادۂ خدا ازلی ہے وہ ازل سے تمام نظام وجود کا عالم ہے اور ازل ہی سے تمام موجودات کا ارادہ رکھتا ہے۔

حادث کا قدیم سے ربط :

فلسفہ میں اس عنوان کے تحت ایک باب قائم کیا گیا ہے کہ اگر خدا کا ارادہ ازلی ہے، علم خدا ازلی ہے اور ارادۂ ازلی تمام موجودات کی علت ہے تو حادث اور قدیم میں ربط کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ جو چیزیں آجکل پیدا ہو رہی ہیں ان کو ازل سے موجود ہونا چاہئے۔ موجودات تدریجاً کیوں پیدا ہو رہی ہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ فاعل کی فاعلیت کا نقص اور قصور نہیں ہے بلکہ پیدا ہونے والی چیز کی استعداد و قابلیت کا نقص ہے، خدا تو ازل ہی سے ان چیزوں کا ارادہ رکھتا ہے لیکن نظام عالم مادہ، نظام حرکت ہے اور حرکت کا لازمہ ہے کہ چیزیں تدریجاً پیدا ہوں بات کو سمجھانے کیلئے ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔

حرکت، تدریج طلب ہے :

آپ اگر کسی عمارت کی بلندی پر جانا چاہیں تو ابتدا ہی سے آپ کا ارادہ ہوگا کہ تمام زینوں کو طے کر کے اوپر جائیں گے لیکن حرکت کی طبیعت یہ ہے کہ جب تک پہلے زینہ کو طے نہ کرلیں دوسرے زینہ پر نہیں چڑھ سکتے اسی طرح دوسرا زینہ طے کرنے کے بعد تیسرا زینہ طے کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ آپ کے ارادہ کا نقص نہیں ہے آپ نے تو شروع ہی سے عمارت کے بالائی حصہ پر جانے کا ارادہ کیا تھا لیکن اس کے لئے حرکت ضروری ہے اور حرکت میں درجہ بندی ہوتی ہے یعنی ایک مرحلہ کے بعد ہی دوسرے مرحلہ میں داخل ہوا جا سکتا ہے یہاں نقص آپ کے ارادہ میں نہیں ہے بلکہ "قابل" میں نقص ہے۔ اس لئے کہ اس میں ہر مرحلہ کو اپنے بعد والے مرحلہ کا مقدمہ ہونا چاہئے۔

آپ ملاحظہ فرمائیں کہ اسی نظام وجود میں جس کا ارادہ خدا نے ازل ہی سے کیا ہے کچھ مجرد موجودات ایسے بھی ہیں جن میں دوسرا سسٹم پایا جاتا ہے وہاں نہ درجہ بندی ہے اور نہ مراحل ہیں۔ جیسے ملائکہ۔ عالم عقول یہ مجردات اسی ازل کے ارادہ سے وجود میں آگئے لیکن عالم مادہ چونکہ عالم حرکت ہے اور مادہ کی حقیقت حرکت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے لہٰذا یہ مادی عالم مراحل، درجہ بندی اور زمانہ کا محتاج ہے اس لئے ہم ہوں، ہمارے ماں باپ، ہماری اولاد یا عالم وجود کی دوسری چیزیں سب کا ارادہ خدا نے ازل سے کیا تھا لیکن چونکہ حرکت کا لازمہ یہ ہے کہ چیزیں رفتہ رفتہ تدریجی طور پر عالم وجود میں آئیں اس لئے یہ فاعل کا نقص نہیں ہے بلکہ پیدا ہونے والی چیزوں کا عیب ہے۔

خطبہ ۹۶ کے شروع میں بھی میں نے کہا تھا کہ اس خطبہ میں حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے خدا کو پہچنوانے کے لئے بڑے عمیق فلسفی مسائل بیان کئے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ حساس و نازک موقعوں پر خدا کے پہچنوانے پر بہت اصرار فرماتے ہیں اس کا راز یہ ہے کہ معرفت خدا تمام علوم و معارف و اخلاق کی بنیاد ہے جس طرح بغیر جڑ کے درخت خشک اور فنا ہو جاتا ہے اسی طرح انسان کے اعمال و کردار بغیر معرفت خدا کے بے وقعت ہیں اس لئے کہ معرفت خدا کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

اگر ہماری نظر اس بات پر ہو کہ ہمارے تمام حرکات و سکنات اور اعمال کو خدا دیکھ رہا ہے وہ ہماری رگ گردن سے قریب ہے وھو اقرب الیکم من حبل الورید تو ہمارے تمام حرکات و سکنات کا متاثر ہونا لازمی ہے جب تمام عقائد و معارف کی بنیاد خدا کی معرفت ہے تو جتنی توانائی بھی ہم اس راہ میں صرف کریں کم ہے۔

امیرالمومنینؑ کے اس خطبہ میں عمیق فلسفی مسائل کا بیان ہونا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک بہت بڑا اعجاز ہے اس لئے کہ علی پروردۂ آغوشِ پیغمبر ہیں اور پیغمبر کی صداقت کے لئے یہ سارے علوم و معارف کافی ہیں۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں عربستان میں نہ تو کوئی مدرسہ تھا نہ ہی کوئی یونیورسٹی تھی ایسے میں حضرت علیؑ نے اصول توحید کو اپنے خطبہ میں اس طرح بیان کیا ہے جسے ہمیشہ دانش گاہوں اور مدرسوں میں پڑھایا جاتا رہا ہے اب خطبہ کا بقیہ حصہ ملاحظہ فرمائیں۔

مقدار کا تعین

مقدر لا بجول فکرۃ (لا بحول فکرۃ)

وہ ہر چیز کو معین کرنے والا ہے لیکن فکر کو بروئے کار لائے بغیر معین کرتا ہے (فکر سے مدد طلب کئے بغیر)

خدا رزق اور عمر وغیرہ کو معین کرتا ہے کسی کی کتنی عمر ہو اس کو خدا ہی معین کرتا ہے وہی اپنے ارادہ سے کسی کو فقیر کسی کو غنی بناتا ہے۔ غرضکہ عالم کی تمام چیزیں اسی کے علم و ارادہ سے وابستہ ہیں جو اس کا ارادہ ہوتا ہے وہی ہوتا ہے لیکن اسمیں اس کو جولان فکر کی یا فکر سے مدد لینے کی ضرورت نہیں ہے اس کو ہماری طرح سوچنا نہیں پڑتا اس لئے کہ خدا جسم نہیں ہے محل حوادث نہیں ہے کہ فکر کے ذریعہ عیاذاً باللہ کاموں کو انجام دے۔ خدا انسانوں کی طرح نہیں ہے۔ انسان اگر ایک عمارت بنانا چاہتا ہے تو اسمیں غور و فکر، مشورہ اور نقشہ وغیرہ کا محتاج ہوتا ہے لیکن خدا ایسا نہیں ہے۔ تمام چیزیں اس کے ارادہ سے متعلق ہیں اس نے صرف اپنے ارادہ سے دنیا اور دنیا کی ساری چیزوں کو پیدا کیا ہے اور جب چاہیگا فنا کردیگا۔

مقدمات ارادہ

لیکن انسان ایسا نہیں ہے انسان میں ہر آن جدید تصور جنم لیتا رہتا ہے اگر وہ ایک عمارت بنانا چاہتا ہے تو پہلے اس کے ذہن میں عمارت کا تصور آتا ہے اس کے بعد پھر وہ اپنے دل میں اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ عمارت مفید ہے اور اس تصدیق کے بعد اس کے دل میں شوق پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ اس عمارت کے بنانے کا پکا ارادہ کرلیتا ہے۔ انسان کے حادث اور متحرک دل میں وہ تمام خیالات جنم لیتے ہیں جنہیں مبادی ارادہ کہا جاتا ہے ــــ لیکن اس کے برخلاف خدا محل حوادث نہیں ہے اور جو کچھ بھی اس کے پاس ہے وہ ازل سے ہے۔

علم ازلی

وہ تمام نظام وجود کا عالم ہے۔ اس کو غور و فکر سے مدد لینے کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ فکر سے مدد لینا اور فکر کو گردش میں لانا حرکت کی علامت ہے اور حرکت مادہ میں ہوتی ہے ــــ ہماری دعائیں جنہیں وہ قبول کرتا ــــ ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہماری دعا کے بعد اس کے اندر اس دعا کے مستجاب کرنے کا ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ اس کو ازل ہی سے اس بات کا علم ہے کہ فلاں وقت فلاں شخص دعا کرے گا اور ازل ہی سے اس کا یہ ارادہ ہے کہ ہم اس دعا کو مستجاب کریں گے اب رہی یہ بات کہ "دعا قبولیت کی علت ہے" تو اسمیں اور گذشتہ بات میں منافات نہیں پائی جاتی اس لئے کہ بہرصورت دعا، نظام وجود کا جزء ہے اور قبولیت بھی نظام وجود کا حصہ ہے اور تمام نظام وجود ابتدا ہی سے علم و ارادہ خدا سے متعلق ہے۔

گذشتہ مثال آپ کے اذہان عالیہ میں محفوظ ہوگی ہم نے کہا تھا کہ اگر آپ زینہ کے پاس کھڑے ہوں تو آن واحد میں آپ کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے زینہ سے مثلاً بیسویں زینہ تک آپ کو جانا ہے یعنی شروع ہی سے آپ کا ارادہ ہوتا ہے کہ عمارت کے بالائی حصہ تک آپکو جانا ہے۔ اگرچہ ارادہ ابتدا ہی سے ہوتا ہے مگر رفتہ رفتہ آپ عمارت کے بالائی حصہ تک پہونچتے ہیں اس لئے کہ یہاں حرکت لازمی ہے اور حرکت کا لازمہ تدریج ہے ــــ لیکن خدا کے یہاں کوئی جدید تبدیلی یا ارادہ نہیں پیدا ہوتا اس لئے کہ جدید علم و ارادہ رفتہ رفتہ کمال تک پہونچنے کی علامت ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ کمال پہلے نہیں تھا اب نئے علم و ارادہ کے ذریعہ یہ نیا کمال پیدا ہوا ہے ــــ یہ بات انسان کے لئے تو درست ہے مگر خدا کے لئے درست نہیں ہے کیونکہ وہ محل حوادث نہیں ہے۔

جول فکرۃ: جول یعنی جولان اور حرکت دینے کے ہیں۔ لا بجول فکرۃ کا مطلب یہ ہے کہ وہ غور و فکر کی زحمت میں مبتلا ہوئے بغیر چیزوں اور ان کی مقدار کو متعین کرتا ہے۔

حول فکرۃ: نہج البلاغہ کے بعض نسخہ میں جول کی جگہ کلمہ حول لکھا ہے حول کے بھی تقریباً وہی معنی ہیں اس لئے کہ حول مدد اور امداد طلبی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ لاحول ولا قوۃ یعنی خدا کے سوا کوئی مدد اور کوئی قوت نہیں ہے ــــ لہٰذا لا بحول فکرۃ کا مطلب یہ ہے کہ خدا فکر و اندیشہ سے مدد حاصل کئے بغیر اشیاء کو متعین کرتا ہے۔

غنی لا باستفادۃ

خدا کسی سے استفادہ کئے بغیر غنی ہے۔

خداوند عالم غنی علی الاطلاق اور بے نیاز ہے اس لئے کہ سارا عالم اس کے ارادہ کا پابند ہے اور جو کچھ بھی عالم میں ہے وہ سب جلوۂ خدا ہے وہ تمام چیزوں کا خالق ہے۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ دوسروں کا سہارا لیکر بے نیاز بنے بلکہ وہ تو غنی محض ہے ہاں ہم کو بندوں سے (خدا سے نہیں) بے نیاز ہوجانے کے لئے محنت کرنی چاہئے۔ زحمتیں اور مشقتیں برداشت کرنی چاہئے تاکہ خدا کی مہربانی سے ہم کو بھی نسبتاً بے نیازی حاصل ہوجائے۔

حرکت، زمانہ، مادہ

لا تصحبہ الاوقات

خدا ــ عالم زمان و مکان سے بالاتر ہے اس لئے کہ وہ خالق زمان و مکان ہے ــ زمانہ حرکت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس لئے کہ زمین جب اپنے محور پر گردش کرتی ہوئی سورج کے گرد گھومتی ہے تب زمانہ پیدا ہوتا ہے یا حرکت جوہر عالم مادہ، زمانہ پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا یہ پتہ چلا کہ زمانہ معلول حرکت ہے (یعنی زمانہ حرکت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے زمانہ کے پیدا ہونے کی علت حرکت ہے) اور حرکت عالم مادہ کا خاصہ ہے۔ اگر عالم مادہ سے بالاتر ہوکر دیکھا جائے تو پھر زمانہ کا کوئی مفہوم نہیں رہ جاتا ــ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ زمانہ مقدار حرکت کا نام ہے اور حرکت مادہ کی خاصیت ہے لہٰذا عالم مجردات میں جو "عالم مادہ" سے بالاتر عالم ہے، زمانہ کا کہیں سے گذر ہی نہیں ہوسکتا۔ عالم مادہ اپنی بے پناہ وسعتوں کے باوجود دراصل عالم مجردات کا ایک ہلکا سا جلوہ ہے۔ بالکل آفتاب کی اس کمزور روشنی کی طرح جو آنگن سے گذر کر کمرہ میں اور کمرہ سے گذر کر کوٹھری میں پہونچتی ہے۔ لہٰذا یہ عالم مادہ مراحل عالم کا پست ترین مرحلہ ہے۔

(باقی آئندہ)

Quranic verses although not an interpretation based on personal caprices and bias, but a just, truthful and balanced interpretation free of all traces of selfish interests If we try to comprehend the Quran in an honest and unbiased way, it is not at all necessary to solve all problems that we find in it In this regard the Quran is similar to Nature In Nature, too, a number of mysteries have neither been solved yet nor can they be solved in present conditions, yet are likely to be solved in the future Moreover, in studying and understanding nature, man has to tailor his ideas in accordance with Nature itself He is forced to interpret Nature in accordance with its reality He cannot define Nature in terms of his own caprices and inclinations The Quran, like the book of Nature is a book that has not been sent for a specific age and time Had it been otherwise, all the secrets of the Quran would have been discovered in the past, this heavenly Book would not have preserved its charm, freshness and vitality But we see that the possibility of contemplation, reflection and discovery of new dimensions is inexhaustible in the case of this Holy Book This is a point that has amply been emphasized and clarified by the Prophet and the Imams In a tradition, it is related from the Prophet (S) that the Quran, like the sun and the moon, will preserve its movement and continuity, that is, the Quran is not static or monotonous In some other place the Prophet has said that outwardly the Quran is beautiful and inwardly it is deep and unfathomable (ظاهره انيق وباطنه عميق) In *'Uyun akhbar al Ridā* from the Imam al Rida (A), it is quoted that Imam Ja'far al-Sadiq (A) was asked about the secret of it that as the time passes and the more it is read and recited, the Quran increases in its novelty and freshness day by day The Imam al Sadiq (A) answered

لأن القرآن لم ينزل لزمان دون زمان ولناس دون ناس

Because the Quran is not for an exclusive age or for an exclusive people

The Quran has been sent for all ages and for all human beings It is so composed that in spite of changes in knowledge, outlook and approach through various times and ages, it surpasses all learning and knowledge in all ages While it encompasses mysteries and abstruse intricacies for the reader of every age, at the same time it presents a great feast of meanings and ideas that can satiate the needs of every time in accordance with the capacity of that particular age

To be continued

NOTES

1 As to the quality of this influence whether it was in the direction of human welfare and progress or if it was towards human decline and degeneration, whether it caused an upsurge in human history and infused a new spirit and injected fresh blood into the veins of human societies or not is a question which lies outside the scope of our present discussion

2 *Ijtihad* means exercise of independent judgement in matters of Islamic Law including social and political affairs by a competent legal authority, a *mujtahid*

3 *Sunnah* means the established customary practice of Prophet Muhammad (S), used as a legal precedent by the Islamic jurisprudents the *fuqaha*

4 *Hadith* means the narratives describing the sayings acts and circumstances of the lives of the Prophet and Imams

5 It is possible that Hafiz was merely an artist and not a thinker or philosopher or he might have possessed both of these merits But what is certain is that he was formerly considered a scholar more than a poet and was familiar with the thought and works of poets writers jurisprudents commentators of the Quran and particularly Islamic mystics On occasions he had studied some or all of these subjects under learned masters Nevertheless in our own times Hafiz is primarily known as a poet and few consider him as one of the great Muslim scholar whereas during his own life, he was known as a scholar who occasionally composed verses In books compiled in ages closer to the times of Hafiz his name is mentioned with titles which are more appropriate for an *alim* than a poet Now the question arises whether the ideas of this scholar who was intimately familiar with the tradition and culture of his times and possessed a profound knowledge of gnostic and mystical writings and who more than any other Persian poet successfully rendered gnostic and mystical experience into the language of poetry were his own innovation or were borrowed from other sources Was he for instance influenced by Muhi al Din al Andalusi (Ibn al 'Arabi) who is regarded as the father of Islamic mysticism? Did Ibn al Farid al Misri who lived before Hafiz and held the same station in Arabic poetry as Hafiz in Persian, have any influence on Hafiz's thought? It is the duty of an analytical study of Hafiz to find answers to such questions

6 During the sessions of the Congress of Islamic Sects held about 35 years ago and which was aimed at removing misunderstandings between the various Muslim sects a number of Isma'ili delegates also participated The Shi'ah and Sunni delegates unanimously declared that they did not consider the Isma'ilis as being one of the Muslim sects and that the Isma'ili delegates had no permission to participate in the conference

7 The Muslim mystics are divided into two categories of the 'Arif and Sufi by the Shi'ah Muslims While the approved mystics and gnostics are referred to as *urafa* (the plural of *arif*) those who lapsed into heresy and departed from the Shari'ah are labeled as *Sufis* It has been a common practice among Shi'ite religious scholars to refer to Islamic esotericism more often as *'irfan* than as *tasawwuf* (Sufism), the latter term being used mostly in a negative sense According to Sayyid Husayn Nasr this is due to historical reasons connected with the fact that the Safavids were at first a Sufi order and later gained political power with the result that many worldly men sought to put on the garb of Sufism in order to gain political or social power therefore discrediting Sufism in the eyes of the devout (See Allamah S M H Tabataba'i *Shi'ah* p 120) Nevertheless in the light of the above criticism by Martyr Mutahhari of the Sufi approach to the interpretation of the Quran and other allegations of adoption of heresies by various Sufi orders found in writings of Shi'ite scholars the distinction between Sufism and *'irfan* must be considered as going beyond merely historical reasons although the historical reasons may have been responsible for this negative usage of the terms "Sufi" and Sufism and positive designation of Islamic esotericism by the term *'irfan*



عن الحسين بن علي قال.

الا ترون ان الحق لا يعمل به وان الباطل لا يتناهى عنه ليرغب المؤمن في لقاء الله محقا فاني لا ارى الموت الا سعادة ولا الحياة مع الظالمين الا برما

Don't you see that righteousness has been abandoned and wickedness goes unforbidden and unchecked? In such conditions the true believer aspires to hasten into the Presence of God Indeed I can see happiness only in death and find nothing but grief and disgust in life under the shadow of tyrants and oppressors

—al Husayn ibn 'Ali (A)



Is the Quran Understandable?

During the ... study of the Quran, the first question that arises is whether the Quran can be studied and understood. Has this book been introduced for the purpose of studying and understanding it, or whether it is just for reading and reciting and obtaining reward and blessing? The reader ... may wonder at raising of such a question. To him it may appear beyond doubt that the Quran is meant for the purpose of knowing and understanding it. Nevertheless, in view of various undesirable ... which due to numerous reasons came into existence in the Muslim world regarding the question of understading of the Quran, and ... important role in bringing about the decline of Muslims, ... shall discuss this matter in brief. Regrettably, the roots of these ... and dangerous notions still persist in our societies. So I consider it necessary to elaborate on this topic.

Among the ... scholars of three or four centuries ago, there appeared a group which believed that the Quran is not a *hujjah* ("proof", meaning ... legal source usable for vindication). Among the four sources ... that have been regarded as the criteria and standard for the understanding of the Islamic problems by Muslim scholars, i.e. the Quran, the *sunnah* (tradition), *'aql* (reason) and *ijmā'* (consensus of opinion), they did not recognize three of them. Regarding *ijmā'*, they said that it belongs to the Sunni tradition and they could not follow it. Concerning reason, they maintained that reason can also err, and reliance on reason is not legitimate. About the Quran they respectfully asserted that the Quran is greater in station than being subject to study and comprehension by us humble human creatures. It is only the privilege of the Prophet and the Imams to ponder over the verses of the Holy Quran. We ordinary human beings have only the right to read and recite them. This group was that of the Akhbārīyūn or Akhbāris.

The Akhbāris ... *hadith* and chronicles as the only permissible sources of *fiqh* (Islamic jurisprudence). One may be astounded to learn that in some of the Quranic exegeses written by these people, they mentioned only those verses about which the tradition existed, and refrained from commenting other verses as if they are not a part of the Quran.

Such a kind of practice was an injustice to the Quran. This shows that a society that ... neglect and alienate their own heavenly book and that too of the standard and stature of the Quran, is not at all upto the Quranic standards. Besides the Akhbāris there were other groups who also regarded the Quran as inaccessible to the ordinary human intellect. Among them the Ash'arites can be named, who believed that the knowledge of the Quran does not necessarily mean that its verses should be pondered over but the real meanings are the same as that the words literally ... According to them, whatever we understand ... outward meaning, we have to be satisfied with it. We should not be ... concerned with the secret and inner meanings. It was quite natural that this sort of thinking regarding the Quran, very rapidly, gave rise to serious deviations and grave misunderstandings. Since ... the one hand to the task of interpretation of the ... Quranic verses, and, on the other hand, banished ... of religious learning, as a result, they were ... vulgar and superficial interpretations of the Quranic ... of their faulty way of thinking, they deviated from the regular course of correct thinking, and thus gave way to distorted and faulty religious vision. As the result of this type of religious thinking ... beliefs like the personification of God the Almighty, and ... other distorted ideas like the possibility of visual perception of God, His possession of physical characteristics etc., came into existence.

Opposite ... group which abandoned the Quran, another group came into existence which used the Quran as the means to fulfil their selfish aims. They gave the Quranic verses such interpretations as were favourable to their selfish interests, and wrongfully attributed certain ideas to the Quranic text that were not at all in agreement with the spirit of the Quran. In answer to every objection that was made against them, they said that none except themselves could understand the esoteric and secret meaning of the Quranic verses, and whatever they stated was based on the understanding and knowledge of the esoteric meaning of the verses.

The champions of this movement in the history of Islam consist of two groups: the first group are the Ismā'īlīs, who are also known as the Bātinis (secret sect), and the other are the Sufis. Most of the Ismā'īlīs are found in India and some of them are in Iran. They had formed an empire in Egypt known as the Fātimid caliphate. The Ismā'īlīs are so-called Shī'ahs who believe in six Imams. But all the Twelve Imami Shī'ah scholars are unanimous in the opinion that inspite of their belief in six Imams, the Ismā'īlīs stand at a greater distance from the Shī'ite faith than the non-Shī'ite sects. The Sunnis, who do not believe in any of the Imams in the same sense as the Shī'ah do, nevertheless are nearer to the Shī'ah than these 'Six-Imami Shī'ahs'.[6] The Ismā'īlīs, on account of their *bātini* beliefs and secretive practices have played a treacherous role in the history of Islam and have had a big hand in causing serious deviations in the realm of Islam.

Besides the Ismā'īlīs, the Sufis are also charged with distortion of the Quranic verses and had a long hand in interpreting them according to their personal beliefs. Here I present a specimen of their exegesis so that the extent and method of their misinterpretation may be known:[7]

The anecdote of Ibrāhīm (A) and his son Ismā'īl is described by the Quran as follows: It occurred to Ibrāhīm (A) in his dream that he has to sacrifice his son for the sake of God. At first he is perplexed regarding such an instruction; but as he repeatedly has the dream reiterating the same theme, he becomes certain of the Will of God and decides to obey the Divine command. He puts the whole matter before his son, who also faithfully accepts his father's proposal of executing the Divine command:

يا بنيّ انی اری فی المنام انی اذبحک فانظر ماذا تری قال یا ابت افعل ماتؤمر ستجدنی ان شاءالله من الصابرین.

"My son, I see in a dream that I shall sacrifice thee, consider what thinkest thou?" He said, "My father, do as thou art bidden, thou shalt find me, God willing, one of the steadfast." (37:102)

Here the aim is the expression of total submission and resignation towards the Divine decree. For the same reason the father and son are ready to execute the Divine command with whole-hearted purity and sincerity, but the execution of the command was stopped by the Will of God. But the same incident is interpreted by the Sufis in this fashion. Ibrahim here represents intellect and reason (*'aql*) and Ismā'īl represents the self (*nafs*); the Quranic anecdote is an allegory that hints at the attempt of reason to murder the human self (*nafs*).

It is obvious that such interpretation of the Quran is like wanton treatment of it, and presents a distorted perspective of its teachings. It is in the context of such deviate interpretations of the Quran based upon personal or sectarian bias and interests that the Prophet has said:

من فسّر القرآن برأیه فلیتبوّء مقعده فی النار

One who interprets the Quran according to his wish, should be certain of his place in hell.

This kind of frivolous attitude towards the verses of the Quran amounts to the betrayal of the Quran and that too of a grievous degree. The Quran itself strikes a middle course between the stagnant and narrow minded attitude of the Akhbāris and the unwarranted and deviate interpretations of the Bātinis. It recommends a course of sincere, disinterested study and asks for unbiased and unprejudiced meditation over its meanings. Not only the believers and the faithful, but even the infidels are invited by it to contemplate over its verses. The Quran demands that it verses should be first contemplated over, before forming any adverse opinion against them. Addressing the opponents, it says, why they don't ponder over the Quran, what sort of hearts they possess, they are as if shut close and sealed.

افلا یتدبّرون القرآن ام علی قلوب اقفالها

What, do they not ponder the Quran? Or is it that there are locks upon their hearts? (47:24)

The Quran also says in one of its verses:

کتاب انزلناه الیک مبارک لیدّبّروا آیاته

(This is) a Book We have revealed to you abounding in good, that they may ponder the verses

That is, We have not sent the Quran to be kissed, embraced and put on the niche to gather dust, but for men to read and to contemplate about its contents:

ولیتذکر اولوا الالباب

that those endowed with understanding may ponder its signs and so remember. (38:29)

The above verse and scores of other such verses emphasize the importance of contemplation in the Quran and interpretation of the

get anywhere without the knowledge of the Persian language. In the same way, to acquaint oneself with the Quran without knowing the Arabic language is impossible. The other essential condition is the knowledge of the history of Islam; since, unlike the Bible and the Torah, this book was revealed gradually during a long period of twenty-three years of the Prophet's life, a tumultuous time in the history of Islam. It is on this account that every verse of the Quran is related to certain specific historical incident called *shā'n-i nuzūl.* The *shā'n-i nuzūl*, by itself does not restrict the meaning of the verses, but the knowledge of the particulars of revelation throws more light on the subject of the verses in an effective way.

The third condition essential for the understanding of the Quran, is the correct knowledge of the sayings of the Prophet (S). He was, according to the Quran itself, the interpreter of the Quran par excellence. The Quran says:

...وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ...

We have revealed to you the Reminder that you may make clear to men what has been revealed to them (16 44)

The Quran also says:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

It is He who has sent among the illiterate a Messenger from among them, to recite His signs to them, and to purify them and to teach them the Book and the Wisdom (62 2)

According to the Quran, the Prophet (S) himself is the exegetist and the interpreter of the Quranic text. Whatever has reached us from the Prophet, is of great help in our understanding of the Quran. For the Shī'ah, who believe in the infallible Imams (A) also, and believe that the Prophet (S) has transmitted everything he obtained from God to his spiritual successors (*awṣiyā'*), those genuine *riwāyāt* (narrations about the Prophet (S)) that have reached us through the Imams, possess the same degree of authenticity as those obtained directly from the Prophet (S). Accordingly, the authentic *riwāyāt* of the Imams are of great help to us in our understanding of the Quran.

A very important point to remember during the initial stages of study, is that we should try to understand the Quran with the help of the Quran itself; because, the verses of the Quran constitute a completely united integral whole, a coherent unified structure. If we single out any verse from the Quran and try to understand it in isolation from the rest of the Book, it would not be a correct method. However, it is possible that we may happen to understand it, but the method is not recommended by caution, as certain verses of the Quran are explanatory for certain other verses. All great commentators of the Quran have affirmed this method; the infallible Imams also had approved of this manner of interpretation of the Quranic verses. The Quran has its own specific mode of discussing various problems. There are instances where if a solitary verse is studied without placing it in its proper context, it gives quite a different sense than when it is seen under the light of the verses dealing with a similar subject.

For instance, the specific mode and style of the Quran may be noticed from the distinction drawn between *al-āyāt al-muḥkamāt* (the firm verses) and *al-āyāt al-mutashābihāt* (the ambiguous verses). There is a prevalent view regarding the *muḥkamāt* and the *mutashābihāt*. Some people imagine that *al āyāt al-muḥkamāt* are such verses as whose meaning is quite simple and clear, whereas the meaning of *al-āyāt al-mutashābihāt* is cryptic, enigmatic and puzzling. According to this notion, men are only permitted to cogitate upon the meaning of *al-āyāt al-muhkamāt*, and *al-āyāt al-mutashābihāt* are basically inscrutable and beyond their understanding. Here, the question arises, what is the philosophy underlying *al-āyāt al-mutashābihāt*? Why has the Quran put forward such verses that are incomprehensible? A brief answer to this question is that neither *muhkam* means "simple" and "clear", nor *mutashābih* means "ambiguous", "cryptic" and "enigmatic". "Ambiguous" and "enigmatic" are adjectives applicable to sentences that do not convey the meaning in a direct and simple manner, as are sometimes met in the writings of various authors. For example, when Sultān Maḥmūd rewarded the poetic efforts of Firdowsī with a reward of an insignificant and humiliating amount of money, Firdowsī did not accept it, and instead he accused Sultān Maḥmūd of the trait of parsimony in his versified lampoons. Some of them were quite clear and obvious whereas the others were not devoid of ambiguity and a lot of enigma. Firdowsī is quite direct when he says:

اگر مادر شاه بانو بدی   مرا سیم و زر تا به زانو بدی

Had the king's mother been an honourable lady,
He would have rewarded me with knee-high gold and silver.

However, when he remarks:

کف شاه محمود کشورگشای   نه اندر نه آمد سه اندر چهار

The palm of king Maḥmūd, the conquerer of lands,
Was nine times nine and three times four,

what does he intend to say? Here Firdowsī has made use of a enigmatic technique. Those who are interested would like to know the solution: 9 X 9 = 81, 3 X 4 = 12, and 81 plus 12 add up to 93. Firdowsī says, the Sultān's palm was just like 93. It means that the fist of the Sultān was so tightly closed that only his thumb was free, and this thumb along with the index finger (which acquires the shape of 9) and other three fingers make 93. Through this obscure statement, Firdowsī wants to emphatically report the miserliness of the Sultān.

We shall see whether there are actually any enigmatic and abstruse verses in the Quran. Such an assumption contradicts with the text of the Quran which unequivocally states that it is a clear and comprehensible book whose verses provide guidance and shed light. The core of the problem is that some of the issues dealt with in the Quran are related to metaphysical matters and the transcendental world, which cannot be expressed in ordinary language. In the words of Shaykh Shabistarī:

معانی هرگز اندر حرف ناید   که بحر بیکران در ظرف ناید

The word fails to encompass meaning,
The ocean cannot be poured into a pot.

Since the language of the Quran is the same as used by men, inevitably, the same diction is used for the most sublime and spiritual themes as we human beings use for earthly subjects. But in order to prevent any misunderstanding about certain problems, some verses have been deviced in such a way that they need to be explained with the help of other verses. There is no way except this. For example, the Quran wanted to point out to a truth namely, seeing God through the heart that is, to witness the presence of God by means of one's heart. This idea has been expressed in the following terms.

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ. إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ

(Some) faces on the Day shall be bright,
looking towards their Lord (75 22 23)

The Quran makes use of the verb 'looking', and no other word more suitable could be available for the expression of the desired sense. But to avert the possibility of any doubt, the Quran explains in other place:

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ

Vision perceives Him not and He perceives all vision (6 104)

The second verse makes the reader distinguish between two different meanings conveyed by the same word. In order to avoid any possibility of ambiguity in its exalted themes, the Quran asks us to check the *mutashābihāt* against the *muḥkamāt*:

أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ...

He sent down upon thee the Book, wherein are verses firm (ayāt muḥkamāt) that are the essence of the Book (3 6)

Thereby, the Quran means that there are certain verses whose firmness cannot be denied and other meanings cannot be derived from them, except their real ones. Such verses are the 'mother' of the Book (*umm al kitāb*). In the same way as a mother is the refuge to her child, or a cosmopolitan city (*umm al-qurā*) is the center of small cities, *al-āyāt al-muḥkamāt* are also regarded as the axes of the *mutashābihāt*. *Al-āyāt al mutashābihāt* are, of course, to be cogitated upon and understood, but they are to be pondered upon with the help of *al-āyāt al-muḥkamāt*. Any inference drawn without the help of the mother-verses would not be correct and reliable.

The other reason responsible for the popularity of the Quran among the people was its extraordinary, supernatural literary and artistic dimension depicted in its rhetoric and eloquence. It was this strong literary attraction towards the Quran, which had an appeal for the people, that prompted them to immediately memorize its verses. But unlike other literary works like the *Diwan-e Hafiz* and poems of Rūmī, which are exposed to meddling by admirers who think they are improving on the original, nobody could ever give himself the permission of meddling with the sacred text, for the Quran immediately declared in one of its verses:

ولو تقول علينا بعض الاقاويل لاخذنا منه باليمين ثم لقطعنا منه الوتين

Had he [the Prophet (S)] invented against Us any saying, We would have seized him by the right hand, then We would surely have cut his life vein. (69:44-46)

There are several other verses in the Quran that forbid forgery in relation to the Word of God. The gravity of this sin as stressed by the Quran had profound impression upon minds and served as a severe discouragement in this regard. In this way, before any type of alterations could have taken place in its verses, they were repeated often, thus reaching a stage that it was impossible to increase, diminish or alter even a single word in this heavenly book. Accordingly, there is neither any need of any discussion about the Quran from the point of view of authenticity, nor does any scholar of the Quran throughout the world see any necessity of such a discussion. However, I think, it is necessary to remind the readers about the fact that, because of the rapid expansion of the Islamic domain and distance of the major part of the population living far away from Medina, which was the center of *huffaz* (those who memorized) of the Quran and the Companions of the Prophet, there arose the danger of occurrence of advertent or willful gradual alteration in the Quranic text. But the prompt dexterity and timely awareness on the part of early Muslims, averted this danger. Within the first five decades, they utilized the services of the *Sahabah* (the Companions of the Prophet) and those of the *huffaz* of the Quran for the purpose of averting the chances of conscious or inadvertent alterations in the text of the Quran. They distributed approved copies of the Quran from Medina to the surrounding regions. They thus checked any chances of wrongdoing, specially on behalf of the Jews, who are well known champions in this field.

2. Analytical Study

During this stage of study and analysis of a book, it is essential to understand these things: the subject it deals with, the goal that it pursues, its outlook regarding the world, its point of view concerning man and society, its style and treatment of the subject, whether the treatment of the subject is in an intellectual and scholarly manner, or whether it has its own characteristic style. One more question that is relevant in this context is whether this book contains any message and guidance for humanity or not. If the answer to this question is in the affirmative, then what is the message that it conveys? The first group of questions are, of course, concerned with the point of view and outlook of the book regarding man and universe, about life and death etc. In other words, these questions are associated with the world-outlook of the book, and in terms of Islamic philosophy, with its *al-hikmat al-nazariyyah* (theoritical wisdom). But the second group of questions is concerned with the perspective of future of mankind offered by the book. They deal with the suggested basis for moulding the human kind and human societies. This aspect may be regarded as the "message" of the book.

This sort of understanding is, however, concerned with the subject of the book, and is relevant in regard to all kinds of books, whether it is the medical treatise of Ibn Sina, or if it is the *Gulistan* of Sa'di. It is possible that a book may lack an outlook as well as a message, or it may contain an outlook but not a message, or it may contain both.

Regarding the analytical study of the Quran we shall have to see in general, what sort of problems does the Quran deal with, and what is its manner of presenting them. What is its manner of argument and its approach to various problems? Does the Quran, being the defender, preserver and protector of faith, and its message being a religious message, view reason as a rival to its teachings, and cling to a defensive posture against it, or whether it considers reason as a supporter and protector of faith and relies upon its power? These questions and various other queries arise during the analytical study of the Quran.

3. Study of the Sources of Ideas

At this stage, i.e. after verification of authenticity of the authorship of a book, and after thorough study and analysis of its contents, we come to the stage of exploring whether the contents of the book comprise of its author's own original ideas, or the ideas have been borrowed from some other source. For instance, in studying Hafiz's works, after verifying the authenticity of the verses and making their analytical study, we have to see whether the themes, ideas, and thoughts that have been incorporated into Hafiz's poetry and poured into the moulds of his words, phrases, couplets, language and style, are actually the creations of Hafiz, or whether only the words and phrases and the beauty, art and craftsmanship reflected in the verses come from Hafiz, whereas the thoughts and ideas belong to someone else, or have been borrowed from another source. After ascertaining his artistic originality, the intellectual originality of Hafiz's works has also to be established.

This kind of study regarding Hafiz, or any other author, implies the study of the source and roots of the author's ideas and thought. This sort of study is secondary to an analytical study, that is, firstly the contents of the author's thought should be completely understood and afterwards an attempt should be made to identify its roots and sources. Otherwise, the result of one's effort will be something like the works of certain writers of history of various sciences, who write without any thorough knowledge of the subject, or similar to the works of those writers of philosophical books, who undertake, for instance, a comparative study of Ibn Sina and Aristotle, without any knowledge of either. After superficial comparison and on discovering some literal similitudes between the works of the two great thinkers they immediately sit down to pass a quick judgement. Although for the purpose of a comparative study, very deep and profound knowledge of the ideas and thoughts of both of the philosophers is required. A lifetime of study is necessary for such a task, otherwise, it has no more value than can be given to blind imitative conjectures.

For the study and understanding of the Quran, an analytical study must be followed by a comparative and historical study. That is, the contents of the Quran should be compared with other books that existed at that time, specially the religious ones. For the purpose of such a comparison, it is essential to keep in mind the conditions and relations of the Arabian peninsula with other parts of the world and the number of educated Arabs living in Mecca at the time. Only then we can arrive at an estimation of the influence of other books of those times on the contents of the Quran, and if we find something common in them, discover its proportions. We can then see whether the material that has been borrowed from other books is used in an original manner or not. Does the Quran go even further to the extent of playing a role in amending the contents of those books, and setting right the errors occurring in them?

The Three Distinguishing Characteristics of the Quran

Our study of the Quran acquaints us with three distinguishing characteristics of this holy book. The first distinguishing characteristic is the absolute authenticity of its source. That is, without the slightest need of any comparison between the oldest manuscripts, it is evident that what we recite as the verses of the Holy Quran are exactly the same words presented before the world by Muhammad ibn 'Abd Allah (S). The second characteristic feature of the Quran is the quality of its contents; its teachings are genuinely original and have not been adopted or plagiarized. It is the duty of an analytical study to prove this fact. The third characteristic of the Quran is its Divine identity; its teachings have been delivered to the Prophet from a world that transcends his thought and mind. The Prophet (S) was only a recipient of this revelation and message. This is the result that we obtain from the study of the sources and roots of the Quran.

But the study of the sources of the Quran and confirmation of its originality, depend upon the analytical study. So I resolve to open this discussion with the analytical study of the Quran. We shall first see what is the subject matter of the Quran, what kind of problems are discussed in it, what type of problems have been given priority, and in what manner those subjects are presented in it. If we are successful in our critical analysis, and acquire a sufficient understanding of the Quranic teachings, it will bring us to an acknowledgement of its principal aspect, which is the Divine aspect of the Quran, the quality of its being a Divine miracle.

Conditions Necessary for the Study of the Quran

The understanding of the Quran requires certain preliminaries which are briefly described here. The first essential condition necessary for the study of the Quran, is the knowledge of the Arabic language, such as for the understanding of Hafiz and Sa'di, it is impossible to

Understanding the Uniqueness of the Qur'ān *Part i*

by Martyr Murtaḍā Muṭahhari

translated from Persian by Muhliqa Qara'i

The study and knowledge of the Quran is essential for every learned person as well as for all faithful believers. It is specially essential for those scholars who are interested in the study of man and society, since this book has been effectively instrumental not only in moulding the destinies of Islamic societies, but also in shaping the destiny of the human race as a whole. A brief glance over history would be enough to provide sufficient proof of the claim that there has been no such book that has ever influenced human societies to the magnitude of the Quran.[1] It is for the same reason that the Quran automatically steps into the precincts of sociological discussions, and becomes the elemental constituent of the subjects of research in this discipline. This means that any deep study and profound research in the field of world history of the last fourteen hundred years, is impossible without the knowledge of the Quran.

The study of the Quran is essential for every committed Muslim, since it is the main source and foundation of the religious thought and faith. Whatsoever that gives meaning, essence and sanctity to his existence lies in the Holy Quran.

The Quran is not just like other religious books which are content to discuss the problems of existence of God and creation in cryptic tones, or like those which merely convey a series of simple moral advices and counsels, so that those who believe in them are hopelessly left to search for guidance in other sources. Unlike such books the Quran formulates the tenets of faith besides communicating the ideas and views that are essential for a man of faith and belief. Similarly, it also lays down the principles of moral and ethical values for the purpose of social and familial existence. It leaves the job of explanation, interpretation, and occasionally that of *ijtihād*[2] and application of principles (*usul*) to secondary matters (*furū'*) to be dealt with through *ijtihad* and *sunnah*.[3] Accordingly, utilization of any other source depends on the prior knowledge of the Quran. The Quran is the criterion and standard for judging all other sources. We should judge *hadith*[4] and *sunnah* in the light of the Quran. We can accept it only when it is in accordance with the Quran, otherwise we do not accept it.

There are four more books that come after the Quran, and are regarded as the most sacred and the most authentic sources (by the Shi'ah Muslims). They are *al-Kafi, Man la yahduruhu al-faqih, Tahdhib*, and *Istibsār*. There are also other sources like the *Nahj al-balāghah*, and the prayers of *al-Sahifah al-Sajjādiyyah*. All these books are secondary to the Quran, and their authenticity of source is not so absolute as that of the Quran. A *hadith* from *al-Kāfi* is as trustworthy as it may be in conformity with the Quran, and reliable so far as its words comply with the teachings of the Quran and do not go against it. The Prophet (S) and the infallible Imams have said that their traditions should be checked in the light of the Quran; if they do not coincide with the words of the Quran, they should be regarded as false and fake, and as being wrongfully attributed to them; since they have not said anything that can go against the Quranic teachings.

APPROACHES TO THE UNDERSTANDING OF THE QURAN

Now that the necessity of understanding the Quran has been confirmed, let us see what are the ways of understanding this book. Generally for the purpose of a profound understanding of any book it is necessary to study it in three ways:

1. Authentication:

At this stage, we want to know to what extent the relationship of a book with its author is authentic. Suppose we want to study the *Diwān-e Hāfiz*, or the *Rubā'iyyat* of 'Umar Khayyām. At first, we have to see whether the work which is attributed to Ḥāfiẓ, wholly belongs to him, or whether a part of it is Hāfiz's work and the rest is an apocryphal annexation to it. Similarly in the case of 'Umar Khayyām, and others too, we must judiciously scrutinize their works. It is here that the matter of examination of manuscripts—and for that matter the oldest of them becomes relevant. Thus we see that none of these books can dispense with such a treatment. The *Diwān-e-Ḥāfiẓ* printed by the late Qazvini, which has been based on some of the most authentic manuscripts of Ḥāfiẓ's work, varies greatly from the ordinary editions of Ḥāfiz printed in Iran and Bombay, which are usually found in homes. The editions of Hāfiẓ's works published during the last thirty or forty years contain as much as twice the amount of Ḥāfiẓ's original works. In view of certain modern manuscript experts of repute, they are fake; although we occasionally come across in them some verses which match the sublime heights of Hāfiẓ's poetry. Likewise when we study the quatrains attributed to 'Umar Khayyām, we shall find nearly two hundred quatrains of the same poetical standard with only minor differences usually possible even among the authentic verses of a single poet. However, if we look back at the history of Khayyām's times, we shall notice that the number of quatrains attributed to him may perhaps be less than twenty. The authenticity of the rest of them is either doubtful, or may with certainty be said to belong to other poets.

It means that the first step towards the research study of any book is to see to what extent the book in our hands is authentic, whether all the things recorded on its pages are genuine, or if only a part of it is authentic. Moreover, what criteria and standards should be employed in order to judge the authenticity and genuineness of authorship? By what logic can the authenticity of any book be totally rejected or affirmed?

The Quran is absolutely exempt from all such criteria that may be applicable to all worldly books. It is regarded as the exclusively singular book since the ancient times. No book of ancient days has remained above doubt to such extent despite a long lapse of several hundred years. No one can ever say about it that such and such a *sūrah* has a questionable authenticity or such and such a verse that is present in such and such a manuscript is missing from another manuscript. The Quran stands above the notions of manuscript reading. There is no place for the slightest doubt that all of the verses that exist in the Quran are those conveyed to Muḥammad ibn 'Abd Allāh (S) who communicated them as the miraculous Word of God. Nobody can ever claim that another version of the Quran existed anywhere, or still exists. There has not been any Orientalist either who would begin the study of the Quran by saying, 'let us trace from the earliest of the manuscripts of the Quran to see what was included in it and what was not'. The Quran is absolutely free from this kind of investigation necessary in case of such books as the *Bible*, the *Torah*, or the *Avesta*, or the *Shāhnāmeh* of Firdowsi, or the *Gulistān* of Sa'di and every other ancient or not so ancient work.

Only for the study of the Quran no such questions arise and the Quran is far above the usual norms of authenticity and the craft of manuscript reading. Moreover, besides the fact that the Quran is one of the heavenly scriptures and has been regarded by its followers as the most basic and authentic proof of the Prophet's (S) claim to prophethood, and as the greatest of his miracles, the Quran, unlike the *Torah*, was not revealed at one time and was not subject to later difficulties in distinguishing the *true* manuscript. The verses of the Quran were revealed gradually during a span of twenty-three years. From the very first day, the eager Muslims memorized its verses, preserved and recorded them. Those were the days when the Muslim society was quite a simple society. No other book existed besides the Quran, and the Muslims were inevitably inclined to memorize its verses. Their clear, unmarked minds and their powerful memory, their general ignorance about reading and writing, all these factors assisted them in acquiring and retaining their information regarding the Quran. This is the reason why the message of the Quran, which was so congenial to their sensibilities and their natural propensities, got effectively imprinted on their hearts like inscription on stone. Since they believed it to be the Word of God, it was sacred to them also. They couldn't permit themselves that a single word or even a letter of it be altered or replaced in its text. They tried to acquire the nearness to God by reciting its verses. It should be noted here that from the very early days the Prophet (S) had engaged a group of scribes for the purpose of writing down the Quran, who were known as the "Scribes of the Revelation". This should be regarded as one of the merits in favour of the Quran from which all other ancient books are excluded. The absence of any alteration and change in the Word of God was on account of this process of writing and recording from the very beginning.

BASHEER-W-NAZEER

Weekly

وأذن في الناس بالحج يأتوك رجالا
وعلى كل ضامر يأتين من كل
فج عميق ليشهدوا منافع لهم و
يذكروا اسم الله في أيام
معلومات ....

— [illegible] ۲۷ ۲۹

IF NOT DELIVERED PLEASE RETURN TO: BASHEER-W-N ZEER, HYDERABAD-500 006. INDIA.
POSTAL REGD.No.H/HD-47283 REGD.No.47283. TEL: 253877/253392. TLX: 425-6603 TTI-IN

ہفتہ وار

بشیر و نذیر



ترتیب

مدیر
سید علی عباس موسوی

جلد (۱) ★ شمارہ (۳)

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ سالانہ ۴۵ روپے

رجسٹرڈ نمبر 47263/20/5/AL/88.TC

اداریہ

اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی دین ہے (ان الدین عند اللہ الاسلام) رسولؐ مقبول نے کامل دین پیش کیا جسمیں، قانون، معاشرہ، اخلاق، فلسفۂ عمل، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر و عبادات پر مشتمل ہے اور اسلام نے انسان کو اعلیٰ اقدار کے زیور سے سنوارا تاکہ وہ فرد کی صلاح و فلاح پر توجہ دے اور فرد اور قوم کی تعمیر کرے اللہ کو حاکم مانے اور شریعت محمدی پر عمل کرے اور قومیت و رنگ و نسل کے فلسفہ کو مسترد کرے۔
یقیناً بصیرت سے کام لیکر انسان اسلام کے ذریعہ حرکت بیداری احساس اور خود اعتمادی پیدا کر سکتا ہے۔

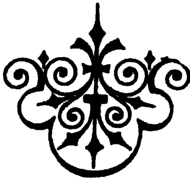
پروردگار عالم نے دیگر عبادتوں کے علاوہ حج کو صاحبان استطاعت پر واجب گردانا مگر حج کے ارکان کی ادائیگی کے دوران کسی فرد، کو برتری یا عظمت نہیں دی بلکہ ایک مقام ایک وقت اور ایکساں، لباس کی پابندی کے ذریعہ بتا دیا کہ خدا کے نزدیک ایام حج میں خدا کے شہر میں سب برابر ہیں احکامات کی پابجائی میں امیر و غریب میں کوئی فرق نہیں کسی کو مارنے، برا بھلا کہنے کا اختیار نہیں بلکہ خواہشات کو ترک کر کے، ریت پر پیشانی خم کر کے، توبہ، مناجات، طلب مغفرت، امید عطا، سب سے دوری اور اللہ سے قربت کے ذریعہ حج میں جو منازل مسلمان طے کرتے ہیں وہ کہیں نہیں ملتے گویا حج میں اسطرح تزکیہ نفس کی عملی تعلیم دی جاتی ہے۔

حج سے واپسی پر یقیناً ہر مسلمان کو رسولؐ مقبول کا وہ آخری حج یاد آتا رہیگا جو ۲۳ سالہ محنت و مشقت کے بعد بجا لا کر رسولؐ اکرم واپس ہو رہے تھے اور جب ۱۸ ذی الحجہ ۱۰ھ کو یہ قافلہ غدیر خم پر پہونچا تو ارشاد پروردگار بموجب قرآن ہوا۔
" اے رسولؐ پہونچا دو اس امر کو جو تم پر نازل کیا گیا ہے اگر تم نے یہ نہیں پہونچایا تو گویا تم نے کار رسالت ہی انجام نہ دیا اللہ تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔"

اس وحی کے نازل ہوتے ہی رسولؐ نے قافلہ کو روکا جو آگے تھے انہیں واپس بلایا اور جو پیچھے تھے انکا انتظار کیا اہتمام نماز ہوا حسنینؑ کو بازو اور علی مرتضیٰؑ کو اپنے سامنے کھڑا کیا حمد و ثنا الٰہی کے بعد اپنے رحلت کی خبر سنائی گمراہی سے نجات پالے کتاب خدا اور اہلبیتؑ سے منسلک رہنے کی تاکید کی اور پھر اپنی رسالت اور مولائیت کا اقرار لیا اور حضرت علیؑ کو ہاتھوں پر بلند کر کے کہا کے مَن کُنت مولاہ فھذا علی مولاہ یعنی میں جسکا مولا ہوں یہ علیؑ بھی اسکا مولا ہے اور دعا کی پروردگار دوست رکھ اُسے جو علیؑ کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اس سے جو علیؑ سے دشمنی رکھے مدد کر اسکی جو علیؑ کی مدد کرے اور چھوڑ دے اسکو جو علیؑ کا ساتھ چھوڑ دے، اور اپنے خطبہ میں تمام حاضرین کو حکم دیا کہ وہ اس اعلان کو قیامت تک آنیوالوں کو پہنچا دیں۔ جب یہ اعلان ہوا تو آیت نازل ہوئی کہ آج دین کامل ہوگیا رسالت کی تکمیل ہوئی اور نعمتیں تمام ہوئی اور اسکے بعد حضرت علیؑ، ابن ابی طالبؑ کو ایک خیمہ میں بٹھوالیا تمام مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت علیؑ کی خدمت میں جائیں اور ایک ایک جماعت سلام و بیعت کرے اس موقع پر مسلمانوں نے بیعت کی مبارکباد دی اور کہا کہ مبارک ہو مبارک یا علیؑ آپکو کہ آج سے آپ ہمارے اور ہر مومن و مومنہ کے مولاؑ ہو گئے
[اس واقعہ کو مسند امام احمد جلد ۴ تاریخ حبیب السیر جلد ۱، ۳ معارج النبوت رکن چہارم ماکنز العمال جلد ۸ ریاض نضرہ جلد ۲ مسند ابوداود۔ تاریخ طبری ابوالفدا۔ صواعق محرقہ روضۃ الاحباب تفسیر در منثور تفسیر فتح البیان وغیرہ میں نقل کیا گیا ہے۔]

یہ اعلان غدیر حضرت علیؑ کی ان خدمات کا جو انہوں نے دعوت ذوالعشیرہ سے لیکر مسجد کوفہ میں شہادت تک مسجد میں راستوں پر، مدینہ میں مکہ اور جنگوں اور انجام دی انکا گویا ظاہری اعتراف تھا۔ اور مسلمانوں کو صراط مستقیم پر گامزن رکھنے کیلئے یہ اعلان رسالت بحکم خدا ہوا۔
لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیئے کہ احکام خدا اور رسولؐ کی روشنی میں حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کے عمل کو اپنے لئے مشعل راہ بنالے تاکہ اسکی زندگی اسلامی اصولوں کے آئین کے مطابق حقانیت کے زیر سایہ بسر ہو۔
ہم عید غدیر کے اس مبارک موقع پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں اس اعلان غدیر پر صدق دل سے عمل آوری کا ہم میں جذبہ پیدا ہو۔

نوٹ۔ قارئین سے امید ہے کہ وہ اپنی رائے اور اہل قلم حضرات اپنے مضامین سے ہماری ہمت افزائی کریںگے۔ اپنی رائے یا چندہ روانہ فرماتے وقت سلسلہ نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
(ادارہ)



سید علی عباس موسوی کی ادارت میں سرور آفسیٹ پرنٹنگ پریس حیدرآباد میں چھپ کر ہفتہ وار خیر نذیر 13-6-822/1 لنگر حوض حیدرآباد اے پی پن کوڈ نمبر ۵۰۰۰۰۸ سے شائع کیا

آیت اللہ العظمیٰ منتظری
ترجمہ: جناب ممتاز علی

معرفتِ خدا

عالم مادہ (ناسوت) اتنا کمزور ہے کہ اس میں لغزندگی پائی جاتی ہے اور یہ حرکت اسی لغزندگی کا اثر ہے اور لغزندگی معلول کا نقص ہے اسی لئے عالم مادہ ارتقاء اور رفتہ رفتہ ترقی و کمال تک پہونچنے کا محتاج ہوتا ہے لیکن عالم مجردات میں کوئی کمی نہیں پائی جاتی وہاں جو کچھ ہے وہ کمال ہی کمال ہے۔

لہٰذا زمانہ، عالم مادہ سے متعلق ہے اس عالم مادہ سے جسمیں حرکت پائی جاتی ہے اور خدا، خالق زمانہ و مادہ و حرکت ہے اس وجہ سے اس کی ذات اقدس میں زمانہ کا گذر ناممکن ہے۔

مرحوم سید حبیب اللہ خوئی شرح نہج البلاغہ کی گیارہویں جلد میں اس مناسبت سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت نقل فرماتے ہیں۔ ہم متن روایت نقل کررہے ہیں۔

"روی فی البحار عن التوحید والامالی عن ابی بصیر عن ابی عبداللہ الصادق علیہ السلام قال: ان اللہ تبارک وتعالی لا یوصف بزمان ولا مکان ولا حرکۃ ولا انتقال ولا سکون بل ہو خالق الزمان والمکان والحرکۃ والسکون والانتقال۔"

ابوبصیر امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: خداوند عالم زمان ومکان وحرکت وسکون وانتقال سے متصف نہیں ہے بلکہ وہ ان تمام چیزوں کا خالق ہے۔

زمانہ، انسان اور جسم کا خاصہ ہے۔

"لا تصحبہ الاوقات" کوئی بھی زمانہ، چاہے وہ ماضی ہو حال ہو مستقبل ہو خدا کی معیت اور مصاحبت میں نہیں ہے — ہم اکثر یہ کہتے ہیں کہ "خدا ہمیشہ سے ہے" یہ صرف اس لئے کہتے ہیں کہ ہم خود زمانہ میں زندگی بسر کررہے ہیں لہٰذا مجبوراً ہم یہ جملہ اپنی زبان پر جاری کرتے ہیں ورنہ لفظ "ہمیشہ" کا اس مقام پر کوئی زمانی معنی نہیں ہے — یہاں لفظ "ہمیشہ" کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذات میں فنا نہیں ہے اور زمانہ کی معیت بھی نہیں ہے اس لئے کہ زمانہ اس عالم مادہ کا امتیاز ہے، زمانہ وجود انسان کا ایک رخ ہے انسان کی خصوصیات اور شان میں سے زمانہ ہے۔ جس طرح انسان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ ایک طول وعرض وعمق رکھنے والا جسم ہے، جس طرح انسان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ پوست اور رنگ رکھتا ہے اسی طرح اس کی ایک خصوصیت ایک شان اور ایک رخ زمانہ بھی ہے لیکن زمانہ اس کا تہہ دار بھی پہلو ہے۔

اسی وجہ سے صدر المتألہین اسفار میں تحریر فرماتے ہیں کہ ہر جسم میں دو امتداد پائے جاتے ہیں۔

۱۔ امتداد زمانی ۲۔ امتداد مکانی

درحقیقت انسان میں چار امتداد پائے جاتے ہیں، ایک تو زمانہ ہے اور دوسرے تین امتداد، یعنی طول وعرض وعمق کو صدر المتألہین سمیٹ کر "امتداد مکانی" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

"ولا ترفدہ الادوات"

آلات اور اوزار اس کی مدد نہیں کرتے۔

خدا، اوزار یا آلہ کا محتاج نہیں ہے۔ بس اس کا ارادہ ہی چیزوں کو وجود میں لانے کیلئے کافی ہے، محض اس کے ارادہ سے ساری چیزیں زیور وجود سے آراستہ ہوجاتی ہیں۔ انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون (سورہ یٰس ۸۲/)۔ چونکہ تمام اوزار اور آلات مخلوق خدا ہیں اس لئے خدا ان سے بے نیاز ہے۔

سبقت تکوینی

سبق الاوقات کونہ

وجود خدا زمانوں سے پہلے ہے

خدا کا وجود ماضی، حال، مستقبل تمام زمانوں سے پہلے ہے لیکن یہ سبقت — سبقت زمانی — نہیں ہے بلکہ یہ سبقت — سبقت تکوینی — اور علت ومعلولی سبقت ہے۔

سبقت زمانی: جیسے کوئی کہے کہ ہمارے آباء واجداد کو ہم پر یا ہمارے باپ دادا اور ہماری اولاد کو فلاں پر سبقت حاصل ہے۔ یا فلاں تو اس کی اولاد اور اس کے پوتوں پر تو یہ سبقت حاصل ہے تو یہ سبقت، سبقت زمانی ہے خطبہ میں اس مقام پر یہ سبقت مراد نہیں ہے۔

سبقت تکوینی: ۱۔ آپ آئینہ میں اپنے عکس پر غور کریں۔ آپ جب تک آئینہ کے سامنے کھڑے رہیں گے آپ کا عکس اسمیں نظر آئے گا۔ یہاں آپ کی ذات آپکے عکس پر سبقت رکھتی ہے۔ اس سبقت کو "سبقت تکوینی" یا علت ومعلولی سبقت کہتے ہیں یعنی جب تک آپ آئینہ کے سامنے نہ ہوں گے آپ کا عکس آئینہ میں نہیں دکھائی دے گا۔

۲۔ وہ قوی نور جو صحن خانہ میں ہوتا ہے اسی کا جلوہ کمروں میں نظر آتا ہے۔ وہ قوی نور ان جلووں کی بہ نسبت سبقت رکھتا ہے لیکن سبقت کا مطلب سبقت زمانی نہیں ہے۔ چونکہ یہاں سرے سے زمانہ ہی نہیں ہے۔ یہاں جو کچھ ہے وہ نور قوی اور اس کا کمروں میں بکھرنے والا جلوہ ہے اگر وہ نور نہ ہوتا تو کمروں میں جلوہ بھی نہ ہوتا۔

۳۔ آگ جلاتی ہے لہٰذا آگ حرارت پر سبقت رکھتی ہے۔ لیکن یہاں بھی سبقت زمانی نہیں ہے بلکہ سبقت علی ومعلولی ہے۔ اس لئے کہ حرارت، آگ کا معلول ہے۔ اس سبقت کو "سبقت شیئی وفیئی" بھی کہتے ہیں۔ یعنی کسی چیز کی سبقت اور اس کا سایہ۔ یہاں گویا حرارت آگ کا سایہ اور پرتو ہے۔ اسی طرح آئینہ میں جو آپ کا عکس نظر آتا ہے وہ آپکا سایہ اور جلوہ ہے یہ سایہ واقعی سایہ نہیں ہے یہ آپ کے سایہ کی طرح ہے۔ لہٰذا اس کو سبقت "شیئی وفیئی" کہتے ہیں۔

بنابر ایں زمانوں پر خدا کی سبقت، سبقت علی اور معلولی ہے۔ اس لئے کہ تمام زمانے مخلوق اور معلول خدا ہیں خدا کے یہاں دراصل کوئی زمانہ ہی نہیں جس کی وجہ سے سبقت زمانی ثابت ہوسکے!

"والعدم وجودہ"

خدا کا وجود عدم پر سبقت رکھتا ہے۔

دنیا کے تمام موجودات پہلے نہیں تھے خدا نے ان کو پیدا کیا عدم سے وجود میں لایا۔ یہ اس اعتبار سے خدا سے متاخر ہیں اور تمام موجودات معلول ذات خدا ہیں لہٰذا مولاؑ نے جو یہ فرمایا ہے کہ "خدا عدم پر سبقت رکھتا ہے" تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام موجودات عالم پر سبقت رکھتا ہے۔

ابتدا — زمانہ کی خصوصیت — ہے۔

"والابتداء ازلہ"

خداوند عالم کی ازلیت تمام موجودات کی ابتدا پر مقدم ہے

دنیا کے تمام موجودات چونکہ زمانہ رکھتے ہیں اس لئے ان کی ابتدا بھی ہے مثلاً اگر آپ کی عمر ستر سال کی ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ستر سال پہلے نہیں تھے یا آپ کے والدین مثلاً ایک سو بیس سال پہلے نہیں تھے۔ غرضکہ ہر چیز کی ایک ابتدا ہے لیکن خدا کی کوئی ابتدا متصور ہی نہیں ہے — اس لئے کہ وہ موجود ازلی ہے — ازلی یعنی وہ موجود جہاں ابتدا ہی نہیں ہے جس طرح ابدی ایسے موجود کو کہتے ہیں جس کی انتہا نہ ہو۔ سرمدی ایسے موجود کو کہتے ہیں جس کا نہ اول ہو نہ آخر ہو (اسی طرح ازلی وہ موجود ہے جسکی ابتدا نہ ہو) لہٰذا خدا جو ازلی ہے اس کو ان تمام موجودات پر سبقت حاصل ہے جن کی کوئی ابتدا ہے۔ اس کی ازلیت، موجودات حادث کی ابتدا سے مقدم ہے۔

ابتدا اور انتہا زمانہ کی خصوصیت ہے چونکہ خدا کے لئے زمانہ کا تصور [illegible]

اس لئے اس کے یہاں ابتدا اور انتہا بھی نہیں ہے اور قرآن میں جو یہ ذکر آیا ہے کہ "ھو الاول والآخر والظاھر والباطن" تو یہاں اول اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ زمانہ کے اعتبار سے اول ہے بلکہ یہاں مراد یہ ہے کہ خدا ازلی ہے اور تمام موجودات اسی واجب الوجود کے معلول ہیں۔

یہاں تک اس عمیق خطبہ کے پہلے حصہ کی حتی الامکان تفسیر بیان کی گئی اب انشاءاللہ آئندہ دوسرے حصہ کی تفسیر اور توضیح پیش کی جائے گی۔

بتشعیرہ المشاعر عرف ان لامشعر لہ

اس نے احساس و شعور کے مرکزوں کو ایجاد کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خود احساس و آلات شعور نہیں رکھتا۔

میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہے میں اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ درس لوگوں کی فہم کے مطابق اور آسان ہو لیکن چونکہ اصل مسئلہ ہی مشکل ہے اس لئے خود آپ حضرات کو بھی غور و فکر سے کام لینا چاہئے اگر اس سلسلہ میں آپ تھکی محسوس کریں تو میں معذرت کا طالب ہوں۔

ادراک کے مراکز

روح و نفس انسان ایسا موجود ہے جو مادی نہیں ہے (جیسا کہ گذشتہ بحثوں میں ثابت کر چکے ہیں) مادہ سے مجرد ہے۔ اگر نفس و روح عالم مادہ سے رابطہ پیدا کرنا اور عالم مادہ کی اطلاعات حاصل کرنا چاہیں تو یہ رابطہ مخصوص حواس کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے ـــــ جیسے باصرہ ـــــ قوت باصرہ کا مرکز آنکھ ہے۔ چیزوں کا عکس پہلے آنکھ کی پتلی پر پڑتا ہے اور پھر اعصاب چشم کے ذریعہ انسان کے دماغ تک منتقل ہو جاتا ہے۔ منتقل ہونے کا یہ منظم عمل مقدمہ بنتا ہے تاکہ نفس انسان دیکھی جانے والی چیزوں کو دیکھ سکے۔

اسی طرح سنی جانیوالی آوازیں لہروں کی شکل میں ہوا میں بکھرتی ہیں، اور قوت سامعہ کے ذریعہ جس کا مرکز کان ہے، دماغ تک منتقل ہو جاتی ہیں اور انسان ان آوازوں کو سن لیتا ہے (درک کر لیتا ہے) چیزوں کی خوشبو، بدبو، قوت شامہ کے ذریعہ۔ لذتیں قوت ذائقہ کے سہارے۔ نرکا، نرمی، حرارت، برودت اس قوت لامسہ کے سبب جو تمام بدن میں موجود ہے، منتقل ہو کر دماغ میں پہونچتی ہے اور مذکورہ بالا چیزوں کا ادراک ہو جاتا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ حواس (لامسہ، باصرہ، سامعہ، ذائقہ، شامہ) خود درک نہیں کرتے بلکہ یہ ادراک کا مقدمہ ہیں

جس طرح کیمرہ ادراک نہیں رکھتا اسی طرح آنکھوں کی قوت بصارت بھی ادراک نہیں رکھتی ادراک اس وقت ہوتا ہے جب چیزوں کا عکس آنکھوں پر پڑنے کے بعد منتقل ہو کر دماغ تک پہونچ جائے۔ دراصل دماغ (مغز) بھی ادراک نہیں کرتا اس لئے کہ وہ جسم ہے ادراک کرنے والا تو انسان کا نفس مجرد ہے جو اس کے پس پشت موجود ہے۔ لیکن یہ نفس مجرد عالم مادہ سے رابطہ پیدا کرنے کے لئے حواس خمسہ ظاہری کا محتاج ہے۔ یہ حواس خمسہ جسمانی آلات ہیں، نفس ان ہی کے سہارے عالم مادہ سے رابطہ قائم کرتا ہے۔ البتہ مرحوم صدر المتألہین ملا صدرا کا اس سلسلہ میں یہ نظریہ ہے کہ ابتدائی مرحلوں کو انجام دینے کے بعد قوت باصرہ کا کیمرہ اس تصویر کو دماغ تک منتقل کر دیتا ہے۔ اس وقت انسان کا نفس اپنے اندر اپنی تخلیقی قوت کے سہارے باہر سے آنیوالی صورت جیسی ایک صورت تخلیق کرتا ہے اور اسی صورت کا نفس ادراک کرتا ہے جس کو اس نے پیدا کیا ہے۔ باہر کے سارے آلات نفس کی تصویر کشی کے لئے مقدمہ بن جاتے ہیں تاکہ نفس اپنی دنیا میں باہر کی تصویر کے مشابہ تصویر بناتا ہے اور وہی تصویر براہ راست قابل توجہ ہوتی ہے جو نفس میں بنتی ہے۔ اس تصویر کو مُدرَک بالذات اور خارج میں پائی جانیوالی تصویر کو مدرک بالعرض کہتے ہیں۔ مدرک بالذات وہ ہے جس کی ذات کو ہم براہ راست درک کرتے ہیں اور اس ذات کے درک کے نتیجہ میں خارج میں پائی جانیوالی چیز درک ہوتی ہے۔

بہرحال ان پانچوں (آنکھ، کان، ناک، زبان اور تمام بدن) حواس ظاہری کو جو انسان کے اعضاء و جوارح میں پائے جاتے ہیں مشاعر خمسہ کہتے ہیں۔ مشعر اسم مکان ہے۔ یعنی یہ حواس محل شعور ہیں یا یوں کہا جائے کہ یہ حواس وہ وسائل ہیں جن کے ذریعہ سے نفس انسان عالم خارج کا شعور و ادراک حاصل کرتا ہے۔

رہ گیا یہ سوال کہ انسان براہ راست بغیر حواس کی مدد کے عالم خارج کو کیوں نہیں درک کر سکتا ؟ ـــــ تو اس کا سبب یہ ہے کہ انسان چونکہ ایک کمزور موجود ہے، اگرچہ نفس انسان مجرد ہے، مگر ایسا ضعیف مجرد ہے جو حواس اور درک کرنے والے آلات کا محتاج ہے وہ ان ہی آلات کے سہارے باہر کی دنیا سے رابطہ پیدا کرتا ہے کیمرہ کے بغیر تصویر نہیں کھینچی جا سکتی یہ انسان کی مجبوری اور کمزوری کا ہے

حواس کی خاصیتیں

یہ حواس چار خاصیتوں کے حامل ہیں:

۱۔ آپ چیزوں کے ادراک کے لئے حواس کے محتاج ہیں۔

۲۔ حواس میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے یعنی جو عکس آنکھوں کے سامنے آتا ہے آنکھیں انہیں قبول کر کے محفوظ رکھتی ہیں۔

۳۔ چونکہ ان حواس کے مختلف شعبے ہیں اس لئے آپ کا علم کثرت کا حامل ہے۔

۴۔ مرکز شعور، اجسام ہیں۔ قوت باصرہ خود بخود کسی چیز کو نہیں دیکھتی بلکہ آنکھوں کی مدد سے دیکھتی ہے۔ اسی طرح قوت سامعہ سننے میں کانوں کی محتاج ہے اور یہ سب جسم ہیں ـــــ اسی طرح دوسری قوتیں بھی ہیں۔

یہ چاروں خاصیتیں نقص پر دلالت کرتی ہیں اور خداوند عالم نقص سے دور ہے لہٰذا حضرت کے جملہ کا مفہوم واضح ہو گیا اور وہ اس طرح کہ خدا نے ہمارے لئے مراکز شعور پیدا کئے ہیں اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ خدا ہماری طرح کا شعور نہیں رکھتا یعنی خدا کا ادراک ایسا نہیں ہے کہ وہ آنکھ، کان، قوت ذائقہ، قوت شامہ یا قوت لامسہ رکھتا ہو۔ اس جملے سے کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ خدا ہماری طرح کا شعور نہیں رکھتا ؟ چونکہ خدا نے پانچ مراکز شعور ہم کو عطا کئے ہیں۔ ان حواس خمسہ میں غور و فکر کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان میں چار خاصیتیں پائی جاتی ہیں اور ہر حالت نقص پر دلالت کرتی ہے اور خدا میں کسی قسم کا نقص نہیں پایا جاتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب ہم خدا کو سمیع و بصیر کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی سماعت اور بصارت عین ذات ہے۔ ان میں سے کوئی چیز زائد بر ذات نہیں ہے۔ خدا سمیع و بصیر ہے مگر آنکھوں اور کانوں کی مدد سے نہیں بلکہ خدا تمام دیکھی اور سنی جانیوالی چیزوں کا علم رکھتا ہے۔ وہ ہماری طرح محتاج نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ کان رکھتا ہو اور ہوا کی لہریں آواز کو اس کے کانوں تک پہونچائیں۔ یہ تمام ذرائع ادراک دراصل جسم ہیں اور خدا جسم نہیں رکھتا۔ اگر معاذ اللہ وہ بھی مواصلاتی آلات کے ذریعہ اطلاعات حاصل کرتا تو اس کا لازمہ یہ تھا کہ اس کی ذات محتاج اور مرکب ہوتی اور اس میں متاثر و منفعل ہونے کی حالت پیدا ہوتی اور وہ جسم والا ہوتا لیکن یہ چاروں صفتیں خدا کی ذات میں نہیں پائی جاتیں۔

بہرحال یہ بحث بہت ہی عمیق ہے جو حضرات مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں وہ بزرگوں کی بیان کردہ توضیحات کا بغور مطالعہ فرمائیں ـــــ مرحوم صدر المتألہین نے بھی اصول کافی کی شرح کی ہے اور کافی کے "باب جوامع التوحید" میں آپ نے اس خطبہ کی بڑی تفصیلی شرح فرمائی ہے، شائقین حضرات وہاں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ حضرت یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر خدا مراکز حواس کا حامل ہوتا تو اس کا لازمہ یہ تھا کہ وہ جسم ہوتا اور یہ ممکن نہیں کہ وہ جسم بھی ہو اور خالق جسم بھی۔ ہم اس بات کو ثابت کرنے کے لئے ذیل میں دو دلیلیں قائم کر رہے ہیں۔

جسم کی فاعلیت، فاعلیت حرکت ہے

دلیل اوّل، جسم کسی چیز کو عدم سے وجود میں نہیں لا سکتا اس لئے کہ جسم کی فاعلیت صرف فاعلیت حرکت ہے۔ اس لئے کہ جسم مؤثر ہونے میں ایک مخصوص وضع و محاذات کا محتاج ہے۔ جب وہ خاص وضع و محاذات حاصل کر لیتا ہے تب مؤثر ہوتا ہے جیسے آگ اگر کسی چیز کو جلانا چاہے تو اس کو اس شئے سے نزدیک ہونا پڑے گا۔ تب اس شئے کو آگ جلا سکتی ہے۔

وضع اور محاذات

جسم اگر کسی چیز پر اپنا اثر ڈالنا چاہے تو اس کو مخصوص وضع و محاذات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب جسم دوسرے جسم سے قریب ہو گا تب اس میں حرکت پیدا ہو سکتی ہے جیسے آگ کا کسی چیز کو جلانا یہ اس جسم میں حرکت پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے اس لئے کہ آگ اس شئے کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیتی ہے۔

اگر اس معنی کو خدا کے بارے میں فرض کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ خلقت عالم سے پہلے اگر خدا جسم تھا اور اس نے عالم کو پیدا کرنا چاہا تو چونکہ کوئی چیز موجود نہ تھی، عدم ہی عدم تھا اور عدم محض میں وضع و محاذات کی گنجائش نہیں اور جسم کے اثر کے لئے وضع و محاذات ضروری ہے ـــــ بفرض محال اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ خدا جسم ہے تو وہ عالم کا خالق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ معدوم عالم کے ساتھ وضع و محاذات کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا پھر وہ اسے خلق کیسے کر سکتا ہے، اسے لباس وجود کیسے عطا کر سکتا ہے ؟ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ اجسام، اجسام ہی میں اثر ڈالتے ہیں۔ البتہ وہ ان کو عدم سے وجود میں نہیں لا سکتے بلکہ صرف اجسام کی صورت بدل دیتے ہیں۔ جو حضرات لوہے کو پہیئے کی شکل میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ وہ لوہے کو اپنے قریب کر کے ہتھوڑے یا دوسرے وسائل کو کام میں لاتے ہیں، اس عمل سے لوہا پہیئے کی شکل میں ڈھل جاتا ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ جسم کی فاعلیت وضع و محاذات کی محتاج ہے اس لئے محال ہے کہ خدا جسم ہو۔ ائمہ سے بہت سی روایتیں اس سلسلہ میں پائی جاتی ہیں کہ خدا جسم نہیں ہے۔ اس کا جسم ہونا محال ہے۔ چونکہ ائمہ کے زمانہ میں بہت سے ظاہر بین افراد خصوصاً اہل سنت سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگ ایسے تھے جو آیہ "الرحمٰن علی العرش استوی" کے سلسلہ میں یہ خیال رکھتے تھے کہ خدا جسم ہے اور عرش پر بیٹھا ہے!! یا یہ کہتے تھے کہ خدا آسمان اوّل پر آتا ہے اور سب کو دیکھتا ہے وغیرہ، اس لئے ہمارے ائمہ سے ایسی روایتیں وارد ہوئی ہیں، انہوں نے چاہا کہ ایسے افراد کو سمجھا دیا جائے کہ تم خدا کے بارے میں غلط خیال رکھتے ہو خدا جسم نہیں ہو سکتا۔

جسم، جسم کی علت نہیں ہے۔

دوسری دلیل ۔ یہ دلیل صدر المتألہین نے بیان کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ کوئی طبیعت خود اس طبیعت کی علت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا جسموں کا خلق کرنے والا جسم نہیں ہو سکتا ورنہ جسم، جسم کی علت ہوگی اور یہ ممکن نہیں ہے کہ جسم جسم کی علت ہو۔ کوئی آگ آگ کی علت نہیں ہو سکتی۔ کوئی آگ، آگ کو عدم سے وجود میں نہیں لا سکتی۔ بہرحال علت و معلول ایک نہیں ہو سکتے ان کو الگ الگ ہونا چاہئے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ایک آگ دوسری آگ کے لئے علت ہے؛ تو میں پوچھوں گا کہ یہ آگ اس آگ کے لئے علت کیوں ہے؟ اس آگ کی وجہ علیت اور موثریت کیا ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ اس آگ کا آگ ہونا علت ہے۔ تو میں کہوں گا کہ اس دوسری آگ میں بھی جلانے کی قوت ہے لہٰذا اس (دوسری) آگ کو بھی علت ہونا چاہئے اگر آگ ہونا (ناریت) آگ کے لئے موثر اور مبدأ فاعلیت ہے تو معلول (جو آگ ہے) کو بھی مبدأ فاعلیت ہونا چاہئے۔ اس طرح دونوں علت ہوں گے۔ لہٰذا گر یہ نظر آئے کہ ایک آگ دوسری آگ کے لئے علت بنی ہے تو پھر واضح ہے کہ آگ ہونا (ناریت) منشأ علیت نہیں ہے۔ بلکہ اس میں کوئی دوسری ہی جہت ہے جو اس چیز میں اثر انداز ہوئی ہے اور وہی دوسری جہت "منشأ علیت" ہے (یہ مرحوم صدر المتألہین کی دلیل کا خلاصہ ہے)

"وبمضادته بين الامور عرف ان لاضد لـه"

اس نے چیزوں کو متضاد پیدا کیا اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ وہ ضد نہیں رکھتا۔

ضد کے دو معنی ہیں ایک معنا اصطلاحی ہے جو فلسفہ میں آتا ہے دوسرا ضد عرفی ہے جو عام ہے۔

تضادِ فلسفی

فلسفیوں کی اصطلاح میں کہا جاتا ہے "الضدان امران وجوديان يتواردان على موضوع واحد ويشتركان في جنس قريب وبينهما غاية الخلاف" ضدین دو صفت اور دو امر وجودی ہیں جو ایک جسم پر دوسرے کے بعد وارد ہوتے ہیں اور ان میں آپس میں بہت اختلاف ہے۔ مثلاً ایک سفید چیز اگر سیاہ ہو جائے یا ایک شجاع اور بہادر انسان اگر بزدل ہو جائے تو سفیدی اور سیاہی یا شجاعت اور بزدلی دو حالت وجودی ہیں جو ایک ہی شے پر ایک دوسرے کے بعد وارد ہو رہی ہیں۔ ایک ختم ہوتی ہے تو دوسری آتی ہے۔ مثلاً کسی انسان کا رنگ اگر سرخ و سفید ہے تو خوف کے موقع پر اچانک اس کا رنگ زرد ہو جاتا ہے جبکہ سرخی اور زردی کے درمیان بہت ہی تضاد اور اختلاف پایا جاتا ہے۔ مگر دونوں رنگ ہی ہیں۔ جنس کے (رنگ ہونے) اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ اسی طرح شجاعت اور بزدلی دونوں انسانی کیفیتیں ہیں دونوں جنس میں ایک دوسرے سے قریب ہیں لیکن پھر بھی ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ فلسفہ کی اصطلاح میں اس کو ضدین کہتے ہیں۔

تضاد عرفی

عرف میں تضاد ایک عام معنی کا حامل ہے۔ چاہے دو امر وجودی آپس میں اختلاف رکھتے ہوں یا ایک امر وجودی ہو اور دوسرا عدمی ہو۔ عرف عام میں ان کو ضدین کہا جاتا ہے۔ جیسے کسی شے کا "ہونا" اور "نہ ہونا" آج کا فلسفہ ان دونوں کو ضدین کہتا ہے اس میں ایک وجود ہے اور دوسرا عدم۔ وہ آگاہ لیکہ فلسفہ قدیم میں اضدین: ان وجودی چیزوں کو کہا جاتا تھا جن میں آپس میں اختلاف پایا جائے مثال کے لئے آپ نور و ظلمت کو لے لیں یہ عرف عام میں ضدین کہے جاتے ہیں درآں حالیکہ نور اور روشنی امر وجودی اور ظلمت اور تاریکی امر عدمی ہیں مگر تاریکی وہ امر عدمی ہے جس میں روشن ہونے کی صلاحیت تو پائی جاتی ہے لیکن فی الحال روشن نہیں بلکہ تاریک ہے۔ "الظلمة عدم النور فيما من شانه ان يكون منورا" نور رکھنے والی چیز کا نور نہ رکھنا ظلمت ہے۔ یہ امر عدمی تو ہے مگر عدم محض نہیں ہے بلکہ اس میں منور ہونے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ فلسفیوں کی اصطلاح میں ضدین دو امر وجودی ہیں اور عوارض میں سے ہیں — لیکن عرف عام میں ضد، ان دو چیزوں کو کہتے ہیں جو ایک ساتھ جمع ہونے کے قابل نہ ہوں، چاہے یہ دونوں چیزیں وجودی ہوں یا ایک وجودی اور دوسری چیز عدمی ہو۔ یہاں تک کہ اگر دو مستقل چیزیں ہوں اور آپس میں مشترک نہ ہوں جمع ہونے کے قابل نہ ہوں ان میں آپس میں بیر ہو تو عرف ان دونوں کو ضدین کہتا ہے جیسے پانی اور آگ۔

اب چاہے ضد کے عرفی معنی لئے جائیں یا فلسفی دونوں صورتوں میں حضرتؑ کے جملہ کی تفسیر اس طرح ہوگی کہ — خدا نے پانی اور آگ، سرخی اور زردی، شجاعت اور بزدلی کو پیدا کیا ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اشیاء کے درمیان ضد قرار دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ضد نہیں ہو سکتی — چاہے وہ "تضاد فلسفی" ہو یا "تضاد عرفی" اس لئے کہ زائد بر ذات دو خاصیتوں کا نام ضدین ہے۔ یہ دو "عرض" ہیں اگر یہ کسی چیز پر عارض ہوں گی تو اس کے لئے ایک معروض کا ہونا لازمی ہے اور خدا پر کوئی چیز عارض نہیں ہوتی۔ ممکن ہے عیاذاً باللہ کوئی کہے کہ "خدا خود عرض ہے" تو ایسی صورت میں وہ معروض کا محتاج ہوگا اور اس کا محتاج ہونا محال ہے اسی لئے ہم نے کہا تھا کہ صفات خدا زائد بر ذات نہیں ہیں بلکہ عین ذات ہیں۔

دو ضد کا موازنہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ عرض کی قسم میں سے نہیں ہو سکتی اس لئے کہ خدا کا کوئی "دوسرا" فرض نہیں کیا جا سکتا جو وہ باہم مخالفت اور تضاد رکھتے ہوں — اس لئے کہ خداوند عالم حقیقت غیر متناہی ہے اور غیر متناہی دو نہیں ہو سکتا اگر دو ہو جائے تو دونوں محدود ہوں گے (ایک اپنی مخصوص حد میں ہوگا اور دوسرا اپنی مخصوص حد میں) اور محدود ہونے کے بعد دونوں متناہی ہو جائیں گے، لیکن ذات باری تعالیٰ ہستی غیر متناہی ہے جس کے لئے کسی قسم کی نیستی اور دوئی نہیں ہے۔

اگر ہم خدا کے لئے ضد و معاند فرض کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے دو مستقل حقیقتیں فرض کر لیں ایسی صورت میں دونوں محدود اور محتاج ہو جائیں گے۔ لیکن خدا نہ محدود ہے اور نہ محتاج بلکہ وہ بے نیاز ہے۔

اس مختصر گفتگو میں یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شئے خدا کی ضد ہو اس لئے کہ جمع نہ ہونا ضد کی خاصیت ہے اور جمع نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ضدین ایک دوسرے کی نفی کر رہے ہیں اور نفی کرنے کا لازمہ محدودیت ہے اور خدا محدود نہیں ہے۔ اگر "تضاد فلسفی" فرض کیا جائے تو تضاد فلسفی از قبیل اعراض سے ہے اس طرح خدا "عرض" ہونے کے بعد محل کا محتاج ہو جائیگا۔ مگر خدا کو کسی چیز کی احتیاج نہیں ہے در اصل سارا عالم خدا کے وجود کا پرتو اور جلوہ ہے اور کسی چیز کا جلوہ اس سے جدا نہیں ہوتا جس کی بنا پر تضاد لازم آئے۔

توضیح:

وضع — نو مقولات عرضی میں سے ایک مقولہ ہے۔ یعنی اجزاء جسم کی ایک دوسرے سے نسبت اور پھر تمام اجزاء کی خارج سے نسبت کو وضع کہتے ہیں۔

خواجہ فرماتے ہیں کہ وضع اس چیز کو کہتے ہیں جو بالقوۃ یا بالفعل اشارۂ حسیہ کے قابل ہو — قیام و قعود میں چیز کے اجزاء ہوں اور ان اجزاء میں آپس میں اور مختلف جہت میں نسبت ہو اور اس نسبت کے سبب ان سب کے لئے ایک ہیئت لازم ہوتی ہے، اسی ہیئت کو وضع کہتے ہیں۔

محاذات — دو چیزوں کا دو مکان میں اس طرح ہونا کہ وہ دونوں مختلف جہت میں نہ ہوں۔

(باقی آئندہ)

قال رسول الله (ص)

مَنِ الْتَمَسَ رِضَى اللّٰهِ بِسَخَطِ النَّاسِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْـهُ وَأَرْضَى عَنْهُ النَّاسَ وَمَنِ الْتَمَسَ رِضَى النَّاسِ بِسَخَطِ اللّٰهِ سَخَطَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَأَسْخَطَ عَلَيْهِ النَّاسَ..

Whoever seeks the good pleasure of God by incurring the people's displeasure, God shall be pleased with him and make the people also (ultimately) pleased with him. But whoever seeks to please the people at the cost of displeasing God, God shall be wrathful at him and cause the people (ultimately) to be displeased with him.

The Prophet Muhammad (S)

The Imams and Leaders of Islam

The previous discussions lead us to the conclusion that in Islam, after the death of the Holy Prophet, there has continuously existed and will continue to exist within the Islamic community (ummah), an Imam (a leader chosen by God). Numerous prophetic hadiths[33] have been transmitted in Shi'ism concerning the description of the Imams, their number, the fact that they are all of the Quraysh and of the Household of the Prophet, and the fact that the promised Mahdi is among them and the last of them. Also, there are definitive words of the Prophet concerning the imamate of Ali and his being the first Imam and also definitive utterances of the Prophet and Ali concerning the imamate of the Second Imam. In the same way the Imams before have left definitive statements concerning the imamate of those who were to come after them.[34] According to these utterances contained in Twelve-Imam Shi'ite sources the Imams are twelve in number and their holy names are as follows: (1) 'Alī ibn Abī Ṭālib; (2) Ḥasan ibn 'Alī; (3) Ḥusayn ibn 'Alī; (4) 'Alī ibn Ḥusayn; (5) Muḥammad ibn 'Alī; (6) Ja'far ibn Muḥammad; (7) Mūsā ibn Ja'far; (8) 'Alī ibn Mūsā; (9) Muḥammad ibn 'Alī; (10) 'Alī ibn Muḥammad; (11) Ḥasan ibn 'Alī; and (12) the Mahdī.

A BRIEF HISTORY OF THE LIVES OF THE TWELVE IMAMS

The First Imam

Amīr al-mu'minīn Ali[35]—upon whom be peace—was the son of Abu Talib, the Shaykh of the Banū Hāshim. Abu Talib was the uncle and guardian of the Holy Prophet and the person who had brought the Prophet to his house and raised him like his own son. After the Prophet was chosen for his prophetic mission, Abu Talib continued to support him and repelled from him the evil that came from the infidels among the Arabs and especially the Quraysh.

According to well-known traditional accounts Ali was born ten years before the commencement of the prophetic mission of the Prophet. When six years old, as a result of famine in and around Mecca, he was requested by the Prophet to leave his father's house and come to the house of his cousin, the Prophet. There he was placed directly under the guardianship and custody of the Holy Prophet.[36]

A few years later, when the Prophet was endowed with the Divine gift of prophecy and for the first time received the Divine revelation in the cave of Ḥirā', as he left the cave to return to town and his own house he met Ali on the way. He told him what had happened and Ali accepted the new faith.[37] Again in a gathering when the Holy Prophet had brought his relatives together and invited them to accept his religion, he said the first person to accept his call would be his vicegerent and inheritor and deputy. The only person to rise from his place and accept the faith was Ali and the Prophet accepted his declaration of faith.[38] Therefore Ali was the first man in Islam to accept the faith and is the first among the followers of the Prophet to have never worshiped other than the One God.

Ali was always in the company of the Prophet until the Prophet migrated from Mecca to Medina. On the night of the migration to Medina (hijrah) when the infidels had surrounded the house of the Prophet and were determined to invade the house at the end of the night and cut him to pieces while he was in bed, Ali slept in place of the Prophet while the Prophet left the house and set out for Medina.[39] After the departure of the Prophet, according to his wish Ali gave back to the people the trusts and charges that they had left with the Prophet. Then he went to Medina with his mother, the daughter of the Prophet, and two other women.[40] In Medina also Ali was constantly in the company of the Prophet in private and in public. The Prophet gave Fāṭimah, his beloved daughter from Khadijah, to Ali as his wife and when the Prophet was creating bonds of brotherhood among his companions he selected Ali as his brother.[41]

Ali was present in all the wars in which the Prophet participated, except the battle of Tabūk when he was ordered to stay in Medina in place of the Prophet.[42] He did not retreat in any battle nor did he turn his face away from any enemy. He never disobeyed the Prophet, so that the Prophet said, "Ali is never separated from the Truth nor the Truth from Ali."[43]

On the day of the death of the Prophet, Ali was thirty-three years old. Although he was foremost in religious virtues and the most outstanding among the companions of the Prophet, he was pushed aside from the caliphate on the claim that he was too young and that he had many enemies among the people because of the blood of the polytheists he had spilled in the wars fought alongside the Prophet. Therefore Ali was almost completely cut off from public affairs. He retreated to his house where he began to train competent individuals in the Divine sciences and in this way he passed the twenty-five years of the caliphate of the first three caliphs who succeeded the Prophet. When the third caliph was killed, people gave their allegiance to him and he was chosen as caliph.

During his caliphate of nearly four years and nine months, Ali followed the way of the Prophet and gave his caliphate the form of a spiritual movement and renewal and began many different types of reforms. Naturally, these reforms were against the interests of certain parties that sought their own benefit. As a result, a group of the companions (foremost among whom were Ṭalḥah and Zubayr, who also gained the support of A'ishah, and especially Mu'awiyah) made a pretext of the death of the third caliph to raise their heads in opposition and began to revolt and rebel against Ali.

NEXT ISSUE (PART II)

CONTD.FROM PAGE (5)

Speech makes man superior to animals,
But misuse of the same can make animals excel him.

11. In all cases in which a particular object guides us to another object, it is called *dalīl* (proof, argument or evidence). Proofs or arguments are of different kinds. One of them is linguistic argument (that is, a particular term has various implications). Such an argument is possible in three ways:

First: Argument by complete identity (*dalālat al-muṭābaqah*): a term or word indicates the totality of a thing; that is, it includes in its domain all of its useful aspects. For instance, when we say 'automobile', we mean to indicate the whole body of the machine, inclusive of all of its parts.

Second: Argument by implication, or partial identity (*dalālat al-taḍammun*). A term in this case refers to a specific meaning only. For instance, when we say, 'there is an automobile', we understand that its chassis or its engine is also present there.

Third: Argument by necessity (*dalālat al-iltizām*): Here a term or word leads us to the understanding of something which is not included in its domain of meaning. For example, when we hear the name, 'Hātim', it immediately suggests 'generosity'.

12. The source of various misconceptions that affected science during the last several centuries was the false notion held by some that the function of Aristotelian logic was also to prove the validity of the matter or contents of a demonstration. Since this was beyond the power of Aristotelian logic, they gave the verdict of its ineffectualness. Regretfully, this error has been repeated many times in our days also, which, of course, shows that those who commit it have neither any correct knowledge of Aristotelian logic, nor did they properly understand it. Making use of the same allegory of construction of a building, we may say that the role of Aristotelian logic in determining the validity of an argument is exactly similar to that of a plumb in determining the straightness of a wall. The plumb line cannot detect any adulteration in the cement used, nor can it indicate the presence or absence of desired qualities in the materials of its construction. What a plumb indicates is just the straightness or irregularity in a wall. The Aristotelian logic, which has been improved by several later thinkers, and has become much more developed, can merely judge the form of an argument and is silent regarding any approval or disapproval of its matter and content.

13. This is the method laid down by Descartes in his work, the *Rules for the direction of the mind*. He will, he says, confine his thinking to fields in which certain and undisputable knowledge seems possible of attainment. He will not take other people's opinions, or accept as a starting-point anything short of an intuition, or mental content, so clear and so distinct that there is no avoiding it. Building upon this intuition, he will keep his superstructure anchored and riveted to its foundation by constant analysis and review and unification of his procedure. No difficulties will be skirted or left unresolved. The foundation will be frequently re-examined and retested by subjecting ever the seemingly self-evident to searching criticism. Last, but not least, he will do his best to avoid what we today call "wishful thinking".

14. However, we must notice that in issues from which probability cannot be excluded and in which certainty cannot be achieved, what is to be taken into consideration is the amount of probability. However, conjecture and probability should be taken for what they are and must not be confused with certainty. Taking probability for certainty is what leads to the second form of error

15. This idea also occurs in one of the essays of Bacon. Unfolding the celebrated account of idols, or false images of the human mind, which distort the judgement in its search for truth, he named this class of idols as "idols of the tribe", by it he aims to point out this practice of blind imitation.

16. The problem of following the ancestors and elders, or following the spirit and ethos of the age—things strictly forbidden by the Quran—should not be confused with the issue of following (*taqlīd*) an Islamic jurisprudent (*faqīh*), which is a religious duty of every muslim based on the sound principle of utilizing the specialized knowledge of a specialist.

The Difference Between Prophet and Imam

The previous argument about the reception of Divine injunctions and laws by the prophets only proves the basis of prophecy, namely the receiving of Divine injunctions The argument does not prove the persistence and continuity of prophecy, even though the very fact that these prophetic injunctions have been preserved naturally raises the idea of persistence and continuity That is why it is not necessary for a prophet (nabi) always to be present among mankind, but the existence of the Imam, who is the guardian of Divine religion is on the contrary a continuous necessity for human society Human society can never be without the figure whom Shi'ism calls the Imam whether or not he is recognized and known God, the Most Exalted, has said in His Book "So if these disbelieve in it, We have already entrusted it to a people [i e the Imams] who do not disbelieve in it " (Quran, VI, 90) [26]

As mentioned above, the functions of prophecy and imamate may be joined in one person who is then appointed to the functions of both prophet and Imam, or to both the reception of the Divine law and its preservation and explanation And sometimes they can be separated such as in periods during which there is no prophet living but when there is a true Imam living among men It is obvious that the number of God's prophets is limited and the prophets have not been present in every period and age

It is also of significance to note that in God's Book some of the prophets have been introduced as Imams such as the Prophet Abraham, about whom is said And (remember) when his Lord tried Abraham with (His) commands and he fulfilled them He said Lo! I have appointed thee a leader [imam] for mankind (Abraham) said And of my offspring (will there be leaders)? He said My covenant includeth not wrongdoers " (Quran, II 124) And God has also said, And We made them chiefs [imams] who guide by Our command (Quran, XXI 73)

The Imamate and Its Role in the Esoteric Dimension of Religion

In the same way that the Imam is the guide and leader of men in their external actions so does he possess the function of inward and esoteric leadership and guidance He is the guide of the caravan of humanity which is moving inwardly and esoterically toward God In order to elucidate this truth it is necessary to turn to the following two introductory comments First of all without any doubt according to Islam as well as other Divine religions the sole means of attaining real and eternal happiness or misery, felicity or wretchedness is by means of good or evil actions which man comes to recognize through the instruction of Divine religion as well as through his own primordial and God given nature and intelligence Second, through the means of revelation and prophecy God has praised or condemned man's actions according to the language of human beings and the society in which they live He has promised those who do good and obey and accept the teachings of revelation a happy eternal life in which are fulfilled all desires that accord with human perfection And to the evildoers and the iniquitous He has given warning of a bitter perpetual life in which is experienced every form of misery and disappointment

Without any doubt God, who stands in every way above all that we can imagine, does not, as we do, possess "thought" moulded by a particular social structure The relations of master and servant, ruler and ruled, command and prohibition, reward and punishment, do not exist outside our social life The Divine Order is the system of creation itself, in which the existence and appearance of everything is related solely to its creation by God according to *real* relations and to that alone Furthermore, as has been mentioned in the Holy Quran[27] and prophetic hadith, religion contains truths and verities above the common comprehension of man, which God has revealed to us in a language we can comprehend on the level of our understanding

It can thus be concluded that there is a real relationship between good and evil actions and the kind of life that is prepared for man in eternity, a relation that determines the happiness or misery of the future life according to the Divine Will Or in simpler words it can be said that each good or evil action brings into being a real effect within the soul of man which determines the character of his future life Whether he understands it or not, man is like a child who is being trained From the instructions of the teacher the child hears nothing but do's and don'ts but does not understand the meaning of the actions he performs Yet, when he grows up, as a result of virtuous mental and spiritual habits attained inwardly during the period of training, he is able to have a happy social life If, however, he refuses to submit to the instructions of the teacher he will undergo nothing but misery and unhappiness Or he is like a sick person who, when in the care of a physician, takes medicine, food and special exercises as directed by the physician and who has no other duty than to obey the instructions of his doctor The result of this submission to his orders is the creation of harmony in his constitution which is the source of health as well as every form of physical enjoyment and pleasure To summarize, we can say that within his outward life man possesses an inner life, a spiritual life, which is related to his deeds and actions and develops in relation to them and that his happiness or misery in the hereafter is completely dependent upon this inner life

The Holy Quran also confirms this explanation [28] In many verses it affirms the existence of another life and another spirit for the virtuous and the faithful, a life higher than this life and a spirit more illuminated than the spirit of man as we know it here and now It asserts that man's acts have inner effects upon his soul that remain always with him In prophetic sayings there are also many references to this point For example, in the Hadith i mi'rāj (hadith of the nocturnal ascension) God addresses the Prophet in these words " He who wishes to act according to My satisfaction must possess three qualities he must exhibit a thankfulness that is not mixed with ignorance a remembrance upon which the dust of forgetfulness will not settle and a love in which he does not prefer the love of creatures rather than My love If he loves Me, I love him I will open the eye of his heart with the sight of My majesty and will not hide from him the elites of My creatures I will confide in him in the darkness of the night and the light of the day until conversation and intercourse with creatures terminates I will make him hear My word and the word of My angels I will reveal to him the secret which I have veiled from My creatures I will dress him with the robe of modesty until the creatures feel ashamed before him He will walk upon the earth having been forgiven I will make his heart possess consciousness and vision and I will not hide from him anything in Paradise or in the Fire I will make known to him whatever people experience on the Day of Judgement in the way of terror and calamity "[29]

Abu Abdallāh may peace be upon him has recounted that the Prophet of God may peace and blessing be upon him—received Harithah ibn Mālik ibn al Nu man and asked him, " How art thou, Oh Harithah ?" He said "Oh Prophet of God, I live as a true believer The Prophet of God said to him, Each thing possesses its own truth What is the truth of thy word?" He said, "Oh Prophet of God! My soul has turned away from the world My nights are spent in a state of awakedness and my days in a state of thirst It seems as if I am gazing at the Throne of my Lord and the account has been settled, and as if I am gazing at the people of paradise who are visiting each other in heaven, and as if I hear the cry of the people of hell in the fire " Then the Prophet of God said, "This is a servant whose heart God has illuminated "[30]

It must also be remembered that often one of us guides another in a good or evil matter without himself carrying out his own words In the case of the prophets and Imams, however, whose guidance and leadership is through Divine Command, such a situation never occurs They themselves practice the religion whose leadership they have undertaken The spiritual life toward which they guide mankind is their own spiritual life [31] for God will not place the guidance of others in someone's hand unless He has guided him Himself Special Divine guidance can never be violated or infringed upon

The following conclusions can be reached from this discussion

(1) In each religious community the prophets and Imams are the foremost in the perfection and realization of the spiritual and religious life they preach, for they must and do practice their own teachings and participate in the spiritual life they profess

(2) Since they are first among men and the leaders and guides of the community, they are the most virtuous and perfect of men

(3) The person upon whose shoulders lies the responsibility for the guidance of a community through Divine Command, in the same way that he is the guide of man's external life and acts is also the guide for the spiritual life, and the inner dimension of human life and religious practice depends upon his guidance [32]

children of all prophets in their backbone but placed my children in the backbone of Ali [14]

Hadith al haqq Umm Salmah has said I heard from the Prophet of God who said Ali is with the Truth (haqq) and the Quran and the Truth and the Quran are also with Ali and they will be inseparable until they come upon me at Kawthar [15]

Hadith al manzilah Sa d ibn Waqqas has said The Prophet of God said to Ali Are you not satisfied to be to me what Harun was to Moses except that after me there will not be another prophet ? [16]

Hadith al da wat al ashirah The Prophet invited his relatives for luncheon and after the meal told them I know of no one who has brought to his people better things than I have brought to you God has commanded me to invite you to draw toward Him Who is there who will assist me in this matter and be my brother inheritor (wasi) and vicegerent (khalifah) among you All remained silent but Ali who was the youngest of all except I shall be your deputy and aide Then the Prophet put his arms around him and said He is my brother inheritor and vicegerent You must obey Then the group began to depart laughing and telling Abu Talib Muhammad has ordered you to obey your son [17]

Hudhayfah has said The Prophet of God said If you make Ali my vicegerent and successor which I do not think you will do you will find him a perspicacious guide who will direct you toward the straight path [18]

Ibn Marduyah has said that the Prophet said Whoever wishes that his life and death be like mine and that he enter paradise should after me love Ali and follow my household for they are my descendants and have been created from my clay My knowledge and understanding have been bestowed upon them Therefore woe unto those who deny their virtues My intercession [on the Day of Judgement] will never include them [19]

Affirmation of the Previous Section

Much of the argument of Shi ism concerning the succession to the Prophet rests on the belief that during the last days of his illness the Prophet in the presence of some of his companions asked for some paper and ink so that something could be written which if obeyed by the Muslims would prevent them from going astray Some of those present considered the Prophet to be too ill to be able to dictate anything and said The Book of God is sufficient for us There was so much clamor raised over this matter that the Holy Prophet told those present to leave for in the presence of a prophet there should not be any noise or clamor

Considering what has been said above about hadiths concerning succession and the events that followed upon the death of the Prophet especially the fact that Ali was not consulted in the question of selecting the Prophet s successor Shi ites conclude that the Holy Prophet had wanted to dictate his definitive views about the person who was to succeed him but was not able to do so

The purpose of the utterances of some of those present seems to have been to cause confusion and prevent this final decision from being clearly announced Their interruption of the Holy Prophet s discourse does not seem to be what it appears outwardly that is concern with the possibility that the Prophet might utter incongruous words due to the intensity of his illness For first of all throughout his illness the Holy Prophet was not heard to have uttered any meaningless or incongruous words and no such thing has been transmitted concerning him Moreover according to the principles of Islam the Prophet is protected by God from uttering delirious or senseless words and is inerrant

Secondly if the words mentioned by some of those present on that occasion before the Prophet were meant to be of a serious nature there would have been no place for the next phrase The Book of God is sufficient for us In order to prove that the Prophet might utter incongruous words under unusual circumstances the reason of his serious illness would have been used rather than the claim that with the Quran there was no need of the Prophet s words For it could not be hidden from any Muslim that the very text of the Book of God considers the obedience to the Holy Prophet to be obligatory and his words to be in a sense like the Word of God According to the text of the Holy Quran Muslims must obey the injunctions of both God and the Prophet

Thirdly, an incident involving illness occurred during the last days of the life of the first caliph who in his last will and testament chose the second caliph as his successor When Uthman was writing the will according to the order of the caliph the caliph fainted Yet the second caliph did not repeat the words that had been uttered in the case of the Prophet according to the hadith of Pen and Paper [21] This fact has been confirmed in a hadith related by Ibn Abbas [22] And it has been accounted of the second caliph that he said Ali deserved the caliphate but the Quraysh would not have been able to bear his caliphate for had he become caliph he would have forced the people to accept the pure truth and follow the right path Under his caliphate they would not have been able to transgress the boundaries of justice and thus would have sought to engage in war with him [23]

Obviously according to religious principles one must force him who has deviated from the truth to follow the truth one must not abandon the truth for the sake of one who has abandoned it When the first caliph was informed[24] that some of the Muslim tribes had refused to pay religious tax he ordered war and said If they do not give me the tithes which they gave to the Prophet I shall fight against them Evidently by this saying he meant most of all that truth and justice must be revived at all costs Surely the problem of the legitimate caliphate was more important and significant than tithes and Shi ism believes that the same principle applied by the first caliph to this matter should have been applied by the whole early community to the problem of succession to the Holy Prophet

The Imamate and Its Role in the Exposition of the Divine Sciences

In the discussion of prophecy it was mentioned that according to the immutable and necessary law of general guidance each created species is guided through the path of genesis and generation toward the perfection and felicity of its own kind The human species is not an exception to this general law Man must be guided through the very instinct of seeking reality and through thought concerning his life in society in such a way that his well being in this world and the next is guaranteed In other words to attain human happiness and perfection man must accept a series of doctrines and practical duties and base his life upon them

It has moreover already been said that the way to understand that total program for life called religion is not through reason but through revelation and prophecy which manifests itself in certain pure beings among mankind who are called prophets It is the prophets who receive from God through revelation the knowledge of men s duties and obligations as human beings and who make these known to men so that by fulfilling them men may attain felicity

It is evident that in the same way that this reasoning proves the necessity for knowledge to guide men to the attainment of happiness and perfection it also proves the necessity for the existence of individuals who preserve intact the total body of that knowledge and who instruct the people when necessary Just as the Divine Compassion necessitates the existence of persons who come to know the duties of mankind through revelation so also it makes it necessary that these human duties and actions of celestial origin remain forever preserved in the world and as the need arises be presented and explained to mankind In other words there must always be individuals who preserve God s religion and expound it when necessary

The person who bears the duty of guarding and preserving the Divine message after it is revealed and is chosen by God for this function is called the Imam in the same way that the person who bears the prophetic spirit and has the function of receiving Divine injunctions and laws from God is called the Prophet It is possible for the imamate[25] and prophecy (nubuwwat) either to be joined in one person or to be separate

The proof given previously to demonstrate the inerrancy of prophets also demonstrates the inerrancy of the Imams for God must preserve His true religion intact and in such a state that it can be propagated among mankind at all times And this is not possible without inerrancy without Divine protection against error

walayat and the hadiths of Ghadir, Safinah, Thaqalayn, Haqq, Manzilah, Da'wat-i dhu'l-'ashirah-i aqrabin and others. But of course these hadiths, most of which are also accepted by Sunnism, have not been understood in the same way by Shi'ism and Sunnism. Otherwise the whole question of succession would not have arisen. Whereas these hadiths appear to Shi'ites as a clear indication of the Prophet's intention in the question of succession, they have been interpreted by Sunnis in quite another way so as to leave this question open and unanswered.

To prove the caliphate of Ali ibn Abi Talib, Shi'ites have had recourse to Quranic verses including the following: "Your friend [wali] can be only Allah; and His messenger and those who believe, who establish worship and pay the poor due, and bow down (in prayer) [or, and this reading is accepted by 'Allamah Tabataba'i, [illegible] pay the poor due while bowing down (in prayer)]" (Quran V, 55). Shi'ite and Sunni commentators alike agree that this verse was revealed concerning Ali ibn Abi Talib, and many Shi'ite and Sunni traditions exist supporting this view.

Abu Dharr Ghifari has said: "One day we prayed the noon prayer with the Prophet. A person in need asked people to help him but no one gave him anything. The person raised his hands to the sky and said, 'Oh God! Be witness that in the mosque of the Prophet no one gave me anything.' Ali ibn Abi Talib was in the position of genuflection in the prayers. He pointed with his finger to the person, who took his ring and left. The Prophet, who was observing the scene, raised his head toward heaven and said, 'Oh God! My brother Moses said to Thee: "Expand my breast and make easy my tasks and make my tongue eloquent so that they will comprehend my words, and make my brother Harun my help and vizier" [cf. Quran XXVIII, 35]. Oh God! I am also Thy prophet; expand my breast and make easy my tasks and make Ali my vizier and helper.'" Abu Dharr says, "The words of the Prophet had not as yet finished when the verse [cited above] was revealed."[7]

Another verse which the Shi'ites consider as proof of the caliphate of Ali is this: "This day are those who disbelieve in despair of (ever harming) your religion; so fear them not, fear Me! This day have I perfected your religion for you and completed My favour unto you, and have chosen for you as religion AL-ISLAM" (Quran V, 3). The obvious meaning of this verse is that before that particular day the infidels had hopes that a day would come when Islam would die out, but God through the actualization of a particular event made them lose forever the hope that Islam would be destroyed. This very event was the cause of the strength and perfection of Islam and of necessity could not be a minor occasion such as the promulgation of one of the injunctions of religion. Rather, it was a matter of such importance that the continuation of Islam depended upon it.

This verse seems to be related to another verse which comes toward the end of the same chapter: "O Messenger! Make known that which hath been revealed unto thee from thy Lord, for if thou do it not, thou wilt not have conveyed His message. Allah will protect thee from mankind" (Quran V, 67). This verse indicates that God commanded a mission of great concern and importance to the Prophet which, if not accomplished, would endanger the bases of Islam and prophecy. But the matter was so important that the Prophet feared opposition and interference and in awaiting suitable circumstances delayed it until there came a definite and urgent order from God to execute this command without delay and not to fear anyone. This matter also was not just a particular religious injunction in the ordinary sense, for to preach one or several religious injunctions is not so vital that if a single one of them were not preached it would cause the destruction of Islam. Nor did the Prophet of Islam fear anyone in preaching the injunctions and laws of religion.

These indications and witnesses add weight to the Shi'ite traditions which assert that these verses were revealed at Ghadir Khumm and concern the spiritual investiture (walayat) of Ali ibn Abi Talib. Moreover, many Shi'ite and Sunni commentators have confirmed this point.

Abu Sa'id Khudari says: "The Prophet in Ghadir Khumm invited people toward Ali and took his arm and lifted it so high that the white spot in the armpit of the Prophet of God could be seen. Then this verse was revealed: 'This day have I perfected your religion for you and completed My favor unto you and have chosen for you as religion AL-ISLAM.' Then the Prophet said, 'God is great (Allahu akbar) that religion has become perfected and that God's bounty has been completed, His satisfaction attained and the walayat of Ali achieved.' Then he added, 'For whomever I am the authority and guide Ali is also his guide and authority. Oh God! Be friendly with the friends of Ali and the enemy of his enemies. Whoever helps him, help him, and whoever leaves him, leave him.'"[8]

In summary we can say that the enemies of Islam who did everything possible to destroy it, when they lost all hope of achieving this end, were left with only one hope. They thought that since the protector of Islam was the Prophet, after his death Islam would be left without a guide and leader and would thus definitely perish. But in Ghadir Khumm their wishes were brought to nought and the Prophet presented Ali as the guide and leader of Islam to the people. After Ali this heavy and necessary duty of guide and leader was left upon the shoulders of his family.[9]

Some of the hadiths pertaining to Ghadir Khumm, the investiture of Ali, and the significance of the Household of the Prophet are cited here.

Hadith-i ghadir: The Prophet of Islam, upon returning from the farewell pilgrimage, stopped in Ghadir Khumm, assembled the Muslims and, after delivering a sermon, chose Ali as the leader and guide of Muslims.

Bara says: "I was in the company of the Prophet during the farewell pilgrimage. When we reached Ghadir Khumm he ordered that place to be cleaned. Then he took Ali's hand and placed him on his right side. Then he said, 'Am I the authority whom you obey?' They answered, 'We obey your directions.' Then he said, 'For whomever I am his master (maula) and the authority whom he obeys, Ali will be his master. Oh God! Be friendly with the friends of Ali and enemy of the enemies of Ali.' Then 'Umar ibn al-Khattab said to Ali, 'May this position be pleasing to you, for now you are my master and the master of all the believers.'"

Hadith-i safinah: Ibn 'Abbas says, "The Prophet said, 'My household is like the ship of Noah; whoever embarks upon it will be saved and whoever turns away from it will be drowned.'"

Hadith-i thaqalayn: Zayd ibn Arqam has recounted that the Prophet said, "It seems that God has called me unto Himself and I must obey His call. But I leave two great and precious things among you: the Book of God and My Household. Be careful of how you behave toward them. These two will never be separated from each other until they encounter me at Kawthar (in paradise)." Hadith-i thaqalayn is one of the most strongly established hadiths and has been transmitted through many chains of transmission and in different versions. Shi'ites and Sunnis agree concerning its authenticity. Several important points can be deduced from this hadith and its like: (1) In the same way that the Holy Quran will remain until the Day of Judgment, the progeny of the Holy Prophet will also remain. No period of time will be without the existence of the figure which Shi'ism calls the Imam, the real leader and guide of men. (2) Through these two great trusts (amanat) the Prophet has provided for all the religious and intellectual needs of the Muslims. He has introduced his Household to Muslims as authorities in knowledge and has pronounced their words and deeds to be worthy and authoritative. (3) One must not separate the Holy Quran from the Household of the Prophet. No Muslim has a right to reject the sciences of the members of the Household of the Prophet and remove himself from under their direction and guidance. (4) If people obey the members of the Household and follow their words they will never be led astray. God will always be with them. (5) The answers to the intellectual and religious needs of men are to be found in the hands of the members of the Household of the Prophet. Whoever follows them will not fall into error and will reach true felicity; that is, the members of the Household are free from error and sin and are inerrant. From this it can be concluded that by "Members of the Household" and "progeny" is not meant all the descendants and relatives of the Prophet. Rather, specific individuals are meant who are perfect in the religious sciences and are protected against error and sin so that they are qualified to guide and lead men. For Shi'ism these individuals consist of Ali ibn Abi Talib and his eleven descendants who were chosen to the imamate one after another. This interpretation is also confirmed by the Shi'ite traditions. For example, Ibn 'Abbas has said: "I said to the Prophet, 'Who are your descendants whose love is obligatory [upon Muslims]?' He said, 'Ali, Fatimah, Hasan and Husayn.'"[12] Jabir has transmitted that the Prophet has said: "God placed the

KNOWLEDGE OF THE IMAM

The Meaning of Imam

Imam or leader is the title given to a person who takes the lead in a community in a particular social movement or political ideology or scientific or religious form of thought. Naturally, because of his relation to the people he leads, he must conform his actions to their capabilities in both important and secondary matters.

As is clear from the preceding chapters, the sacred religion of Islam takes into consideration and gives directives concerning all aspects of the life of all men. It investigates human life from the spiritual point of view and guides man accordingly, and it intervenes on the plane of formal and material existence from the point of view of the life of the individual. In the same way it intervenes on the plane of social life and its regulation (i.e., on the plane of government).

Thus the imamate and religious leadership in Islam may be studied from three different perspectives: from the perspective of Islamic government, of Islamic sciences and injunctions, and of leadership and innovative guidance in the spiritual life. Shi'ism believes that since Islamic society is in dire need of guidance in each of these three aspects, the person who occupies the function of giving that guidance and is the leader of the community in these areas of religious concern must be appointed by God and the Prophet. Naturally, the Prophet himself was also appointed by Divine Command.

The Imamate and Succession

Man through his God-given nature realizes without any doubt at no organized society, such as a country or city or village or tribe or even a household consisting of a few human beings, can continue to subsist without a leader and ruler who puts the wheel of the society in motion and whose will governs each individual's will and induces the members of that society to perform their social duty. Without such a ruler the parts of this society become dispersed in a short time and disorder and confusion reign. Therefore, he who is the ruler and governor of a society, whether it be great or small, if he is interested in his own position and the continued existence of his society, will appoint a successor for himself if he is to be absent from his function temporarily or permanently. He will never abandon the domain of his rule and be oblivious to its existence or annihilation. The head of a household who bids farewell to his house and household for a journey of a few days or months will appoint one of the members of the household or someone else as his successor and will leave the affairs of the house in his hands. The head of an institution, or the principal of a school, or the owner of a shop, if he is to be absent even for a few hours will select someone to represent him.

In the same way Islam is a religion which according to the text of the Holy Book and the Sunnah is established upon the basis of the primordial nature of things. It is a religion concerned with social life, as has been seen by every observer near and far. The special attention God and the Prophet have given to the social nature of this religion can never be denied or neglected. It is an incomparable feature of Islam. The Holy Prophet was never oblivious to the problem of the formation of social groupings wherever the influence of Islam penetrated. Whenever a city or village fell into Muslim hands he would, in the shortest time possible, appoint a governor or ruler in whose hands he would leave the affairs of the Muslims.[1] In very important military expeditions ordered for the Holy War (jihad), he would appoint more than one leader and commander, in order of succession. In the war of Mu'tah he even appointed four leaders, so that if the first were to be killed the second would be recognized as the head and his command accepted and if the second were to be killed, then the third, and so on.[2]

The Prophet also displayed great interest in the problem of succession and never failed to appoint a successor when necessary. Whenever he left Medina he would appoint a governor in his own place.[3] Even when he migrated from Mecca to Medina and there was as yet no idea as to what would occur, in order to have his personal affairs managed in Mecca for those few days and to give back to people what had been entrusted to him, he appointed Ali—may peace be upon him—as his successor.[4] In the same way, after his death Ali was his successor in matters concerning his debts and personal affairs.[5] The Shi'ites claim that for this very reason it is not conceivable that the Prophet should have died without appointing someone as his successor, without having selected a guide and leader to direct the affairs of Muslims and to turn the wheels of Islamic society.

Man's primordial nature does not doubt the importance and value of the fact that the creation of a society depends on a set of common regulations and customs which are accepted in practice by the majority of the groups in that society, and that the existence and continuation of that society depend upon a just government which agrees to carry out these regulations completely. Anyone who possesses intelligence does not neglect or forget this fact. At the same time one can doubt neither the breadth and detailed nature of the Islamic Shari'ah, nor the importance and value the Prophet considered it to possess, so that he made many sacrifices for its application and preservation. Nor can one debate about the mental genius, perfection of intelligence, perspicacity of vision or power of deliberation of the Prophet (beside the fact that this is affirmed through revelation and prophecy)

According to established traditions in both Sunni and Shi'ite collections of hadith (in the chapter on temptations and seditions and others) transmitted from the Prophet, the Prophet foretold seditions and tribulations which would entangle Islamic society after his death, and the forms of corruption which would penetrate the body of Islam, and later worldly rulers who would sacrifice this pure religion for their own impure, unscrupulous ends. How is it possible that the Prophet should not neglect to speak of the details of events and trials of years or even thousands of years after him, and yet would neglect the condition that had to be brought into being most urgently after his death? Or that he should be negligent and consider as unimportant a duty that is on the one hand simple and evident and on the other significant to such a degree? How could he concern himself with the most natural and common acts such as eating, drinking and sleeping and give hundreds of commands concerning them, yet remain completely silent about this important problem and not appoint someone in his own place?

Even if we accepted the hypothesis (which Shi'ism does not accept) that the appointment of the ruler of Islamic society is given by the Shari'ah to the people themselves, still it would be necessary for the Prophet to give an explanation concerning this matter. He would have had to give the necessary instructions to the community so that they would be aware of the problem upon which the existence and growth of Islamic society and the life of religious symbols and observances depended and relied. Yet there is no trace of such a prophetic explanation or religious instruction. If there had been such a thing, those who succeeded the Prophet and held the reins of power in their hands would not have opposed it. Actually, the first caliph transferred the caliphate to the second caliph by bequest. The second caliph chose the third caliph through a six-man council of which he was himself a member and whose order of procedure he had himself determined and ordered. Mu'awiyah forced Imam Hasan to make peace and in this way carried away the caliphate. After this event the caliphate was converted into an hereditary monarchy. Gradually many religious observances identified with the early years of Islamic rule (such as holy war, commanding what is lawful and prohibiting what is forbidden, the establishment of boundaries for human action) were weakened or even disappeared from the political life of the community, nullifying in this domain the efforts of the Prophet of Islam.

Shi'ism has studied and investigated the primordial nature of man and the continuous tradition of wisdom that has survived among men. It has penetrated into the principal purpose of Islam, which is to revivify man's primordial nature, and has investigated such things as the methods used by the Prophet in guiding the community; the troubles which entangled Islam and the Muslims and which led to division and separation; and the short life of the Muslim governments of the early centuries, which were characterized by negligence and lack of strict religious principles. As a result of these studies Shi'ism has reached the conclusion that there are sufficient traditional texts left by the Prophet to indicate the procedure for determining the Imam and successor of the Prophet. This conclusion is supported by Quranic verses and hadiths which Shi'ism considers as sound, such as the verse on

for the first time in the history of human ideas, warning mankind against this kind of error

The second source of error in the reasoning process, which is particularly relevant in social issues, is imitation. Most people are such that they accept whatever beliefs that are current in their society. They adopt certain beliefs merely for the reason that they were followed by their preceding generation.[15] The Quran bids people to carefully scrutinize all ideas and judge them by the criteria of reason—neither to follow blindly the conventional beliefs and traditions of their ancestors, nor to reject them totally without any rational justification. It reminds us that there are many false doctrines that were introduced in the past, but were accepted by the people, and there are also certain truths that were presented in the distant past, but people resisted them on account of their ignorance. In accepting any ideas or principles, men are advised to make use of their intellects and rational faculties, and not to indulge in blind imitation. Very often, the Quran puts imitation of ancestors in direct opposition to reason and intellect.

وإذا قيل لهم اتبعوا ما أنزل الله قالوا بل نتبع ما ألفينا عليه آباءنا أولو كان آباؤهم لا يعقلون شيئا ولا يهتدون

And when it is said to them: Follow what God has sent down, they say: No, but we will follow such things as we found our fathers doing. What? Even if their fathers had no understanding of anything and if they were not guided. (2:170)

The Quran constantly reiterates the view that the idea of antiquity of an idea is neither the evidence of its falsity, nor is it a testimony of its truthfulness. Antiquity affects material objects but the eternal truths of existence never become old and outmoded. Truths like

إن الله لا يغير ما بقوم حتى يغيروا ما بأنفسهم

God changes not what is in a people until they change what is in themselves

are true for ever and ever. The Quran asks us to face issues with the weapon of reason and intellect. One should neither forsake a belief for fear of becoming the target of others' ridicule and banter, nor should he accept a belief just because it is upheld by some important and well-known persons. We should ourselves study and investigate the roots of all matters and draw our own conclusions.[16]

A Third effective source of error pointed out by the Quran is

عیب رعی آمد هنر پوشیده شد
صد حجاب از دل بسوی دیده شد

Selfish motives tarnish virtue and merit,
A cascade of curtain[illegible] from the heart towards vision

Unless one maintains objectivity and neutrality in every matter, he is unlikely to think correctly. Reason can function properly only in an atmosphere that is free of selfish desires and motives. A well known anecdote of al-Allāmah al-Hillī, can illustrate this point.

A problem of *fiqh* was put before al-Allāmah al-Hillī. If an animal falls inside a well, and the carcass cannot be removed, what should be done with the well? Incidentally, during the same days an animal happened to fall into the well in his own house and it became inevitable for him to deduce an injunction to solve his own problem, too. There were two possible ways to solve the issue. Firstly, the well should be totally closed not to be used again; secondly, a fixed quantity of water should be emptied from the well and the rest of well's water would be clean and usable. The 'Allāmah realized that he could not give a completely impartial verdict about the problem without interference from his own personal interest. Accordingly, he ordered his own well be colsed. Then, with an easy mind, free of the pressure of selfish motives he turned to deducing the details of verdict in the second case.

The Quran contains a large number of warnings regarding the evil of submission to personal desires. The following is just one instance of it:

إن يتبعون إلا الظن وما تهوى الأنفس

They follow nothing except conjecture and what the self desires. (53:23)

To be continued

NOTES

1. Various Eastern and Western scholars have spoken regarding this religious or spiritual consciousness in man. Here I shall cite quotations from two of those thinkers of world renown. One is from Einstein. In one of his treatises he has expressed his views about religion. In his view three types of religion exist in the world:

a. The religion of fear: that is the religion of those people whose driving motive towards religion consists of a series of fears associated with nature and environment.

b. The religion of ethics: by this he means the kind of religion which is based on moral expediencies.

c. Then he mentions another religion which he calls "the religion of being". This interpretation of religion by Einstein almost concurs with what we mean by "the heart". According to Einstein, one sometimes attains a spiritual state when he liberates himself from the confinement of his limited self, chained in the shackles of petty worldly desires, and is successful in spontaneously elevating himself above the level of mundane physical existence which has entrapped him. Then he is able to gain a panoramic view of the totality of being and perceives it as a single reality. In such a state the greatness and grandeur that lies beyond the phenomenal existence are revealed to him. That is the time when man is able to evaluate his own existence as an insignificant and infinitesimal fraction of the totality of being and becomes a part of it.

This interpretation of Einstein reminds us of the episode of Hammam who once asked Amīr al-Mu'minīn Alī (A) about the attributes of the pious and Alī gave him a concise reply saying:

يا همام اتق الله وأحسن فإن الله مع الذين اتقوا والذين هم محسنون

O Hammam, fear God and perform good acts because verily God is with those who guard themselves against evil and those who do good (to others). (Nahj al-balaghah, sermon 193)

But Hammam would not be satisfied with this answer and wanted a more detailed and elaborate description. Then Alī (A) took to describing the qualities of a believer in detail enumerating approximately 130 characteristics of the pious. There he says:

ولولا الأجل الذي كتب الله عليهم لم تستقر أرواحهم في أجسادهم طرفة عين

If there had not been a fixed period (of life) ordained for each, their spirits would not have remained in their bodies even for the twinkling of an eye.

This is the same state as Einstein refers to. He says that a religious person feels himself as if in an imprisoned state and wants to get out of the cage of his physical existence in order to recover his vision of the unity of the totality of being. This truth has been defined more intensely and colourfully by Alī (A). According to him, it is as if the *mu'min* accumulates the totality of being in his physical frame as a result, his spirit spontaneously breaks its barriers and obtains liberty. It is recounted that as Alī finished his speech Hammam gave a cry and his soul left his physical form.

In the context of spiritual experience Iqbal too, has said something interesting; he says: "The spiritual reward of the prayer as a means of spiritual illumination is not at all puzzling. It is a vital act by which the tiny island of our personality discovers its true situation within the vast ocean of existence."

2. The Imams (A) used to chant the Quran in such a moving tone that the passers-by stopped, stood in awe and tears flowed from their eyes.

3. Imam al-Sajjād (A) mentions this point in his prayer meant for reciting on the occasion of completion of the Quran by someone:

واجعل القرآن لنا في ظلم الليالي مؤنسا

And make the Quran a companion unto us in the darkness of the night.

4. In our own times this truthful promise of God has been once again fulfilled and a single man, a descendent of the Prophet (S) who like his holy ancestor, had his sole reliance in the power of Quran and his faith, brought about a deadly and crushing defeat on the militia of *kufr* and evil.

5. Imam 'Alī (A) in one of the sermons of the *Nahj al-balaghah* which is popularly known as *al-Muttaqun* (sermon 193) enumerates many qualities of the pious and delineates their character, behaviour, their manner of speech, how they spend their nights and so on.

أما الليل فصافون أقدامهم

During nights they line up their feet (standing) for worship

تالين لأجزاء القرآن يرتلونها ترتيلا

reciting in a well measured way, not like many of us who hastily recite the Quran without understanding its meaning)

يحزنون به أنفسهم

Creating through it feeling in their souls

If they come across a verse creating eagerness (for Paradise) they pursue it avidly and their spirits turn towards it eagerly and they feel as if it is in front of them. And when they come across a verse which contains fear (of Hell) they turn the ears of their hearts towards it and feel as though they hear the raging of hellfire with their ears.

6. *Ahl al-kitab* or "the People of the Book" is a term used to designate the Jews and Christians as distinct from the idolaters.

7. This verse is one of the most wonderful verses of the Quran. At the time of its revelation the Prophet was in Mecca and his intercourse was limited to the people of this small town. It seemed ludicrous to many that a man so alone among his own tribe should talk so confidently and calmly tell them that they would learn about the significance of this verse later on and would find out how this Book will change the world and its people in a short period of time.

8. Because in that case the followers would not really aim at the goals of justice and truth but they would be after their own material gains and fulfilment of their desires.

9. Here the term *dabbah* (beast) includes insects also but in Arabic the usage of this term is confined to four footed animals like the horse, cow, mule etc.

10. The same idea has been put into verse in the following fine couplet of Sa'di:

به نطق آدمی بهتر است از دواب   دواب از تو به گر نگویی صواب

To be continued On P 10

view is totally negated and refuted by the Quran.

2. References to the Law of Causality

The other argument that supports the view that the Quran approves of the ultimate authority of reason, is that it defines various problems in terms of cause-and-effect relationship. The cause-and-effect relationship, or the law of causation, is the foundation of rational thinking. This law is honoured by the Quran and is also employed by it. The Quran speaks on behalf of God, the Almighty, the Creator of the system of cause and effect. Despite the fact that His Word transcends the limitations of causality, the Quran is not oblivious of pointing out to the system of causality operating in the universe; it views all phenomena and events as being subservient to this system. The following verse supports this view:

... إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ...

God changes not what is in a people, until they change what is in themselves (13 11)

The Quran intends to say that, although all destinies depend on the Will of God, He never imposes upon human beings such fate as is outside and alien to their determination, will and action. The destinies of societies also change according to their intrinsic system of functioning. God does not extravagantly alter the destiny of a nation without any specific reason, unless they themselves bring about a major change in their system of social and moral values and their manner of performing their individual duties.

The Quran urges Muslims to study the conditions and circumstances of societies of the past and to take lesson from their history. It is evident that if the destinies of races and nations were random, or dependent upon accidents, or were prescribed from above, the advice to study and draw a lesson would not have any sense. By laying emphasis on it, the Quran intends to remind us that a uniform system of laws governs the destinies of all the nations of the world. It also reminds us that if the conditions of a society in which we live are similar to the conditions prevalent in a society of the past, the same fate awaits us too. Elsewhere, the Quran says:

فَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَقَصْرٍ مَّشِيدٍ ۝ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ...

How many a city We have destroyed in its evildoing, and now it is fallen down upon its turrets How many a ruined well, a tall palace What, have they not journeyed in the land so that they have hearts to understand with, or ear to hear with ? (22 45-46)

From this statement, we can infer that the affirmation of the law of causality and the approval of the cause-and-effect relationship, imply the acceptance of authority of reason.

3. Rational Basis of Divine Commands

Another argument which proves that the Quran believes in the ultimate authority of reason, is that the Quran always explains the rationale behind its commands, laws and precepts. The scholars of *usul al-din* (the principles of the Faith) maintain that the harms and benefits caused by human deeds are among the reasons behind laws and commands. For example, while at one place the Quran ordains the performance of prayers, in another place it explains the philosophy of prayer:

... إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ ...

indeed prayer forbids indecency and dishonour (29 45)

It mentions the spiritual effects of prayer, and states how the prayer can edify man. It explains that it is on account of this exaltation that man can dissociate himself from indecencies. Elsewhere, after laying down rules for observing the fast, the Quran explains the rationale for its command:

... كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

prescribed for you is the Fast, even as it was prescribed for those that were before you—haply you will be God-fearing (2 183)

Similarly, with respect to other commandments like those regarding *zakāt* (alms) and *jihād*, the Quran clarifies their necessity for individual, as well as for society. In this way, the Quran, not withstanding the transcendental nature of Divine commandments, clarifies fully their worldly and terrestrial relevance, and asks men to cogitate upon their rationale until their meaning becomes explicit, so that it may not be imagined that these laws are based on a series of occult notions beyond the power of human comprehension.

4. Combating Deviations of Reason

Another evidence in favour of the Quran's affirmation of the authority of reason -which is more conclusive than that mentioned above—is the battle it launched against all those agents which obstruct the proper functioning of reason. For clarification of this point, we are forced to mention certain things in the way of an introduction.

The human mind can, in many cases, fall into error. This fact is acknowledged by all of us. However, this danger is not limited to the intellect alone, but can equally befall the senses, and feelings as well. Just for the sense of vision, scores of visual errors and optical illusions have been pointed out. In the case of reason, too, there are times when people frame an argument and rationale and draw an inference on its basis, but later on they realize that the basis of their conclusion was erroneous. Here the question arises, whether the faculty of reason should be suspended on account of its occasional failures, or whether we should employ other means for discovering the errors of the intellect and seek to avoid such errors. In answering this question, the Sophists said that reason should not be relied upon, and that, basically, argumentation and reasoning is an absurd practice. Other philosophers have given a fitting reply to the Sophists, and said that though the senses can also err like reason, but no one has ever recommended their suspension. Since it was not possible to discard reason, the philosophers resolved to find ways of making reason secure from error. During their efforts in this regard, they discovered that all arguments consist of two parts, namely, matter and form. Like a building which has various ingredients in its construction, like, lime, cement, steel, etc. (matter), to acquire a specific structure (form). In order to attain the permanence and perfection of its construction, it is essential to procure proper material as well as to draw a perfect and faultless plan. For the correctness and accuracy of an argument, too, it is essential that its content and form be both free of error and defect. For judging the validity of the form of any argument, the Aristotelian or formal logic came into existence. The function of formal logic is to determine the accuracy or inaccuracy of the form of an argument, and help the mind to avoid errors in the process of reasoning.[17]

But the major problem that remains is that solely formal logic is inadequate for this purpose, because it cannot alone guarantee the validity of an argument. It can give assurance about one aspect alone. To obtain the perfection of the material aspect, the use of material logic is also essential, that is, we need certain criteria for controlling the quality of the rational material.

Thinkers like Bacon and Descartes strove hard to evolve some kind of material logic similar to the formal logic of Aristotle, which was devised for formal reasoning. They did obtain certain criteria in this regard, though they are not as universal as those of Aristotelian logic, but are, to a limited extent, helpful in preventing the mind from committing errors in reasoning. Some may be surprised to know that the Quran has presented such principles for the prevention of any lapses in the process of reasoning, which surpass in merit and precedence the efforts of philosophers like Descartes and others.

The Quranic Viewpoint Regarding the Sources of Error

Among various sources of error mentioned by the Quran, one is that of taking conjecture and hypothesis for certainty and conviction.[13] If a person were to adhere to the principle of putting conviction only in certainties and of not confusing between conjectures and certainties, he would not fall into error.[14] The Quran lays great emphasis on this problem, and has clearly stated in one place that one of the biggest errors of the human mind is pursuit of conjectures and hypotheses. In another verse, which is addressed to the Prophet (S), the Quran says:

وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ۝

If thou obeyest the most part of those on earth, they will lead thee astray from the path of God they follow only surmise, merely conjecturing (6 116)

In another verse, the Quran says:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ...

And pursue not that thou has no knowledge of (17 36)

This is the word of caution to mankind extended by the Quran,

إِنْ هُوَ إِلاَّ ذِكْرٌ لِلْعالَمينَ * وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حينٍ *

It is but a reminder unto all beings, and you shall surely know its tiding, after a while.[7] (38 87-88)

Then, is this book meant for all the people of the world, or is it for the believers alone? In another verse, addressing the Prophet, God, the Most Exalted, says:

وَما أَرْسَلْناكَ إِلاَّ رَحْمَةً لِلْعالَمينَ *

We have not sent thee, save as a mercy unto all beings (21 107)

A more detailed explanation of this matter would be undertaken during the course of later discussion regarding the historical aspect of the Quran. Here it is just sufficient to mention that the Quran is addressed to all the people of the world. It does not single out any particular nation or group. Everyone who accepts the invitation of the Quran is assured of spiritual salvation. However, the verses which mention the Quran as the book of guidance for the believers and the God-fearing (*mu'minūn* and *muttaqūn*), clearly specify the kind of people who will be attracted towards it and others who will turn away from it. The Quran never names any particular nation or tribe as being its devotees. It does not take sides with a specially chosen people. Unlike other religions, the Quran never associates itself with the interests of any specific class. It does not say, for example, that it has come to safeguard the interests of the workers or the peasants. The Quran repeatedly emphasizes the point that its purpose is to establish justice. Speaking about the prophets, it says:

... وَأَنْزَلْنا مَعَهُمُ الْكِتابَ وَالْميزانَ لِيَقُومَ النّاسُ بِالْقِسْطِ ...

and We sent down with them the Book and the Balance so that men might uphold justice (57 25)

The Quran advocates justice for all mankind, not merely for this or that class, tribe or nation. It does not, for example, like Nazism and other such cults, stir up the passions of prejudice to attract people. Similarly, it does not, like certain schools of thought like Marxism, base its appeal upon the human weakness of interest-seeking and enslavement to material motivations to incite people;[8] because the Quran believes in the essential primariness of the rational consciousness of man and his intrinsic conscience. It believes that it is on the basis of its moral potentialities and its truth-conscious human nature that mankind is placed firmly on the path of progress and evolution. This is the reason why its message is not limited to the working or farming class or exclusively to the oppressed and deprived. The Quran addresses both the oppressors as well as the oppressed, and calls them to follow the right path. Prophet Moses (A) delivers the message of God to both Bani Israel and Pharaoh, and asks them to believe in the Lord and to move in His path. Prophet Muḥammad (S) extends his invitation both to the chieftains of Quraysh and to ordinary persons like Abu Dharr and 'Ammār. The Quran cites numerous examples of an individual's revolt against his own self and his voluntary return from the path of deviation to the straight one. But, at the same time, the Quran is aware of the point that the restoration and repentence of those immersed in a life of luxury and opulence is comparatively more difficult than that of those familiar with the hardships of life: the oppressed and the deprived, who are, as a matter of fact, naturally more inclined towards justice; whereas the rich and wealthy, at the very first step, have to forgo their personal and class interests and abandon their wishes and aspirations.

The Quran declares that its followers are those who have a clear and pure conscience. They are drawn to it solely by the love of justice and truth, which is ingrained in the nature of all human beings—not under the urge for material interests and worldly desires and allurements.

Conception of Reason in the Quran

Heretofore we have discussed briefly the diction of the Quran, and said that, for the purpose of communicating its message, the Quran makes use of two types of languages, namely, the language of rational argument and the language of feeling. Each of these languages has a specific appeal. The first type addresses and appeals to the intellect or reason, while the second one is meant to appeal to the heart. Now we shall examine the point of view of the Quran regarding reason (*'aql*).

It is to be seen whether or not the Quran acknowledges the 'authority' (*ḥujjah*) of reason—as the scholars of *fiqh* (Islamic jurisprudence) and *uṣūl* put it. This means whether or not we should respect the judgements of reason and act according to them if they happen to be correct and rightly deduced by it. Moreover, if one acts according to the dictates of reason and occasionally falls into error, will God exonerate him for it, or whether He will punish him on account of that error? And, if one fails to act according to the ruling of reason, does he deserve punishment?

Evidence in Favour of the Authority of Reason

The issue of the authority of reason in Islam is certain. Since the earliest times until the present, none amongst the Islamic scholars—except for a very small number—has ever negated the authority of reason; they have counted it as one of the four sources of Islamic *fiqh*.

1. The Quran's Emphasis on Rationalism

Since our discussion is about the Quran, I think it necessary to produce arguments concerning the authority of reason from the Quran itself. The Quran, in various ways, confirms the authority of reason. About sixty to seventy verses can be cited—and that, too, for just *one* of the various ways, as mentioned—in which the Quran indicates that such and such a matter has been mentioned for reason to reflect on. In one instance, the Quran refers to this issue in a striking statement:

إِنَّ شَرَّ الدَّوابِّ عِنْدَ اللهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذينَ لا يَعْقِلُونَ *

Surely the worst of beasts in God's sight are those that are deaf and dumb and do not reason.[9] (8 22)

Of course, it is obvious that the Quran does not mean the physically deaf and dumb, but those who do not want to listen to truth, or those who, when they hear, do not wish to admit it with their tongues. In the view of the Quran, the ears which are unable to listen to truth and which are only used for listening to absurd and nonsensical things, are deaf. The tongue which is merely used to utter nonsense, is dumb. The people who do not reason (... الَّذينَ لا يَعْقِلُونَ *) are those who do not make use of their intellect and their faculty of thought. Such are not fit to be called human beings. The Quran includes them among the beasts.[10]

In another verse, while bringing up a subject related to Divine Unity (*al-tawḥīd*), the Quran refers to the issue of unity of Divine Acts, and says:

وَما كانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُؤْمِنَ إِلاَّ بِإِذْنِ اللهِ ...

It is not for any soul to believe, save by the leave of God....(10.100)

After stating this profound issue—a problem which is not easily comprehensible to every human mind—the Quran continues the verse like this:

... وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذينَ لا يَعْقِلُونَ *

....and He lays abomination upon those who do not reason. (10.100)

In these two verses, which I quote here for the sake of example, the Quran, in the terms of logic, invites us to ratiocination. There are many other verses in the Quran which, on the basis of consequential signification, can be said to accept the authority of reason.[11] In other words, the Quran makes statements which cannot be accepted without accepting the authority of reason. For instance, an opponent is asked to forward rational argument in favour of his position:

... قُلْ هاتُوا بُرْهانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صادِقينَ *

. . .Say Bring your proof if you are truthful (2·111)

This can only be inferred to mean the Quran's ratification of the authority of reason. In another place it uses syllogistic argument to prove the existence of the Necessary Being (*wājib al-wujūd*):

لَوْ كانَ فيهِما آلِهَةٌ إِلاَّ اللهُ لَفَسَدَتا ...

Were there gods in them [earth and heaven] other than God, they would surely disintegrate....(21.22)

In these verses the Quran has framed a conditional proposition, which exempts or excludes the antecedent premise for arriving at a conclusion which is consequent upon it. Thus the Quran aims at emphasizing the role of reason and refutes the view of some of the religions that faith is alien to, or, is incompatible with reason, and that to embrace faith one has to suspend his rational faculty and concentrate upon heart alone, so that it may absorb the Divine light and become illuminated by it. This

his whole being, which is profoundly influenced. This sort of influence can perhaps be illustrated by the example of music. The various forms of music share the common quality which is stimulation of human feelings. Music appeals to the human soul and immerses it into a specific world of feeling. The nature of feelings, excited by different kinds of music, of course, varies. Certain types of music may be associated with the passions of valour and bravery. In the past, on the battlefield, the effects of martial music were evident. Sometimes its effects were so strong that the frightened soldiers who would not dare come out of their bunkers, were made to march in fervour despite fierce attacks from enemy's ranks. It is possible that certain other kinds of music may excite sensual feelings and invite the listener to succumb to sensual vices. The results of such music are noticeable in the moral waywardness of our own times. Perhaps no other thing could have so effectively broken down the walls of morality and chastity to the extent of this kind of music. Other kinds of instinctive feelings and passions, whether aroused by means of music or by some other means, can be controlled when addressed in the language that appeals to them.

One of the most sublime instincts and emotions present in all human beings is the urge for religion and the natural quest for God. It is in the same heavenly echoes that the Quran speaks to the Divine instincts of mankind.[1] The Quran itself recommends that its verses be recited in fine and beautiful rhythms; for it is in those heavenly rhythms that it speaks to the Divine nature of man.[2]

The Quran, describing itself, maintains that it speaks in two languages. Sometimes it introduces itself as the Book of meditation, logic and demonstration; at other times as the Book of feeling and love. In other words, it does not merely seek to nourish the intellect and thought, but also nurtures the human soul.

The Quran lays great emphasis on its own specific quality of music, a music which more than any other music, is effective in arousing the profound and sublime feelings of the human heart. The Quran directs the believers to devote a few hours of the night to reciting its verses, and to recite them during their ritual prayers when their attention is turned towards God. Addressing the Prophet, the Quran says:

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ • قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلاً • نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلاً • أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلاً •

O thou enwrapped in thy robes, keep vigil the night, except a little (a half of it, or diminish a little, or add a little) and chant the Quran very distinctly (73:1-4)

It asks the Prophet (S) to recite the Quran while standing for the prayers. *Tartīl* means to recite neither too hastily that words cannot be distinguished, nor too slowly that their connection be lost. It commands the Prophet (S) to recite its verses rhythmically, and at the same time to cogitate upon their meaning. Again, in a later verse of the same sūrah, the Prophet is reminded that he needs enough sleep to effectively perform the daily chores of business or jihad in the path of God; nevertheless, he should not forget to seclude himself for worship.

It were the same rhythms of the Quran that became the singular source of spiritual joy and strength, and the means of producing inner purity and sincerity among Muslims. It was the same music of the Quran, which, in a very short period of time, converted the barbarous tribes of the Arabian peninsula, into a steadfast nation of committed believers, who could grapple with the greatest powers of the age and overthrow them.

The Muslims did not merely view the Quran as a book of moral advice and instruction alone, but also, as a spiritual and ideological tonic. They recited the Quran with devotion of heart during their intimate nightly supplications, and during the day, they derived from it the strength to attack the unbelievers like roaring lions.[3] The Quran had just such an expectation of those who had found their faith. Addressing the Prophet, it says:

فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَاداً كَبِيراً •

Obey not the unbelievers, but struggle against them with it [the Quran] striving mightily. (25:52)

The Quran advises the Prophet (S) not to pay heed to the words of the infidels and to stand firmly against them equipped with the weapon of the Quran. It assures him that the ultimate victory shall be his. The life of the Prophet (S) itself is a positive proof of this assurance. He stood all alone against enemies without any support except the Quran, and the same Quran meant everything to him. It produced warriors for him, furnished arms and forces, until, ultimately, the enemies were totally subdued. The Quran drew towards him individuals from the enemy's camp, and caused them to submit before the Messenger of God. In this way the Divine pledge was fulfilled.[4]

When the Quran calls its language 'the language of the he[art] means the heart which it seeks to purify, enlighten and stimulate[.] language is other than the language of music that occasionally arou[ses] sensual feelings. It is also different from the language of martial musi[c] that arouses the spirit of heroism in the hearts of soldiers and strengthens and enhances their enthusiasm. Rather, it is the language which converted the Arab bedouins into inspired mujāhidīn, for whom it was said:

حَمَلُوا بَصَائِرَهُمْ عَلَى أَسْيَافِهِمْ

They carried their visions on their swords.

Those people carried their vision, their ideology, their religion and spiritual discoveries on their swords, and used them in the defence of those ideals and ideas. The notions of private and personal interest were alien to them. Though they were not innocent and infallible, and they did commit mistakes, yet they were those who rightly fitted the description:

قَائِمُ اللَّيْلِ وَصَائِمُ النَّهَارِ

Standing in prayer during nights, fasting during daytime.

Every moment of day and night, they were in contact with the depths of Being. Their nights were passed in worship, and days in jihad.[5]

It is on account of this characteristic, that the Quran is a book of the heart and the soul. Its appeal overwhelms the soul and brings tears flowing from the eyes and makes the heart tremble. It stresses this point and considers it true even of the "People of the Book":[6]

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِهِ هُمْ بِهِ يُؤْمِنُونَ • وَإِذَا يُتْلَى عَلَيْهِمْ قَالُوا آمَنَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ •

Those to whom We gave the Book before this believe in it, and, when it is recited to them, they say, 'We believe in it, surely it is the Truth from our Lord, even before it we were of those who surrender. (28.52-53)

It describes a group of people who undergo a state of veneration and awe when the Quran is recited before them. They affirm faith in all the contents of the Book, declare everything in it to be nothing but truth and their veneration of it continues to increase. In another verse, the Quran affirms that among the *Ahl al-Kitāb* (The People of the Book), the Christians are closer to the Muslims than the idolaters and Jews. Then a group of Christians who believed and became Muslims on hearing the Quran are described in these words:

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَى أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ •

And when they hear what has been sent down to the Messenger, thou seest their eyes overflow with tears, because of the truth they recognize They say, 'Our Lord we believe; so do Thou write us down among the witnesses.'(5:83)

In another place, while describing the believers, the Quran says:

اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَاباً مُتَشَابِهاً مَثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ...

God has sent down the fairest discourse as a book, consimilar in its oft-repeated parts, whereat shiver the skins of those who fear their Lord; then their skins and their hearts soften to the remembrance of God....(39:23)

In these, as well as in many other verses (such as 19:58, 61:1, etc.), the Quran tells us that it is not merely a book of knowledge and analysis; but at the same time that it makes use of logical arguments that appeal to the intellect, it also speaks to the finer sensibilities of the human soul.

The Quran's Addressees:

Another point that has to be inferred from the Quranic text during its analytical study, is to determine the identity of those who are addressed by it. There are certain expressions like هُدًى لِلْمُتَّقِينَ (guidance for the God-fearing), هُدًى وَبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ (guidance and good tiding for the believers), لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (to admonish and caution him who is alive), which often recur in the Quran. Here, the question may arise: Of what need is guidance for those who are already guided, the pious and the righteous? Moreover, we see that the Quran describes itself in these words:

Understanding the Uniqueness of the Qur'ān *Part 2*

by Martyr Murtaḍā Muṭahhari

translated from Persian by Mahliqā Qarā'ī

Issues in an Analytical Study of the Quran:

Now we shall proceed to study the contents of the Quran from an analytic viewpoint. Of course, if we were to deal with every subject of the Quran separately, it would call for—as Rūmī would say—seventy tons of paper. So we will confine our discussion mainly to general and then a few particular issues.

The Quran has dealt with a vast range of subjects, and in this process, it is more concerned with certain subjects and less with others. The universe and its Creator are among the most recurring themes of the Quran. We must try to see how it treats this theme. Is its outlook philosophical or gnostic? Is its treatment similar to that of other religious books like the Bible and the *Torah*? Is it similar to that of the religious books of Hinduism? Does it deal with this problem in its own independent manner?

The other problem that is repeatedly treated by the Quran is the problem of the universe or the world of creation. We must examine the outlook of the Quran about the universe. Does it regard the universe and all creation to be an exercise in vanity and futility or does it regard it as being based on coherent truth? Does it consider the state of affairs in the universe as being based upon a series of laws and principles, or does it regard it as a chaotic phenomenon in which nothing is the cause or condition of any other thing? Among the general issues dealt by the Quran is the problem of the human being. The Quranic outlook regarding the human being must be analyzed. Does the Quran possess an optimistic outlook of man? Does it speak of him in pessimistic and negative terms? Does the Quran consider man as a despicable creature, or does it acknowledge his nobility and dignity?

The other problem dealt with in the Quran is the problem of human society. We have to see if the Quran considers the society to be primary and the individual as secondary or whether it subordinates the society to the individual. Are societies, according to the Quran, subject to laws governing their life and death, their rise and decline, or are these conditions applicable to individuals alone? In the same way, its conception of history also needs to be clarified. What is the Quranic view regarding history? What are the forces that control the dynamics of history? To what extent can an individual's influence affect the course of history in the view of the Quran?

The Quran deals with numerous other issues. I shall enumerate some of them here. One of them is the point of view of the Quran about itself. The other issue is related to the Prophet (S) and its manner of introducing and addressing him. Another issue is its definition of a believer (*mu'min*) and his characteristics and so on.

Furthermore, each of these general issues possesses various branches and divisions. For example, when discussing mankind and its situation, it is natural to speak about morality. Or, when speaking about society, the problem of human relationships also unavoidably enters the discussion. The same is true of such notions as 'enjoining good and forbidding evil' (الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر), and the problem of social classes.

How does the Quran Introduce Itself?

For the purpose of analysing Quranic themes, it is better to start by examining the opinion of the Quran about itself and its manner of self-introduction. The first and foremost thing that the Quran pronounces about itself is that all of its words, phrases and sentences are the Word of God. It makes clear that the Prophet (S) was not its author; rather the Prophet only related whatever was revealed to him through the agency of the *Rūḥ al-Qudus* (Gabriel) with the permission of God.

The Quran describes its other function as the presentation of the prophetic mission, which is aimed at guidance of humanity, by delivering it from *darkness* and leading it towards *light*:

... كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ

.. A Book We have sent down to thee that thou mayest bring forth mankind from the darkness into the light....(14 1)

Without doubt the darkness of ignorance is one of the vices from which the Quran emancipates humanity and leads it towards the light of knowledge and wisdom. However, if merely ignorance were regarded as darkness, then the philosophers could have accomplished this job. But there exist other evils more dangerous than the vice of ignorance, and to subdue them is beyond the power of sheer knowledge. Among them are the vices of worship of material benefits, egoism, enslavement to desires, and greed, which are considered to be personal and moral vices. Social vices like oppression and discrimination manifest the spiritual darkness of a society. In Arabic, the word *ẓulm* (injustice and oppression) is derived from the same root as *ẓulmah* (darkness), which shows that injustice is a form of social and spiritual darkness. To struggle against such forms of darkness is the responsibility and mission of the Quran and other heavenly books. Addressing Prophet Moses (A), the Quran says:

... أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ...

... that thou mayest bring forth your people from the darkness into the light ...(14:5)

This *darkness*, this shadow, is the darkness of Pharaoh's oppression and injustice and that of his clique. The *light* is the light of justice and freedom.

The exegetists of the Quran emphasize the point that whenever the Quran mentions darkness, it always uses it in the plural form الظلمات though it always uses light in its singular form. This means that the word الظلمات (darkness) includes all sorts of darkness, all of the evil ways that lead towards darkness, and that النور (light) signifies one single right path—the path of righteousness, whereas the ways of deviation and perversion are many. In *Sūrat al-Baqarah*, the Quran says:

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ...

God is the Protector of the believers, He brings them forth from the darkness into the light. And the unbelievers—their protectors are tāghūt, that bring them forth from the light into the darkness.. (2:257)

The Quran determines its goal to be the breaking of the chains of ignorance, misguidance, moral and social corruption and destruction, or in other words, to dissipate all sorts of darkness, and to guide humanity in the direction of justice, goodness and light.

The Language of the Quran

The other issue is that of gaining familiarity with the language of the Quran and the recitation of it. There are some people who think that the Quran is to be read merely for the purpose of obtaining spiritual reward (*thawāb*) without need of understanding anything of its contents. They continuously recite the Quran, but if they are even once asked, "Do you understand the meaning of what you are reading?" they cannot answer. To recite the Quran is essential and good, being regarded as the first step necessary for comprehending its contents; and not merely as a means for gaining Divine reward.

The comprehension of the meaning of the Quran has certain peculiarities to which due attention must be paid. While other books are read for the purpose of acquiring the knowledge of novel ideas that merely involve reason and the rational faculties of the reader's mind, the Quran must be studied with the intention of educating oneself. The Quran itself clarifies this point:

كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ

A book We have sent down to thee, blessed, that men possessed of mind may ponder its signs and so remember (38 29)

One of the functions of the Quran is to instruct and to teach. For this purpose, the Quran addresses human reason and speaks in logical and demonstrative terms. There is also another language that the Quran makes use of. But this language is not used to appeal to the faculty of reason, but to the heart. This is the language of feeling. Whosoever wants to acquaint himself with the Quran, should be familiar with both of the languages and be able to make use of both of them simultaneously. It is a grave mistake to separate one from the other.

That which is termed here as *the heart*, is the great source of profound feeling that resides within all human beings. This is sometimes also called "the sense of being", i.e. the feeling of relationship between human existence and the Absolute Being.

One who knows the language of the heart, when he addresses the human being in this language, can move the inner depths of his being. It is not merely the mind and the intellect alone which is affected, but

BASHEER-W-NAZEER

Weekly



(مِنْ كَلامِ لأمِيرِ آلْمؤمِنِينَ عَلىّ عليْهِ السَّلاَمْ لكُمَيْلِ بْن زِيادِ النَّخْعِىّ)

يا كُميْلُ، الْعِلْمُ خَيْرٌ مِن آلْمال. وَآلعِلْمُ يحْرُسُكَ وأنت تحْرُسُ آلْمال. المالُ تنْقُصُهُ آلنفقهُ وَآلْعِلْمُ يَزْكُو عَلى الإنْفَاق، وَصَنيعُ آلْمَال يزولُ بزوالِه.

Amir al-Mu'minin, 'Ali (A) addressed Kumayl ibn Ziyad al-Nakh'i saying

"O Kumayl, knowledge is better than wealth. Knowledge guards you while you have to guard the wealth. Wealth decreases by spending while knowledge multiplies by spending and the results of wealth die as the wealth decays"

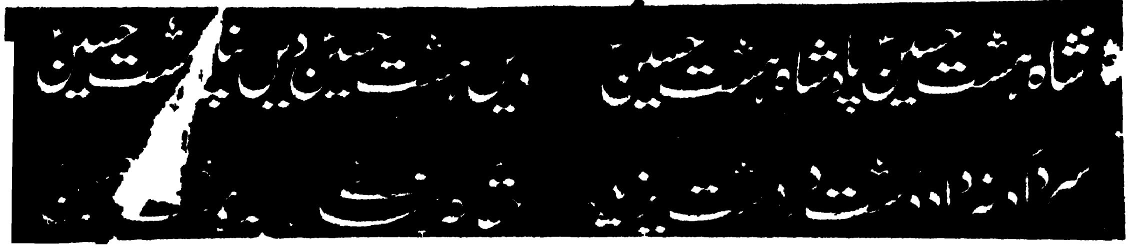
Imam 'Ali (A)

S. A. ABBAS MOOSVI
EDITOR.

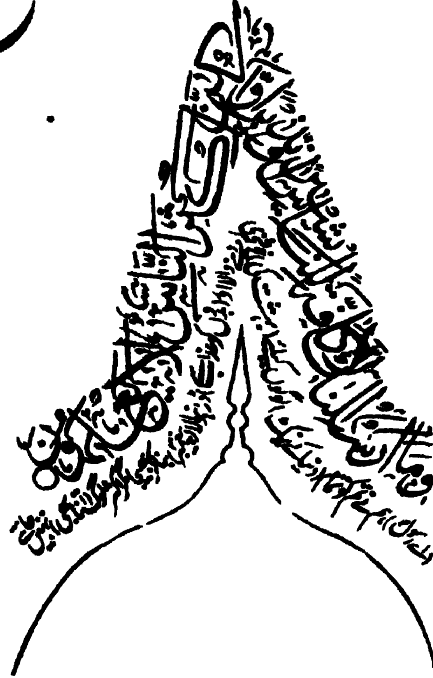
VOLUME I NO.3. PRICE Rs. ONE
1st AUGUST 1988.

IF NOT DELIVERED PLEASE RETURN TO: BASHEER-W-NAZEER, HYDERABAD-500 008. INDIA.

POSTAL REGD.No.H/HD-47283 REGD.No.47283. TEL: 253877/253392. TLX: 425-6603 TTI-IN



بسم اللہ الرحمن الرحیم



ہفتہ وار

بشیر و نذیر

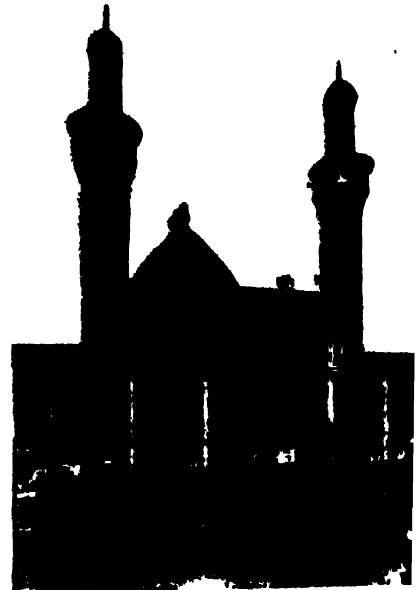
ترتیب

کربلا - اسباب و علل

فلسفہ قیام حسینؑ بزبان حسینؑ

WHY HUSAIN TOOK STAND

BASHEER-W-NAZEER Weekly



جلد (۱)

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ سالانہ ۴۵ روپے

رجسٹرڈ نمبر 47283/20/5/AL/88.TC

S.A. ABBAS MOOSVI
EDITOR.

مدیر
سید علی عباس موسوی

VOLUME 1 NO 8
20 th AUGUST 1988
PRICE PER COPY Rs 1/-
YEARLY Subscription Rs 45/-

IF NOT DELIVERED PLEASE RETURN TO: BASHEER-W-NAZEER, HYDERABAD-500 00. INDIA.

POSTAL REGD.No.H/HD-47283 Regd.No.47283. TEL: 253877/253392. TLX: 425-6603 TTI-IN

حجۃ الاسلام والمسلمین خامنہ ای :

کربلا - اسباب و علل

حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک دنیا، کربلا کے عظیم المیّہ سے پوری طرح آگاہ نہیں ہو سکی ہے، اس کے تمام آفاق نمایاں نہیں ہوئے ہیں۔ خود مسلمان بھی اس حادثہ سے ناآشنا ہیں۔ یہاں تک کہ خود ہماری قوم جو امام حسینؑ سے واقف ہے، حسینؑ بن علیؑ اور عاشورا و محرم کی یاد منانا اس کی عادات میں شامل ہو چکا ہے، ابھی اس حادثہ سے پوری طرح آشنا نہیں ہے۔

گو الحمدللہ گزشتہ بیس برسوں میں انقلابی تحریک کی برکت سے عاشورہ کے بارے میں نئی اور اہم باتیں کہی گئی ہیں، مفکروں، دانشوروں، اہل قلم اور محققین نے کچھ ایسی چیزیں بیان کی ہیں جس سے کافی حد تک اس کا چہرہ نمایاں ہو گیا ہے، لیکن ابھی تک بحث و گفتگو کی گنجائش باقی ہے۔

امام حسینؑ کی تحریک کا بنیادی نکتہ اسلامی حکومت کو امامت سے سلطنت میں تبدیل کئے جانے کے خلاف جہاد ہے۔ میرے خیال میں اگر اس نکتہ پر تکیہ کریں تو اسلامی حکومت کے متعلق میری گزشتہ بحثوں سے اس کا ربط بھی برقرار رہے گا۔

اسلامی حکومت کے امتیازات

جیسا کہ گزشتہ خطبوں میں "حکومت اسلام اور الٰہی شریعتوں کے نقطہ نظر سے" کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ الٰہی ادیان میں حکومت کی اساس و بنیاد وہ چیز نہیں جو دنیا پرست، توسیع پسند اور ابن الوقت عناصر اپنی حکومت کے لئے بنیاد تصور کرتے ہیں۔

دنیا پرست اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کی خاطر عوام پر مطلق العنان حکومت سمجھتے ہیں، چاہے وہ حکمران ہوں جو مدبر و لائق تھے اور تاریخ انہیں طاقتور و مدبر حکمران کے عنوان سے یاد کرتی ہے یا نالائق و بزدل بادشاہ ہوں، یہ سب کے سب اس جہت میں شریک ہیں کہ وہ عوام پر حکومت کو اپنے عیش و عشرت کا ذریعہ سمجھتے تھے اور آج بھی دنیا کی یہی حالت ہے، جس شخص کو حکومت مل جاتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ اسے عیش و عشرت کی زندگی مل گئی، پوری دنیا کی یہی حالت ہے، شاید دو ایک ملکوں کو مستثنیٰ کیا جا سکے۔

لیکن اسلامی و دینی ثقافت میں حکومت ایک فریضہ ہے، سخت و پرخطر ذمہ داری ہے جہاں قدم قدم پر محرومیوں کا سامنا ہے، حکومت، سنگین ترین ذمہ داری کے بوجھ کو اٹھانا ہے، یہ تصور نہیں کہ حکومت پانے والا اپنے لئے کوئی چیز طلب کرنے، بندگانِ خدا کو اپنے چنگل میں اسیر کرے، مال اللہ کو رنگین و پرتکلف دسترخوان سمجھے، اس سے ناجائز فائدہ اٹھائے، یہی وجہ ہے کہ دنیاوی اقتدار پرستوں کی اصطلاح میں حکومت کو سلطنت و ملوکیت و بادشاہی سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن اسلام میں اسے ریاست کہا جاتا ہے، اس کا نام خلافت اللہ ہے۔ اس کا نام ولایت اور عوام کے امور کی ذمہ داری ہے، یعنی حتیٰ کہ حکومت کے نام میں بھی ذمہ داریوں کی طرف اشارہ موجود ہے۔ پیغمبر اسلامؐ نے سماجی نظام اور عوام کی زندگی کے سلسلے میں سب سے بڑا قدم جو اٹھایا وہ یہ تھا کہ عوام کو طاغوتوں کے چنگل سے نجات دلا دی، اور اپنی خدائی قیادت و امامت و ولایت کے زیر سایہ انہیں بندۂ خدا بنا دیا :

لیخرج الناس من عبادۃ العباد

الی عبادۃ اللہ ومن طاعۃ العباد
الی طاعۃ اللہ۔

امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے "دل کو ان انسانوں کی بندگی سے آزادی دلائی جو خود بندگانِ خدا ہیں، مگر زبردستی دوسروں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے، انہیں ولایتِ الٰہی کے زیر سایہ جگہ دی، ولایتِ الٰہی، آزادی، عزت اور عظمت کا نقطۂ کمال ہے۔

پیغمبر کے بعد بھی کسی حد تک یہ خصوصیت باقی رہی، ہر چند کچھ اختلافات پیش آئے اور اس الٰہی انسانی شریفانہ حکومت کو ٹھیس پہنچی، مسلمین، فتوحات اور دیگر اسباب کی بنا پر دولت و ثروت، عیش و آرام، اور مال دنیا میں مشغول ہو گئے۔ اس طرح کے مسائل ضرور پیش آئے، لیکن حضرت علیؑ کے ہاتھوں میں اقتدار آتے ہی وہی الٰہی حاکمیت پلٹ آئی اور اسلامی حکمران یعنی حضرت علیؑ، عوام کو حقیر و ذلیل سمجھنے اور ان سے غرور و تکبر سے پیش آنے کے بجائے، عوام کی ایک فرد بن گئے بلکہ دنیاوی زندگی کے لحاظ سے آپ کی حالت دوسروں سے کہیں زیادہ خستہ تھی۔

امیر المومنینؑ نے اس حالت کو اپنایا تاکہ عوام کو عیش و عشرت کے متعفن دلدل اور طاغوتی زندگی میں غرق ہونے سے نجات دیں عصر جاہلیت کی اس بلا سے محفوظ رکھیں جو دوبارہ عوام کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی، امیر المومنینؑ نے دوبارہ اس طرح کا اسلامی معاشرہ قائم کر دیا، لیکن آپؑ کی شہادت کے بعد معاشرے میں دوبارہ وہی چیزیں رونما ہونے لگیں جس سے انبیاء و اوصیاء عوام کو بچانا چاہتے تھے، یعنی دوبارہ وہی ظلم و استبداد، ہوا و ہوس، کنبہ پروری جڑ پکڑنے لگی، اسلامی بنیادوں کے بجائے جاہلی اساس پر حکومت دوبارہ پلٹ آئی یعنی وہی حالت جسے امیر المومنینؑ نے اپنی حکومت کے آغاز میں بیان کیا تھا

الا وان بلیتکم قد عادت
کھیئتھا یوم بعث اللہ نبیکم۔

•••

حضرت امیرؑ کی شہادت کے بعد وہی ساری خصوصیات ظلم و استبداد کے اضافہ کے ساتھ عصر معاویہ و یزید میں دوبارہ پلٹ آئیں۔ خلفائے اول (خلفائے راشدین) کے زمانے میں استبداد نہیں تھا اور عوام کو اعتراض کرنے کا حق حاصل تھا، اس وقت لوگوں میں اتنی جرأت تھی کہ خلیفہ کے منبر کے سامنے کھڑے ہو کر اس پر اعتراض کرتے تھے اور اگر عصر جاہلیت کے عادات و اطوار کی بازگشت کے خلاف آواز اٹھانے والوں پر سختی بھی کی جاتی تھی تو اس حد تک تھی کہ مثلاً ابوذر کو جلاوطن کر کے ربذہ بھیج دیا گیا۔ یا عمار یاسر کو خلیفہ کے سامنے مارا گیا۔ اس سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ حقیقی مومنین اور پیغمبرؐ کے اصحاب باوجود جن کی تعداد کم بھی نہ تھی، دل کی بات زبان پر لا سکتے تھے فضا کسی حد تک آزاد تھی، اس وقت مومنین کے لئے ممکن تھا کہ جاہلی اقدار کی طرف بڑھتے قدم کو روک دیں، جاہلی سیاست کے خلاف آواز اٹھائیں، لیکن حضرت امیرؑ کی شہادت کے بعد سنسرشپ اور سیاہ استبداد حکمفرما ہو گیا جس میں سانس لینا بھی ممکن نہ تھا۔ مورخین حضرت امیر المومنینؑ کی شہادت کے بعد کی جو تصویر پیش کرتے ہیں وہاں دور کے عوام خاص کر مسلمین و مومنین کے لئے اتنی بڑی مصیبت ہے جسے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ابھی پیغمبر اسلامؐ کی وفات کو نصف صدی بھی نہیں گزری ہے، ابھی اسلام تر و تازہ ہے، عوام تو مسلم ہیں، ابھی بہت سے شہر اور ملک واقعاً اسلام میں پہلے سے ہی ہیں اور اس طرح سے اسلامی اصول مسخ کئے جا رہے ہیں، ہر چیز بدل رہی ہے۔

حضرت امیرؑ کی شہادت کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس روایت کے مصداق ہے جسے امام حسنؑ و امام حسینؑ نے پیغمبر اسلامؐ سے نقل کیا ہے، حضرتؐ نے فرمایا:

اذا بلغ آل ابی العاص ثلاثین

جب آل ابی العاص (بنی امیہ کی اہم شاخ ہے جس نے تقریباً پچاس سال تک عالم اسلام پر حکومت کی ہے، مروان حکم سے مروان حمار تک تھا) کی تعداد تیس ہو جائے گی۔

اتخذوا مال اللہ دولا وعباد اللہ
خولا ودین اللہ دخلا بینھم

الٰہی اور طاغوتی حکومت کا فرق

امام حسین علیہ السلام نے جس چیز کے

خلاف تحریک شروع کی اور آپ کے قیام سے پہلے دنیائے اسلام اس میں مبتلا تھی اور اسلام و مسلمانوں کے لئے سب سے بڑی مصیبت تھی اسے تین جملوں میں بیان کیا جاسکتا ہے، یعنی الٰہی اور طاغوتی حکومت کا فرق ان ہی تین نکتوں میں ہے۔

پہلے اموال: ظالم و طاغوتی حکومت مال اللہ کو اپنا مال سمجھتی ہے۔ روئے زمین پر پائی جانے والی دولت، بیت المال، عمومی آمدنیاں اور وہ چیزیں جنہیں تمام لوگوں میں تقسیم ہونا چاہئے اور جن ذرائع سے تمام لوگوں کو مستفید ہونا چاہئے، طاغوتی حکومتیں نہ صرف یہ کہ ان چیزوں کو تمام عوام کی ملکیت تصور نہیں کرتیں، نہ صرف یہ کہ غریب و محروم عوام کو صاحب حق و حصہ دار نہیں سمجھتیں اور نہ صرف یہ کہ طاقتور، مالداروں کو لوٹ کھسوٹ سے منع نہیں کرتیں بلکہ اس کے برعکس غریبوں، محروموں اور کمزوروں کو خداداد دولت سے محروم اور مال اللہ پر اپنی اجارہ داری قائم کر دیتی ہیں، وہ اور ان کے کتے مال خدا کو بھنبھوڑتے رہتے ہیں۔

اتخذوا مال اللہ دولا

یہ طاغوتی حکومت کی ایک خصوصیت ہے لیکن حاکمیت الٰہی مالِ خدا کو خدا کا مال سمجھتی ہے جس میں اس کے تمام بندے سہیم و شریک ہیں۔ حاکم اسلامی مالِ خدا کو غریب ترین بندوں میں تقسیم کرتا ہے۔ غریب و محروم افراد کو مالدار و توانگر افراد پر ترجیح دیتا ہے اور خود کو معاشرے کی سب سے نچلی صف میں قرار دیتا ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام کی حکومت آپ کے سامنے ہے۔ امیر المومنینؑ اتنا معمولی کھانا کھاتے اور اتنا معمولی کپڑا پہنتے تھے کہ اس زمانے میں اس سے معمولی کھانے اور کپڑے کا وجود ہی نہ تھا۔

امام حسینؑ جس حکومت کے خواہشمند تھے وہ ایسی ہی حکومت تھی، لیکن آل ابی العاص جن کی حکومت سے پیغمبر اسلامؐ مسلمانوں کو ڈراتے تھے ان میں یہ صفت مفقود تھی۔

ابھی ہمارا جہاد ختم نہیں ہوا ہے
ہم اپنے معاشرے میں حسینی
تحریک کو ختم شدہ تصور نہیں
کرتے، ہم ابھی کربلا و عاشور
کے راستے پر گامزن ہیں،
ہماری قوم میں ابھی بھی یہ
احساس ہونا چاہئے کہ ہم
کربلا میں کھڑے ہوئے ہیں

وعباد اللہ خولا۔

طاغوتی حکومتوں کی ایک دوسری خاصیت یہ ہے کہ وہ بندگانِ خدا کو اپنا غلام تصور کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ زبان سے نہ کہیں کہ عوام ہمارے غلام ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ عوام کو اپنا غلام سمجھتی ہیں۔ یہ وہی چیز ہے جو پہلی صدی میں بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومت میں تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ عصر معاویہ میں اس کا آغاز ہوا، یزید کے دور میں پروان چڑھی اور مروان و عبد الملک کے دور میں اپنے اوج کو پہنچ گئی اور اسی طرح آگے بڑھتی گئی، یہ حکومتیں سچ مچ میں عوام کو اپنا غلام سمجھتی تھیں بس فرق اتنا ہے کہ شروع میں زبان سے کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی لیکن چند دہائی گزر جانے کے بعد، تیسری صدی ہجری کے آغاز یا دوسری صدی ہجری کے اختتام میں عرب کا معروف مصنف جاحظ اپنی کتابوں میں واضح الفاظ میں لکھتا ہے کہ "عوام امیر المومنین کے غلام ہیں"۔ یعنی اس فاسق و فاجر و فاسد خلیفہ کے غلام ہیں جسے امیر المومنین کہا کرتے تھے۔ جاحظ کہتا ہے:

"خلیفہ مولا و آقا ہے اور عوام اس کے غلام ہیں"۔

یہ طرز فکر اسلامی حکومت سے انحراف کے بعد وجود میں آئی۔

بہر کیف طاغوتی حکومتوں کی یہ بھی ایک خاصیت ہے کہ وہ عوام کو اپنا غلام سمجھتی ہیں، ان کی نظروں میں عوام کا کوئی احترام نہیں، عوام کا کوئی حق نہیں، نہ انتخاب کا حق، نہ اظہارِ خیال کا، اور اگر بیعت بھی کرنی ہے تو صرف اس شخص کی جس کی بیعت کا خلیفہ یا طاقتور افراد حکم دیں۔ عوام بیعت کرنے پر مجبور ہیں۔

ودین اللہ دخلا بینہم

طاغوتی حکومت کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ دین خدا کو کھلونا بنا لیتے ہیں، اپنی مرضی کے مطابق دینِ خدا کو بدلتے رہتے ہیں۔

جب کبھی ضرورت پڑتی ہے عوام کو اپنا

محبوبہ بنانے کے لئے اظہار تعبد کرتے ہیں، اسلام و قرآن کا نام لیتے ہیں، نماز با جماعت ادا کرتے ہیں اور جب کبھی ضرورت ہوتی ہے تو اپنی انفرادی زندگی یا سماجی زندگی یا کسی کام میں یا صلح و جنگ کے موقع پر اسلام کو بڑے اطمینان سے پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ جس طرح سے چاہتے ہیں اسلام سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ درحقیقت اسلام ان کا ہادی و رہنما نہیں ہوتا بلکہ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جب اور جس طرح چاہتے ہیں اسلام سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ چیز خلفائے بنی امیہ و بنی عباس میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے، اگر کوئی شخص پہلی و دوسری صدی کے تاریک ایام اور اندوہناک حالات کا مطالعہ کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ آل ابی العاص کے متعلق پیغمبر اسلام نے

دین اللہ دخلا بینھم

کی جو خبر دی تھی اس کا مطلب کیا ہے۔ جو دل چاہتا کرتے تھے۔ جعلی حدیثیں گھڑتے، آیاتِ قرآنی کی تلاوت پر پابندی لگا دیتے، تفسیر آیت جرم قرار دیتے۔ لوگ فلاں آیت کو پڑھیں اور فلاں طریقے سے معنی کریں، جیسی ضرورت پیش آتی ویسے معنی نکال لیتے، خلافت کے پرتکلف دسترخوان پر روٹی توڑنے والے کچھ "رجالِ دین" نامی افراد بھی موجود تھے، یہ منفعت پرست خدا فراموش، حکمرانوں کی مرضی کے مطابق قرآن کی تاویل و تفسیر کیا کرتے۔

یہی تین چیزیں تھیں جن کی خبر پیغمبر اکرمؐ نے آل ابی العاص کے متعلق دی تھی۔ ابوذر غفاری کی روایت کے مطابق حضرت نے فرمایا: "جب آل ابی العاص کی تعداد تیس تک پہنچ جائے گی اس وقت وہ لوگ اس قسم کے اعمال انجام دیں گے۔"

اتخذوا مال اللہ دغلا و عباد اللہ خولا و دین اللہ دخلا بینھم

اور یہی کچھ ہوا بھی۔ آل ابی العاص نے دنیائے اسلام کو ان مشکلات میں گرفتار کر دیا حکومت الٰہی و امامت جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے، یھدون بامرنا" ہمارے حکم سے لوگوں کی ہدایت کریں گے۔ امر بمعروف و نہی از منکر کریں گے۔ نماز قائم اور زکوٰۃ ادا کریں گے۔ اتنے اعلیٰ مفاہیم کی حامل امامت ایک ایسی طاغوتی سلطنت و حکومت میں بدل گئی کہ انسان میں جتنی زیادہ شقاوت و بربریت تصور کی جا سکتی ہے وہ سب کی سب ان سلاطین میں دیکھی جا سکتی ہے جتنی برائیاں خود جانتے تھے، ایران و روم کے بادشاہوں سے سیکھتے تھے۔ مختصر یہ کہ اس قسم کے سنگین حالات پیدا ہو گئے تھے، ان حالات کے مقابلے میں کیا کرنا چاہئے؟ تاریخ کے سامنے یہ عظیم سوال تھا، یا ایسا نظم الٰہی تھا جس سے دنیائے اسلام نا آشنا تھی، اگر اسلامی معاشرے میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے، ان کا فریضہ کیا ہے؟ جس وقت حکومت امیر المومنینؑ کے ہاتھوں میں تھی، آپ کا فریضہ یہ تھا کہ ایسے حالات پیدا نہ ہونے دیں، لہٰذا اسی مقصد کے لئے آپ جنگ کرتے رہے، جب تک حضرت علیؑ زندہ تھے کسی میں علانیہ فسق و فجور کی جرأت نہ ہوتی تھی، بلکہ قرآن کا سہارا لیتے تھے۔ امیر المومنینؑ کی شہادت کے بعد امام حسنؑ نے اپنے پدر بزرگوار کی سیرت کو باقی رکھا، یہاں تک کہ آپؑ نے جب دیکھا کہ حضرت علیؑ کے مانند اقدام نہیں کر سکتے تو امام حسنؑ حکمت عملی بدلنے پر مجبور ہو گئے، کیونکہ امیر المومنینؑ کے پاس ایک بڑی فوج تھی، سپاہی جنگ کے لئے تیار تھے لیکن ایسی فوج امام حسنؑ کے پاس نہ تھی، جو تھی وہ لڑنے کے لئے تیار نہ تھی۔ دونوں کا مقصد ایک ہے، صرف ٹیکنیک کا فرق ہے، شاید میں اس سے پہلے بھی امام حسنؑ کی زندگی اور صلح کے متعلق گفتگو کر چکا ہوں، اور اگر دوبارہ موقع ملا تو پھر کبھی بحث کروں گا اور ثابت کروں گا کہ امام حسنؑ نے اس دور میں جب کہ عوام ابھی آگاہ نہ تھے، ابھی طاغوتی حکومتوں کی حقیقت سے بے خبر تھے، وہ نہیں جانتے تھے کہ کتنی بڑی مصیبت ان کی گھات میں ہے، ایسے حالات میں سب سے بہترین کام جو کیا جا سکتا تھا، وہی تھا جو امام حسنؑ نے انجام دیا یعنی معاویہ سے صلح۔ اس صلح کا مطلب صرف جنگ بندی تھا۔ یہ صلح ایک حکمت عملی تھی، خواص جانتے تھے کہ امام حسنؑ کو اس طرح کی فرصت کا انتظار تھا تاکہ اچھی طرح سے زمین ہموار کر سکیں۔ امام حسنؑ نے دس برس تک کوشش کی اور کافی حد تک زمین ہموار کر لی، مگر اسی عرصے میں امام حسنؑ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا، اور بعد امامت امام حسینؑ

نے سنبھالا۔ امام حسینؑ نے بھی دس سال تک امام حسنؑ کی حکمت عملی پر عمل کیا، لوگوں کو آگاہ کیا، تقریریں کیں، نزدیکی اصحاب کو ہدایات دیں، شیعوں کو متحد کیا، علماء و فقہا کو ان کے فرائض سے آگاہ کیا، لیکن معاویہ کی موجودگی میں کوئی اقدام نہیں کیا جا سکتا تھا، کیونکہ معاویہ بری طرح مسلط تھا، معاویہ کی حیات میں امام حسینؑ کے لئے کسی اقدام کا امکان نہ تھا۔

۶۰ ہجری میں معاویہ اس دنیا سے رخصت ہوا، اس کے دنیا سے جاتے ہی زمین ہموار ہو گئی، یعنی عوام آمادہ ہیں، ذہن کسی حد تک تیار ہیں، تمام باتیں کہی جا چکی ہیں اور یزید کی شخصیت بھی معاویہ جیسی نہیں۔ معاویہ نے کم از کم عصر رسول اکرمؐ کو دیکھا تھا، ظاہری اسلام کو کسی حد تک حفظ کرتا تھا، پیغمبرؐ سے اس کی رشتہ داری کچھ لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اسلام دشمنی کا کھلم کھلا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ فتح شام میں وہ اور اس کا بھائی شریک تھے اور وہیں پر انہوں نے پڑاؤ ڈال لیا تھا۔ معاویہ نے شام کو اپنا اڈہ بنا لیا تھا، لیکن یزید میں یہ خصوصیتیں نہ تھیں عالم اسلام میں یزید کا کوئی اثر نہ تھا۔ یزید شراب خوار، فاسد اور علانیہ فسق و فجور کا ارتکاب کرتا تھا۔ عالم اسلام میں حسینؑ جیسی شخصیت یزید کے مقابلے میں اٹھ کھڑی ہو سکتی تھی۔ حسینؑ یہ کہہ سکتے تھے کہ میں یزید جیسے شخص کی بیعت نہیں کر سکتا، وہ ہرگز لائق خلافت نہیں اور یہی انکارِ بیعت ایک تحریک کا سبب بن جائے، عوام اٹھ کھڑے ہوں، عالم اسلام زندہ ہو جائے، اسلامی نظام اپنی اصل صورت میں نمودار ہو جائے، سلطنت کو دوبارہ امامت میں بدل دیا جائے۔ اس قسم کے حالات پیدا ہو چکے تھے، اسی مقام پر امام حسینؑ کی اہمیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ البتہ یہ عرض کروں کہ اس تاریخی موقع پر ہمارے ائمہ اطہار علیہم السلام میں سے جو امام بھی امام حسینؑ کی جگہ پر ہوتا، وہی کچھ کرتا جو امام حسینؑ نے کیا۔

اگر یہی حالات امام حسنؑ، امام سجادؑ امام صادقؑ، امام علی النقی، امام حسن عسکریؑ کے زمانے میں پیش آتے تو وہ بھی یہی کرتے اور وہی امام سید الشہداء کا لقب پاتا، لیکن یہ حالات صرف امام حسینؑ کے زمانے میں پیش آئے۔ پیغمبر اسلامؐ نے پہلے سے اس کی خبر دی تھی۔

میں اس مقام پر ایک نکتہ عرض کر دینا چاہتا ہوں، تمام اسلامی احکام پر پیغمبر اکرمؐ نے خود عمل کر کے بتایا۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، امر بمعروف و نہی از منکر۔ پیغمبر اکرمؐ صرف کہنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے کہ اے لوگو، نماز پڑھو۔ بلکہ خود نماز پڑھ کر بتاتے تھے کہ اس طرح نماز پڑھو، صرف کہتے ہی نہیں تھے کہ جہاد کرو، بلکہ آگے آگے خود چلتے تھے اور دشمنوں سے جہاد کرتے تھے۔ حج بجا لا کر لوگوں کو حج کی تعلیم دی، امر بالمعروف کر کے بتایا کہ امر بالمعروف اس طرح کیا جاتا ہے۔ قرآن پڑھ کر مسلمانوں کو تلاوتِ قرآن کی تعلیم دی۔ جتنے احکام مسلمانوں کو بتائے تھے پہلے خود ان پر عمل کرتے تھے، تمام احکام اسلام پر پیغمبر اسلامؐ کی حیات میں عمل ہو گیا تھا صرف ایک حکم باقی رہ گیا تھا جس پر پیغمبر اکرمؐ کی زندگی میں عمل نہیں ہوا، وہ یہ کہ اگر اسلامی تحریک جادۂ حق سے منحرف ہو جائے، اگر نظام اسلامی اپنے راستے سے ہٹ جائے، لا الٰہ الا اللّٰہ کے بجائے مقصد بت و طاغوت ہو جائے تو اس وقت مسلمانوں کا کیا فریضہ ہے؟ یہ ایسی چیز تھی جس پر پیغمبر اسلامؐ کی زندگی میں عمل ممکن نہ تھا۔

طاغوتی حکومت میں مسلمانوں کی ذمہ داریاں

جب الٰہی و اسلامی امامت کے بجائے طاغوتی و شیطانی سلطنت حکم فرما ہو جائے اس وقت مسلمانوں کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ یقیناً اسلام میں اس کا حکم موجود ہے۔ پیغمبر اسلامؐ نے بھی ایسے حالات میں مسلمانوں کے فرائض بیان کئے ہیں، خود امام حسینؑ بھی پیغمبر اسلامؐ سے روایت کرتے ہیں، لیکن خود پیغمبر اسلام اس حکم پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔ کیوں؟ اس لئے کہ خود پیغمبر اسلامؐ کی زندگی میں اس قسم کے حالات پیدا ہی نہیں ہو سکتے تھے، یہ حالات آپ کے برحق جانشینوں اور اوصیاء کے زمانے میں پیش آ سکتے تھے اور یہ ان کی ذمہ داری تھی کہ اس حکم کی عملی طور پر تبلیغ کریں۔

امام حسین علیہ السلام کے زمانے میں پائی جانے والی شخصیتوں سے آپؑ کا امتیاز یہی تھا امامؑ کے زمانے میں بہت سی لائق و قابلِ احترام شخصیتیں بھی موجود تھیں۔ بہت سے ایسے افراد

تھے جو امام حسین علیہ السلام کو کربلا جانے سے منع کر رہے تھے اور وہ ایسا امام حسینؑ سے محبت کی بناء پر کر رہے تھے، جیسے جناب زینبؑ کے شوہر عبداللہ بن جعفر۔ ابن عم عبداللہ بن عباس، آپ کے بھائی عمر بن علی،

پیغمبر اسلام کی زوجہ محترمہ ام سلمیٰ، اس کے علاوہ اور بہت سے افراد جو امام حسینؑ سے بحث کرتے تھے، آپؑ سے اظہار محبت کرتے تھے، وہ لوگ خود بھی معاویہ و یزید کے خلاف تھے، لیکن امام حسینؑ کی تحریک کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے، نہ خود اس تحریک میں شامل ہونے پر تیار تھے اور نہ امام حسینؑ کو اس تحریک کی اجازت دیتے تھے۔ امام حسینؑ میں اور ان لوگوں میں یہی فرق تھا کہ وہ لوگ صرف کہنا جانتے تھے عمل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگرچہ نہج البلاغہ اور دیگر تاریخی کتابوں کی روشنی میں عبداللہ بن عباس اور امیرالمومنینؑ کے درمیان کچھ مسائل پیش آئے تھے، لیکن شک نہیں کہ عبداللہ بن عباس، امیرالمومنینؑ اور اہل بیتؑ اطہار کے وفادار تھے۔

عبداللہ بن عباس کے حالات زندگی کا جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے، چاہے وہ عاشورے سے پہلے کے حالات ہوں یا عاشورے کے بعد کے، مجھے شک نہیں کہ عبداللہ بن عباس اہل بیت پیغمبرؐ کے محب اور ان کے مخالفوں کے مخالف تھے، وہ معاویہ کے خلاف تھے، یزید سے انہیں نفرت تھی، یزید کے بعد کے خلفاء کی مخالفت کی، ان کے مقابلے میں گو کہ عبداللہ بن جعفر گو علم و تقویٰ میں عبداللہ بن عباس کے پائے کے نہ تھے لیکن انہیں بھی امام حسینؑ سے محبت تھی، وہ بھی آپ کو کسی مصیبت میں گرفتار نہیں دیکھنا چاہتے تھے اسی طرح پیغمبر اسلامؐ کی زوجہ محترمہ ام سلمہ کو بھی امام حسینؑ سے محبت تھی ان سب کو امام حسینؑ سے عقیدت تھی، محبت تھی، لیکن یہ لوگ امام حسینؑ کی اس خاص تحریک کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

امام حسینؑ کی تحریک یہ تھی کہ اس زمانہ کے اور آئندہ آنے والے مسلمانوں کو یہ بتا دیں کہ جب کبھی اسلامی معاشرہ و نظام اور دین حالات سے دوچار ہو جائے گا، جب کبھی مسلمانوں کی کی زمام کسی امام کے بجائے بادشاہ کے ہاتھ میں آجائے تو ان کا فریضہ ہے کہ اس بادشاہ کے خلاف اس طاغوتی حکمران کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں، ہر ممکن طریقہ سے اقدام کریں، اگر تلوار اٹھانے کا امکان ہے تو پھر زبانی مخالفت پر اکتفا کرنا حرام ہے، ایسی صورت میں سخت سے سخت اقدام واجب ہے چاہے اس کا نتیجہ جو بھی ہو، چاہے قتل ہی ہو جانا پڑے، یہی امام حسینؑ کا راستہ ہے، امام حسینؑ کی تحریک کا مقصد مسلمانوں کو ان کی ذمہ داری یاد دلانا تھا، کچھ عرصہ قبل محققوں و دانشوروں میں یہ گفتگو تھی کہ امام حسینؑ کی تحریک کا کیا مقصد تھا؟

کچھ لوگ کہتے تھے کہ امام حسینؑ نے قیام حکومت کے لئے تحریک چلائی تھی، امام حسینؑ کا مقصد یہ تھا کہ عراق جا کر اپنی من پسند حکومت تشکیل دیں، لہٰذا جب آپ

میرا مقصد حکومت و اقتدار حاصل کرنا نہیں ہے، میرا مقصد دنیوی فضول حطام حاصل کرنا نہیں ہے، میری تحریک کا مقصد عوام کو دین کی چھپی ہوئی نشانیوں سے واقف کرانا ہے، قرآن اور اسلامی اصول و اقدار، اہداف و مقاصد کو دوبارہ زندہ کرنا ہے، ہمارا مقصد عوام میں ان چیزوں کی نمود ہے۔

پروردگارا! ہم تیرے شہروں اور تیری سرزمین کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں، اسلامی معاشرے کو آباد کرنا چاہتے ہیں۔ اس ظلم و ستم، ان طبقاتی اختلافات، فقرا کی شدید غربت اور امیروں کی شکم پری اور پرخوری کو ختم کرنا چاہتے ہیں ظلم اور بیجا امتیازات کو مٹانا چاہتے ہیں۔ ہمارا مقصد انہی چیزوں کی اصلاح ہے۔

(امام حسینؑ)

کو راستے میں یہ خبر ملی کہ عراق میں تشکیلِ
حکومت کا امکان نہیں ہے، کوفیوں نے
بے وفائی کی ہے تو آپ نے مدینہ واپس ہونے
کا ارادہ کیا، حضرتؑ شہید نہیں ہونا چاہتے
تھے، آپؑ کو مجبور کر کے کربلا لے جایا گیا،
اور وہاں شہید کر دیا گیا۔ یہ ایک نظریہ تھا
جسے بعض لوگوں نے قائم کیا تھا کچھ لوگ
اسے قبول بھی کرتے تھے، بعض لوگ اس
نظریے کے مقابلے میں دوسرا نظریہ رکھتے تھے،
وہ کہتے تھے کہ امام حسینؑ کا مقصد حکومت
نہ تھا بلکہ وہ صرف شہید ہونا چاہتے تھے۔

آپؑ نے مدینہ سے سفر کیا تاکہ کربلا آکر
شہید ہو جائیں۔ آپؑ کہتے تھے کہ اگر میں
زندہ رہ کر مبارزہ نہیں کر سکتا تو پھر شہید
ہو جاؤں اور اپنی شہادت کے ذریعے مبارزہ
کروں۔

لیکن جب ہم تاریخ کربلا کا بنظرِ مطالعہ
کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ امام
حسینؑ کا مقصد نہ تشکیلِ حکومت تھا
نہ شہادت تھا۔

ظالم و جابر حکمران کے خلاف آپ کے
علمِ جہاد بلند کرنے کا مقصد سخت ترین
حالات میں فریضۂ الٰہی کی بجا آوری اور لوگوں
کو ظلم و ستم کے خلاف جہاد و مبارزہ کی تعلیم
دینا تھا۔ امام حسینؑ نے اپنے اس اقدام سے
دنیا کو بتا دیا کہ اس طرح کے اقدام میں اگر
شہادت و کامیابی کا امکان ہے لیکن خود یہ
اقدام ہر چیز سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

حسینی تحریک محتاجِ بیان نہیں

حسینی تحریک اپنا مقصد خود بتاتی
ہے، جو چیز ابھی تک تاریخ میں موجود ہے،
وہ امام حسین علیہ السلام کے کلمات ہیں۔ آپؑ نے
اپنے دوستوں، دشمنوں، غیر جانبداروں، متعصب
ساتھیوں اور منحرفوں کو خطاب کر کے اپنے مقصد
کی وضاحت فرمائی ہے۔ میں امام حسین علیہ السلام
کے بعض کلمات پیش کرتا ہوں، جن سے
واقعاتِ کربلا پر روشنی پڑتی ہے:۔

اس زمانے میں علماء اسلام کی اچھی خاصی
تعداد تھی۔ علماء سے میری مراد وہ افراد تھے
جو اصحابِ پیغمبرؐ تھے۔ پیغمبرِ اکرمؐ کی احادیث
خود پیغمبرِ اکرمؐ کی زبانی یا دوسروں کے وسیلے
سے سنے ہوئے تھے، احادیث کو نقل کرتے
تھے، عوام جنہیں علمائے دین کی حیثیت سے
احترام کی نگاہوں سے دیکھتے تھے، حسینؑ
بن علیؑ نے ان میں سے کچھ افراد کو منیٰ میں
اکٹھا کر کے تفصیلی گفتگو فرمائی جو کہ
تحف العقول اور دیگر کتابوں میں موجود
ہے۔ اختتامِ تقریر میں آپ نے آسمان
کی جانب رخ کر کے کہا:

"خدایا! تو جانتا ہے کہ میری اس
تحریک و بیانات کا مقصد وہ نہیں ہے جو
عام دنیا پرست جنگجوؤں کا ہوا کرتا ہے۔

میرا مقصد حکومت و اقتدار حاصل
کرنا نہیں ہے۔ میرا مقصد دنیوی فضول حطام
حاصل کرنا نہیں ہے (فضول حطام ان چیزوں
کو کہا جاتا ہے جو انسان کی معمولی زندگی سے
زائد ہو، فاخرہ لباس، عمدہ مکانات، بہترین
سواری، پرتکلف دسترخوان، رنگ برنگے
کھانے، عیش و عشرت یہ سب فضول حطام ہے)
میری تحریک کا مقصد عوام کو دین کی چھپی ہوئی
نشانیوں سے واقف کرانا ہے۔ قرآن و اسلامی
اصول و اقدار، اہداف و مقاصد کو دوبارہ زندہ
کرنا ہے۔ ہمارا مقصد عوام میں ان چیزوں کی
نمو ہے۔

پروردگارا! ہم تیرے شہروں اور تیری
سرزمین کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ اسلامی
معاشرے کو آباد کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ظلم و ستم،
اس طبقاتی اختلافات، فقراء کی شدید
غربت اور امیروں کی شکم پری اور پُرخوری کو
ختم کرنا چاہتے ہیں، ظلم اور بے جا امتیازات
کو مٹانا چاہتے ہیں۔ ہمارا مقصد انہی
چیزوں کی اصلاح ہے۔

ہماری تحریک تیرے ستم رسیدہ و مظلوم
بندوں کی نجات کی خاطر ہے۔ ان کے تحفظ
و آسائش کی خاطر ہے، کیونکہ اس زمانہ میں
اگر کوئی شخص حکمرانوں کی نفسانی خواہشات
اور ہوا و ہوس کے خلاف معمولی سا بھی اقدام
کرتا تھا تو اسے سخت ترین سزائیں دی جاتی
تھیں۔"

امام حسین علیہ السلام نے یہ باتیں منیٰ میں
علماء، فقہاء، محدثین اور قاریانِ قرآن کے مجمع
میں کہیں اور واضح الفاظ میں اپنے مقصد کو
بیان فرمایا۔

حاکمِ مدینہ، ولید بن عتبہ نے جب

امام حسینؑ کے پاس پیغام بھیج کر آپؑ کو دارالعمارہ میں طلب کیا تو حضرتؑ نے فوراً ہی کچھ لوگوں کو اکٹھا کیا۔ عبداللہ بن زبیر اور مدینہ کی دوسری اہم شخصیتوں کو جمع کرکے کہا کہ شاید معاویہ کا انتقال ہوگیا ہے اور ہم لوگوں کو بیعت کے لئے بلایا گیا ہے، لہٰذا حضرت تیاری کے ساتھ دارالعمارہ تشریف لے گئے۔ عتبہ بن ولید کا مقصد بھی یہی اس نے امام حسینؑ کو بیعت لینے کے لئے ہی بلایا تھا۔

دارالعمارہ میں حجاز کا گورنر عتبہ بن ولید اور مروان بن حکم موجود تھے۔ ان لوگوں نے حضرت امام حسینؑ سے بیعت طلب کی، حضرتؑ نے بات کو ٹالنا چاہا۔ فرمایا۔ صبح ہونے دو، اس وقت دیکھیں گے کہ کیا کرنا چاہئے، اور اگر بیعت ہی کرنا ہے تو پھر بھرے مجمع میں ہونی چاہئے۔

امامؑ نے دارالعمارہ سے جانا چاہا، لیکن مروان نے ولید کو اشارہ کیا، کہ تم حسینؑ کو جانے دے رہے ہو، اگر حسینؑ چلے گئے تو پھر تمہارے ہاتھ نہ لگیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ اسی وقت حسینؑ پر دباؤ ڈال کر بیعت لے لو۔

امام حسینؑ کا عزم مصمم

حضرت امام حسینؑ نے مروان کی طرف رخ کرکے سخت لہجے میں فرمایا:

"تو مجھ سے زبردستی بیعت لینا چاہتا ہے، کیا تجھ میں یا ولید میں اتنی جرأت ہے؟ خدا کی قسم، تم ایسا ہرگز نہیں کرسکتے، مطمئن رہو، میرا جیسا یزید جیسے کی ہرگز بیعت نہیں کرسکتا۔"

لیکن پھر بھی صبح تک انتظار کرو، دیکھو کیا ہوتا ہے۔

حضرتؑ اس فرصت کو کھونا نہیں چاہتے تھے، آپؑ اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ صحیح و سالم مکہ پہنچنا چاہتے تھے، تاکہ وہاں پہنچ کر اس عظیم تحریک کو شروع کریں۔ اسی لئے حضرتؑ نے دارالعمارہ سے واپس آتے ہی راتوں رات مدینہ چھوڑ دیا۔

مروان کو خطاب کرکے حضرتؑ نے یزید کے متعلق کچھ گفتگو کی ہے۔ جب مروان نے یہ کہا کہ حسینؑ بن علیؑ، میرا مشورہ ہے کہ تم یزید کی بیعت کرلو اور اپنے کو پریشانی میں مبتلا نہ کرو۔

حضرتؑ نے جواب میں فرمایا: جس دن عوام یزید جیسے توفان کے ہاتھ میں گرفتار ہو جائیں، یعنی بھیڑ بکریاں، بھیڑیوں کے پنجے میں اسیر ہو جائیں، اس دن اسلام کی بربادی یقینی ہے۔ اسلام کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ ان کلمات سے پتہ چلتا ہے کہ حسینؑ بن علیؑ کا مقصد احیائے اسلام تھا۔

حضرت کی وہ مشہور و معروف وصیت جو آپ نے محمد بن حنفیہ سے کی تھی، مدینہ سے نکلتے وقت حضرت نے فرمایا:

"میرے خروج و تحریک کا محرک (ابھی حضرت مکہ بھی نہیں پہنچے تھے، یہ جملے مدینہ سے نکلتے وقت فرمائے ہیں، لیکن اسی میں قیام و تحریک و خروج کا تذکرہ فرماتے ہیں، یہاں حرم پیغمبرؐ میں پناہ لینے کا تذکرہ نہیں ہے ورنہ لفظ "اخرج" کا استعمال نہ فرماتے) تکبر، خودخواہی، انانیت، ہوس اقتدار اور وہ چیزیں نہیں جو عام طور پر ستمگروں، مفسدوں اور ظالموں کا مقصد ہوا کرتی ہیں، ہم ظلم کرنے کے لئے نہیں نکلے ہیں، ہم نے فتنہ و فساد کی غرض سے خروج نہیں کیا ہے، ہمارے قیام و خروج کا مقصد امتِ جدؐ کی اصلاح ہے، امتِ جد بیمار ہے، اسے طبیب کی ضرورت ہے، عالم اسلام میں برائیاں رچ بس گئی ہیں، ان برائیوں کو اپنی تحریک کے ذریعے دور کروں گا، میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنا چاہتا ہوں، اپنے جدؐ اور اپنے بابا کی سیرت پر عمل کررہا ہوں، یعنی اسلامی امامت و الٰہی حاکمیت کو معاشرے میں دوبارہ قائم کرنا چاہتا ہوں۔"

امام حسین علیہ السلام نے متعدد مقامات پر خطبے دے کر اپنے مقصد کی وضاحت کی ہے۔ اگر وقت ہوتا تو میں ان تمام خطبات کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا، لیکن کمی وقت کے پیش نظر صرف ایک خطبہ پر روشنی ڈالوں گا۔

حضرت نے اپنے مقصد کی وضاحت خاص طور سے اس خطبہ میں فرمائی تھی جو آپ نے حُر اور اس کے لشکر کے ایک ہزار سپاہیوں کے سامنے بیان فرمایا تھا۔

شاید پہلی منزل شراف میں حُر سے آپ

کی ملاقات ہوئی، اس وقت آپ نے خطبہ دیا، لشکر حُر کو یاد دہانی کرائی، کیونکہ وہ اہل عراق و کوفہ تھے، انہیں یاد دلایا کہ تم ہی نے ہمیں دعوت دی تھی، تم ہی نے پیغام بھیجے تھے کہ میں یہاں آکر اسلامی و الٰہی حکومت تشکیل دوں، اسلام کو زندہ کروں اور احیائے اسلام میں تمہارا ساتھ دوں، تم اپنے وعدوں سے کیوں پھر گئے ہو؟

دوسری یا تیسری منزل میں حضرت نے پھر تقریر فرمائی:

"اے وہ لوگو، جو ہمارے ہمراہ ہو اور میری تحریک کا مقصد جاننا چاہتے ہو۔ اے وہ لوگو جو آج ہمارے دشمن کی حیثیت سے ہمارے مقابلے میں کھڑے ہوئے ہو، اے وہ بے خبر و غیر جانبدار افراد جنہیں قیام حسینی کی خبر ملے گی مگر یہ معلوم نہ ہوگا کہ فرزند پیغمبرؐ نے کیوں قیام کیا، ان کی تحریک کا مقصد کیا تھا۔ اور اے وہ لوگو! جو اسلامی تعلیمات و احکام کو سمجھنا چاہتے ہو، لیکن تمہیں ہمارے قیام کا مقصد نہیں معلوم، جان لو کہ میں جو کچھ کہتا ہوں، اپنے سے نہیں کہتا، اپنا ذاتی نظریہ بیان نہیں کرتا، میں وہی حسینؑ ہوں جو حکم پیغمبرؐ کو عملی جامہ پہنا رہا ہے، حکم پیغمبرؐ ہے کہ جب کبھی دیکھو کہ معاشرہ کی باگ ڈور ظالم و ستمگر ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے، ظالم و ستمگر حکمران عوام سے بدسلوکی کر رہا [illegible] پر ظلم و ستم ڈھا رہا ہے، عوام کے مفادات اس کی نظروں میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ صرف اپنے مفادات سے مطلب ہے، جب کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں، اگر کوئی شخص ان حالات کو دیکھ کر ظلم کے خلاف آواز نہ اٹھائے، قیام نہ کرے تو حق ہے کہ خداوند عالم قیامت کے دن اسے بھی وہی سزا دے جو ظالم کی سزا ہے"

ہمارے اسلامی انقلاب کا محرک بھی یہی تھا۔ اس گھٹن کے دور میں جن لوگوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جہاد کیا، ظلم کے خلاف آواز اٹھائی، مصیبت برداشت کی، جیل کی سختیاں تحمل کیں، دار و رسن کو گلے لگایا، جام شہادت نوش کیا، ان کی تحریک بھی یہی چیز تھی، یہی پیغمبر اسلامؐ کی حدیث جسے حضرتؐ کے نواسے امام حسینؑ نے بیان فرمایا، اور آج بھی مسلمانِ عالم کا یہی فریضہ ہے، چاہے وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں رہتے ہوں، اگر وہ اپنے فرائض سے پہلو تہی کریں گے تو خداوند عالم کی نظر میں وہ ظالم اور یہ خاموش و لاپرواہ افراد ایک ہی زمرے میں قرار دیئے جائیں گے۔

آج خون آشام توسیع پسندوں کے مقابلے میں ہمارا بھی یہی فریضہ ہے، ابھی ہمارا جہاد ختم نہیں ہوا ہے، ہم اپنے معاشرے میں حسینی تحریک کو ختم شدہ تصور نہیں کرتے، ہم ابھی کربلا و عاشورا کے راستے پر گامزن ہیں، ہماری قوم میں ابھی بھی یہ احساس ہونا چاہئے کہ ہم میدان کربلا میں کھڑے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کی تحریک کی روح یہی ہے کہ جہاں کہیں اسلامی تعلیمات کی بقاء، حدود الٰہی کے قیام اور احیائے اسلام کے لیئے کوئی تحریک شروع ہوتی ہے، وہ تحریک حسینی ہوتی ہے، جن لوگوں نے نجات فلسطین کے لیئے تحریک کی انہوں نے درحقیقت امام حسینؑ کی تاسی کی، جس وقت فلسطینیوں کے پاس شجاع و مجاہد قائد موجود تھے، ان قائدوں کا کہنا یہ تھا اور حقیقت بھی یہی تھی کہ ہم روح کربلا، روح عاشورا اور راہِ حسینؑ سے الہام حاصل کر رہے ہیں، ہم تحریک حسینیؑ سے سبق حاصل کر رہے ہیں، دنیا کے جس گوشے میں اس طرح کی تحریک رونما ہو، پیغام حسینی کا پرتو ہے۔

حسین بن علیؑ نے اپنی مقاصد کے ساتھ اقدام کیا، حسینؑ نے مدینہ سے مکّہ کا سفر طے کیا، چند ماہ مکّہ میں گذرے، پھر مکّہ سے کربلا تک کا طویل سفر کیا، اس عرصے میں کہیں پر بھی امام حسینؑ نے دفاعانہ پہلو اختیار نہیں کیا جس کسی نے پوچھا، اس کی ظرفیت کے مطابق اپنے مقصد کی وضاحت کردی۔ اگر کسی کمزور دل شخص نے پوچھا، جیسے فرزدق شاعر جنہیں امام حسینؑ سے لگاؤ ضرور تھا، لیکن جنگ کی ہمت نہ تھی، یا جیسے حضرت ام سلمیٰ آپ ضعیف العمر ہو چکی تھیں، انہیں غمگین کرنا مناسب نہ تھا، یا محمد حنفیہ جس وقت مکّہ میں دوسری مرتبہ امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں بیمار تھے، شاید اگر بیمار نہ ہوتے تو امام حسینؑ کے ہمراہ ہوتے۔ ان لوگوں کو امام حسینؑ نے دوسرے انداز میں جواب دیا ہے۔ اگر اس میں سخت جواب سننے کی طاقت نہیں ہے، تب بھی اسے اجمالی طور پر اپنے مقصد سے آگاہ کر دیا کہ جو خدا کی مرضی ہے وہی ہوگا، ہم نے اپنے کو ہر قسم کے حادثے

کے لیے تیار کرلیا ہے، اللہ اکبر ہے، اس طرح کے جوابات دیئے۔

لیکن جس شخص میں سننے کی طاقت موجود ہے، اور اسے بتانا ضروری ہے ہولیں حضرت نے نہایت واضح اور صریح الفاظ میں اپنے مقصد کو بیان فرمایا ہے، حتیٰ کہ جس وقت امام حسینؑ مکہ چھوڑ کر جا رہے تھے اور عبداللہ بن جعفر، مدینہ کے گورنر سعید بن عاد (ولید بن عتبہ کو امام حسینؑ سے بیعت لینے میں سستی کرنے کے جرم میں گورنری سے برطرف کرکے سعید بن عاد کو گورنر بنا دیا تھا) سے جو اس وقت مکہ میں موجود تھے، امان نامہ حاصل کرکے امام حسینؑ کی خدمت میں گورنر کے بھائی کے ہمراہ آئے ہیں اور امام حسینؑ سے درخواست کی ہے کہ آپ مکہ سے نہ جائیں، فی الحال یہیں پر سکونت اختیار کریں۔ اس مقام پر حضرت نے مکمل عزم کے ساتھ سخت لہجے میں گفتگو فرمائی کہ امان، خدا کی امان ہے خدا کی امان میں رہنے والے کو کسی غیر کے امان نامہ کی ضرورت نہیں، حتیٰ کہ جب آپ کربلا میں پہنچ چکے تھے اور ظاہراً چوتھی محرم کو عمر سعد کربلا میں وارد ہوا ہے، اس کے بعد چند دن تک عمر سعد اور امام حسینؑ کے درمیان گفتگو جاری رہی، عمر سعد، امام حسینؑ کے خیمہ میں آکر آپ سے گفتگو کرتا تھا، ایک گفتگو میں امام حسینؑ نے عمر سعد سے ایک جملہ کہا، پہلے آپ حالات کا جائزہ لے لیں کہ امام حسینؑ نے کس حالت میں یہ بات کہی ہے۔ امام حسینؑ وہ شخص ہیں جنہوں نے قیام کیا ہے اور اب اس میدان میں محاصرہ میں لئے جا چکے ہیں، ظاہری طور پر حالات یہ ہیں کہ حضرتؑ ستر بہتر افراد کے ہمراہ جن میں مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے سبھی شامل ہیں۔ میدان کربلا میں محاصرہ ہو چکے ہیں، ان کے چاروں طرف ہزاروں مسلح افراد کا نرغہ ہے جو چند ٹکوں کے بدلے انسانیت کا خون بہانے پر کمربستہ ہیں۔ وہی وحشی جانور، درندہ بھیڑیئے جن کے ہاتھوں میں نیزے بھی ہیں اور تلواریں بھی۔ اس قسم کے لوگوں نے امام حسینؑ کا محاصرہ کر رکھا ہے، معلوم ہے کہ ایسے حالات میں محاصرہ شدہ انسان کس انداز میں گفتگو کرتا ہے، ظاہری طور پر فاتح لشکر کا کمانڈر امام حسینؑ کے خیمے میں آتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان کس قسم کی گفتگو ہوگی۔ واضح ہے، ظاہراً تو ہونا یہ چاہئے کہ وہ امامؑ سے احتجاج کرے کہ حضرتؑ آپ یہاں کیوں آئے ہیں، حضرتؑ بھی جواب دیں کہ بھائی جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، لیکن اب کوئی راستہ نکلنا چاہئے، لیکن اس کے برعکس جب عمر سعد خیمہ میں آتا ہے تو آپ فرماتے ہیں:

"تم ہمارا ساتھ کیوں نہیں دیتے، ہماری تحریک میں شامل کیوں نہیں ہوتے۔"

وہ کہتا ہے:

"میرے بال بچے وہاں ہیں، میں پھنس جاؤں گا۔"

حضرت فرماتے ہیں:

"پھر چلے جاؤ ہم سے جنگ نہ کرو، ابن زیاد کی اطاعت نہ کرو۔"

وہ کہتا ہے:

"میں ڈرتا ہوں، ایسا نہیں کرسکتا، مجھ پر حملہ ہو جائے گا، میرا مال لٹ جائے گا۔"

حضرت اس پر اعتراض کرتے ہیں اور وہ عذر پیش کرتا ہے۔

بقیہ: کیپی چولیشن

پردہ ہٹانے کے ضمن میں عوام سے درخواست کی کہ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بھلا کر، غیروں کی غلامی سے نجات پاتے اور استقلال و آزادی کے لئے کوشش کریں۔ امام خمینی کی تاریخی تقریر اور اعلامیے کے بعد عوام میں شاہ اور اس کے گرگوں کے خلاف غیظ و غضب اور نفرت و بیزاری کی لہر دوڑ گئی۔

شاہی حکومت جسے اتنے سخت ردعمل کی قطعی امید نہ تھی بری طرح خوفزدہ ہوگئی، اسے یقین ہو گیا کہ بیدار ذہن و شجاع قائد کے ہوتے ہوئے نہ صرف "انقلاب سفید" کے سامراجی منصوبے اور امریکہ کے استعماری مفادات خطرے میں پڑ جائیں گے، بلکہ اس کا تاج و تخت و سلطنت بھی جاتی رہے گی، لہٰذا امام کو گرفتار و جلاوطن کرکے خود کو بچانے کی کوشش کی اور ہر مخالف آواز کا گلا گھونٹ دیا۔

۴ نومبر ۱۹۶۴ء (۱۳ / ابان ۱۳۴۳ ھ ش) کی شب میں سینکڑوں گوریلوں اور چھاتہ برداروں نے قم میں امام خمینی کے گھر پر حملہ کرکے آپ کو گرفتار کرلیا، اس کے بعد آپ کو ترکی جلاوطن کردیا گیا۔

سید محمد جواد ہادی، کوہاٹ، پاکستان۔

فلسفہ قیامِ حسینؑ بزبانِ حسینؑ

امام حسین علیہ السلام کے خونین اور جاوید قیام کے بارے میں اب تک بہت سے علماء، دانشور اور محققین نے نہایت ہی گراں مایہ تحقیقات کر کے حتی المقدور اس عظیم انقلاب کی حقیقت کو پیش کرنے کی مساعی جمیلہ کی ہیں۔ شاید ہی دنیا کی کسی تحریک اور قیام کے بارے میں اتنی کتابیں لکھی گئی ہوں یا تقریریں کی گئی ہوں جتنی کتابیں اب تک اس انقلابِ جاوید کے بارے میں لکھی گئی ہیں اور جتنی تقریریں حسینی انقلاب کے سلسلے میں کی گئی ہیں۔ تقریباً اس انقلاب کے ہر پہلو کے بارے میں اب تک سیر حاصل بحث و مباحثے اور تحقیقات ہو چکی ہیں اسی طرح انقلاب کے مخالف عناصر نے بھی عظیم انقلاب کو تباہ کرنے یا تحریف کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ۶۱ ہجری عصر عاشورا سے لے کر اب تک کیا کیا کوششیں حق اور انقلاب کے دشمنوں نے اس انقلاب کے درخشاں چہرہ کو چھپانے کے لئے نہ کیں لیکن

يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ
بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ
وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ

کے مصداق بن کر اس عظیم انقلاب کو دشمنوں کی ان ناکام کوششوں سے نہ صرف یہ کہ کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ روز بروز درخشاں سے درخشاں تر ہوتا رہا۔

ہمیں محققین اور دانشوروں کی تحقیقات اور نظریات سے ہٹ کر اس انقلاب کے فلسفہ اور مقصد کو بیان کرنا ہے۔ ہمیں اپنے محترم بھائیوں کے سامنے اس انقلاب کے فلسفہ کو انقلاب کے بانی یعنی مولا حسینؑ کی زبان گوہر بیان سے ہی پیش کرنا ہے۔ ہمیں فلسفہ انقلابِ حسینی خود امام حسینؑ ہی کی زبانِ مبارک سے اور ان ہی کے کلمات کی روشنی میں پیش کرنا ہے۔ دنیا کیا کہتی ہے؟ مفکرینِ عالم اس انقلاب کے مقصد کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ ہمیں ان سب باتوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے خود مولا حسینؑ اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں؟

سب سے پہلے ہم یہاں زندگی اور موت کے بارے میں مولا حسینؑ کے نظریہ کے بارے میں مختصر سی بحث کرنا چاہتے ہیں۔ موت اور زندگی کا مسئلہ جو زندگی کے تمام مسائل میں سب سے اہم مسئلہ ہے۔ زندگی اور موت کا مسئلہ جس کے حل ہونے سے دوسرے تمام مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں اور بیشک جس کے لئے موت اور زندگی کا مسئلہ حل نہیں ہو سکا وہ نہ صرف انقلاب برپا نہیں کر سکتا بلکہ اس کو انقلاب کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیئے۔ اگر کوئی انقلاب کے بارے میں سوچنا چاہتا ہے، اگر کوئی انقلابی بننا چاہتا ہے تو اس کو چاہیئے کہ پہلے موت اور زندگی کے مسئلہ کے بارے میں سوچے، غور کرے، اس لئے کہ انقلاب کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ کچھ افراد اپنی زندگیوں کو انقلاب کے لئے قربان کر دیں، اپنی زندگی کی راحت اور نعمتوں سے چشم پوشی کریں۔ ظاہر سی بات ہے کہ یہ قربانی صرف وہی لوگ دے سکتے ہیں جنہوں نے زندگی کا صحیح مفہوم سمجھ لیا ہو جنہوں نے زندگی کا فلسفہ پڑھا اور سمجھا ہو، لہٰذا مولا حسینؑ دنیا کے انقلاب پسند اور انقلاب خواہ انسانوں کو زندگی کا مفہوم سمجھانا چاہتے ہیں۔ وہ قول جو امام حسینؑ کی طرف منسوب ہے اگر یہ قول انہی کلمات اور الفاظ و مضمون سے حسینؑ سے صادر نہیں ہوا ہے تو گویا علماء اور دانشمندان نے حسینؑ کی سیرت اور عمل کو ان کلمات کی صورت میں پیش کیا ہے کہ حسینؑ زندگی کے بارے میں یہ نظریہ رکھتے تھے اور عملاً ہمیں بتا بھی دیا کہ زندگی کی حقیقت یہی ہے۔ فرماتے ہیں:

إِنَّمَا الْحَيَاةُ عَقِيدَةٌ وَجِهَادٌ

امام حسینؑ عملاً اور قولاً یہ اعلان فرماتے ہیں دیکھو اگر زندگی کی حقیقت سمجھنا چاہتے ہو تو زندگی کا مطلب اچھا کھانا، اچھا پہننا، اونچے اونچے بنگلوں میں رہنا اور لمبی لمبی کاروں میں پھرنا نہیں ہے بلکہ زندگی کا وسیع مفہوم صرف دو چیزوں میں ہی محدود ہے:

ایک عقیدہ، نظریہ، مقصد ہدف اور ——— دوسری چیز اس عقیدے اور نظریہ کا دفاع کرنا ہے۔ اس کو دنیا میں پھیلانے کے لئے جہاد کرنا، لڑنا اور مرنا۔

لہٰذا اگر کوئی شخص زندگی میں سب کچھ رکھنے کے باوجود عقیدہ، نظریہ اور مقصد سے تہی ہے تو وہ صحیح معنوں میں زندہ ہی نہیں ہے اور اگر کوئی نظریہ، مقصد اور عقیدہ رکھتا ہے لیکن اس کا دفاع نہیں کرتا، اس کو پھیلانے کے لئے جہاد نہیں کرتا، اس کے لئے لڑتا اور مرتا نہیں وہ بھی نیم مردہ ہے، وہ بھی زندہ نہیں ہے لہٰذا سمجھ لو اے دنیا والو، کہ زندگی صرف عقیدہ اور جہاد کا نام ہے، اس راستے اور اس مقصد کے لئے مرنا ہی زندگی ہے۔ جس طرح سے مولا علیؑ نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں:

الحیاۃ فی موتکم قاھرین والموت
فی حیاتکم مقھورین۔

سن لو اے زندگی کے پرستارو اور ہمیشہ زندہ رہنے کی تمنا کرنے والو، زندگی یہ نہیں ہے کہ انسان طولانی عمر کرے، بہت عرصہ تک دنیا میں پھرتا رہے بلکہ حقیقی حیات اور زندگی یہ ہے کہ مر جائے لیکن کسی جابر و ظالم طاقت کے سامنے سر خم نہ کرے، مرنا قبول کرے مگر ذلت قبول نہ کرے۔ اور موت یہ نہیں ہے کہ اس دنیا سے اٹھ جائے، اس دنیا سے چلا جائے، بلکہ یہ تو حقیقی زندگی کا آغاز ہے۔ موت یہ ہے کہ ذلت و خواری کے عالم میں زندگی بسر کرے، ظالم اور جابر طاقت کے سامنے سر جھکائے۔ یہ موت ہے اور بدترین موت۔ پس مولا حسینؑ جنہوں نے مولا علیؑ کے دامن میں پرورش پائی ہے، ہمیں موت اور زندگی کا درس دیتے ہوئے قولاً اور عملاً بتا دیتے ہیں کہ ہم سر کٹا سکتے ہیں لیکن سر جھکا نہیں سکتے۔

مرگ سرخ بہتر از زندگی ننگین است
این درس را آموختہ بما حسینؑ ابن علیؑ است

حسینؑ اگر چاہتے تو یزیدؑ کی بیعت کرکے زندگی کی ہر نعمت سے بہرہ مند ہو سکتے تھے۔ بہت سارا مال و دولت، جائیداد، ظاہری عزت حتیٰ کہ حکومت میں حصہ بھی مل سکتا تھا، مگر حسینؑ اس زندگی کو زندگی نہیں سمجھتے، اسے موت بلکہ موت سے بھی بدتر سمجھتے ہیں، لہٰذا آنے والی نسلوں کو انقلاب کا پیام دینے اور انسانوں کو زندگی کا مقصد سمجھانے کی خاطر ان چیزوں کو جنہیں دنیا والے زندگی اور عزت سمجھتے ہیں ٹھکرا کر زندگی کا حقیقی تصور پیش کیا۔ لہٰذا امامؑ نے اس زندگی کو ذلت سمجھ کر فرمایا:

ھیھات منا الذلۃ

ارے حسینؑ اور ذلت کی زندگی —! یہ کیسے ممکن ہے، ظلم و ظالم کے سامنے سر جھکا کر زندہ رہوں، یہ تو ذلت ہے۔ یہ تو وہی موت ہے جس سے حسینؑ دور رہنا چاہتے ہیں —

ھیھات منا الذلۃ! ھیھات منا الذلۃ!

حسینؑ ذلت کی زندگی برداشت نہیں کر سکتے — لہٰذا امامؑ نے بیعت یزید اور اس کے نتیجے میں ملنے والی زندگی اور نعمتوں کو ٹھکرا کر فرمایا۔

لا اری الموت الا سعادۃ ولا الحیات
مع الظالمین الا برما

یہ موت جو مجھے نظریہ اور عقیدے سے دفاع کرنے کے نتیجے میں نصیب ہوگی اور جو یزید کی بیعت نہ کرنے کی سزا ہوگی یہ سعادت اور خوش بختی ہے۔ ظالموں کے ظلم کو دیکھتے رہنا اور تماشائی بن کر رہنا ہی باعث ذلت و ملامت ہے۔ میں سعادت کو کیوں اختیار نہ کروں۔

حسینؑ نے اپنے کردار سے دنیا کے حریت پسند اور عزت و سعادت طلب انسانوں کو ایک پیغام دیا اور سب کو بتا دیا کہ دیکھو قیام قیامت تک حق و باطل، عزت و ذلت، موت و زندگی کی جنگ جاری رہے گی دیکھنا کبھی دھوکے میں نہ آنا، دیکھو کبھی اپنے اصول اور نظریات سے دنیا کی دو روزہ زندگی کی خاطر دست بردار نہ ہونا۔ کبھی چند دن اور زندہ رہنے کی خاطر حق اور حقیقت کی پامالی کو برداشت نہ کرنا۔ دیکھو میں جو کچھ کر رہا ہوں یہ ایک ابدی تحریک ہے اور جاوید انقلاب کا آغاز ہے، جب بھی تمہیں ایسے مراحل سے گزرنا پڑے تو میری راہ اختیار کرنا۔ اے میرے ماننے والو — اے آنے والی نسلو میں جو کچھ کر رہا ہوں — یہ حسینؑ ابن علیؑ اور یزید لع بن معاویہ لع کے درمیان کوئی ذاتی اور شخصی معاملہ نہیں ہے، یہ نظریے کی جنگ ہے۔ یہ حق و باطل کا مقابلہ ہے — اے حق کے طرفدارو، میرا ایک پیغام سنو، میرا اصول دیکھو، میرا یہ اصول ہمیشہ کے لئے ذہن نشین کر لو کہ —

مثلی لا یبایع مثل یزید لع

جو بھی میرا ماننے والا ہے — جو بھی حریت، عزت، سعادت اور کرامت انسانی پر عقیدہ رکھتا ہے۔ جو بھی حق کا پیرو ہے — جو بھی حق کا مدافع ہے، کسی وقت بھی اور تاریخ کے کسی مرحلہ میں اور دنیا کے کسی گوشہ میں بھی اگر ان کو مجھ جیسے مراحل اور آزمائش و امتحان سے گزرنا پڑے تو میرا یہ نعرہ ہمیشہ یاد رکھے کہ جو بھی مجھ جیسا ہوگا وہ یزید جیسے کی بیعت نہیں کرے گا وہ مرے گا، کٹے گا لیکن جھکے گا نہیں۔

پیغام ملا ہے یہ حسینؑ ابن علیؑ سے
عزت کی موت بہتر ذلت کی زندگی سے

اب کسی حد تک زندگی کا مفہوم اور راز ہمیں مولا حسینؑ کی زبان سے معلوم ہوا، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ حسینؑ نے یہ موت و زندگی کا کٹھن اور دشوار مسئلہ کس طرح سے حل کرکے دنیا کے انقلاب پسند انسانوں کو ایک مفید درس دیا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ حسینؑ نے اپنے

(باقی آئندہ)

The object of deputation of the Prophet

All are fully aware that the object of the deputation of the Prophets particularly of Mohammad son of Abdullah (Shouts of Salawath from the gathering)

The Salawath should be called out loudly It is the tradition of the commons that the learned people amongst them do not weep nor call out Salawath? I usually address the institutions of the writers annually and this respectable audience is a witness to the fact that they call out Salawath loudly (Vociferous Salawath from the gathering)

To quote psalm 2 of Sura Jum aa He is the same God who amongst those ignorant people deputed one of them who recites before them His psalms, purifies them and teaches them the things of reason and learning

The duty of the Prophet of Islam is the purification of the conscience and this is incumbent before the teachings of the commandments to awaken the hearts then to enlighten them with the natural light and to purge the pages of their conscience from the polythiestic pollution and purify them of the filth of vaindesires and then teach them because if a polluted one acquires the knowledge it will be like a sword in the hands of an ebrietous negro Hence the primal importance is to the purification of soul and this very purification of soul and the reconciliation of heart is the object of the deputation of the Prophet

Purity and cleanliness is the foundation of Islam The renowned saying that Islam is based on cleanliness is to be interpreted in such a way that the cleanliness should be meant extensively The cleanliness does not mean only that of the body but also of the heart and brain They should all be purified

The foundation of Islam is this very purification The first proclamation of Islam is the Unity of God i e there is no god but Allah Before establishing the Unity of God in mind it is necessary to wipe off the polytheistic notions from the heart and cleanse it of polytheistic pollution Thus the first base of religion rests on purity i e the purification of the polytheism after which when we ponder over the ethical excellences can we expect one to be adorned with the ethical excellences without first getting rid of the ethical aberrations vulgarities and the perverse habits in which one had been indulgent? Never!

A person was asked to take part in the crusade in the Prophet's leadership He replied that if he ventured to go he would not be able to overcome his weakness for the pretty women and would not be able to control himself therefore he declined to go

A group of the hypocrites and three of the faithful [1] broke their promise to join the Jehad and these three who remained behind were dealt with harshly till the psalm 118 of Sura Tauba revealed itself The land inspite of so much extent became narrow for them", meaning that in this very incident all who avoided the crusade one of them apologised When the Prophet was about to set out these were apologising What is this? Is this the excuse? Can this man become a crusader? Evidently, he cannot unless he purifies himself ethically he cannot attain the heights of ethics

(1) The story of these three persons who refrained themselves from participating in the Jehad with the prophet is described in Sura Tauba A group of the hypocrites put up an excuse but these three persons of the faithful were men of insight never was the hypocrisy observed in them and they were Kaab bin Maalik, Murara bin Rabi and Hilaa ibne Umaiyya

The rituals of the prayer too are similar If you peruse the religious books you will first find the discussions about the purification ablution, bath and cleaning by dust and then the prayer devotion etc rather it can be said that our prayer itself is purification and cleanliness There s one sermon of Ali A S based on prayer in Nehjul Balaagha He says in it that the Prophet has given prayer the resemblance with a hot water fountain If anyone bathes and laves himself in it five times daily no filth and pollution can remain on his body This is infact the condition of the prayer and similarly the fasting is also a purgative In the financial matters too unless the rights of the destitutes are separated one cannot spend from his wealth The word Zakaath means purgation and purification etc

Hence the motto Islam is based on purification is applicable on every stage In the matters of belief ethics religious observances rather on all stages of individual and communal life this principle holds good

Dont oblivionise the object

The Prophet came for the purification of the soul and this very is the object of the prophet hood Before the teachings of Quran and the commandments he commences his task with the purification of the souls To quote Quaran To purify their souls and then teach them the Book and the wise things' This infact is the object of the deputation of the Prophet Hence every tradition every saying every introduction, every good tidings every reward and desirable thing which is consistent with this object is correct and contrary to this is incorrect

The Prophet came for the purification of the soul hence all the obligatory and desirable deeds which the adherents of the Prophet observe should be ancillory and accessory to this object and if opposed to it they are wrong and there is loophole for doubt in it

What should I say to the people regarding the intercession the pilgrimage and the lamentation? When I want to make the people eager for the pilgrimage to the holy tombs and make them hopeful of the intercession or preach for the lamentation on Husain A S. and make clear to them the necessity of the revival of the object by Mohammad's progeny I stress upon them that if these deeds were efficacious for the purification of their souls then they were all good rather they were the object of the prophethood but when it was not so then there was a doubt and whatever we have understood was not correct, and therefore binding on us to review our imaginations and outlook For it can never be that the Prophet came for the purity of soul and after him Husain A S (God forbid) came to promulgate spurious actions Are such conceptions right? Was that great Imam martyred to make the people bold and impudent in commitment of sins, holding a mourning congregation once a week and then have license for the commitment of what ever sin is desired? To visit Karbala and return to indulge in all intended wrongs Speak truthfully does the sound reason accept these things or will you all admit that this is all contary to the object of the deputation of the Prophet?

1. Amirul Momineen (A S) said · The best traits of women are those which are the worst traits of men, namely : vanity, cowardice and miserliness Thus since the woman is vain she would not allow anyone access to herself ; since she is miserly she would preserve her own property and the property of her husband, and since she is weak-hearted she would be frightened with everything that befalls her

۱ عورتوں کی بہترین خصلتیں وہ ہیں۔ جو مردوں کی بدترین صفتیں ہیں۔ غرور، بزدلی اور کنجوسی
اس لیے کہ عورت جب مغرور ہوگی، تو وہ کسی کو اپنے نفس پر قابو نہ دے گی اور کنجوس ہوگی، تو اپنے اور شوہر کے مال
کی حفاظت کرے گی اور بزدل ہوگی، تو وہ ہر اس چیز
سے ڈرے گی جو اُسے پیش آئے گی۔

of Shabaan is the birthday of Imam A S according to what generally is observed, and on that very day Husain A S entered Mecca

Towards Mecca

The third of Shabaan is a date on which Imam A S was born and it is the one on which he entered Mecca i e the date which marks the commencement of his fruitful and consequential activity which shall remain fresh up to the day of judgement Why I prefer the date of his entry in Mecca to the date of departure from Medina is for the reason that the departure from Medina was for the object that he should start his work in the shelter of God and remain free from swearing the allegiance He had not yet started his tussle and had departed from there without swearing the allegiance As soon as he entered Mecca he started his struggle inorder to enlighten the minds and brains of the people because from the date of the martyrdom of his father and particularly after the relinquishment of his brother Imam Hasan A S Muawiya on the strength of his absolute power and particularly for his hostility with Ali A S had been engaged in deliberate tampering of the principles and the tenets of Islam

Socrates had said while in prison that for twenty years he had been calumniated and if the defence on his part was stressed upon he should also be given a period of twenty years A single and lonely prisoner could not refute in twenty minutes the calumny continued for twenty years Such defence and vindication could not be successful and effective

But notice how the son of the Prophet ... done the ... in so short a time

The wails and lamentations were not the sole object

It was a time when it used to be very hideous ... excepting the top learned men of religion the preachers and the ... some individuals used to pass ... sacrilege and blasphemy on anything which was contradictory to the traditional observances They protested against ... but ... the thoughts and reflections are free ... enlightened persons preaching on the pulpit ... in the minds of people not to lower the object of Imam Husain A S as to make it dependent ... Twenty years ago such expression ... but it is my good fortune that my audience ... learned and reasonable men who have acquired ... learnings They are not the ... argumentative In ... the object of Husain A S should not be lowered so much

Though in connection with the ... some one questions whether one should weep for Husain A S or not These two matters are jumbled up either by the selfish persons or the extremely ignorant individuals

I offer the witness of all these persons who constitute this assembly who have been fully familiar with my speeches that recollecting the torturing pains and afflictions of Imam Husain A S I am my self much moved more than anybody else and become helpless in suppressing my tears I cannot peruse the annals of martyrdom since my condition undergoes a change I can never oppose the lachrymation nor God forbid I can prohibit people from weeping and wailing rather I say that the eye which sheds not for Husain A S and the heart which is not struck with pain are not the human eye and heart but this is quite different from the fact that Husain A S was martyred only for the absolution of some people from a future age to assemble and weep for him

The Salvation from the sins

2

For years the preachers and the learned men of Islam have been indulging in disputation with the Christianity and the books of this disputation of the Musalmans with the Christians are fully based upon this fact that it was only a fabricated fiction regarding Jesus Christ that the Great God sent His son for being sacrificed for redemption of the people from their burden of sins and carnation To express this denial is painful for such Muslims who oppose this belief and consider it as nonsense They are the followers of the same book which says One who does wrong shall suffer for it (Sura Nisa psalm 123) Whosoever will do the slightest good shall be rewarded for it and even the slightest wrong one does, shall he see it (Sura Zilzal psl 897) The man has no other thing for himself save what he strives for (Sura An Najm psl 39)

The heavenly Book which always commands for meditation and reasoning which gives great importance and value to reason as compared to other religions and laws it does not become for the followers of that Book to say that Hussain A S came and was martyred, after whom some people assembled to wail and lament for him, and those who wept for him were absolved of all their sins

Three kinds of Sins

Husain A S s venerable father said on the pulpit There are three kinds of sins and outrages One is an outrage which cannot be pardoned, the second is one which cannot be abondoned without being avenged, and the third outrage is that which is forgiven gratis

There are three kinds of sins The first kind is of a sin which will never be forgiven and it is to believe in some component and the sharer of God, and there is the sin which cannot be pardoned on be... ing for it and on renunciation

The tyranny on fellow beings has extreme penalty It is not the wound that can be easily cured or avenged by walloping Those who commit cruelty against a creature of God are not susceptible to redemtion unless they are punished for it not to say of the whipping daggering or wounding the body punishment for cruelty on others is more severe than ... and wounding hence what Hazrat Amir ul momineen A.S has said is quite correct and what is reported to have been said by Imam Jafer Sadiq A S that even the sins equal to the number of sand particles in the desert, of commitment of cruelty on fellow beings shall be pardoned in lieu of his weeping for Husain A S can not be correct Supposing you are a professional and spent the whole of your life in cutting the ears of the people or an officers of some department and spent your life in collecting bribes from the people or a holder of authority and power spending whole of life in hammering the heads of the people harming them by your tongue hands pen and practice put to miseries and afflictions by you and thousands of Shias of Husain A S being maltreated by you for losses and ruins then would your sheer shedding of tears absolve your sin O elders is this sane?

At this juncture it is necessary for us to find out which of the sins are exculpable

Ali A S has himself said A self rending outrage is an outrage against one's self The man s commitment of sin for his person is an insignificant matter (a minor sin)

Certainly these subjects are such which are to be discussed on the Aashoora (10th Moharrum) and today happens to be the night of the genesis This night is for rejoicings and delight and this topic is not in keeping with it but before my arriving at the real topic I would like to place this thing before the elderly learned men men who are bound to convey these discussions to the vision and audience of the people, I mean the realities of the religion

WHY HUSAIN TOOK STAND

In the name of Allah Merciful and Kind

To quote Quran All those that have been martyred in the cause of Allah never consider them dead, rather they are alive and get their varied subsistence from their Sustainer!

To quote three couplets by Husain A S -

I am a head of the entire world due to my ethical elegance and courage The light of guidance secured the glowing resplendence from my sense and wisdom even in the gloom!

The denier, wanted to extinguish this light but the God willed not but to raise its splendour to extreme!

May Almighty by the grace of the Chief of the Martyrs Husain make this auspicious festival felicitous to all the Shias and particularly to the respected audience of this congregation O Allah! count us all among the friends of Abi Abdullah il Husain A S !

The Two kinds of Life and Death

There is one birth and one death for every individual rather for every living being the natural birth and the natural death, but for the great personalities there happen to be two lives and two deaths

Even the great personalities have one birth like others, in the sense that they too are born to their mothers like others and similarly they too face one death when the soul parts from the tegument of the body This birth and death are natural physical and general

But they have a particular birth as well which starts on the time when that great person commences his fruitful consequential and active practical life a life which impregnate the people with the impressions of its practical values This very is the second birth On account of the all surrounding personality of the man his spiritual greatness and the significance of his activity this life varies in duration and extent One person leaves his impressions in some limited bounds and these impressions sustain only to a time limit and then are obliterated in this the death of that person occurs There is yet another person whose fruitful and beneficial activity prevails upon the entire ecumene and no assessment of his all surrounding existence is possible nor can any extent to it be defined It breaks all the limitations and thus his death is either prolonged or does not occur at all So long the world remains he too lives

(The speech given by Hon ble Prof Aqai Shariathi in the Kanoon e Nashr–e Haqaiq e Islami Mashad on 3rd Shaban, 138?H) On the auspicious occasion of the celebration of the Birthday of Husain A S son of Ali A S the leader of the liberals

The Savants of Religion are alive

According to Quran The real savants or the learned men o religion and the sages never die

On that night when Ali A S. grasping the hand of Kumail A R led him to the cemetry and there he dilated the points on the excellence of learning, and summing them up said

The learning is such a religion which is acquired by the men It is through the learning alone that a man can subjugate others in life and gets fame and renown after death "

Those who amass wealth are dead in the very life but the learned are alive till the existence of the world Alth[illegible] they rise from the midst their memory their name the[illegible] and the reflection of their dignified souls remain [illegible] the hearts of the people "

Never think the Martyrs to be dead

You have read what the Chief of the Faithful said about the learned that they never die

The Quran says Dont think that the Martyrs in the cause of God are dead They are eternally alive ! "

Husain A S is alive eternally and exists

Husain A S has attained perpetual life by two angles of view The first reason is that he is a learned man and so long remains the world shall the learned men remain! The second reason is that he is a martyr in the cause of God and is the Chief of all those that have sacrificed their lives in the cause of religion and freedom

Although there is not a single individual in this gathering who would make such statements, I am placing these subjects before the youth for if they happen to confront such insipid discussions they might be able to respond them It is not my aim to lay such intangible meanings with which the audience happens to be unfamiliar

The Meaning of Freedom

There are two meanings of Freedom, the one which the politicians construe Let them what they mean but those who are good shall interpret it in a good manner while those who are bad shall do it so But the meaning of the freedom deduced by the righteous persons is the freedom which is in accordance with the Quran, for which the Prophets were deputed

"*Sura l' raf 157* 'And he removes from them the burden laid on theirs backs and the meshes entangling them '

The Prophetic advent has been to redeem the man from the shackles of disbelief and the chains of whims and vagaries binding their minds and brains and to relieve them from the heavy burden of sin, infidelity and misguidance In this way the Prophets have come to save the people from the miseries of the world and its damnation

To quote Quranic invocation "Relieve my nape from the hell-fire, i e the freedom of man from the devilish thoughts from the tangles of wishes and vaindesire, from the snares of Satan,from the fire of hell, and from the wretchedness and helplessness in the hereafter This actually is the meaning of freedom

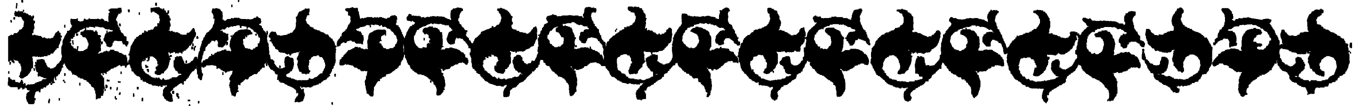
The Martyr for Freedom

When we say that Husain A S. is the martyr for freedom it means this very freedom which we have explained above

An Egyptian writer Abdur Rahman Ash Shargadi has written a very good book "Mohammad Rasool ul Hurriyeh (Mohmmad the Prophet of freedom)

Imam Husain A S. is the martyr in the cause of religion and also of freedom It is not only for Shias to pride on the name of Husain but it is becoming that all the lovers of freedom should feel proud of him

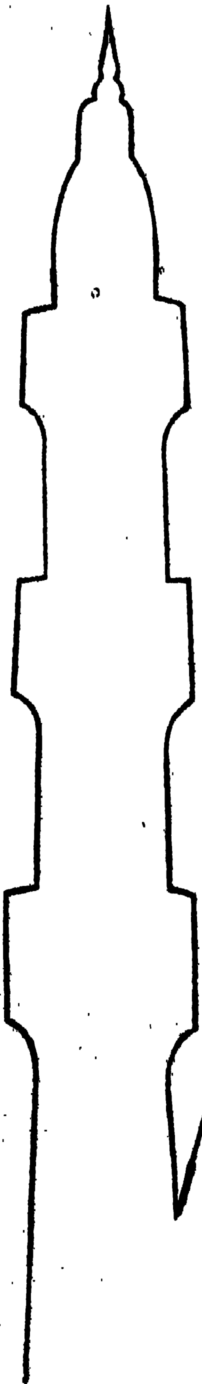
It is accidental that both the births of Husain have occurred on the same day It is amazing indeed that the third



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

۱۲۱





وما ارسلنٰک الا کافۃ للناس بشیرا ونذیرا ولکن اکثر الناس لا یعلمون

ہفتہ وار

بشیر و نذیر

مدیر

سید علی عباس موسوی



ترتیب:

۱۔ اداریہ — مدیر ۱

۲۔ سیاسیات — ۲

۳۔ سوالات و اطلاعات

۴۔ ... قرآن ... (لوحہ)

۵۔ ... ایت اللہ ... (لوحہ)

۶۔ قومی یکجہتی ... ۹

۷۔ ... ۲۰

۸۔ ہمارے شہر میں

گورنر ... کو ... یاد ...

۹۔ ...

15

مورخہ ۱۸ جولائی ۱۹۸۸ء

...

... 822 6 19 ...

...

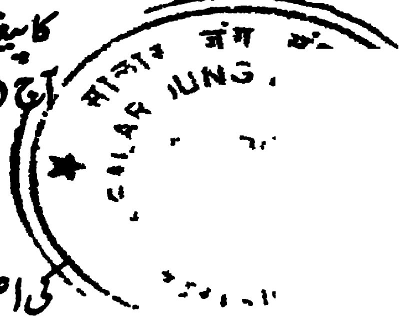
ٹیلیفون 253877 253392

ٹیلکس 425 6603-TTI

47283 20/5 AL 88 TC

ساری تعریف اللہ کیلئے اور محمدؐ و آلِ محمدؐ پر درود و سلام





عرصہ دراز سے یہ تمنا تھی کہ قلم کے ذریعہ سچائی' مساوات اور انصاف کا پیغام عام کرنے کی سعی کی جائے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ تمنا آج (بشیر و نذیر) کی صورت میں پیش ہو رہی ہے۔

"گر قبول افتد زہے عزو شرف"

اسلام کا مقصد انسانیت کی گود میں سچائی' مساوات اور انصاف کی اعلیٰ اقدار کی پرورش کرنا' افراد کے لئے اصلاحی و فلاحی اقدامات کو عام کرنا' فرد اور قوم کی زندگی کو سنوارنا اور ایسے معاشرہ کی تشکیل دینا ہے۔ جہاں انسانیت اور بھائی چارگی کا جذبہ عام ہو اور انسان بندۂ خدا بن جائے تاکہ دوسروں کی غلامی اور برتری کے بوجھ سے نجات پالے پھر احکامِ۔۔۔ خداوندی اور سیرت رسولؐ و ائمہ طاہرین کی روشنی میں حق و صداقت کے راستے پر ایسے گامزن ہو کہ بڑی سے بڑی آزمائشوں پر بھی اُس کے قدم میں لرزش نہو۔

آج بظاہر سائنسی ترقی سے انسانی زندگی سہولتوں اور آسائشوں کا گہوارہ بن گئی ہے۔ مگر پھر بھی ساری انسانیت سکون کی متلاشی ہے۔ عارضی سکون ہی کے لئے بھٹکتی ہوئی انسانیت کے سامنے اس پیغام کو پیش کرنے کی ضرورت ہے جو سچائی' مساوات اور انصاف' کی اعلیٰ اقدار کا مظہر ہے۔ اور جو انسان میں بیداری حرکت اور احساس خود اعتمادی پیدا کرے اور اسے سکون مہیا کرے۔

ظہور امام ہشتم امام ضامن و ثامن حضرت امام موسیٰ رضا علیہ السلام کے اس مبارک مہینہ میں" بشیر و نذیر" کا یہ پہلا شمارہ منظر عام پر آرہا ہے۔ ہفتہ وار کا نام رسول مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے صفات کے آئینہ دار قرآنی ارشاد پر مبنی ہے۔

انشاء اللہ تعالیٰ" بشیر و نذیر" کے آئندہ شماروں کے لئے یہ کوشش ہوگی کہ محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام' قرآن' نہج البلاغہ' قومی یکجہتی' اقلیتی مسائل اور بین الاقوامی حالات پر مشتمل ایسے مضامین پیش کئے جائیں جو سچائی' مساوات اور انصاف کے نقیب ہوں امید ہے کہ قارئین محترم مفید تنقید و تبصرہ کے ساتھ ساتھ متذکرہ عنوانات پر مضامین بشیر و نذیر کے لئے لکھکر اپنے قلم سے حمایت حق کا کام انجام دینگے اور ادارہ کی ہمت افزائی کرینگے۔

شہید آیت اللہ بہشتی
ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

حج اور قرآن

حج اور مکۂ معظمہ و مدینۂ منورہ میں موسم حج کا عظیم اجتماع عالم اسلام کا اہم ترین اجتماع ہے۔ اس اجتماع کی اہمیت و جاذبیت نے بہت سے اسلامی محققین کو تحقیق و تحریر، بحث و گفتگو کے لئے اپنی جانب متوجہ کیا ہے: کیوں کہ حج کی یہ اجتماعی عبادت ہر دور میں اہل نظر کو انفرادی و اجتماعی طور پر دعوت فکر و نظر دیتی رہی ہے۔

یہ تحریر اس عہد کے سماج اور معاشرہ پر ان کی گہری نگاہ اور کامل بصیرت کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ برسوں بعد آج بھی اس مضمون میں ان کے افکار و ارشادات کی تازگی محسوس کی جاسکتی ہے۔

آیات حج کا ترجمہ

حج و عمرہ کو خدا کی رضا اور اس کی خاطر بجا لاؤ۔ لیکن اگر اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں تمہارے سامنے کوئی رکاوٹ آجائے تو اتنا ہی کافی ہے کہ اپنی جگہ پر۔ تا حد امکان قربانی کا فریضہ انجام دو (اور احرام کھول دو تاکہ تمہارا حج اسی منزل پر تمام ہو جائے) اور (اگر تم حج کو جاری رکھے ہوئے ہو تو) اس وقت تک اپنے بال نہ تراشو جب تک تمہاری قربانی اپنی منزل تک نہ پہنچ جائے (اور قربانی سے پہلے اپنے ——— سر کے بال نہ تراشو) لیکن اگر کوئی شخص بیمار ہے یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہے تو اسے چھوٹ ہے کہ وہ سر تراشے اور) اس کے بدلے میں روزہ، صدقہ یا قربانی کی صورت میں کفارہ ادا کر دے (ان دنوں کا کفارہ جن میں تم امن و سکون سے رہ رہے ہو) لیکن اگر ممکن ہو تو حج کو مکمل کرو۔ جو شخص حج کو حج تمتع کی شکل میں بجا لا رہا ہے یعنی عمرہ بجا لا رہا ہے۔ ساتھ ہی چاہتا ہے کہ اسے حج سے بھی ملا دے تو اگر اسے میسر ہو تو ایک قربانی حج کے لئے بھی رکھ چھوڑے اور اگر اس کے پاس قربانی کا جانور نہیں ہے (مل نہیں رہا ہے یا وہ خرید نہیں سکتا) تو وہ تین روز حج کے درمیان اور سات روز جب وہ اپنے گھر واپس ہو۔ کل ملا کر کامل دس روز روزے رکھے۔ یہ حکم (فطری طور سے) اس شخص کے لئے ہے جس کا گھر مسجد حرام کے قریب نہ ہو (اور وہ اس علاقہ کا رہنے والا یا اہل مکہ میں سے نہ ہو) خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ خدا کا عذاب شدید اور سخت ہے۔

حج، معین مہینوں سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا جو شخص حج کا ارادہ کرے وہ جان لے کہ جنسی استفادہ، جھوٹ، فسق و فجور، گناہ، مجادلہ (یا قسم کھانا) حج میں منع ہے اور ہر وہ نیک کام جو تم انجام دیتے ہو خدا سے جانتا ہے۔ زاد سفر مہیا کرو کہ بہترین زاد سفر تقویٰ ہے اور اے صاحبان فہم و خرد میرا تقویٰ اختیار کرو۔

اگر تم حج کے سفر میں اپنے پروردگار کی بخشش اور عطا کی جستجو میں بھی رہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (مراسم حج میں) جب تم عرفات سے چل کر مشعر الحرام کے نزدیک پہنچو تو خدا کو یاد کرو (اور ذکر خدا میں مشغول ہو جاؤ) خدا کو یاد کرتے رہو جس طرح خدا نے تمہاری ہدایت فرمائی جبکہ تم اس سے پہلے گمراہ تھے۔

(اس کے علاوہ تم) وہاں سے جس جگہ سے تمام افراد روانہ ہوتے ہیں (منیٰ کی طرف) چل پڑو اور خدا سے اپنے گناہوں کے سلسلہ میں مغفرت کی دعا کرو کیونکہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

اور جب تم حج کے تمام اعمال انجام دے لو تو اپنے خدا کو اس طرح یاد کرو جیسے تم اپنے آباء و اجداد کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بڑھ کر اپنے خدا کو یاد کرو۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اے میرے خدا ہمیں اسی دنیا میں تمام چیزیں یا نعمتیں عنایت فرما دے (یعنی ہم جزا کے طور پر اپنا حصہ اسی دنیا میں چاہتے ہیں) یہ وہ لوگ ہیں جو آخرت میں اپنا کوئی حصہ نہیں رکھتے۔

لیکن ایک دوسرا گروہ بھی ہے جو یہ دعا کرتا ہے کہ: خدایا دنیا میں بھی ہمیں بہتر زندگی عطا فرما اور آخرت میں بھی اپنے الطاف سے محروم نہ رکھ اور ہمیں دوزخ (اور عذاب آتش) سے محفوظ رکھ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کچھ انہوں نے خود سے حاصل کیا ہے اس سے بھی بیش قیمت حصہ پائیں گے اور خدا بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔ (ان مراسم کی انجام دہی کے بعد) بھی مخصوص دنوں میں خدا کی یاد میں مشغول رہو۔ اگر کوئی شخص جلدی کر بیٹھے اور دو ہی روز میں (منیٰ سے مکہ کی طرف پلٹ آئے) تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور اگر کوئی تیسرے دن ٹھہر رہے اور تاخیر سے آئے جبکہ تقویٰ و پرہیزگاری اس کے پیش نظر رہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں اور جان لو کہ تم سب اسی (خدا) کی جانب پلٹائے جاؤ گے۔

ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور ہاجرہؑ

یہ سورہ بقرہ کی ۱۹۶ سے ۲۰۳ آیتوں کا ترجمہ تھا جس میں کہیں کہیں مختصر توضیح بھی کی گئی ہے جو حضرات حج سے مشرف ہو چکے ہیں یا مناسک حج سے واقفیت رکھتے ہیں وہ ان آیتوں سے ایک حد تک آشنا ہیں لیکن جو افراد اس سلسلہ میں معلومات نہیں رکھتے انھیں ان آیتوں کے سمجھنے میں کافی وضاحت کی ضرورت ہوگی۔ قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جناب ابراہیمؑ خدا کے حکم سے جناب اسماعیلؑ اور جناب ہاجرہ کو فلسطین میں واقع اپنے گھر سے لیکر نکلے۔ جناب ابراہیمؑ کا واقعہ جسے آپ بارہا سن چکے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے "سارا" نام کی خاتون سے شادی کی لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔ اس زمانہ میں چونکہ اس معاشرہ میں اولاد اور خصوصاً اولاد نرینہ کی بڑی اہمیت تھی جیسا کہ آج بھی ہمارے موجودہ معاشرہ میں خاندانی روابط کے استحکام میں اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ جناب سارا نے غور کیا کہ میں تو بہر حال صاحب اولاد نہ ہو سکوں گی لہٰذا اپنی کنیز کو جس کا نام "ہاجرہ" تھا اپنے شوہر ابراہیمؑ سے بیاہ دوں تاکہ اس کے ذریعہ ابراہیم کی ذریت پروان چڑھے۔ "ہاجرہ" سے جناب ابراہیمؑ کے یہاں ایک فرزند متولد ہوا جس کا نام اسماعیلؑ رکھا گیا۔ چنانچہ فطرتاً بچہ کی پیدائش کے بعد "سارا" اور "ہاجرہ" کے انداز میں فرق آگیا۔ اب وہ پہلے جیسی بات نہ تھی۔ پہلے ہاجرہ ایک خادمہ کی حیثیت سے اس گھر میں رہتی تھیں اور اب زوجہ کی حیثیت سے اپنے شوہر کے گھر میں رہ رہی تھیں اور وہ بھی ایک فضیلت و امتیاز کے ساتھ یعنی صاحب اولاد بیوی اور بیٹے کی ماں ہونے کی حیثیت سے۔ لہٰذا "سارا" کو احساس ہوتا تھا کہ ہاجرہ اب پہلے جیسی نہیں رہیں۔ رفتہ رفتہ سارا کے لئے ہاجرہ کا وجود ناقابل برداشت ہوتا گیا۔ یہ ایک ایسی نفسیاتی بیماری اور اذیت ہے جسے کم ہی خواتین برداشت کر پاتی ہیں۔

جب ابراہیمؑ نے یہ دیکھا کہ ہاجرہ اور اسماعیل کا یہاں رہنا ان کی گھریلو زندگی کے سکون و آرام کو درہم و برہم کر دے گا۔ تو آپ اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے لگے اور قرآن کریم کے مطابق، خداوند عالم نے انھیں یہ حکم دیا کہ اسماعیل اور ہاجرہ کو ہمیشہ کے لئے سرزمین فلسطین سے دور کہیں اور پہنچا آئیں۔

یہاں توریت میں ایک ایسے علاقہ کا نام ذکر کیا گیا ہے، جس کی تعیین میں جغرافیائی اعتبار سے بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن ہمیں اس وقت توریت سے سروکار نہیں ہے۔ قرآن کریم کی آیات سے جو بات معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ جناب ابراہیمؑ، اسماعیل و ہاجرہ کو مکہ کی سرزمین پر لے کر آئے۔ اس وقت وہاں چند بدو عرب خانوادے ایک مختصری آبادی کی صورت میں رہ رہے تھے۔ مگر اس وقت نہ تو ایک ³ کی صورت میں آباد تھا اور نہ ایک اچھی خاصی آبادی کی کوئی شکل ہی تھی۔ کیونکہ وہاں زندگی کے امکانات بہت ہی محدود تھے۔ آج بھی شہر مکہ، حجاز کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں بے آب و گیاہ، اجاڑ اور خشک شہر ہے۔ اگرچہ گذشتہ چند برسوں میں اسکی حالت قدرے سدھر گئی ہے۔ اس کے باوجود اگر مدینہ سے اس کا موازنہ کیا جائے تو مکہ ایک بے آب و گیاہ خشک شہر نظر آئے گا۔ اگرچہ مسجد حرام سے سات سو میٹر کے فاصلہ پر موجودہ وسائل کے تحت کچھ شجر کاری اور ہریالی پیدا کی گئی ہے پھر بھی مکہ کو ایک خشک اور بے شجر شہر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کے بہ نسبت طائف یا مدینہ میں پانی، سبزے، باغات اور کھیتیاں ان علاقوں کی شادابی کا ثبوت دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس وقت مکہ میں جانوروں کو پالنے یا کھیتی کرنے کے امکانات بہت ہی کم تھے جس کے نتیجہ میں وہاں زندگی دشوار تھی۔

بنائے کعبہ

جناب ابراہیمؑ نے جناب ہاجرہ و اسماعیل کو ایسی ہی ویران اور اجاڑ جگہ پر لاکر بسا دیا۔ اس کے بعد قرآن کریم میں اس سلسلہ میں مزید وضاحت نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو خداوند عالم کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ وہ دونوں مل کر اس کی عبادت کرنے والوں کے لئے ایک گھر تعمیر کریں۔

توریت بھی اگرچہ اس سلسلہ میں بہت زیادہ وضاحت نہیں دیتی لیکن اس کی شرحوں و تفسیروں اور بنی اسرائیل کی دوسری تاریخی کتابوں میں اس پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن چونکہ ان کی تاریخی حیثیت روشن اور مسلم نہیں ہے، لہٰذا ان مصادر سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم یہاں بھی قرآن سے استفادہ کرتے ہیں جو سند کے اعتبار سے قطعی و یقینی حیثیت کا حامل ہے۔ بہر حال اسماعیل اسی سرزمین مکہ میں زندگی گزارتے ہوئے منزل شباب کو پہنچے اور دونوں باپ بیٹے کو خدا کی عبادت کے لئے اللہ کی جانب سے ایک گھر بنانے کا حکم ملا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خدا کا یہ گھر تعمیر کے سادہ ترین آلات و وسائل کے ذریعہ بنایا جاتا ہے اور بلا کسی تزک بھڑک اور شان و شوکت کے ناتراشیدہ پتھروں کو تلے اوپر رکھ کر صرف قد آدم تک ایک چہار دیواری کھینچ دی جاتی ہے تاکہ اللہ کی عبادت کے لئے ایک جگہ معین ہو سکے۔ غور طلب نکتہ یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے:-

> "جب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اس گھر کی دیواروں کو بلند کر رہے تھے تو ان کے لبوں پہ یہ دعا تھی کہ خدایا اس جگہ، اس گھر اور اس سرزمین کو ہمارے فرزندوں کی اقامت گاہ قرار دے اور زندگی بسر کرنے کے امکانات ان کے لئے فراواں کر دے اور ہمارے فرزندوں کو اس کی توفیق عطا فرما کہ وہ خدا پرست، طیب و طاہر، حق کے بندے اور حق کی راہ میں زندگی گزارنے والے ہوں اور ہمیں بھی یہ حکم صادر فرما کہ ہم تیری عبادت و پرستش کے قانون کے تحت کون سا عمل بجا لائیں؟ اعمال و عبادات اور اس کے طریقوں کے سلسلہ میں ہماری رہنمائی فرما۔ (بقرہ، آیات ۱۲۷ ــــ ۱۲۸)

اس غیر مرئی خدا کی عبادت و پرستش، پاکیزگی و صفائے قلب اور اس کی عظمت کی مناسبت سے ہونی چاہئے۔ وہ خدا جسے ہم نہیں دیکھتے اور جس کے بارہ میں زیادہ سے زیادہ ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ سب سے بزرگ و برتر ہے یہاں تک کہ ہمارے قیاس و خیال اور وہم و گمان سے بھی بالاتر ہے۔ ایسے خدا کی عبادت اور اس عبادت کا طور طریقہ، بت پرستی، اشخاص پرستی، بودھوں کے طرز پرستش، آفتاب و ماہتاب و ستاروں کی پرستش یا درخت و چوب و سنگ کی پرستش سے بہر حال فرق رکھتا ہے۔ اگرچہ بت پرستوں نے بھی بتوں کی پرستش و عبادت کے لئے مخصوص رسمیں، ترانے، آہنگ اور بتوں کی تعظیم و تکریم کے لئے مخصوص تکلفات وضع کر رکھے ہیں: نیز ان کے آئین میں کسی شخص کو بھی اسکی اجازت نہیں ہے کہ جس کا جس طرح جی چاہے بتوں کی پرستش کرے۔ لیکن خدا کی عبادت کا مسئلہ اس سے کہیں بالاتر اور اہم ہے اور وہ یہ کہ ہم کیا کریں کہ خدا کے لئے ہماری عبادت بت پرستی کی شکل اختیار نہ کرنے پائے؟ یہ بات بہت اہم ہے یہاں واقعاً ہر کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ جس طرح چاہے خدا کی عبادت کرے۔

خدا کی عبادت اس کی معرفت کی روح سے ہم آہنگ ہونی چاہئے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ میں فلاں عمل خدا کی رضا کے لئے یا اس کا تقرب حاصل کرنے کے لئے صرف خدا پرستی کے عنوان سے انجام دے رہا ہوں، لہٰذا اب مجھ پر کوئی تنقید نہیں کر سکتا۔ تو ہم اس سے یہ کہیں گے کہ خدا کی عبادت کا طور طریقہ خود الٰہی تعلیمات سے حاصل کرنا چاہئے۔ خود ساختہ خدا پرستی کجروی اور گمراہی کا سبب بنتی ہے، کیونکہ اس طرح خدا کا تقرب حاصل کرنا غلط ہے اور اسلام کے خدا شناسی اور عبادت کے تصور سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتا۔ بہر حال جناب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے خدا کی بارگاہ میں یہ درخواست کی کہ اے خدا تو اپنی عبادت کے طرز و آئین کو ہمارے لئے خود بیان فرما دے۔ اس طرح ایک گھر کی تعمیر کی جاتی ہے جو رفتہ رفتہ خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت و بندگی کرنے والوں کے لئے اجتماع کا مرکز بن جاتا ہے اور دھیرے دھیرے وحی الٰہی کے فرمان کے مطابق جناب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اس گھر میں خود اپنے لئے اور تمام بنی نوع انسان کے لئے خدا کی عبادت کے طریقے معین و مقرر فرماتے جاتے ہیں کہ لوگو! اس طرح حج کے اعمال بجا لاؤ اور خدا کی عبادت کے مراتب و مدارج کو محفوظ رکھو۔

حج کے نام پر خرافات و توہمات

چونکہ کوئی شئی بھی زمانہ کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہی، لہٰذا یہ احکام و قوانین عبادت بھی دیگر ہاتھوں سے نہ بچ سکے۔ ابھی کچھ دن نہ گزرے تھے کہ جناب ابراہیمؑ و اسماعیل کے ذریعہ مقرر کردہ خدا پرستی کے مناسک و قوانین میں چند توہمات و خرافات کا اضافہ بھی ہوگیا اور کچھ مزید ایام گزرنے کے بعد وہ سادہ اور غیر مزین گھر جو ہر عیب و نقص سے پاک خدا کی عبادت کے لئے تعمیر کیا گیا تھا ایک بڑے بت خانہ میں تبدیل ہو گیا اور حج کے وہ اعمال و مناسک جو خدا کی عبادت کے عنوان سے انجام دئے جاتے تھے، حج کے نام پر فقط توہمات و خرافات کا پلندہ بن گئے۔ اب یہ حج خانہ خدا کا حج نہیں تھا بلکہ ایک بڑے بت خانہ کا حج تھا۔

حج کے [illegible] و مناسک میں یہ فرض تھا کہ جو شخص بھی عبادت گزاروں کے اس اجتماع میں چند روز کے لئے شرکت کرنے کا معتمر تھے وہ شان و شوکت کے اظہار کے لئے بس فاخرہ پہن کر آئے اور اس جگہ اس کا لباس اور اس کے شب و روز دوسروں کے لئے اپنے مال و دولت، جاہ و جلال، بزرگی و عظمت کی نمائش نہ نہیں، بلکہ وہ سادگی کو اپنا شعار بنائے۔ لیکن مرور ایام سے یہ مفہوم اس قدر تبدیل ہوا کہ لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ اظہار تجمل و شان و شوکت سے روکے جانے کا مطلب یہ ہے کہ لوگ لباس ہی نہ پہنیں بلکہ ایک دم مادر زاد برہنہ ہو کر یہاں آئیں اور اسی حالت میں خانہ کعبہ کا طواف کریں۔ چنانچہ تھوڑے وقفہ کے لئے تجمل اور شان و شوکت۔

سے روس کے جلنے کا مطلب یہ نکال لیا گیا کہ برہنہ طواف کرنا چاہیئے اور تماشا یہ کہ اس کی توجیہ بھی با آسانی یہ کی جاسکتی ہے کہ حج ایسا باعظمت مقام ہے جہاں ہر شخص کو اپنے آپ سے بے پرواہ و غافل ہو کر فقط خدا کو یاد کرنا چاہیئے اور جب انسان اپنے آپ سے غافل ہو جائے تو وہ اپنے اردگرد سے بھی غافل ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھ یا آگے چلنے والا انسان ہے یا جانور، لباس پہنے ہے یا برہنہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس غلط نظریہ کی توجیہ کتنی آسانی سے کردی گئی اور وہ بھی کس قدر عالی اور پُر معرفت توجیہ۔ !

اتفاق سے دین کی صحیح شناخت کے سلسلہ میں جو مسائل درپیش ہوتے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر ہم اس طرح کی توجیہات کے ذریعہ دین کی حقیقت کو پہچاننا چاہیں تو آسانی سے اسے صحیح یا غلط رنگ میں ڈھال سکتے ہیں۔ میں آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ دو متضاد مطالب کے سلسلہ میں ایک سطح کا ذہن رکھنے والے افراد کے دو الگ الگ مجمع میں ایسی دلچسپ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ دونوں گروہ بے ساختہ کہہ اٹھیں۔ کیا اچھی اور صحیح بات کہی گئی ہے لیکن جب ان دونوں گروہ کے افراد آپس میں ملتے ہیں تو انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جس بات کو انھوں نے ایک خاص آئیڈیالوجی اور ایک طرز فکر کے تحت صحیح تسلیم کیا تھا وہ اس کی ایک دم ضد اور الٹی بات ہے جسے ان کے دوسرے رفیقوں نے ایک الگ فکری بنیاد کے تحت صحیح مانا ہے۔ کیونکہ در اصل یہ توجیہیں غلط و گمراہ کنندہ ذوق و سلیقہ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اسی لئے اسلام میں اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ نہ صرف دین کے معاملے میں بلکہ مجموعی طور سے اصول زندگی کے انتخاب کے سلسلہ میں مسلمات اور مستحکم فکر و نظریات پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور حتی الامکان ذوق و سلیقہ اور ظن و گمان سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ گر صرف ظنی و ذوقی توجیہات سے کام لیا جائے تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ دو متضاد باتوں کو ایک گروہ کے درمیان صرف چند منٹ کے فاصلہ سے ایسی دلچسپ توجیہ کے ساتھ بیان کروں کہ گذشتہ تقریر پر واہ واہ کرنے والے افراد اس تقریر پر بھی واہ واہ کہہ اٹھیں اور اس سے غافل ہو جائیں کہ ابھی چند منٹ پہلے میں ان کے سامنے ایک بالکل الٹی تصویر پیش کر چکا ہوں۔

ہمارے زمانہ کے جوشیلے اجتماعات کا حال بھی یہی ہے کہ لوگ جذبات و احساسات سے متاثر عوام کو جذباتی اور ہیجان انگیز تقریروں کے ذریعہ ادھر ادھر گھماتے پھرتے ہیں اور وہ بیچارے تھوڑے ہی وقفہ کے فاصلہ سے ایک دوسرے کی ایک دم متضاد باتوں پر کبھی زندہ باد اور کبھی مردہ باد کا شور بلند کرتے رہتے ہیں۔ یہی ناپختہ فکری کی نشانی ہے۔ لہٰذا ان کی محکم اور استوار زندگی کے لئے انسانی معاشرہ کی سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ انہیں صحیح انداز فکر کا سلیقہ سکھایا جائے اور نہ صرف یہ سلیقہ انھیں سکھایا جائے بلکہ اسی نہج پر ان کی تربیت بھی کی جائے تاکہ وہ ہمیشہ صحیح ڈھنگ سے سوچنے اور فکر کرنے کے عادی ہو جائیں۔

یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ خداوند عالم نے ان مذکورہ آیات کے ذیل میں "یا اولی الالباب" یعنی "اے صاحبان خرد" کی قید کے ساتھ انسان کو مخاطب کیا ہے، وہ اس لئے کہ خدا یہ چاہتا ہے کہ انسان ہمیشہ صحیح و استوار فکر کو بروئے کار لائے۔ کیونکہ یہی تمام مسائل کے حل کی کلید ہے۔ یہ بات غور کرنے کی ہے کہ اگر پیغمبر خدا و علی مرتضیٰؑ دس ہزار سال تک اس دنیا میں تشریف رکھتے اور اتنی مدت تک تبلیغ کے دوران ان کا سابقہ بے وقوفوں اور ناسمجھ افراد سے پڑتا تو کیا وہ خطرات ہدایت کا کوئی کام انجام دے سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ لہٰذا پیغمبر اکرمؐ کی مکہ کی تیرہ سالہ تبلیغی زندگی میں سب سے پہلی کوشش یہی تھی کہ دین کے لئے پورے طور سے آمادہ افراد کو پہلے فکری طور سے کامل و مستحکم بنایا جائے تاکہ یہ لوگ اس تحریک کے لئے ڈھال کا کام دے سکیں اس طرح یہ تحریک آنے والے دنوں میں بھی عمومی طور سے بالغ نظری اور فکری رشد و کمال کی فضا قائم کر سکے۔

مناسک حج میں تحریف

بہرحال لوگوں نے جناب ابراہیمؑ کے بعد حج کے مراسم میں بڑی تحریفیں کر ڈالیں۔ مقصد یہ تھا کہ جو شخص بھی حج کے ارادے سے خدا کے گھر کی طرف جائے اسے چاہیئے کہ ان چند دنوں کے لئے اپنی بزرگی و برتری کو فراموش کردے تاکہ سب کے سب وہاں یکساں ہو جائیں لیکن اس کی مضحکہ خیز توجیہ یہ کی گئی کہ اس سے بہتر یکسانیت کی اور کون سی صورت ہوگی کہ سب برہنہ ہو جائیں۔ چنانچہ اس میں مردوں اور عورتوں میں کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ عورتیں رات کی تاریکی میں برہنہ ہو کر طواف کرتی تھیں اور مرد دن کی روشنی میں اور زیادہ طواف کرتے تھے۔ ان بعد افزوں انحرافات کے علاوہ بھی بہت سی تحریفیں ان دنوں روا تھیں، ان ہی میں سے ایک یہ کہ تمام لوگ اپنے سارے امتیازات ختم کرنے کے لئے برہنہ طواف کرتے تھے، قریش اور مکہ کے دوسرے ممتاز افراد نے حج کے موقع پر مراسم کی ادائیگی میں اپنے آپ کو عام لوگوں سے ممتاز اور جدا کر رکھا تھا۔ پہلے ایسا ہوتا تھا کہ کچھ لوگ ذوالحجہ کی نویں تاریخ کو صحرائے "عرفات" میں قیام کرتے تھے اور عصر کے وقت یعنی غروب آفتاب کے قریب "منیٰ" کی طرف کوچ کرتے تھے لوگ شب عرفہ وہاں جاتے تھے اور شب و روز "عرفہ" وہیں قیام کرتے تھے۔ جو لوگ شب میں نہیں پہنچ پاتے تھے دن میں آکر ان لوگوں سے مل جاتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ غروب آفتاب کے وقت منیٰ کی طرف روانہ ہوتے تھے لیکن قریش کے ممتاز افراد کہتے تھے کہ ہمارا طریقہ عام لوگوں سے الگ ہے۔ ہم پہلے ہی سے وادی "مشعر الحرام" کی حدود میں جاکر وہیں اقامت کریں گے اور وہاں سے "مکہ" کی طرف واپس روانہ ہو جائیں گے اور وہ بھی ایک خاص وضع اور امتیاز کے ساتھ اور اس کی توجیہ بھی اس طرح کرتے رہے ہوں گے کہ چونکہ ہم گروہ قریش، خانۂ خدا کے ان تمام مہمانوں کے میزبان ہیں لہٰذا ہمارے لئے یہی بہتر ہے کہ ہم عام لوگوں کی نسبت مکہ سے ایک منزل نزدیک رہیں تاکہ حاجیوں کے استقبال کے لئے ان سے پہلے مکہ پہنچ جائیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح کی توجیہات کے ذریعہ تو تقریباً سارے اعمال حج کا قصہ پاک کیا جاسکتا تھا، اسی لئے مناسک حج کے مختلف حصوں میں بہت ساری تحریفیں پیدا ہو گئی تھیں

صلح حدیبیہ

پیغمبر اسلامؐ نے جب مدینہ کو اپنا مقر بنا لیا اور اجتماعی طور سے اتنی قوت پیدا کرلی کہ ان غلط رسموں کو توڑا جاسکے۔ تو آپ ایک "مثالی حج" بجا لانے کے لئے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ہجرت کے چھٹے سال آنحضرتؐ نے ایک ہزار دو سو یا تین سو صحابہ کے ہمراہ ایام حج میں مکہ کی جانب پیش قدمی فرمائی۔ لوگوں کے ہمراہ ان کی قربانیوں کے جانور بھی تھے۔ ان دنوں معمول یہ تھا کہ قربانی کے جانوروں کی گردنوں میں علامت کے طور پر کوئی چیز آویزاں کر دیتے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ جانور چرنے کے لئے نہیں جارہے ہیں بلکہ قربانی کے جانور ہیں یہ علامتیں اس لئے لگائی جاتی تھیں کہ جانور چوروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ رہ سکیں۔ ان علامتوں کو قلائد و شعائر کہا جاتا تھا۔ "گردن بند یا علامت و نشانی" لیکن چونکہ مشرک عربوں کی طاقت بھی اتنی زیادہ تھی کہ جب پیغمبر اسلام اپنے حج کے قافلے کے ساتھ مکہ کے نزدیک پہنچے تو آپ کو روک دیا گیا

شاید آپ سوال کریں، پیغمبرؐ کو روک کیوں دیا گیا؟ جواب صاف ہے، اور وہ یہ کہ رسموں اور رواج کے خلاف قدم اٹھانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ابھی ہجرت کا چھٹا سال ہے پیغمبر اسلامؐ کے ہمراہ ایسے مسلمان ہیں جو ابھی اٹھارہ انیس برس ہوئے اسلام لائے ہیں۔ کچھ دس، بارہ سال کے مسلمان ہیں، کچھ افراد سات آٹھ سال پہلے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ہیں اور کچھ مسلمان ایسے بھی ہیں جو ابھی تین یا دو یا ایک سال پہلے رسول خداؐ اور قرآن حکیم پر ایمان لائے ہیں۔ بہرحال پیغمبر اسلامؐ ابھی سرزمین حدیبیہ پر پہنچے تھے کہ کفار مکہ کے نمائندوں نے اسلامی قافلہ کا راستہ روک لیا اور پیغمبرؐ سے کہنے لگے اس سال آپ حج نہیں کر سکتے ورنہ جنگ برپا ہو جائے گی۔ آخرکار یہ معاملہ صلح پر تمام ہوا اور یہ طے پایا کہ اس سال پیغمبرؐ بغیر حج کئے واپس تشریف لے جائیں اور آیندہ سال بھی صرف تین روز کے لئے حج کی غرض سے تشریف لائیں ان تین دنوں میں مشرکین خانۂ خدا سے دور رہیں گے اور اللہ کے گھر کو مسلمانوں کے حوالے کردیں گے۔ لیکن ایک شرط یہ بھی ہے کہ حج کے دوران مسلمان کوئی ہتھیار، یہاں تک کہ تلوار بھی اپنے ساتھ نہیں لاسکتے تاکہ مشرکین ہر صورت میں مسلمانوں سے محفوظ رہیں۔

رسم شکنی

جب صلح کا مرحلہ طے ہو گیا تو پیغمبرؐ نے اعلان فرمایا کہ "ہم احرام باندھ کر مکہ کی جانب آئے اور

۔ رسموں کو توڑنے کے لئے بت شکنی سے کہیں زیادہ طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ رسموں کو توڑنا بتوں کو توڑنے سے زیادہ سخت ہے۔ وہ افعال و افکار جن کے لوگ عادی ہو چکے ہوں ان سے ٹکرانا اور ہمیشہ کے لئے انہیں مٹانے کی کوشش کرنا بہت ہی مشکل، اور دیر رس کام ہے۔

اپنی قربانیاں بھی ہمراہ لائے تھے لہٰذا اپنا حج یوں ہی تمام نہیں کریں گے۔ بہتر ہے کہ ہر شخص اسی مقام پر اپنی اپنی قربانیاں ذبح کرے اس کے بعد احرام کھولے" پیغمبرؐ کا یہ اعلان ہر ایک کے لئے حیرت انگیز تھا۔ کیونکہ صدیوں سے یہ رسم و عادت ہو چکی تھی کہ جب لوگ احرام پہنتے تھے تو سرزمین "منیٰ" میں ہی یہ لباس جسموں سے اترتا تھا اور آج پیغمبرؐ یہ فرما رہے ہیں کہ یہیں اسی صحرا میں اپنے جانور ذبح کرو اور احرام کھول ڈالو، اگرچہ پیغمبرؐ نے مسلمانوں کو کئی مرتبہ قربانی کرنے اور احرام کھولنے کا حکم دیا لیکن مسلمان اس عجیب و غریب حکم کے لئے تیار نہ تھے۔ سب حیرت سے پیغمبرؐ کی طرف دیکھ رہے تھے، اور کچھ لوگ تو جو آنحضرتؐ کے اس حکم پر عمل بھی نہیں کر رہے تھے آپس میں یہ کہنے لگے کہ ہم ایک مدت سے پیغمبرؐ کو اللہ کے رسولؐ کے عنوان سے مانتے آئے لیکن ہماری صدیوں کی عادت

کے خلاف سرزمین حدیبیہ پر اپنے جانوروں کی قربانی کرو" ان کے اس حکم نے ہم کو ان کی پیغمبری سے متعلق شک میں مبتلا کر دیا ہے۔ درحقیقت اس شک کی ایک اور بنیاد بھی تھی اور وہ ایک خواب تھا جسے پیغمبرؐ نے ان سے بیان فرمایا تھا کہ تم لوگ مسجد الحرام کی زیارت سے مشرف ہوگے۔

اس موقع پر مورخین ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کرتے ہیں جس نے تحریک میں ایک نئی سیاسی و قیادی صورت حال پیدا کر دی۔ کچھ چنے ہوئے مسلمان پیغمبرؐ کے ساتھ ہیں۔ پیغمبرؐ فرماتے ہیں کہ حکم خدا یہ ہے کہ اپنی قربانیوں کو ذبح کرو اور احرام اتار ڈالو۔ آپ کے بار بار فرمانے کے باوجود لوگ آپ کے حکم پر عمل نہیں کرتے۔ بہرحال کسی بھی تحریک کے لئے یہ سخت مرحلہ ہوتا ہے۔ مورخین کے بیان کے مطابق پیغمبر اسلام دل برداشتہ ہو کر ام المومنین ام سلمہؓ کے خیمے میں تشریف لائے۔ ام سلمہؓ نے آپ کی یہ حالت دیکھ کر دریافت فرمایا کہ یا رسول خداؐ۔ بات کیا ہے؟ جواب میں پیغمبرؐ نے فرمایا کہ میں بار بار ان لوگوں سے کہہ رہا ہوں کہ خدا کا حکم بجا لاؤ اور اپنے ساتھ جو بھی قربانی کے جانور لائے ہو یہیں ذبح کرو اور احرام اتار ڈالو، لیکن یہ لوگ میرے کہنے پر عمل ہی نہیں کرتے۔

ام سلمہؓ نے فرمایا یا رسول اللہ یہ مشکل تو بڑی آسانی سے حل ہو سکتی ہے۔ آپ تشریف لے جائیے اور اس مرتبہ کسی سے کچھ کہے سنے بغیر اپنی قربانی کے جانور خود ذبح کر ڈالئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے دیکھا کہ یہ اچھا مشورہ ہے رہبر کو بعض اوقات خود ہی میدان کارزار میں قدم آگے بڑھانا چاہئے اس کی یہ پیش قدمی زبانی قانون بتانے یا تبلیغ کرنے یا دلائل وغیرہ پیش کرنے سے کہیں زیادہ پُراثر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس مرتبہ پیغمبرؐ نے نہ کسی سے بات کی نہ کسی کو حکم دیا بلکہ سیدھے اپنی قربانی کے جانوروں کے پاس تشریف لائے اور تمام جانوروں کو ذبح کر ڈالا۔ یہاں ابن اثیرؒ نے کامل میں نقل کیا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں نے اس طرح شوق و ذوق سے اپنی قربانیوں کو ذبح کرنا شروع کر دیا کہ یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو ابھی حکم پیغمبرؐ کو ماننے سے تامل اور انکار کر رہے تھے۔ گویا سب کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ہم سے بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے کیونکہ کسی تحریک کے لئے یہ بات مفید ہے کہ لیے ہم دنیا کے موڑ پر اپنے رہبرؐ کے حکم سے منہ موڑ جاتے اور نافرمانی بھی ایسے خطرناک حالات میں، جب دشمن سے ٹکر کا خطرہ ہو وہ بھی ایسے رہبرؐ کے حکم سے انکار جو حکم خدا کے عنوان سے ہمیں پیغام پہنچا رہا ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ان کی پیغمبری میں شک کر رہے ہیں؟ آیات میں اس موضوع کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

فتح مکہ

پہلی مرتبہ پیغمبر اسلامؐ چھٹی ہجری میں مکہ کی جانب تشریف لائے کہ تمام خرافات، توہمات و تحریفات سے مبرا اور پاک و پاکیزہ حج کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش فرمائیں لیکن مشرکین نے آپ کو اجازت نہ دی دوسرے سال صرف عمرہ بجا لانے آئے۔ ہجرت کے آٹھویں سال مکہ فتح ہوا۔ نویں سال گرچہ مسلمانوں نے فریضہ حج کو مکمل طور سے انجام دیا لیکن پیغمبر اسلامؐ اس حج میں مسلمانوں کے ہمراہ نہ تھے۔ اسی سال امیر المومنین حضرت علیؑ، پیغمبرؐ کی طرف سے مشرکوں کے سامنے سورۂ "برائت" کی تبلیغ پر مامور ہوئے۔ دم ہجرت کا دسواں سال تھا جب پیغمبر اسلامؐ مسلمانوں کے انبوہ کثیر کے ساتھ ایک اعلیٰ اور شان دار حج ادا کرنے کے لئے مکہ تشریف لائے اور آج حج کے جو اعمال و افعال ہمارے سامنے موجود ہیں پیغمبرؐ کے اسی حج کا پرتو ہیں۔

لفظ "حج" یعنی خانہ خدا کی طرف جانے کا قصد و ارادہ۔ اس وقت اگر کسی سے دریافت کرتے تھے کہ کہاں جا رہے ہو تو وہ یہ جواب دیتا تھا میں خدا کے گھر کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا ہوں (انا اَحُجُّ البیتَ) رفتہ رفتہ اس سفر کا نام ہی حج پڑ گیا۔

لفظ "عمرہ" سے مراد آباد و تعمیر کرنا ہے۔ حج معمولاً سارے مناسک و مراسم کے عنوان سے بجا لایا جاتا ہے لیکن عمرہ چھوٹا حج ہے۔ اس طرح بڑے حج سے مراد ایسی اجتماعی عبادت ہے جو سال بسال ادا کی جاتی اس کے بارے میں ہم آئندہ وضاحت کریں گے۔ لیکن چونکہ یہ حج سال میں ایک مرتبہ انجام پاتا تھا لہذا اس کے خاتمہ پر کعبہ کے اطراف و جوانب اور اس کے ارد گرد کی بستیاں بھی سنسان ہو جاتی تھیں جیسا کہ آج بھی یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ حج کے موقع پر مکہ اور کعبہ میں اس قدر مجمع ہوتا ہے جس کی حد نہیں لیکن اگر کوئی شخص ماہ ذی الحجہ کے آخری دنوں میں مسجد الحرام میں جائے تو وقت نماز کے علاوہ عام اوقات میں وہاں بھی ایسے ہی سناٹا نظر آئے گا جیسا ہماری مسجدوں میں ہوتا ہے اسی بنا پر یہ سنت قائم کی گئی کہ حج کے دنوں کے علاوہ بھی لوگ خانہ خدا کی زیارت کو جائیں۔ اس زیارت کو "عمرہ" کہا جاتا تھا، یعنی وہ زیارت جو خدا کے گھر اور اس کے اطراف کو آباد رکھے۔ چنانچہ اس کا نام خدا کے گھر کو آباد رکھنے کی زیارت یا "عمرۃ الاعتمار" پڑ گیا۔

عرب معمولاً رجب کے مہینہ میں حج کے لئے جاتے تھے کیونکہ یہ مہینہ ماہ حرام تھا۔ لیکن چونکہ یہ تنہا حرام مہینہ تھا لہذا اس ماہ میں ایسے ہی لوگ مکہ جا سکتے تھے جن کے گھر مکہ سے صرف سات، آٹھ یا زیادہ سے زیادہ دس روز کے فاصلہ پر ہوتے تھے۔ تاکہ اس میں دس دس روز کی آمد و رفت کے علاوہ دس بارہ روز مکہ میں قیام بھی کر سکیں۔ لیکن وہ لوگ جن کے گھر مکہ سے ایک ماہ کی مسافت پر تھے وہ اس عمرہ میں شریک نہیں ہو پاتے تھے اس لئے کہ ماہ امن و امان ختم ہو چکا ہوتا تھا۔ اب چونکہ رجب کے علاوہ ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم بھی محترم مہینے تھے لہذا جو لوگ مکہ سے تیس، چالیس روز کی مسافت پر بھی رہتے تھے۔ ان متصل مہینوں میں اگر اطمینان سے حج کے فرائض ادا کر کے واپس جا سکتے تھے۔ اسی وجہ سے ذی الحجہ کے مہینہ کا حج بڑے حج کی حیثیت سے جانا جاتا تھا کیونکہ اس میں بہت بڑا اجتماع ہوا کرتا تھا۔ ماہ رجب کا حج عمرے سے زیادہ اہمیت اختیار نہ کر سکا۔ جو لوگ مکہ سے ایک روز یا چند گھنٹوں کی مسافت پر رہتے تھے وہ معمولاً عمرہ بجا لایا کرتے تھے اور برابر ایسی زیارتیں کرتے تھے جو خدا کے گھر کی آبادی کا سبب بنتی تھیں۔

جو لوگ مکہ سے زیادہ دور رہتے تھے ایک ہی سفر میں حج و عمرہ دونوں بجا لا سکتے تھے۔ یعنی قبل از وقت مکہ پہنچ کر پہلے وہ عمرہ و زیارت انجام دیتے اور چند دن وہاں قیام کرتے تھے یہاں تک کہ حج بزرگ کی تاریخیں آ جاتی تھیں اس طرح ایک ہی سفر میں وہ حج و عمرہ دونوں بجا لاتے تھے۔ یہ حج ہمارے یہاں "حج تمتع" کے نام سے جانا جاتا ہے۔

شیعہ فقہ میں موجودہ فتووں کے مطابق وہ مسلمان جو مکہ سے اڑتالیس میل یا اس سے زیادہ دور ہوں ان پر حج تمتع واجب ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک حج میں عمرہ و حج دونوں بجا لائے جائیں۔

۱؎ ایک فرسخ برابر تین میل، ایک میل برابر چار ہزار ہاتھ، ایک ہاتھ برابر چوبیس انگل۔۔۔ شرح لمعہ ج ۱ صلوٰۃ المسافر

حجۃ الوداع

ہجرت کے دسویں سال پیغمبر اکرمؐ مسلمانوں کے انبوہ کثیر کے ساتھ حج کے لئے مکہ معظمہ تشریف لائے مورخین نے اس حج میں حاجیوں کی تعداد اسی ہزار نقل کی ہے۔ خانۂ کعبہ کے گرد اسی ہزار مسلمانوں کا اجتماع بڑی ہیبت اور عظیم شکوہ کا حامل تھا۔ اس حج میں ایک شخص بھی بت پرست نہ تھا کیونکہ اس کے پہلے سال یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ آئندہ سال سے بت پرست مشرکین حج کے مراسم میں شرکت کے حقدار نہ ہوں گے۔ چنانچہ وحدت پرست مسلمانوں کا یہ متحد اجتماع اسلامی تحریک کے حق میں ایک اعلیٰ معیار کا قابل دید، موثر اور باعظمت مظاہرہ تھا۔ وہ پیغمبرؐ جو دس سال پہلے سختیوں، مصائب و شدائد کے ساتھ اسی سرزمین مکہ سے کئی فرسخ دور کر دیا گیا تھا، آج پورے جاہ و جلال کے ساتھ اسی ہزار افراد کے ہمراہ اسلام کے عظیم رہبر کی حیثیت سے خانۂ کعبہ کی طرف واپس آ رہا تھا اور اس کے ہمراہ ایسا عظیم اجتماع تھا کہ میرے خیال سے آج سے پچاس برس پہلے ہمارے ملک میں بھی ایسا مجمع ایک بے مثل و بے نظیر اجتماع شمار ہوتا تھا۔

ایک ہی وقت میں اسی ہزار افراد پر مشتمل اجتماع بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ مجموعی طور سے اس وقت کی آبادی کے اعداد و شمار ہمارے سامنے نہیں ہیں، نہیں معلوم کہ اس وقت عرب کی کل آبادی پانچ لاکھ بھی تھی یا نہیں۔ لیکن یہ طے ہے کہ اس وقت سب سے بڑے شہر کی آبادی بھی دس ہزار افراد سے زیادہ نہیں ہوا کرتی تھی۔

عرب کی سرزمین پر ایسے حالات و شرائط کے تحت وہ پیغمبرؐ اور مسلمان جو دس سال قبل اسی سرزمین سے نکال دیئے گئے تھے آج ایک متحد اجتماع کی شکل میں اکٹھا ہوئے ہیں۔ ایسا اجتماع جس میں ہر طرف سے ایک ہی آواز "اللہ اکبر" بلند ہو رہی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ "لبیک" حج کے مراسم کا ایک حصہ ہے۔ لبیک اللھم لبیک۔ لبیک لاشریک لک" یعنی نعرۂ توحید ہر طرف بلند ہو رہا ہے اور آج اسی ہزار افراد ایک زبان ہو کر کہہ رہے ہیں "لبیک اللھم لبیک لاشریک لک لبیک" یہ وہی سرزمین ہے جہاں ابھی ایک سال پہلے تک جب مشرکین و بت پرست بھی حج میں شریک ہوا کرتے تھے، ایک گروہ "یا ہبل یا ہبل" کہتا ہوا آتا تھا تو دوسرا گروہ "یا لات یا لات" کہتا تھا۔ مختصر یہ کہ ہر گروہ کا ایک مخصوص نعرہ تھا اور وہ اپنے اپنے بتوں کو پکارا کرتے تھے اور مجمع بھی شاید دس ہزار سے زیادہ نہ ہوا کرتا تھا اور آج اسی ہزار کا ایک عظیم مجمع ایک رہبر کی سرپرستی میں ایک قانون کے تحت ایک ہی نعرہ بلند کر رہا ہے اور سب کے سب ایک ساتھ کہہ رہے ہیں "لبیک اللھم لبیک لاشریک لک لبیک" الٰہا! ہم تیری دعوت کو قبول کرتے ہوئے اس سرزمین پر آئے ہیں اور تیرے سوا ہر اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ کسی کو بھی

تیری خدائی میں شریک تسلیم نہیں کرتے۔ یہ منظر کتنا باعظمت اور قابل دید رہا ہوگا۔ بلاشبہ حجۃ الوداع کے مراسم نے اسلامی تحریک کے استحکام میں بڑا موثر کردار ادا کیا۔

موجودہ حج اور اسلامی امت

آج کل ہم حج جیسی اجتماعی عبادت سے جس قدر استفادہ کرنا چاہئے حاصل نہیں کرتے۔ آج کے مسلمان حج کے عنوان سے جو اعمال انجام دے رہے ہیں وہ اسلامی تعلیمات سے اسی فیصد بلکہ نوے فی صد دور ہے اور اسے فراموش کئے ہوئے ہیں۔ لیکن اسلامی حج کی ابھی بھی حیثیت اس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ موجودہ حالات و شرائط کے تحت کسی بھی صورت میں اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کا مقصد یہ بھی نہیں کہ کسی صورت میں آئندہ بھی ایسے حالات نہیں رہیں گے۔ کیونکہ ممکن ہے وقتی طور پر بعض مخصوص، اجتماعی حالات و شرائط کے تحت یا اجتماعی اسباب و علل کے پیش نظر خود مصلحت اسلامی ایک، دو یا تین سال کے لئے حج کو حرام ہی قرار دیدے لیکن اس عبادت کی حیثیت و اہمیت میں کسی طرح کی کمزوری ہرگز نہیں آنی چاہئے۔ ہاں اگر بنیادی طور سے حج کو ہی کمزور بنانے کی کوشش کی گئی تو اس وقت اس سلسلہ میں سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔ کیونکہ جو کچھ میں نے خود سفر حج میں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا ہے، نیز اسلامی تاریخ کے مطالعہ کے بعد اس کی حقیقت سے آشنا ہوا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر حج کے مراسم نہ ہوتے تو اب تک جو کچھ باقی ماندہ خوبیاں دنیا کے مسلمانوں کے درمیان پائی جاتی ہیں اسلام کے داخلی و خارجی دشمن انھیں بھی نابود کر چکے ہوتے۔

اسلام میں فرقہ بازی و تفرقہ پردازی خود امت اسلامیہ کے لئے ایک بڑی مصیبت ہے۔ یہ سچ ہے کہ امت اسلام میں ہر گروہ دین فہمی کے سلسلہ میں آزاد ہے، جو کچھ وہ اسلام کے بارے میں سمجھتا اس پر عمل کرنے میں آزاد ہے۔ ایک شیعہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ شیعہ رہے اور اسلام سے متعلق اپنا نظریہ پیش کرے۔ اس کے سامنے کوئی مجبوری نہیں ہے کہ وہ سنی کی پیروی کرے۔ خود اہل سنت میں بھی کیا کم گروہ بندی ہے؟ چھوٹے چھوٹے گروہوں کو تو جانے دیجئے ان کے بڑے گروہ دیکھ لیجئے۔ فقہ میں حنفی ہیں، شافعی ہیں، مالکی ہیں، حنبلی ہیں اور اصول عقائد اسلام شناسی میں اشعری ہیں، معتزلی ہیں وغیرہ...... شافعی کسی حنفی کو مجبور نہیں کر سکتا کہ تمہیں میرے مسلک پر چلنا ہوگا۔ اسی طرح حنفی بھی شافعی پر کوئی جبر نہیں کر سکتا کہ میری ہی پیروی کرو بلکہ ہر گروہ خود مختار ہے اور یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم اسلام سے متعلق اپنی آزاد فکر رکھتے ہیں اور ہماری منطق جس بات کو قبول کرتی ہے اسی پر عمل کرتے ہیں۔ لیکن جو چیز ضروری ہے وہ یہ ہے کہ حنفی، شافعی سے کہے، چونکہ تم شافعی ہو اور میں حنفی ہوں لہذا ہم آپس میں دینی بھائی نہیں ہیں۔ اسی طرح شیعہ و سنی ہیں، کہ شیعہ سنی سے کہے کہ چونکہ تم سنی ہو لہذا ہم میں تم میں کوئی دینی برادری نہیں۔ ایسی بری اور اسلام کش تعبیریں جو ہمارے درمیان رائج ہو گئی ہیں اور اکثر اہلبیت حضرت کے ... سے بھی سنی جاتی ہیں نہ معلوم کہاں سے آگئی ہیں۔

ہماری یہ بحث ناصبی یا دشمن اہلبیت کے سلسلہ میں نہیں ہے وہ ایک الگ موضوع ہے۔ آج گروہ ناصب افراد پر مشتمل اسلامی سماج میں بہت سی جگہوں پر ہے اور ... ناصبیوں کا وجود ہی نہیں ہے اور ... کی آبادی والے ممالک میں بعض جگہوں پر ہیں لیکن وہاں بھی بہت سے اہل سنت بھی ان سے نفرت کرتے ہیں۔ یہاں ہم ناصبی یا دشمن اہلبیت سے متعلق بحث ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہماری بحث کا موضوع وہ سیدھے سادے اہل سنت ہیں جن کی اکثریت اہلبیت سے محبت کرتی ہے۔ حقیقتاً بہت سے مقامات پر مجھے ذاتی طور سے کئی اہل سنت دوستوں کو نزدیک سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جن میں زیادہ تر افراد اہلبیت کے دوستدار ہیں۔ میرے ایک دوست جو مصر کے ... کے حالات مجھ سے بیان کر رہا تھا کہ میں نے مصر میں ایک سنی بھائی سے ملاقات کی دوران گفتگو اس سنی بھائی نے مجھ سے فرمایا:

"آپ سوچتے ہیں کہ اہلبیت کے دوستدار فقط آپ ہی لوگ ہیں؟ ہم بھی اہلبیت کو دوست رکھتے ہیں۔ آپ خود ہی ملاحظہ فرمائیں کہ مصر میں جس قدر علی، حسن و حسین جیسے نام رکھے جاتے ہیں اتنے عثمان، ابوبکر و عمر نام نہیں رکھے جاتے اور اگر آپ لوگ حسن یا حسین کے نام پر اپنے بچوں کے نام رکھتے ہیں تو ہم ... سے بھی خوب ہے ... وہ جو نام رکھا جاتا ہے وہ حسین ہے۔"

میں خود اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان کروں جسے میں اپنے ایک دوست سے ذکر بھی کر چکا ہوں کہ ایک مرتبہ میں ہیمبرگ، جرمنی میں چند ترکوں سے جو حنفی مذہب تھے، گفتگو کر رہا تھا، میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان لوگوں کے دلوں میں اہلبیتؑ کی محبت کا جذبہ پیدا کروں چنانچہ میں نے اس مقصد کے تحت دو حدیثیں ان کے سامنے نقل کیں اچانک میں نے دیکھا کہ ان کے چہروں کے تاثرات بدل گئے اور وہ عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے سوچا شاید یہ لوگ اس جذبہ سے بہت دور ہیں اور میں نے ابتدا ہی غلطی کی ہے لہذا ان کو کچھ اور فاصلہ سے اپنے مقصد کے قریب لانا چاہئے۔ (میں چونکہ ترکی نہیں جانتا تھا لہذا جرمنی زبان میں گفتگو کر رہا تھا اور میرا ترجمان خود ترکی تھا میری گفتگو کو ترکی میں ترجمہ کر کے ان سے بیان کر رہا تھا) میں نے آزمائش کے طور پر ان سے ایک اور بات کہی کہ دیکھوں یہ لوگ کیا جواب دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ جیسا میں سوچ رہا تھا مسئلہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان لوگوں نے ترجمان کو جواب دیا کہ ان (ان کی اصطلاح میں خواجہ) سے کہو کیا ہم دوستدار اہلبیت نہیں ہیں جو یہ ہم سے اس طرح کی باتیں کر رہے ہیں؟ ہم اہلبیتؑ کو دوست رکھتے ہیں کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مسلمان ہو اور دوستدار اہلبیتؑ نہ ہو؟ لہذا ہم ناصبیوں سے متعلق کوئی گفتگو نہیں کر رہے ہیں۔ اصل میں یہ گفتگو سنی مسلمان بھائی سے متعلق ہے جن میں کوئی بھی ناصبی نہیں ہے۔

ایک شیعہ کا فریضہ

ایک شیعہ کو کسی صورت میں ایسی باتیں کہنے کا حق حاصل نہیں ہے جن سے دینی، سیاسی و اجتماعی سطح پر اہل سنت مسلمان بھائی سے اس کی دینی بھائی چارگی اور اتحاد کی بنیاد متزلزل ہو جائے۔ اگر حج جیسی عظیم عبادت نہ ہوتی تو اب تک مسلمانوں میں انتشار پھیلانے والے بے شمار فتنے سر سے اسلام ہی کو باد فنا کی نذر کر چکے ہوتے اور میرے خیال سے جن اتحاد بخش رابطوں کو پیغمبر اسلامؐ اور صدر اسلام کے مسلمانوں نے اپنے خون جگر اور اپنی جان و مال کا نذرانہ دیکر قائم کیا تھا، مولا علیؑ نے تیس سال کی خاموش زندگی میں خون دل پی پی کر جس کی حمایت و حفاظت کی تھی، امام حسن مجتبیؑ نے اپنے زمانہ کے تلخ سیاسی شرائط کے ہاتھوں ایک غیر مطلوب دستاویز قبول کر کے جسے محفوظ رکھا اور جنگ روک دی تھی، امام سجادؑ (زین العابدین) سے لیکر امام حسن عسکریؑ تک ہمارے تمام ائمہ طاہرینؑ نے امت کے اسی اتحاد و یکجہتی کے پیش نظر ہر طرح کے مصائب و آلام برداشت کئے تھے۔ اگر مراسم حج نہ ہوتے تو ان بزرگواروں کی یہ تمام جانفشانیاں اب تک نہ جانے کب کی نقش عدم بن چکی ہوتیں۔ یہ درست ہے کہ ہمارے اتحاد میں رخنہ ڈالنے والوں نے اہل سنت کے ذہن میں یہ بات بھر دی کہ شیعہ اصلاً خدا کو نہیں مانتے۔ شیعہ یہ کہتے ہیں کہ جبرئیل سے غلطی ہو گئی ہے، طے یہ تھا کہ وہ علیؑ کے گھر جائے لیکن وہ بھول کر پیغمبرؐ کے گھر چلا گیا اور یہ بھی درست ہے کہ شیعوں کے درمیان یہ بات مشہور کر دی گئی ہے کہ جتنے سنی ہیں سب حضرت علیؑ کے دشمن ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اکثریت علیؑ و ائمہ علیہم السلام کا احترام کرتی ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ اس طرح کی غلط تبلیغات نے اپنا پورا پورا اثر دکھایا پھر بھی آخر سال میں ایک بار مختلف ممالک سے کم از کم ایک لاکھ سے زیادہ شیعہ اور سات آٹھ لاکھ سے زیادہ اہل سنت مکہ میں ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ اگر اک ذرا ہمت و حوصلہ پیدا کر کے ایک دوسرے کے بارے میں غور کریں اور آپس میں مل جل کر ایک دوسرے کے حالات معلوم کریں تو بڑی آسانی سے یہ بات ان کی سمجھ میں آ جائے گی کہ یہ سب افواہیں تھیں، جھوٹ اور فریب تھا۔ سوچئے ابھی حج کی شکل میں کم از کم سال میں ایک ہی بار سہی، اس درد... آزمائی کا موقع تو مسلمانوں کے پاس موجود ہے۔

اگر حج کے اسی ایک فائدہ کو محسوس کیا جائے تو یہی اپنے آپ میں بہت بڑا اور اہم ترین فائدہ ہے۔ لہذا میں ذاتی طور سے حج کی اسی ایک امتیازی شان کے تحت اس بات پر بہت زور دیتا ہوں کہ حج کے مراسم ہر سال زیادہ سے زیادہ جمعیت اور شان و شوکت کے ساتھ ادا کئے جانے چاہئیں۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ اپنی وصیت میں اپنے بیٹے امام حسنؑ اور اہل خاندان کو اس قدر تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اللہ اللہ، خدا کی یاد میں مشغول رہو، اس کا تقویٰ اختیار کرو خوف خدا اپنے دل میں بسائے رہو۔ حج ادا کرو اور اپنے خدا کے گھر اور اس کے اطراف کو خالی و تنہا نہ چھوڑو ورنہ دوسرے اس پر قبضہ جما لیں گے۔"

یہ سب اس لئے ہے کہ حج چاہے مقصد کے اعتبار سے جس قدر ضعیف و کم اثر ہو جائے پھر بھی ہمارے لئے ایک عظیم پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا ہے اور ایسی عظیم پناہ گاہ کو کسی بھی حال میں خالی نہیں رکھنا چاہئے۔ اس

؎ شہید مظلوم آیت اللہ بہشتی نے برسوں پہلے اسلامی حج کو اس کے صحیح معنی و مفہوم کے ساتھ ادا کرنے کی آواز اٹھائی تھی۔ اور آج خصوصیت سے ہزاروں ایرانی حاجیوں کی موجودگی میں حج کی اس شان و شوکت پر عالمی استکبار اپنے پورے غصہ اور التہاب کے ساتھ ان سے دست و گریباں نظر آرہا ہے۔

زمانہ میں موجودہ حج سے جو فائدہ ہم حاصل کرتے ہیں مختلف ہوں اور مختلف شرائط و حالات کے تحت ہو۔ نہج البلاغہ۔ وصیت بہ حسنین علیہما السلام۔

یہ حج "اسلامی حج" سے صرف دس سے بیس فی صدی تک ہم آہنگی رکھتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس پُر عظمت عبادت کے اسّی سے نوّے فی صدی حصہ کو بھی اختیار کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیئے۔

اللہ کی حقیقی معرفت

حج سے مراد پہلی منزل میں دین کی اہم ترین اصل کی حفاظت کے لئے ایک اہم واقعہ کی یاد تازہ کرنا ہے۔ دین کی اس اہم ترین اصل کا نام توحید ہے۔ اسلام کا نعرہ "لاالٰہ الا اللّٰہ" اور پیغمبرِ اسلام کی رسالت کا نقطۂ آغاز "قولوا لاالٰہ الا اللّٰہ تفلحوا" ہے۔ یعنی لاالٰہ الا اللّٰہ کہو نجات پا جاؤ گے۔ کیا توحید نے اہم کردار کی حامل ہے؟ جامع و کامل توحید، انسانی زندگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہونے دیتی۔ ہمارے عیب و نقص کا سبب یہ کہ ہم میں صحیح یکتا پرستی کا تصور نہیں ہے۔ اللہ سے متعلق بیشتر لوگوں کی معرفت یا کچھ کم و کاست کے ساتھ یا پھر بہت سے مواقع پر ایک قسم انحراف کا شکار ہے، جن میں سے بعض انحرافات تو مذکورہ آیات میں بھی بیان کئے گئے ہیں۔ تم کیسے خدا کی عبادت کرتے ہو، یہی مسئلہ ہر انسان کے لئے پہلا اور آخری مسئلہ ہے جو خدا کے لئے، اسی کے نام پر اور اسی کی یاد میں زندگی گزار۔ اس مسئلہ میں سب سے زیادہ دلچسپ اور بے پایاں بات یہ ہے کہ انسان کو برابر پیہم اور مسلسل اپنے توحیدی عقیدہ کی اصلاح کرتے رہنا چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ مسئلہ اس قدر اہم اور سخت ہے کہ اس سلسلہ میں ایک، دو، چار، دس مرتبہ نہیں بلکہ برابر اور ہمیشہ اصلاح کرتے رہنا لازمی ہے؟ جواب۔ ہاں یہ مسئلہ اتنا ہی مشکل اور اہم ہے۔ میں مذکورہ آیات سے دو مثالیں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ کو اس کی اہمیت کا احساس ہو جائے۔

ایک یمنی عرب جو بت پرستی چھوڑ کر مسلمان ہوا ہے اور بتوں کی پرستش چھوڑ کر اب صرف اللہ کو یاد کرتا ہے لیکن کیا بات یہیں تمام ہو جاتی ہے اور اس کی توحید کامل ہو جاتی ہے؟ نہیں بلکہ یہ شخص حج کے لئے یمن سے مکہ کی جانب روانگی کا ارادہ کرتا ہے۔ اس طولانی سفر میں زادِ سفر، سواری اور آذوقہ کا انتظام ایک بدیہی اور لازمی امر ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے، کیا اس سفر میں میں خدا کا مہمان نہیں ہوں؟ چنانچہ جب اس سفر میں خدا کا مہمان ہوں تو مجھے زادِ راہ اور سواری وغیرہ کے وسیلہ کی کیا ضرورت ہے؟ اور اسی امید پر وہ سفر کے لئے نکل پڑتا ہے اور ظاہر ہے یہیں اس کے عقیدۂ توحید کی خامیاں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ کوئی اس سے کہے اے یمنی مسلمان بھائی کیا تو اپنے گھر میں خدا کا مہمان نہیں تھا اور فقط اس سفر میں اس کا مہمان ہوا ہے؟ کیا تو صرف حج کے زمانہ میں خدا کے الطاف و اکرام سے فیض یاب اور اس کا مہمان ہوتا ہے؟ یہ پوری زمین تو اسی کا عام دسترخوان ہے۔ آخر تجھ سے کس نے کہہ دیا کہ تو فقط سفر کے ان چار دنوں میں خدا کا مہمان ہے؟ عقیدۂ توحید کی یہی کمی اور خامی جو اس مسلمان بھائی میں پائی جاتی ہے اس کے عمل کو بھی متاثر کرتی ہے۔ یہ فکری انحراف اس کے محور زندگی اور اس کے حرکات و سکنات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ نتیجہ میں وہ اسلامی قانون اور رضائے خدا کے برخلاف اپنے گھر سے بغیر توشہ اور زادِ سفر لئے نکل پڑتا ہے اور ساتھ ہی اسے یہ خیال بھی ہے کہ یہی خدا پر ایمان رکھنے کا تقاضا ہے۔ یہ عجیب خدا فہمی اور خدا شناسی ہے کہ وہ کہے زادِ سفر اپنے ہمراہ نہ لو اگر تم نے ایسا کیا تو گویا خدا پر تمہارا بھروسہ نہیں ہے۔ لیکن وہ خدا جسے اسلام محور و مرکز قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ اگر تم نے توشۂ سفر ساتھ نہ لیا تو خدا کی رضا اور اس کی خوشنودی کے خلاف عمل انجام دیا۔ اب ذرا اس نظریہ کے تحت ہم اپنی جگہ پر غور کریں کہ ہمارے سامنے کتنے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ امور جو ہم اصلاً واقعاً اور قلباً خدا کی رضا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انجام دیتے ہیں ان میں کس قدر انحراف پایا جاتا ہے؟ ہمارے ایسے کتنے اعمال آزمائش اور کسوٹی پر پرکھنے کے قابل ہیں؟ اگر انسان اپنی پوری زندگی یا پھر اپنے اردگرد دوسروں کی زندگیوں یہاں تک کہ علماء و عرفاء کی زندگیوں پر اس زاویہ سے غور کرے تو اسے نظر آئے گا کہ ایک عارف جس نے برسہا برس معرفتِ خدا میں کمال پیدا کرنے کی کوشش کی، اس کی معرفت میں اضافہ بھی ہوا اور وہ عام اور معمولی سطح سے کہیں بلند تر ہو گیا ہے لیکن کیا مسئلہ یہیں تمام ہو گیا اور معرفتِ خدا کی حد ختم ہو گئی؟ نہیں یہ مسئلہ تمام ہونے والا نہیں ہے اور ایسا لامحدود ہے کہ میدانِ عمل میں بھی اپنا اثر رکھتا ہے۔ آیت میں ارشاد ہوتا ہے: "وتزودوا" یعنی زادِ سفر بھی اپنے ہمراہ لو۔ یہاں قرآن کے بیان کا نکتہ اور اس کی بلاغت ہمیشہ کی طرح اپنے کمال پر ہے جہاں وہ ایک عام بات کی طرف اشارہ کرتا ہے وہیں اس کے پہلو ایک بہترین نتیجہ بھی برآمد کرتا ہے، زادِ سفر مہیا کرو اور دیکھو آخرت کے سفر میں بھی زادِ راہ کی ضرورت پیش آئے گی (فان خیر الزاد التقوی) تقویٰ آخرت کے سفر کا توشہ ہے۔ بہرحال ہر سفر میں زادِ سفر کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہاں عبارات بدلے ہوتے ہیں۔

حج اور اقتصادی فائدے

حج کی ان آیات میں ایک نکتہ اور بھی ہے اور یہ نکتہ بھی عرب کے ایک گروہ کی غلط خدا شناسی کی تصویر پیش کرتا ہے۔ یہ لوگ ظہورِ اسلام کے بعد جب بھی حج کے لئے جاتے، ہر منافع بخش کام سے پرہیز کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ ہم خدا کے لئے سفر پہ نکلتے ہیں اور جو شخص حج کے لئے خانۂ خدا کی طرف سفر کرے اسے تجارت اور کسب و کار کے تصور کو اپنے ذہن سے ایک دم نکال دینا چاہیئے۔ اتفاق سے یہ بات آج بھی لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ میں نے خود بعض علماء کو دیکھا ہے جو بعض حاجیوں پر تنقید کرتے ہوئے نظر آئے کہ معلوم نہیں یہ لوگ تجارت کے لئے سفر کرتے ہیں یا زیارت کے لئے۔ ظہورِ اسلام کے بعد یہی فکر عربوں میں بھی پائی جاتی تھی۔ اسلام سے پہلے حج کے مراسم، دینی و زیارتی مراسم سے زیادہ اقتصادی، اجتماعی و سیاسی حیثیت رکھتے تھے۔ چنانچہ حج کے زمانہ میں بڑے بڑے بازار لگائے جاتے تھے۔ منجملہ ان میں بازار "عکاظ" مکہ کے نزدیک اور ایک دو دوسرے بازار بھی الگ الگ جگہوں پر تشکیل پاتے تھے۔ ان بازاروں میں اقتصادی پہلوؤں کے علاوہ اجتماعی، ادبی و ہنری پہلو بھی قابلِ توجہ تھے۔ ان کی ایک مثال سال کے بہترین اشعار کا ان بازار میں پیش کیا جانا بھی ہے۔ یہ ایک سالانہ بازار تھا۔ آج بھی دنیا میں سالانہ بازار لگتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے ملک میں ابھی حال ہی سالانہ بین الاقوامی تجارتی نمائش کا آغاز ہوا ہے۔

یہ طریقہ دنیا کے اقتصادی اصول میں سے ہے کہ اہلِ صنعت سال کے مختلف زمانوں میں دنیا کے الگ الگ گوشوں میں یہ تجارتی نمائشیں لگاتے ہیں۔ مثلاً "ہانوور" (HANNOVER) مغربی جرمنی کے ایک شہر میں مارچ، اپریل کے مہینوں میں ایک بہت بڑی نمائش لگتی ہے۔ جس میں دنیا کے بہت سے ملکوں کی رنگ برنگی ایجادات و مصنوعات پیش کی جاتی ہیں ان نمائشوں کا مقصد نئی ایجادات اور مشنریوں کے لئے بازار بنانا ہوا کرتا ہے۔ عرب کے لوگوں میں بھی ایسے بڑے بڑے سالانہ بازار برپا ہوتے تھے اور وہ بھی سال میں کئی بار مختلف جگہوں پر لگتے تھے۔ ان میں سے تین بازار حج کے زمانہ سے مربوط تھے جو حج کے راستوں کے الگ الگ مراکز پر قائم ہوتے۔ انہی میں سے ایک مرکز جہاں بالعموم حجاج اکٹھا ہوا کرتے تھے "عکاظ" تھا۔ ظہورِ اسلام کے بعد مسلمان یہ کہنے لگا کہ میں چونکہ خدا کی خوشنودی اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے اس سفر پہ نکلا ہوں لہٰذا تجارت، کام کاج اور پیسہ وغیرہ کا تصور مجھے اپنے ذہن سے نکال دینا چاہیئے۔ وہ یہ فکر کرتا کہ حج کے سفر میں تجارت یا مزدوری وغیرہ سرے سے حرام ہے اور سفر کی اہمیت و وقعت کو ختم کر دیتی ہے۔ چنانچہ آیت نازل ہوئی۔

لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم .... (بقرہ/۱۹۸)

اگر حج کے سفر میں خدا کی بخششوں کے امیدوار بھی رہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

متعدد روایتیں یہ بیان کرتی ہیں کہ، میں نے امام سے پوچھا کہ میں حج کے سفر میں اپنے اونٹ کرایہ پر دیتا ہوں اور اس ذریعہ سے پیسہ کماتا ہوں کیا میرے لئے یہ بہتر ہے کہ میں اس سفر میں احرام نہ باندھوں اور حج نہ بجا لاؤں یہاں یہ دیکھنا چاہیئے کہ "لیس علیکم جناح" سے کیا مراد ہے؟ اور یہ طرزِ تفکر کہ حج کے سفر میں اجتماعی، سیاسی و اقتصادی فائدے حاصل کرنا حج کی پاکیزگی اور خلوص کو زائل کر دیتا ہے، کون سا طرزِ فکر ہے؟ اور حقیقتاً یہ خیال کیسے پیدا ہوا؟ یہ انحراف کہاں سے وجود میں آیا؟ کیا توحید اور معرفتِ خدا نے یہ تصور پیدا کیا ہے۔ آخر مسلمان کیسے خدا کی معرفت رکھتا ہے کیا وہ ایسے خدا کی معرفت رکھتا ہے کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے صرف اس کی یاد میں گم رہیں اور کوئی کام کاج نہ کریں جبکہ اسلام کا خدا ایسا نہیں ہے۔ اسلام کا خدا تو وہ ہے جو یہ فرماتا ہے کہ جو شخص اپنے اور اپنے بال بچوں کے لئے روزی حاصل کرنے میں تگ و دو کرتا ہے وہ خدا کی راہ میں جد و جہد اور جہاد کرنے والوں کے مانند ہے۔ یہ بھی جہاد ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اسلام چاہتا ہے کہ ہم مسلمان یورپ اور امریکا کے عیسائیوں جیسے نہ بن جائیں۔ اس بات کو میں نے بارہا خود ان لوگوں سے بھی سنا ہے اور وہاں پر تحقیق کے لئے گئے ایرانیوں سے بھی۔ ابھی حال میں ایک شخص جو وہاں سے واپس ہوا ہے مجھ سے بیان کرنے لگا کہ ایک عیسائی شخص صرف یکشنبہ کے دن جب وہ کلیسا میں جاتا ہے تو اللہ کا بندہ ہے۔ اس دن وہ کلیسا میں جا کر صحیح معنوں میں دس لوگ تا ہے اور اسی کی یاد میں مشغول رہتا ہے لیکن جب وہ کلیسا سے باہر آتا ہے تو کمزور ہو جاتا ہے یعنی یوں کہا جائے

کہ خدا سے دور ہو جاتا ہے اور دوشنبہ سے لیکر شنبہ تک اس کا خدا سے کوئی رابطہ نہیں رہتا۔ نہ وہ اسے یاد کرتا ہے۔ ایک عیسائی کا یہی معمول ہے کہ وہ ہفتہ میں ایک بار اپنے خدا کو مزید یاد کرتا ہے۔ جبکہ اسلام ایک مسلمان کو ایسا نہیں دیکھنا چاہتا کہ وہ شنبہ تک تو کسب و کار و فکر معاش بلکہ ہر طرح کے کاموں میں مشغول ہو اور خدا کو فراموش کر دے۔ اگرچہ تمام عیسائی ایسے نہیں ہیں بلکہ آجکل کلیسا کی روش نے ہی یہ طرز عمل پیدا کر دیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی ایسے بہت سارے عیسائی ہیں جو پورے ہفتہ اپنے تمام کاموں میں خدا کی یاد میں مشغول رہا کرتے ہیں۔ اور کلیسا کی پرانی روش بھی

۱۔ فروع کافی ۴/۲۵۴۔ کتاب الحج، باب ما یجزی من حجۃ الاسلام وما لا یجزی۔

ایسی ہی تھی۔ سابق میں ایسا نہ تھا کہ عیسائی ہفتہ میں ایک بار کلیسا جائے بلکہ وہ صبح، دوپہر اور شب تینوں وقت میں کلیسا جایا کرتا تھا۔ اگر ہم خدا کے ذکر اور اس کی یاد کو کلیسا سے مخصوص سمجھیں تو چونکہ ہمارے شب و روز کی مصروفیتیں ہفتہ میں ایک بار سے زیادہ ہمیں کلیسا جانے کی مہلت نہیں دیتیں لہٰذا ہم بھی ہفتہ میں ایک بار سے زیادہ خدا کی عبادت نہیں کر سکتے۔ اسلام کا خدا کلیسا والا خدا نہیں ہے۔ اسلام کا خدا وہ ہے جو ہر وقت ہر جگہ موجود ہے لہٰذا اسلام ایک بندہ سے مطالبہ کرتا ہے کہ اگر تو اپنے کسب و کار و معاش میں بھی مشغول ہے تب بھی اپنے خدا کو یاد کرتا رہ۔ اور اسے کسی حال میں بھی فراموش نہ کر۔ خدا کے نام اور اس کی یاد کے ساتھ کسب و کار و فکر معاش میں مشغول ہونے اور بغیر یاد خدا کے محنت و معاش میں بہت فرق ہے۔ خدا کے ذکر اور اس کی یاد کے ساتھ علمی مطالعہ (یہاں تک سائنس و ٹیکنالوجی میں بھی) مشغول ہونے اور بغیر ذکر خدا کے تحصیل علوم میں بہت فرق ہے۔ وہ شخص جو سائنسی تجربہ گاہ میں خدا کے ذکر اور اس کی یاد کے ساتھ مشغول ہے چونکہ خدا ہمیشہ اس کے پیش نظر ہے لہٰذا وہ کبھی بھی اپنے آثار، تجربات اور سائنسی مطالعات کو ظالموں کے حوالہ نہیں کر سکتا اور اگر وہ ایسا کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ خدا اپنے قہر و جلال کے ساتھ اس کے پیش نظر نہیں ہے۔ اگر کوئی نام خدا و یاد خدا کے ساتھ اسلحے و جنگی ہتھیار بناتا ہے اس میں اور خدا کو فراموش کر کے اسلحے بنانے والے میں بہت فرق ہے۔ جو خدا کے نام پر ہتھیار بناتا ہے وہ بغور دیکھتا ہے کہ یہ اسلحہ کس کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے اور کون اس کا نشانہ بن رہا ہے۔ یہ تیر کسی ظالم کا گلا پھاڑ رہا ہے یا کسی مظلوم کے حلق میں پیوست ہو رہا ہے۔ وہ کوئی بہت بڑا احمق ہی ہوگا جو یہ کہے کہ میں خدا کے نام پر اور اس کی یاد میں ہتھیار بنا رہا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کل اسی ہتھیار سے اہل حق قتل کئے جائیں گے۔ حقیقت یہ بہت بڑی بیوقوفی ہے۔ اسی بنا پر اسلام ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ خدا کی یاد ہر جگہ اور ہر حالت میں ہمارے پیش نظر رہے۔ "والذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم"[۱] یعنی وہ لوگ جو اٹھتے، بیٹھتے اور کروٹ لیتے ذکر خدا میں مشغول رہتے ہیں۔ انسان کے یہاں تین حالت کے علاوہ چوتھی حالت نہیں پائی جاتی۔ یا وہ کھڑا ہے اور کام کر رہا ہے، یا وہ بیٹھا ہوا ہے اور یا لیٹا ہوا ہے اور اسلام یہ چاہتا ہے کہ وہ ہر حالت میں خدا کو یاد کرتا رہے۔

مندرجہ بالا گفتگو کی بنیاد پر حج کے سفر میں اقتصادی منافع حاصل کرنے کی فکر کسی شخص کے حج کے

۱۔ آل عمران/۱۹۱

خلوص نیت کو نقصان پہنچا سکتی ہے جو پیسہ کمانے کے سلسلہ میں خدا کا تصور نہ رکھتا ہو۔ ورنہ خدا کے تصور کے ساتھ کسب معاش اور خدا کی عبادت میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ اگر ہم کسب معاش کرنے والے سے یہ پوچھیں کہ تم یہ پیسہ کیوں کما رہے ہو؟ تو وہ یہی جواب دیگا کہ اس سے میں اپنے اور اپنے بال بچوں کی پرورش کروں گا اور یہ وہ فریضہ ہے جسے خداوند عالم نے میرے ذمہ عائد کیا ہے۔ کیا ایسی صورت میں پیسہ حاصل کرنا ذکر خدا سے ٹکراؤ کا باعث ہوتا ہے؟ اگر ہم اپنی آمدنی کے اضافی حصہ کو خدا کے فرمان:۔ "وانفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ" یعنی خدا کی راہ میں اپنے مال کو خرچ کرو اور خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو" کے مطابق خدا کی راہ میں انفاق کریں، تو ہمیں چاہئے کہ ہم اس کے حکم پر عمل کرنے کے لئے کچھ اپنے پاس رکھتے بھی ہوں تاکہ اسے راہ خدا میں خیرات کر سکیں یہاں کمائیں تاکہ دوسری جگہ خیرات کریں۔ کیا ایسا کام اللہ کی رضا سے ٹکراؤ رکھتا ہے؟ نہیں۔ ہاں صرف اپنی خواہشات و ضروریات کے پورا کرنے اور پیسہ کمانے سے متعلق اسلام کے معین کردہ تمام حدود و قوانین سے صرف نظر کر جانا خدا سے ٹکراؤ کا باعث ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر انسان اپنے معاملات میں خدا کو ثانوی حیثیت دے اور اس نیت کے تحت حج کے سفر میں پیسہ کمائے یا تجارت کرے تو یہ درست نہیں ہے۔ لیکن وہ انسان جو خدا کو اپنی زندگی کا محور و مرکز قرار دیتا ہے اور اپنی روح کی مانند جو اس کے جسم کے ذرہ ذرہ میں ایمان سرایت کئے ہوئے ہے کہ جسم کا کوئی ریشہ اس سے خالی نہیں ہے، اس طرح اگر وہ اپنے خدا پر عقیدہ رکھتا ہے تو اس کا کوئی عمل، محنت و تجارت، ایمان و معنویت سے کبھی کوئی ٹکراؤ نہیں رکھتا۔

سفر حج اور تحفے

میرے ایک دوست حج کے لئے جا رہے تھے، مجھ سے پوچھنے لگے اگر میں اس سفر میں تحفے تحائف خریدوں اور اس خریداری میں اپنا کچھ وقت صرف کروں تو کیسا ہے؟ میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیسے تحفے اور کس نیت سے خریدنا چاہتے ہو؟ اگر تم خیال کرتے ہو کہ میں اس عظیم سفر پر آیا ہوں لہٰذا یادگار کے طور پر اپنے بیوی بچوں، ماں باپ، بھائی بہنوں یا عزیزوں کے لئے کچھ تحفے لے جاؤں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اگر یہ فکر ہے کہ لوگ کتنا سامان لے جا رہے ہیں میں کتنا لے جاؤں، یعنی فکر حرص و ہوس اور اپنے مال و دولت کی نمائش ہو تو غلط ہے اور صاف نیت کے ساتھ وہ تحفے جو ہمارے عزیزوں اور دوستوں کو خوش و مسرور کریں ان کی خریداری میں جو چند گھنٹے صرف کروگے اور عزیزوں کی خوشی کو خدا کی رضا اور اسلامی فریضہ شمار کروگے تو یہ عمل بہرحال بہت بہتر ہوگا۔

درحقیقت مسلمان ایک خشک اور سخت انسان نہیں ہے بلکہ ایک تربیت یافتہ الفت و شفقت، مہر و محبت کا مجسمہ ہے۔ لہٰذا اس کی زندگی میں بھی ایسے حالات آشکار ہوتے ہیں۔ کیا ہمارے یہاں روایات میں اس بات کی تاکید نہیں ہے کہ جب بھی اپنے کسی دوست یا عزیز کے گھر جاؤ کم از کم ایک عدد سرخ سیب لیے جاؤ اور اس مختصر تحفہ کے ذریعہ ہی اپنے عزیز مومن کو خوش و مسرور کرو؟ یہ سب کیا ہے؟ مہر و محبت، دوستی و برادری سے بھری ہوئی ایسی زندگی خود مطلوب پروردگار ہے اور جو اس راہ میں قدم رکھتا ہے وہ خدا کی مرضی و خوشنودی سے کوئی ٹکراؤ نہیں رکھتا اور اس عمل کے ذریعہ اس کے اس سفر کے اخلاص میں کوئی فرق بھی پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا اب مسئلہ یہی رہ جاتا ہے کہ تم کیسا تحفہ، کس نیت سے خریدنا چاہتے ہو۔ جو شخص خدا کی رضا اور اس کی خوشنودی کی بنیاد پر کوئی تحفہ خریدنا چاہتا ہے تو جب وہ اسے خریدنے نکلتا ہے تو پورے طور سے معین رکھتا ہے کہ مجھے کیا خریدنا ہے اور کس لئے خریدنا ہے، کیسا تحفہ خریدنا ہے اور کس قدر خریدنا ہے۔ اپنے اس ظرف کی روشنی میں وہ ان تمام باتوں پر غور کرتا ہے ورنہ اگر مثال کے طور پر میں سود کے ذریعہ حاصل کئے ہوئے یا قرض لئے گئے پیسوں سے تحفے وغیرہ خریدوں (یہاں بقیہ طریقوں کو بیان نہیں کروں گا، صرف انہیں پہلوؤں کی طرف اشارہ کروں گا) یا میں لوگوں کا مقروض ہوں اور لوگ مجھ سے مطالبہ کر رہے ہیں پھر بھی میں وقت پر انہیں قرض ادا نہیں کرتا بلکہ ان پیسوں سے تحفے خرید کر لاتا ہوں مگر اس انداز سے کوئی تحفے وغیرہ خریدے تو یہ (حج کے سفر) سے ہم آہنگی نہیں رکھتا۔

یا یہ کہ جس معاشرہ میں ہم رہتے ہیں اگر اس میں ایسے محتاج افراد بھی رہتے ہوں جن کی ضرورتیں تحفے تحائف کی خریداری پر مقدم ہیں تو ایسے تحفے و سوغات کا خریدنا بھی مناسب نہیں ہے۔ روح عمل خدا کی یاد روح کی مانند ہمارے رگ و ریشہ میں موجود رہنی چاہئے تاکہ وہ انسان کے لئے ہدایت کا کام کر سکے اور اس کے لئے راہ کا تعیین کرے کہ فلاں جگہ جاؤ اور فلاں جگہ مت جاؤ۔ یہ کام کرو اور وہ کام نہ کرو۔ ایسے کرو، اور ویسے نہ کرو۔ اسلام ایسے ہی خدا کی عبادت کا حکم دیتا ہے۔ اس طرز فکر کی روشنی میں اب جبکہ ہم اللہ کے فضل سے مسلمان ہیں اور بت پرستی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں صحیح اور پاکیزہ اسلامی حج ادا کر رہے ہیں تو ایسی صورت میں ہمیں متوجہ رہنا چاہئے کہ اس سفر کے دوران کار و معاش کی فکر غلط فکر نہیں ہے۔ بلکہ اس سے ایکدم گریز کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسلام کی شناخت میں غلط نتیجہ حاصل کئے ہیں۔ یہ غلطی کہاں سے وجود میں آئی؟ صحیح اور غلط توحید و خدا پرستی میں اختلاط کی بنیاد پر۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا پرستی اپنے وسیع اور کامل معنی و مفہوم کے اعتبار سے ایک مسلمان کی زندگی پر بھرپور اثرانداز ہوتی ہے اور یہ صحیح خدا پرستی و توحید ہی ہے جو اسلامی فرد و امت دونوں کو سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتی ہے۔ اسی بنا پر جناب ابراہیم نے ایک باعظمت موحد کی حیثیت سے اپنے فرزند اسماعیل کے ہمراہ اہل توحید کے لئے اس دور افتادہ مقام پر ایک سادے گھر کی بنیاد رکھی اور توحید سے سازگار عبادتی اعمال و مناسک قائم کئے ہیں۔ لہٰذا توحید و خدا پرستی کے اصل محور و مرکز کی سالمیت و حفاظت کے لئے اللہ کی عظیم خدمات کو یاد رکھنا چاہئے اور یہی حج کی اساس و بنیاد ہے۔

۱۔ اس سلسلہ میں روایت بھی موجود ہے جس میں ارشاد ہے کہ "الھدیۃ من نفقۃ الحج" یعنی ہدیے اور تحفے حج کے اخراجات کا جزو ہیں۔ فروع کافی ۴/۲۸۰۔ کتاب الحج، باب الفضل فی نفقۃ الحج ح ۳

مناسکِ حج کا مقصد، توحید کی حفاظت

چونکہ توحید ہی حج کی اساس و بنیاد ہے لہٰذا ہمیں غور کرنا چاہئے کہ مناسک حج میں اس اصل کی کہاں تک رعایت کی گئی ہے تاکہ حج کے تمام اعمال کو اسی محور پر پرکھا جا سکے۔ چنانچہ ہم اس کی ابتداء میں سے کرتے ہیں جس کی طرف پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

اگر خدا ایک ہے تو اہل توحید کا سماج بھی ایک ہی ہونا چاہئے۔ چنانچہ کوئی چیز اہل توحید کے اس متحد سماج میں افتراق و اختلاف کا سبب نہیں بن سکتی۔ کیا خدا بھی دو ہو سکتا ہے؟ جب خدا ایک ہی ہے تو خدا پرستوں کا سماج بھی ایک اور متحد ہونا چاہئے۔ حج کی صورت میں سال بہ سال ایک اجتماع اس مقصد کے استحکام میں کافی مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر ہم اہل توحید کے سالانہ اجتماع کے لئے کسی ایک نقطہ یا مرکز کا انتخاب کرنا چاہیں تو ان دو معصوم خدا پرستوں کے ہاتھوں تعمیر شدہ خدا کے اس سادہ گھر سے پاکیزہ اور بہتر اور کون سی جگہ نظر آتی ہے؟ وہ مرکز جہاں تک اہل توحید کا سفر کرنا خود توحید و یکتا پرستی کی راہ میں ایک عظیم محافظ و نگہبان کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا ہم مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ

اے اہل اسلام دنیا کے ہر گوشہ و کنار سے ہر درۂ عمیق سے (جیسا کہ خود قرآن میں فج عمیق آیا ہے[1]) اور دور و نزدیک سے خدا کے نام پر اور اس کی یاد کے ساتھ اپنے گھروں سے کوچ کرو تاکہ ایک مخصوص دن مخصوص جگہ پر تمام آلودگیوں اور کثافتوں سے پاک و پاکیزہ ایک عظیم اجتماع تشکیل پائے اور تم اپنی آنکھوں سے اس اجتماع کے (لیشہدوا منافع لھم[2]) مادی، دنیاوی اور معنوی و روحانی منافع و فوائد دیکھو۔ اور درک کر سکو۔ اس اجتماع سے متعلق ایک نکتہ کی طرف پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں۔ اس جگہ مزید دو ایک نکتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جس نکتہ کی طرف اشارہ کر چکا ہوں وہ یہ تھا کہ حج کا موجودہ اجتماع ایسی بہت ساری سازشوں کو ناکام بنانے میں بڑا موثر ثابت ہوا ہے جو صدیوں سے ہم مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اندازی کا سبب بنی ہوئی ہیں اور جن کے ذریعہ مذہبی عنوان کے تحت مختلف طریقوں سے اسلامی سماج و معاشرہ کے اتحاد و یگانگت میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ میں پورے اطمینان و وثوق سے کہہ سکتا ہوں (اور وہ بھی اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر) کہ اگر حج کا یہ سالانہ اجتماع نہ ہوتا تو آج جو کمزور و خفیف سا اتحاد و یگانگت گوناگوں فرقوں اور مسلکوں کے مسلمانوں کے درمیان پایا جاتا ہے، وہ بھی نہ ہوتا یا اگر ہوتا بھی تو بہت ہی ضعیف و کمزور تر ہوتا۔ کیونکہ درحقیقت امت اسلامی کے اتحاد کی حفاظت و نگہبانی حج کا فریضہ ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ جب خدا ایک ہے تو خدا پرستوں کی امت بھی ایک ہی ہے۔ چنانچہ جب ایک شیعہ مسلمان جس کے دماغ میں سنی مسلمان کے خلاف سیکڑوں قسم کی غلط باتیں ڈال دی گئی ہیں جب وہاں جاتا ہے تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ تمام سنی مسلمان علیؑ کے دشمن نہیں ہیں وہ یہ دیکھتا ہے کہ سیکڑوں سنی علیؑ سے اظہار محبت کرتے ہیں۔ اس نے یہ سنا تھا کہ تمام سنی فاطمہ زہراؑ کے دشمن ہیں یہ جھوٹ ہے بلکہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ سیکڑوں سنی جنت البقیع جاتے اور اس جگہ احترام کرتے ہیں یہاں تک کہ بقیع میں دفن دیگر ائمہ معصومینؑ کا بھی احترام بجا لاتے ہیں۔ اس وقت اسے یہ خیال آتا ہے کہ اب تک اسے دھوکہ میں رکھا گیا اور وہ سنی مسلمان بھی جس نے یہ سن رکھا تھا کہ شیعہ در اصل کسی دوسرے دین کا حامل ہے اور ایک الگ قبلہ کی طرف اسلام سے ایک عجیب و غریب نماز پڑھتا ہے۔ وہاں وہ اپنی آنکھوں سے یہ دیکھتا ہے شیعہ اسی کی طرح اسی قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کر رہا ہے۔

ویسے ہی انداز میں حج کے مناسک بجا لا رہا ہے جیسے ہم ادا کرتے ہیں۔ فقط چند جگہوں پر فتووں کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ خود (اہل سنت) بھی آپس میں (فتووں کا اختلاف) رکھتے ہیں۔ اس طرح اس کی سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے کہ ہمارے ذہنوں میں جو غلط تبلیغات کے ذریعہ یہ آمادہ گیا تھا کہ شیعہ کافر اور بے دین ہوتے ہیں، یہ سب جھوٹ ہے۔ (لیشہدوا[1]) اور جب وہ ان تمام مفید باتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے تو پھر غلط تبلیغات آسانی سے اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔

[1] ان مناظر کا دیکھنا اور ان پر غور کرنا بہت مؤثر ہے۔

[1] حج/۲۷ [2] حج/۲۸

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

بسنت محلہ ۵

اے میرے بھائیو! سب یک جا ہو کر اور محبت سے دشمنی کو مغلوب کر دو۔

پریم سمارگ

کسی سے مخالفت یا جھگڑا نہ کرو۔ مخالفت میں تکلیف ہوتی ہے۔ صلح کل ہو کر رہو۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (آل عمران ۱۰۵)

اور تم لوگ ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا۔ جنہوں نے باہم تفرقہ کر لی۔ اور باہم اختلاف کر لیا۔ جبکہ ان کے پاس احکام واضح پہنچ چکے تھے۔ اور ان لوگوں کے لئے سزائے عظیم ہوگی (جو آپس میں مل کر نہیں رہے)

پس آؤ۔ ایسی باتوں کی پیروی کریں جن سے صلح اور میل ہو۔ اور جن سے ایک دوسرے کی عزت بڑھے۔

(رومیوں ۱۴-۱۹)

دیکھو! کیا اچھی اور خوبی کی بات ہے۔ کہ آپس میں بھائی بھائی مل کر رہیں۔ (زبور ۱۳۳-۱)

نیک کام مل کر ہی سرانجام ہو سکتے ہیں

(اتھرو وید ۲۰-۱۲۸-۱۲)

تم ایک دوسرے کی حفاظت کرو۔ اور ایک دوسرے کے مددگار ہو۔ (یجر وید ۱۲-۸۸)

آیت اللہ شہید باقر الصدر
ترجمہ: جناب سید محمد ظفر حسینی

قرآن کا فلسفۂ تاریخ

اس عنوان کے تحت بحث کے لئے سب سے پہلے ہم جس موضوع کا انتخاب کر رہے ہیں وہ ہے "قرآن کریم میں تاریخ کے اصول و ضوابط"۔ اس سلسلے میں جو سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں یوں ہیں، کیا قرآن کریم میں بشری تاریخ کے کچھ اصول و ضوابط پائے جاتے ہیں؟ کیا تاریخ انسانی کچھ ایسے قوانین کی حامل ہے جو اس کے ارتقائی سفر پر حاکم ہوں؟ — وہ کون سے اصول و ضوابط ہیں بشری تاریخ جن کی گرفت میں ہے؟ — تاریخ انسان کا آغاز کیونکر ہوا؟ — اس کی نشو و نما کس طرح ہوئی؟ — اس نے اپنا ارتقائی سفر کیسے طے کیا؟ نظریۂ تاریخ کے بنیادی اسباب کیا ہیں؟ — عملیۂ تاریخ میں انسان کا کیا کردار ہے؟ — عالم بشریت میں آسمانی نبوت و رسالت کے کیا نقوش و اثرات ہیں؟ — یہ وہ تمام سوالات ہیں جن سے مذکورہ بالا موضوع یعنی قرآن میں تاریخ کے اصول و ضوابط کے تحت ہمیں بحث کرنا ہے اور یہ قرآن کا وہ رخ ہے جو مختلف زاویوں اور عنوانات سے سہی لیکن قرآن کریم کے بیشتر حصوں میں زیر بحث آیا ہے، مثال کے طور پر انبیاء علیہم السلام کے قصوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جو اس قرآنی پہلو کے عظیم جزو کی نمائندگی کرتے ہیں، انبیاء کرام کے قصے تاریخی نقطۂ نظر سے زیر بحث آئے ہیں، جن سے مؤرخین نے مکمل استفادہ کیا ہے اور ان تمام واقعات و حوادث سے متعرض ہوئے ہیں جنہیں قرآن کریم نے بیان کیا ہے اور جب مؤرخین نے کہیں پر کوئی ایسا خلا محسوس کیا ہے جسے قرآن نے پر نہیں کیا ہے تو انہوں نے اسے روایات و احادیث کے ذریعہ پُر کرنے کی کوشش کی ہے یا جو کچھ گذشتہ مذاہب کی کتابوں میں نقل ہوا ہے اس سے خلا کو بھرنا چاہا ہے اور یا جھوٹی داستانوں اور خرافات کے ذریعہ اسے ختم کرنے کی سعی کی ہے جس کے نتیجہ میں اس قرآنی پہلو کے نظم و ترتیب کی غرض سے تاریخ سے متعلق دفتر کے دفتر معرض وجود میں آگئے ہیں۔

اسی صورت قرآن میں اس پہلو پر ایک اور زاویہ یعنی قرآن کے اسلوب داستان نگاری کے نقطۂ نظر سے بھی بحث ہوئی ہے، نیز یہ کہ یہ قرآنی اسلوب حقیقت و واقعیت، قدرت بیان اور ندرت کلام کے جوہروں سے کس حد تک آراستہ ہے، قرآنی قصے حیاتی پہلوؤں اور تحرک بخش و واقعات آفریں عناصر کی دولت سے کتنے زیادہ مالامال ہیں؟ — یہ بھی چند ایسے گوشے ہیں جن پر گذشتہ موضوع کے تحت بحث ناگزیر ہے، نیز ان کے علاوہ بھی قابل بحث کچھ اور موضوعات ہیں، لیکن ہم فی الحال مذکورہ عنوان کے تحت جس زاویہ سے بحث کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ "اس گوشے سے تاریخ کے اصول و ضوابط پر کس حد تک روشنی پڑتی ہے" تاریخی اصول و ضوابط سے ہماری مراد وہ قوانین و حدود ہیں جو حرکت تاریخ میں مکمل طور پر کارفرما ہیں بشرطیکہ قرآن نے اس طرح کے اصول و ضوابط اور قوانین و حدود کا کوئی تصور ہمیں عطا کیا ہو۔

دوسرے علوم و فنون کی مانند تاریخ کی دنیا میں بھی ہمیں کچھ موجودات و ظواہر نظر آتے ہیں جس طرح فلکیات و طبیعیات وغیرہ کے میدانوں میں کچھ ظواہر ملتے ہیں اسی صورت تاریخی میدان میں بھی — جس کی توضیح و تشریح مخصوص فصلوں میں ہم عنقریب تاریخ ہی سے پیش کریں گے، موجودات و ظواہر کی ایک تعداد نظر آتی ہے، جس طرح دیگر میدانوں میں ان موجودات و ظواہر کے کچھ اصول و ضوابط اور قوانین و حدود معین ہیں اسی صورت ہمیں یہ دریافت کرنے کا حق حاصل ہے کہ تاریخی میدان میں پائے جانے والے ظواہر بھی کچھ اصول و ضوابط کے حامل ہیں یا نہیں؟ ان اصول و ضوابط اور قوانین و حدود کے بارے میں قرآن کریم کا موقف کیا ہے؟ اور قرآن نے ان کے متعلق مثبت یا منفی انداز میں، مجمل یا مفصل طور پر کس نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے؟؟

بعض لوگ اس وہم کے شکار ہیں کہ ہمیں — یہ توقع وابستہ نہیں کرنا چاہئے کہ قرآن کریم میں تاریخ کے اصول و ضوابط" جیسے موضوع پر کوئی بحث موجود ہوگی، کیونکہ طبیعیات، کیمیا اور نباتیات وغیرہ کے قواعد و ضوابط کی مانند تاریخ کے اصول و ضوابط کا مسئلہ بھی ایک علمی مسئلہ ہے اور قرآن اکتشافات و اختراعات کی کتاب کی حیثیت سے نازل نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی حیثیت کتاب رشد و ہدایت کی ہے۔ قرآن کسی درسی کتاب کی شکل میں نہیں آیا ہے اور رسول اللہ پر ایک معلم کے عنوان سے نہیں نازل ہوئے ان معنوں میں کہ جس طرح شاگرد کے لئے استاد کی باتیں لائق تقلید و عمل ہوتی ہیں، اسی صورت قرآن کا وجود بھی ایک استاد کی سی ہے تاکہ وہ ماہر علوم اور متمدن و تہذیب یافتہ لوگوں کے ایک گروہ کا معلم و مربی ہو بلکہ یہ کتاب صرف اس لئے نازل ہوئی ہے کہ لوگوں کو گمراہی اور جاہلیت کے اندھیروں سے نکال کر رشد و ہدایت اور اسلام کے اجالوں میں لے آئے، لہذا اسے محض کتاب اصلاح و ہدایت کہا جا سکتا ہے نہ یہ کہ اکتشافات و اختراعات کی کتاب تصور کیا جائے۔

یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمیں قطعاً یہ امید نہیں رکھنا چاہئے کہ قرآن دیگر علوم و فنون سے متعلق کسی قسم کے حقائق و معارف اور ان کے بنیادی قواعد و ضوابط کے بارے میں کوئی نظریہ پیش کرے گا، یا طبیعیات، کیمیا اور نباتیات و حیوانیات وغیرہ جیسے موضوعات پر کوئی بحث و تبصرہ کرے گا۔ البتہ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ان تمام علوم و فنون کی طرف قرآن میں اشارات ضرور موجود ہیں، لیکن یہ اشارات بس اسی حد تک ملتے ہیں جس حد تک قرآن کے ان ہی پہلو (اثبات الوہیت کے مسئلے) پر روشنی پڑ سکے اور اس الٰہی کتاب کا ربانی رخ سامنے آ سکے۔ ایک ایسی کتاب جو ماضی، حال اور مستقبل کے تمام حالات کا اپنے دامن میں احاطہ کئے ہوئے ہے جس کو گوناگوں علوم و فنون کے مختلف میدانوں میں انسانی تجربات و انکشافات پر علمی حقائق و معارف اور بے شمار رازہائے سربستہ کے چہروں سے نقاب کشائی کے سلسلے میں صدیوں کی سبقت و اولیت حاصل ہے، لیکن یہ قرآنی اشارات و کنایات نہ ہی علمی اغراض و مقاصد کے تحت ہیں جن کا ابھی تذکرہ ہوا ہے نہ یہ کہ ان کا مقصد فزکس اور کیمسٹری وغیرہ کی تعلیم دینا ہو۔ قرآن، انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کی جگہ خود نہیں لینا چاہتا ہے اور نہ اس کی خداداد لیاقتوں اور صلاحیتوں کو تلاش اور ریسرچ کے ذرائع سے باز رکھنا چاہتا ہے خواہ وہ زندگی کے شعبوں میں سے کسی بھی شعبۂ حیات میں تلاش اور ریسرچ کا مسئلہ ہو، جس کا ایک جزو تجربات و مشاہدات اور موجودات سے آشنائی بھی ہے، چنانچہ قرآن نے کبھی بھی ان امور کی جگہ خود نہیں لینا چاہی ہے، بلکہ خود کو ایک ایسی روحانی اور معنوی طاقت کے عنوان سے پیش کیا ہے جس کا کام انسان کی ہدایت و رہنمائی، اس کی خوابیدہ طاقتوں کو بروئے کار لانا، زندگی کے سچے راستے پر اسے گامزن کرنا اور ولولہ و تحرک عطا کرنا ہے۔

غرضیکہ یہ بات جب تسلیم شدہ ہے کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کا فریضہ لوگوں کی ہدایت و رہنمائی ہے اور وہ اکتشافات و اختراعات کی کتاب نہیں ہے تو اب ہمارے لئے اس بات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے کہ ہم یہ بیجا توقع رکھیں کہ قرآن ان تمام علوم و فنون سے متعرض ہو جن کے اصول و ضوابط کی تعیین و حد بندی اور قوانین و حدود طے کرنا انسانی فہم و دماغ کا کام ہے — ہم کیوں بلاوجہ منتظر رہیں کہ قرآن علوم و فنون کے بنیادی اصول کی نشاندہی کرے گا اور اس سلسلے میں اپنے نظریات بیان کرے گا؟ یا کائنات کے بے شمار شعبوں اور میدانوں میں سے صرف شعبۂ تاریخ میں اس کے اصول و ضوابط سے متعلق کوئی علمی مفہوم ہمارے سامنے پیش کرے گا؟؟ — جبکہ دیگر شعبوں میں قرآن نے اس طرح کی کوئی روش نہیں اپنائی ہے، اور اس سلسلے میں قرآن پر کوئی اعتراض بھی وارد نہیں ہو سکتا کہ وہ دیگر میدانوں میں اس قسم کے رویہ کا حامل کیوں نہیں ہے؟؟ — کیونکہ اگر ان اصول و ضوابط اور قواعد و قوانین کی نشاندہی اور حقائق و معارف کی نقاب کشائی کی ذمہ داری قرآن کے دوش پر ہوتی تو اس کتاب کی نوعیت بھی کچھ اور ہی ہوتی پھر یہ پوری فضائے بشریت کے فائدے اور مقصد کی کتاب نہ رہ جاتا بلکہ علوم و فنون کے ماہر طبقہ کی مخصوص کتاب ہو جاتا جسے ایک درسی اور نصابی کتاب کے عنوان سے مخصوص گروہوں، شعبوں اور حلقوں میں پڑھایا جاتا۔

ہمارے اختیار کردہ موضوع سے متعلق بعض افراد کے یہ چند اعتراضات ہیں اور باوجودیکہ کسی حد تک یہ اعتراضات بجا اور درست ہیں یعنی قرآن اکتشافات و اختراعات کی کتاب نہیں ہے، وہ انسان کی ارتقائی طاقتوں، ایجاد و اختراع کی قوتوں اور تلاش اور ریسرچ کی صلاحیتوں کو زنگ آلود نہیں بنانا چاہتا ہے، بلکہ وہ رشد و ہدایت کی کتاب ہے، اس کے باوجود ہمیں تاریخ اور دنیا کے دیگر علوم و فنون کے درمیان ایک بنیادی فرق نظر آتا ہے اور یہی وہ بنیادی فرق ہے جو تاریخ پر حاکم اصول و ضوابط نے ایک ایسا مسئلہ وجود میں لاتا ہے جسے علوم کے دیگر شعبوں اور بشری معارف کے دیگر میدانوں کے برخلاف قرآنی فریضے سے مربوط اور منسلک کر دیا ہے، یعنی ہدایت ہی کی طرح وہ بھی قرآن کی اہم ترین ذمہ داری ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن کتاب ہدایت ہونے کے ساتھ ساتھ اصلاح بشری اور تغییر باطن کی کتاب بھی ہے، اور "تغییر باطن" یہ قرآن کی وہی ذمہ داری ہے جس کو خود اس نے ظلمت سے نکال کر نور میں لانے سے تعبیر کیا ہے، "یخرجہم من الظلمات الی النور"

تفسیر بالمعنی کا عمل دو بہتر پہلوؤں کا حامل ہے۔ اس کا اولین پہلو اس کے مضمون اور مطالب و مفاہیم کا ہے، جس کی بازگشت احکام الٰہی، ضوابط حیات اور قوانین زندگی کی جانب ہوتی ہے اور جنہیں ہم تشریعی امور کا نام دیتے ہیں عمل تفسیر کا یہ الٰہی، ربانی اور آسمانی پہلو ہے، یہی پہلو اس شریعت الٰہیہ کی نمائندگی کرتا ہے جو نبی اکرمؐ پر نازل ہوئی اور جس کا نزول ہوتے ہی تمام تاریخوں میں اس کا چرچا ہوا، کیونکہ یہ شریعت اس ماحول کی وسعت سے جس میں نازل ہوئی تھی کہیں زیادہ بڑی اور اس فرد کے دائرۂ وجود سے جس کو اس کی تبلیغ و رسالت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی کہیں زیادہ وسیع تھی۔ — چنانچہ عمل تفسیر کے اس پہلو کو مضمون اور مطالب و مفاہیم کے پہلو کا نام دیا جا سکتا ہے، نیز اسے تشریعی احکام اور ایسے قواعد و قوانین کے نام سے بھی یاد کر سکتے ہیں، عمل تفسیر جن کی پابندی ہم پر لازم قرار دیتا ہے اور یہی اس کا الٰہی و ربانی پہلو بھی ہے۔ اس کے علاوہ عمل تفسیر ایک اور پہلو کا حامل ہے جو نبی اکرمؐ اور اصحاب کرام کے ذریعہ بروئے کار آیا ہے، چنانچہ ہم جب ایک ایسے عمل کی شکل میں جو لوگوں کے ایک گروہ یعنی پیغمبر اکرمؐ اور اصحاب کرام کی ذوات مقدسہ میں مجسم ہو کر سامنے آیا ہے۔ ملاحظہ کرتے ہیں.

اور ایسے ان افراد میں مجسم ایک اجتماعی عمل کے روپ میں دیکھتے ہیں نیز یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو مختلف حالات و واقعات کے موڑ سے گذرا ہے اور جس نے متعدد اقتصادی، معاشرتی، سیاسی اور فوجی میدانوں میں اجتماعی بحث و نزاع کے مختلف مراحل سر کئے ہیں، (اس صورت) جب ہم تفسیر کے اس عمل کا اس حیثیت سے جائزہ لیتے ہیں کہ یہ عرصۂ تاریخ میں واقع ایک ایسا مجسم بشری کردار ہے جس کا (تاریخی دنیا کے علاوہ) دوسرے گروہوں اور دیگر حالات و واقعات سے بھی ایک ایسا تعلق ربط اور لگاؤ ہے، جو اس کی تائید و تردید دونوں کا مستحق بن سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جب عمل تفسیر کا اس نقطۂ نظر سے ہم مشاہدہ کرتے ہیں تو وہ انسانی جنبہ کے حامل ایک بشری کردار کی شکل میں سامنے آتا ہے اور یہ وہ افراد ہیں جن پر دوسرے لوگوں کی مانند تاریخی اصول و ضوابط بہت زیادہ حد تک حکم فرما ہوتے ہیں بالکل اسی طرح سے کہ جیسے دیگر طبقات اور گروہوں پر ان کی فرماں روائی ہوتی ہے۔

اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ عمل تفسیر اس کد و کاوش کا نام ہے جو قرآن کریم اور پیغمبر اکرمؐ کی جانفشانی کا ثمرہ ہے جس کے دو پہلو ہیں۔ ایک قانون و شریعت اور دوسرا وحی و الہام، چنانچہ وہ ایک الٰہی و ربانی عمل اور بشری تاریخ کی سطح سے کہیں زیادہ بلند اور مافوق ہے لیکن اس اعتبار سے کہ وہ ایک ایسا عمل ہے جسے تاریخ انسانیت کے میدان میں انجام دیا جا رہا ہے اور اس حیثیت سے کہ وہ ایک ایسی بشری سعی و کوشش کا نام ہے جس کا براہ راست دوسری بشری کاوشوں اور کوششوں سے مقابلہ اور ٹکراؤ ہے۔ بہرحال اسے ایک ایسا تاریخی عمل تسلیم کرنا ہوگا جس پر تاریخی اصول و ضوابط بہر صورت حاکم ہوں گے، چنانچہ خداوند عالم نے موجودات عالم کے نظم و ضبط کی خاطر تاریخ کی دنیا میں جو قواعد و قوانین وضع فرمائے ہیں وہ اس پر حکم فرما ہیں۔ — یہی وجہ ہے کہ ہم یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ جب قرآن عمل تفسیر کے اسی دوسرے پہلو یعنی بشری و انسانی جنبہ کے متعلق گفتگو کرتا ہے تو اس کا محور محض ذات بشر ہوتی ہے، آسمانی پیغام اور وحی و الہام کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ انسان کے صرف بشری جنبہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے گفتگو کرتا ہے اور ان انسانوں کا تذکرہ کرتا ہے جہاں وہ تمام تاریخی اصول و ضوابط حکم فرما ہوتے ہیں جو دوسرے افراد کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں، مثال کے طور پر ہمیں یہ ملے گا کہ جب قرآن نے جنگ احد میں مسلمانوں کی فتح و کامیابی کے مسئلے پر روشنی ڈالنا چاہی، درصورتیکہ وہ جنگ بدر میں عظیم الشان نمایاں کامیابی حاصل کر چکے تھے لیکن اس کے بعد انہیں جنگ احد میں کافی نقصانات اٹھانے پڑے اور ابتدا میں شکست کا سامنا کرنا پڑا تو جب قرآن نے اس نقصان اور شکست کا تذکرہ کیا تو کن الفاظ میں کیا؟ — کیا یہ کہا کہ سماوی پیغام اور نبوت و رسالت کو نقصان و شکست کا سامنا کرنا پڑا؟؟..

نہیں! یہ ہرگز نہیں کہا!!.... کیونکہ وحی الٰہی اور نبوت و رسالت کا مرتبہ دنیاوی معیاروں کے مطابق وضع کئے گئے فتح و شکست کے مفاہیم سے کہیں زیادہ برتر اور بلند ہے، الٰہی پیغام اور نبوت و رسالت کبھی شکست خوردہ ہوئے ہیں اور نہ کبھی شکست کھا سکتے ہیں، ہاں! جسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا ہے وہ صرف انسان ہے خود یہ وہی انسان کیوں نہ ہو جس کو الٰہی پیغام کی تبلیغ و رسالت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ انسان بہرحال تاریخی اصول و ضوابط کی گرفت میں ہوتا ہے، چنانچہ ہمیں اس سلسلے میں قرآن کا ارشاد یوں ملے گا: وتلک الایام نداولها بین الناس (آل عمران/۱۴۰) یعنی یہ (فتح و شکست کے) وہ دن ہیں جنہیں ہم لوگوں کو یکے بعد دیگرے دکھاتے ہیں.

یہاں پر قرآن نے انسانوں کا ذکر بحیثیت انسان کے کیا ہے، چنانچہ مقصود قرآنی یہ ہے کہ اس واقعہ کا ربط درحقیقت تاریخی اصول و ضوابط سے ہے مسلمانوں کو جنگ بدر میں ایسی صورت حال میں کامیابی نصیب ہوئی جو تاریخی اصول و ضوابط کے مطابق اس دور کے موجودہ حالات فتح و کامیابی کی متقاضی تھی اور معرکۂ احد میں انہیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا جب تاریخ کی وہی صورت حال شکست و ہزیمت ہی کی متقاضی تھی۔ ان یمسسکم قرح فقد مس القوم... الخ (آل عمران/۱۴۰) یعنی اگر تمہیں شکست اور نقصان کا سامنا کرنا پڑا ہے تو تمہارے دشمنوں پر بھی یہ افتاد پڑے گی، ہم نے فتح و شکست کے دنوں کو باری باری سب کے لئے قرار دیا ہے — قرآن کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم یہ تصور ہرگز نہ کرنا کہ فتح و کامیابی اللہ کا عطا کردہ تمہارا ذاتی حق ہے بلکہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ نصرت و کامیابی تمہارا فطری حق ہے، بشرطیکہ تم نے ان تاریخی اصول و قوانین کی روشنی میں اس کے اسباب و مقدمات خود فراہم کئے ہوں، جو حصول کامیابی کے لئے خداوند عالم کی جانب سے معین کئے گئے ہیں، چنانچہ جنگ احد میں تمہاری ناکامی کا یہی سبب ہوا، چونکہ تمہارے حالات فتح کے متقاضی نہیں تھے اس لئے شکست کا منہ دیکھنا پڑا — غرضیکہ یہاں پر قرآن کا روئے سخن بشر کی طرف بعنوان بشر ہے، اس کی گفتگو کا محور بشری اعمال و افعال ہیں، یہاں پیغام سماوی اور منصب نبوت و رسالت سے کوئی بحث نہیں ہے اور صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں بلکہ قرآن اس مرحلے میں اور بھی آگے گیا ہے اور اس نے پردۂ تاریخ پر نقل و حرکت کرنے والی نہایت پاکیزہ و پارسا مخلوق یعنی دنیائے بشریت کو دھمکی تک دی ہے، چنانچہ خطاب کرتے کہا ہے کہ اگر تم اپنا تاریخی کردار صحیح معنوں میں ادا نہ کرو گے اور خود کو اس بات کا اہل ثابت نہ کرو گے کہ الٰہی پیغام کی تبلیغی ذمہ داری اور منصب رسالت کا بار سنبھال سکو تو اس کا قطعاً یہ مطلب نہ ہوگا کہ وحی الٰہی کا سلسلہ منقطع اور پیغمبری کا کام بند کر دیا جائے اور تاریخی اصول و قوانین نافذ نہ کئے جائیں، ایسا ہرگز نہ ہوگا، تم اگر اپنا فریضہ ادا نہ کرو گے تو تمہاری جگہ پر دوسروں کو لایا جائے گا تاریخ تمہیں اپنے منصب سے معزول کر کے تمہارے بدلے یہ ذمہ داری دوسری امتوں کے حوالے کر دے گی، جو تمہارے مقابلے میں تم سے کہیں زیادہ بہتر اسباب و حالات فراہم کرنے کی اہل ہوں گی اور تم سے کہیں زیادہ بہتر انداز میں اپنے فرائض و کردار ادا کر سکیں گی، اور صرف یہی نہیں بلکہ ایسی صورت حال میں جب حالات اس کے متقاضی نہ ہوں گے کہ تم لوگوں پر گواہ بن سکو تو پھر وہ امتیں تم پر اور تمام لوگوں پر گواہ قرار دی جائیں گی۔

چنانچہ اس مطلب کی طرف یوں اشارہ کیا ہے: الا تنفروا یعذبکم .... الخ (توبہ/۳۹)

یعنی اگر تم نے خود کو جہاد کے لئے آمادہ نہ کیا تو دردناک عذاب میں مبتلا ہوگے، اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لائے گا، تم اسے کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچا سکتے ہو وہ ہر امر پر قادر ہے — دوسری جگہ یوں ارشاد ہے: یاایها الذین آمنوا من یرتد منکم عن دینه ..... الخ (مائدہ/۵۴) یعنی اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی بھی اپنے دین سے منحرف اور مرتد ہوا تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض ایسے لوگوں کو وجود میں لائے گا جنہیں وہ خود دوست رکھتا ہوگا اور وہ بھی اسے دوست رکھتے ہوں گے، جو مومنین سے انکسار و خاکساری کے ساتھ پیش آئیں گے، کافروں سے شدت و سختی کا سلوک روا رکھیں گے، راہ خدا میں جہاد کریں گے اور انہیں ملامت کرنے والوں کی ملامت کا کوئی خوف و ہراس نہ ہوگا۔ یہ خدا کا لطف و کرم ہے وہ جسے چاہے نوازتا ہے اور وہ صاحب وسعت اور علیم و دانا ہے۔

معلوم ہوا کہ ان جگہوں پر قرآن کا موضوع بحث عمل تفسیر کا دوسرا رخ بشری پہلو ہے اور انسان سے اس کی گفتگو اس کی کمزوری و ناتوانی، استقامت و پامردی، انحراف و گمراہی اور حالات کی فراہمی و عدم فراہمی اور سازگاری و ناسازگاری کے بارے میں ہے۔

چنانچہ یہ بات یہیں سے ثابت ہو جاتی ہے کہ تاریخ اور تاریخی اصول و ضوابط کے موضوع کا قرآن جیسی الٰہی کتاب سے جو اگرچہ رشد و ہدایت کی کتاب ہے اور لوگوں کو تاریکی سے نکال کر نور میں لانے کے لئے نازل ہوئی ہے — بے حد گہرا ربط اور اعضائے جسمانی کا سا شدید تعلق ہے، کیونکہ عمل تفسیر کے عملی رخ یا یوں کہا جائے کہ اس کے بشری پہلو کا سر تسلیم ہمیشہ تاریخ کے قواعد و قوانین کے سامنے خم اور سدا تاریخ کے زیر اثر ہے، لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس سے مکمل استفادہ کریں اور قرآن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہمیں ایسے نظریات و تصورات عطا کرے جن سے فلسفۂ تاریخ اور تاریخی اصول و ضوابط کے موضوع پر اسلام و قرآن کے بنیادی افکار و نظریات کا ایک اجمالی نقشہ سامنے آسکے

اس بیان سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ فلسفۂ تاریخ کی نوعیت فزکس، کیمسٹری اور علوم فلکیات و حیوانیات و نباتیات وغیرہ کی سی نہیں ہے، کیونکہ ان علوم اور ان کے اصول و ضوابط کا تاریخ سے براہ راست کوئی رابطہ نہیں ہے لیکن اس کے برعکس تاریخ اور تاریخی اصول و ضوابط کا براہ راست رابطہ عمل تفسیر سے ہے، اسی لئے جب بھی عمل تفسیر کا دوسرا رخ زیر بحث آئے تو ضروری ہے کہ فلسفۂ تاریخ اور تاریخی اصول و ضوابط کی بھی توضیح و تشریح کی جائے اور اس سلسلہ میں ہمیں قرآن سے پوری توقع رکھنا چاہئے کہ وہ ہمیں اس موضوع سے متعلق بنیادی قواعد و قوانین سے آگاہ کرے، البتہ ہماری یہ توقعات قطعاً بیجا ہوں گی کہ قرآن علم تاریخ اور اس کے قواعد و ضوابط کی ایک مدرسی کتاب کا کردار ادا کرے یعنی اس کے دامن میں تاریخ سے متعلق تمام تفصیلات و جزئیات موجود ہوں حتیٰ کہ اس میں وہ تمام باتیں بھی بیان کی گئی ہوں جن کا تفسیر کے اس عمل سے — جسے نبی اکرمؐ کی ذات گرامی انجام دیتی ہے — دور کا بھی واسطہ نہ ہو کیونکہ قرآن بنیادی طور پر رشد و ہدایت کی کتاب ہے، اس نے کسی بھی علم

باقی صفحہ ۱۶ پر

درس آیت اللہ العظمیٰ منتظری

ترجمہ: جناب محمد علی

معرفتِ خدا

قبلہ عالی قدر حضرت آیۃاللہ العظمیٰ منتظری مدظلہ نے کچھ عرصہ سے نوجوان نسل کے لئے بعض اہم موضوعات پر مشتمل نہج البلاغہ کے خطبوں کی تشریح و توضیح کا نہایت مفید سلسلہ شروع کیا ہے۔ پیش نظر مقالہ "معرفت الٰہی" کے موضوع پر آپ کے درس کا ترجمہ ہے جس میں مولائے کائنات کے خطبہ نمبر ۱۸۶ کی تشریح کی گئی ہے۔

— ادارہ —

صفات خداوند عالم :

خداوند عالم کی صفتیں تین طرح کی ہیں :۔

۱۔ صفات حقیقیہ : جیسے علم، قدرت، حیات اور ارادہ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو حقیقی ہیں۔ ان کو صفات کمال بھی کہتے ہیں۔

۲۔ صفات اضافیہ : جیسے خالقیت رازقیت۔

ہر مکرّر کو اضافہ کہتے ہیں لہٰذا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا رازق ہے، خالق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مخلوق بھی ہے جس کو اس نے خلق کیا ہے جس کو وہ رزق دیتا ہے۔

ان صفت کو صفاتِ اضافیہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا دوسرا سرا خود ہم ہیں — ہم کو رزق ملتا ہے تو آخر یہ رزق کون دیتا ہے؟ — ظاہر ہے کہ ہمارا رازق خدا ہے۔ اس صفت رازقیت کو صفت اضافیہ کہتے ہیں، اسی طرح دوسرے موارد بھی ہیں۔

۳۔ صفات سلبیہ : یہ وہ صفتیں ہیں جو خدا کے لئے نقص اور عیب ہیں۔ اس لئے ہم ان صفتوں سے خدا کی نفی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا مرکب نہیں ہے، جسم نہیں ہے، عاجز نہیں ہے، جوہر نہیں ہے، عرض نہیں ہے ......

بہرحال ہم خدا کو ان ہی اضافی صفات اور صفات سلبیہ کے ذریعہ پہچانتے ہیں — صفات حقیقیہ، جو صفات کمال ہیں ہم ان کو نہیں پہچان سکتے۔ اس لئے کہ ہم خود ناقص اور محدود ہیں اور ناقص کامل کا سراغ نہیں لگا سکتا۔ محدود، لامحدود کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

علم، قدرت، حیات اور ارادہ خدا وہ صفات ثبوتیہ ہیں جو حقیقی ہیں یہ صفتیں عین ذات خدا ہیں۔ یعنی علم خدا وہ علم ہے جو لامتناہی ہے، قدرت خدا وہ قدرت ہے جو لامحدود ہے۔ حیات پروردگار عالم وہ حیات ہے جو غیر متناہی ہے۔ اسی طرح ذات باری تعالیٰ بھی غیر متناہی ہے وہ ہم انسانوں کی طرح نہیں ہے۔ ہمارا علم اور ہماری قدرت زائد بر ذات ہیں۔ اس لئے کہ ہم دراصل عالم نہیں ہیں، پڑھنے لکھنے کے بعد تھوڑا سا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ دراصل ہمارے پاس قدرت نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ ہم کو قدرت اور توانائی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ خدا کا علم اور اس کی قدرت ذات خدا کی طرح لامتناہی ہیں، کوئی صفت اس کی ذات سے جدا نہیں ہے، اس لئے ہم اس کی ذات و صفت کو کما حقہ نہیں سمجھ پاتے۔

ہم ایک بار پھر اس بات کو بیان کر دیں کہ ہمارے لئے خدا کی معرفت صرف صفات اضافیہ اور صفات سلبیہ کے ذریعہ ممکن ہے۔ چونکہ "صفات اضافیہ" میں ہم خود طرف اضافت (دوسرا سرا) ہیں اس لئے کہتے ہیں کہ ہم حادث ہیں۔ ہر حادث کو ایک محدث کی ضرورت ہے۔ ہم کو رزق دیا جاتا ہے لہٰذا ہمیں ایک رازق کی ضرورت ہے۔

صفات سلبیہ کے ذریعہ خدا کو پہچاننے کا طریقہ یہ ہے کہ — چونکہ ہم اپنی کمی اور نقص و عیب کو درک کر سکتے ہیں جیسے عاجزی، احتیاج، مرکب ہونا، یا جسم والا ہونا وغیرہ۔ اس لئے ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ خدا میں یہ کمی نہیں ہونی چاہئے۔

لیکن صفات حقیقیہ، ذات خدا کی طرح ہیں وہ ہمارے فہم کی دسترس سے باہر ہیں۔ ہم ان کی کنہ تک نہیں پہونچ سکتے اس لئے کہ ہم ان کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

جن لوگوں نے خدا کی صفات حقیقیہ کی توضیح کی کوشش کی ہے۔ وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر بھٹک گئے ہیں یا ان سے بہت ہی فاش غلطی سرزد ہوئی ہے۔

صفات خدا کے بارے میں اشاعرہ کا عقیدہ :

اشاعرہ کا کہنا ہے کہ خدا کے صفات حقیقیہ حقیقت رکھتے ہیں وہ زائد بر ذات ہیں! یعنی خدا الگ ہے اور اس کا علم ایک الگ موجود ہے جو اس کی ذات کے علاوہ ہے اسی طرح قدرت، حیات، وغیرہ غرض کہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ خدا کی سات حقیقی صفتیں، ذات خدا سے الگ موجودات ہیں اور وہ بھی قدیم ہیں۔ اس طرح وہ درحقیقت آٹھ قدیم کے قائل ہو گئے اور انہیں، اشاعرہ "قدماء ثمانیہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

متکلمین کی اس جماعت یعنی اشاعرہ پر اعتراض کیا گیا ہے کہ اگر عیسائی اقانیم ثلاثہ (باپ، بیٹا، روح القدس) کے قائل ہونے کی وجہ سے مشرک ہو گئے تو اشاعرہ آٹھ قدیم ماننے کے بعد کیوں کر نہ مشرک ہوں گے یہ بھی شرک ہی کی ایک قسم ہے۔

صفات خدا کے بارے میں معتزلہ کا عقیدہ :

معتزلہ اس عقیدہ سے دور رہنا چاہتے تھے اور چونکہ وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ صفات، عین ذات ہیں اس لئے انہوں نے کہا کہ "قدیم تو ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ خدا ہے۔ وہ علم، قدرت اور حیات وغیرہ نہیں رکھتا، ہاں اس کی ذات ہی اس کے صفات کی نائب ہے۔ یعنی خدا کی ذات صفت کی جگہ لے سکتی ہے۔ لہٰذا علم نہ رکھنے کے باوجود علم والے کام اس سے سرزد ہوتے ہیں۔ قدرت نہ ہونے کے باوجود قدرت سے متعلق امور اس سے انجام پاتے ہیں۔

الٰہی فلسفیوں کا عقیدہ :

الٰہی فلسفیوں نے قرآن اور وحی الٰہی سے کسب فیض کیا ہے۔ انہوں نے نہ تو اشاعرہ کے عقیدہ کو قبول کیا ہے نہ معتزلہ کے عقیدہ کو۔ ان کا کہنا ہے کہ خداوند عالم "حقیقی صفات" رکھتا ہے لیکن ہماری طرح سے اس کے صفات زائد بر ذات نہیں ہیں بلکہ عین ذات ہیں۔ خدا علم، قدرت، حیات وغیرہ رکھتا ہے اور جس طرح اس کی ذات لامتناہی ہے ویسے ہی اس کا علم اس کی حیات سب لامتناہی ہیں — بعض فلسفیوں کی تعبیر کے مطابق حقیقت ہستی، عین علم، عین قدرت، عین ادراک اور عین حیات ہے۔ لہٰذا خدا یہ سب صفتیں رکھتا ہے لیکن یہ صفتیں زائد بر ذات نہیں بلکہ عین ذات ہیں۔

حاج ملا ہادی سبزواری مرحوم فرماتے ہیں :

والاشعری بازدیاد قائلۃ وقال بالنیابۃ المعتزلۃ

اشاعرہ زائد بر ذات صفات کے قائل ہیں اور معتزلہ ذات کو نائب صفات مانتے ہیں۔

بہرحال، وجود و ہستی تمام کمالات کے ساتھ ساتھ ہے اور چونکہ ذات خدا لامتناہی ہے اس میں نیستی کا کہیں گذر نہیں ہے اس لئے علم بھی لامتناہی ہے۔ اس میں جہل کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسی طرح حیات اور قدرت وغیرہ بھی لامتناہی ہیں۔

چونکہ یہ صفات عین ذات پروردگار عالم ہیں اس لئے ہم انہیں درک نہیں کر سکتے۔ انسان ارتقا کی چاہے کتنی ہی بلند منزل پر کیوں نہ پہونچ جائے چاہے وہ خاتم الانبیاء ہی کیوں نہ ہو جائے لیکن وہ ذات حق تعالیٰ کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ ترقی کی اعلیٰ منزل کے بعد بھی وہ اس کی مخلوق اور ممکن الوجود رہے گا اور ممکن الوجود، ذات واجب الوجود کو بعینہ درک نہیں کر سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ معصومین علیہم السلام نے فرمایا: "ماعرفناک حق معرفتک" اے میرے معبود جو تیری حق معرفت ہے وہ ہم ادا نہیں کر سکے۔

اس مختصر سی گفتگو کے بعد اب ہم مقدمہ کو تمام کرتے ہیں اور اصل خطبہ سے گفتگو شروع کرتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: "ما وحدہ من کیفہ" وہ موحد نہیں ہے جو خدا کے لئے کیفیت کا قائل ہو جائے اس لئے کہ کیف اعراض میں سے ہے اور خدا نہ جسم ہے نہ عرض۔

مقولات عشر:

فلاسفہ کہتے ہیں کہ اس عالم کے تمام موجودات دس مقولوں پر منقسم ہیں۔ ان میں سے ایک مقولہ جوہر[1] ہے۔ جو ہر ذات اشیاء ہے اور دوسرے مقولات اعراض ہیں۔ "کیفیت" ان ہی اعراض میں سے ایک عرض ہے۔ جس کا مطلب ہے "کیفیت و احوال اشیاء"۔

دوسرا مقولہ "کم" ہے۔ "کم" کا مطلب چیزوں کی مقدار اور اندازہ ہے جیسے خط، سطح، جسم و اعداد دوسرے سات مقولات کو اعراض نسبیہ کہتے ہیں مثلاً اشیاء کی نسبت جب زمانہ سے دی جاتی ہے تو اس کو "متی" اور مکان سے نسبت دی جاتی ہے تو "این" کہتے ہیں۔

اقسام کیف:

فلاسفہ کیف[2] کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ **کیفیات محسوسہ**: وہ کیفیتیں جو حواس پنجگانہ (ذائقہ، سامعہ، لامسہ، باصرہ اور شامہ) کے ذریعہ محسوس کی جاتی ہیں جیسے رنگ جو آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے۔ یا کسی چیز کی نرمی، سختی یا حرارت و برودت ہاتھوں کے ذریعہ محسوس ہوتی ہے۔

۲۔ **کیفیات استعدادیہ**: وہ چیزیں جن میں متاثر و منفعل ہونے کی قوت ہو یا نہ ہو مثلاً ہم کہتے ہیں کہ فلاں شئے نرم ہے وہ دب سکتی ہے، یا فلاں چیز سخت ہے نہیں دب سکتی۔ یا یہ کہتے ہیں کہ فلاں ضعیف المزاج ہے۔ بیمار ہونے کی استعداد اس میں موجود ہے یا یہ کہتے ہیں کہ فلاں قوی المزاج ہے اس میں جراثیم اور جلدوں سے بچنے کی قوت پائی جاتی ہے۔ ان ساری باتوں کو کیفیات استعدادیہ کہتے ہیں۔

۳۔ **کیفیات نفسانیہ**: وہ صفتیں جو نفس انسان میں پیدا ہوتی ہیں جیسے آدمی عالم نہیں ہوتا بعد میں علم حاصل کرتا ہے یا قدرت نہیں رکھتا، بعد میں صاحب قدرت بنتا ہے۔ یہ قدرت و علم وغیرہ جو انسان کے نفس میں پیدا ہو جاتے ہیں انہیں کیفیات نفسانیہ کہتے ہیں۔

۴۔ **وہ کیفیات جو کمیات سے مخصوص ہیں:**

یہ وہ کیفیتیں ہیں جو مقدار پر عارض ہوتی ہیں جیسے خط سطح اور جسم تعلیمی یہ "کم" ہیں لیکن انہیں ایک کیفیت پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ ان کیفیتوں کو "کم" سے مختص کیفیت کہتے ہیں مثلاً ایک جسم جو مثلث ہے، ممکن ہے کہ وہ "مربع" یا "ذوزنقہ" ہو جائے۔ یا جسم تعلیمی کی سطح جو کبھی مثلث اور کبھی مربع ہو جاتی ہے۔ یہ وہ کیفیات ہیں جو کمیات سے مخصوص ہیں۔

[1] مقولات عشرہ میں ایک تو جوہر ہے اور نو مقولہ عرض ہیں۔ کم، کیف، وضع، این، اضافہ، متی، ملک، فعل و انفعال مقولہ عرض ہیں ارسطو کا کہنا ہے کہ دنیا کے تمام موجودات انہیں دس مقولوں پر منحصر ہیں۔ بعض فلاسفہ پانچ ہی مقولات کے قائل ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ بنیادی مقولات چار ہیں (جوہر، کم، کیف اور نسبت) یہ حضرات نسبت کو این اور زمان سے نسبت کو متی سمجھتے ہیں۔

[2] کیف سے مراد وہ عرض ہے جس کا تصور خود اس کے علاوہ کسی دوسرے پر موقوف نہ ہو (انہا ہیئۃ قارۃ [illegible]) خواجہ نصیر الدین طوسی اساس الاقتباس [illegible] دوسرے [illegible] موقوف نہ ہو اور اس کے تصور میں خود [illegible] کے علاوہ کسی دوسرے [illegible] کے تصور کی [illegible]

کہ یہ چیزیں اس کے پاس نہیں تھیں۔ کسی دوسرے نے یہ ساری چیزیں اسے عطا کی ہیں۔ ایسی صورت میں ایک ایسے ایجاد کرنے والے کی ضرورت ہوگی جو ان صفتوں کو اس خدا کو عطا کرے!! اور کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ان باتوں کا قائل ہو یا اس کا دعوی کرے۔

یا یہ کہا جائے کہ یہ کیفیتیں زائد بر ذات ہیں اور خدا خود اپنی ذات پر ان کیفیتوں کو عارض کرتا ہے ایسی صورت میں یہ کہنا پڑے گا کہ خدا ازل سے ان کیفیتوں کا حامل ہے پھر تو یہ وہی بات ہوگی جو اشاعرہ کہتے ہیں۔ اشاعرہ "قدمائے ثمانیہ" کے قائل ہیں اور یہ شرک ہے۔

اسی وجہ سے امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "ما وحدہ من کیفہ" یعنی وہ مشرک ہو جائے گا جو خدا کے لئے کیفیتوں کا قائل ہو جائے اس لئے کہ کیف عرض ہے اور اعراض زائد بر ذات ہیں۔ اگر کوئی خدا کے لئے کیف کا قائل ہو جائے اور کیف کو ذات کی طرح قدیم جانتا ہو تو اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ ایک "ذات قدیم" ہو اور ایک "کیفیت قدیم" اس طرح پلٹ کر اشاعرہ ہی کی بات آتی ہے جو خلاف توحید ہے۔

اس نکتہ کو حضرتؑ نے اپنے پہلے خطبہ میں بیان فرمایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "فمن وصف اللہ فقد قرنہ" جو خدا کے لئے ایسی صفت کا قائل ہو جیسی صفت ہمارے اندر پائی جاتی ہے، جیسے علم، قدرت، کیف (سفیدی، سیاہی، درازی، کوتاہی وغیرہ) تو یہ صفتیں ہماری ذات پر زائد ہیں ایسی صفتوں کا خدا کی ذات میں قائل ہونا خدا کی ذات میں الگ سے ان صفتوں کا لانا ہے اور اس طرح تعبیر کرنا ہے کہ ایک تو خدا کا وجود ہے۔ اور الگ سے اس میں علم بھی ہے!

"ومن قرنہ فقد ثناہ" اور اگر ایسی چیزوں کو خدا کا قرین قرار دیا تو دوگانگی کے قائل ہوگئے اور یہ شرک ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح عیسائی اقانیم ثلاثہ (باپ، بیٹا، روح القدس) کے قائل ہیں۔ یا اشاعرہ "قدمائے ثمانیہ" کے قائل ہیں۔

"لشہادۃ کل صفۃ انہا غیر الموصوف وشہادۃ کل موصوف انہ غیر الصفۃ" اس لئے کہ ہر صفت گواہی دیتی ہے کہ وہ موصوف سے الگ ایک چیز ہے اور ہر موصوف شہادت دیتا ہے کہ وہ صفت کا غیر ہے۔ لہذا اگر کوئی علم، قدرت، حیات کو زائد بر ذات مانے تو یہ درست نہیں ہے اس لئے کہ درحقیقت صفات خدا عین ذات ہیں یعنی وہی ذات عین علم و قدرت و حیات ہے۔

ہم اس مقام پر مذکورہ بالا گفتگو کی مناسبت سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث نقل کر رہے ہیں تاکہ مطلب واضح ہو جائے۔

ابو الفضل شیبانی اس حدیث کو نقل کرتے ہوئے اس کی سند ابن عباس تک لے جاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "قدم یہودی علی رسول اللہ" ایک یہودی پیغمبر کی خدمت میں آیا "فقال یا محمد! انی سائلک عن اشیاء تلجلج فی صدری منذ حین" اور اس نے کہا کہ میرے دل میں ایک بات ہے جو بہت دنوں سے کھٹک رہی ہے وہ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ "فان انت اجبتنی عنہا اسلمت علی یدک" اگر آپ اس کا جواب دیدیں تو میں آپ کے ہاتھوں پر اسلام قبول کر لوں گا۔

حضرتؑ نے فرمایا "اسأل یا ابا عمارۃ" اے ابو عمارہ پوچھو۔ "فقال یا محمد صف لی ربک" اس نے کہا کہ آپ ہمارے لئے اپنے رب کی توصیف بیان کریں۔

آپ نے فرمایا "ان الخالق لا یوصف الا بما وصف بہ نفسہ" وہ خدا جو تمام موجودات کا پیدا کرنے والا ہے قابل توصیف نہیں ہے مگر ان چیزوں کے ذریعہ، جن سے خود اس نے اپنی توصیف کی ہے (وہ صفات، صفات کمال ہیں اور صفات کمال عین ذات ہیں)

اس مقام پر اہل فن کے لئے ایک نکتہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ فلاسفہ ——— حکمت متعالیہ ——— کی بحث میں کہتے ہیں کہ:

"عالم میں حقیقت وجود کے سوا کچھ نہیں ہے۔ تمام ماہیتیں امور اعتباری ہیں عدم تو کچھ ہے ہی نہیں۔ لہذا حقیقت بس ہستی ہے اس لئے صفات کمال جو حقیقت میں انکی بازگشت حقیقت ہستی کی طرف ہوتی ہے۔"

یہ درحقیقت مذکورہ بالا مطلب کی دلیل ہے۔ اور وہ اس طرح کہ حقیقت ہستی موجود، تمام حقائق کی بہ نسبت مساوی ہے۔ حقیقت ہستی عین علم و قدرت و حیات ہے اس لئے جو صفات، صفات کمالیہ ہیں ان کی بازگشت حقیقت ہستی کی طرف ہوتی ہے۔ خدا ان تمام صفتوں کا حامل ہے اور یہ تمام صفتیں عین ذات ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی خدا کی ذات پر زائد صفت کا قائل ہو تو وہ مشرک ہے۔

پیغمبر ختمی مرتبت نے خداوند عالم کے بارے میں جو ارشاد فرمایا ہے، روایت اسے یوں بیان کرتی ہے:

وکیف یوصف الخالق الذی یعجز الحواس ان تدرکہ والاوہام ان تنالہ والخطرات ان تحدہ

اس خالق کی توصیف انسان کیسے بیان کرسکتا ہے جو اس اور اوہام جسے درک کرنے سے عاجز اور دل میں آنے والے خیالات پرندہ گرد عالم کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ دریا کوزہ میں نہیں سمویا جاسکتا۔ بس اسی طرح لامحدود خدا، ہماری محدود فکر جس ذہن میں پیدا کی ہوئی ہے، نہیں آسکتا ــــ "والابصار عن الاحاطہ بہ" آنکھیں اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ اور بات تو دراصل یہ ہے کہ خدا جسم ہی نہیں ہے جسے آنکھیں دیکھ سکیں۔

"جل عما یصفہ الواصفون" خدا توصیف کرنے والوں کی توصیف سے منزہ ہے۔

صفات ثبوتیہ کو کمال و جمال اور صفات سلبیہ کو صفات جلال کہتے ہیں۔ صفات جلال کا مطلب یہ ہے کہ خدا ان صفتوں سے منزہ ہے۔

"نأی فی قربہ" "خدا نزدیک ہونے کے باوجود دور ہے" [illegible]

نحن اقرب الیہ من حبل الورید [illegible]

[illegible]

اس لئے کہ ہم میں سے کوئی بھی اتنی قربت کے باوجود اس کو درک نہیں کرسکتا۔ "وقرب فی نأیہ" اور دور ہونے کے باوجود قریب ہے "وھو معکم اینما کنتم" "تم جہاں کہیں بھی رہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ تمہارا احاطہ کئے ہوئے ہے" ہاں تم اس کا درک نہیں کرسکتے۔

"کیف الکیفیۃ" یہ کیفیتیں اپنی مختلف قسموں کے ساتھ اسی کی پروردہ ہیں اور خدا ان کیفیتوں کا خالق اور ایجاد کرنے والا ہے۔ "فلا یقال لہ کیف" لہٰذا اس کے لئے "کیف" کی لفظ نہیں بولی جاسکتی۔ کیفیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ کیسا ہے اور خدا جسم نہیں ہے کہ پوچھا جائے کہ کیسا ہے۔

"واین الاین" "مکان تو مخلوق خدا ہے" "فلا یقال لہ این" لہٰذا یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ خدا کہاں ہے؟ وہ زمان و مکان کا خالق ہے لہٰذا زمان سے بالاتر ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟!

"وھو منقطع الکیفوفیۃ والاینونیۃ" وہ "کیف" اور "این" سے جدا ہے۔

"فھو الاحد الصمد" وہ یگانہ ہے کسی قسم کا کوئی نقص اس کی ذات میں نہیں ہے "کما وصف نفسہ" جیسا کہ اس نے خود اپنا وصف قرآن مجید میں بیان کیا ہے۔

"والواصفون لا یبلغون نعتہ" توصیف کرنے والے اس کی کنہ صفات تک نہیں پہونچ سکتے۔ "لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد" نہ تو اس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ کسی سے [illegible] اور نہ کوئی اس کا کفو ہے۔

جب یہودی نے ان باتوں کو سنا تو کہنے لگا "صدقت یا محمد" آپ نے صحیح فرمایا پھر اس نے پوچھا: اخبرنی عن قولک انہ واحد لا شبیہ لہ، الیس اللہ واحد والانسان واحد؟ فوحدانیتہ اشبہت وحدانیۃ الانسان؟ "آپ جو یہ فرماتے ہیں کہ خدا واحد ہے تو انسان بھی تو واحد ہے؟ لہٰذا خدا کی وحدانیت انسان کی وحدانیت کی شبیہ ہوئی"

[illegible] ذات حق تعالیٰ میں کوئی [illegible]

پیغمبر نے فرمایا تو واحد کے مفہوم کو سمجھنے میں غلطی کررہا ہے۔ خدا کی وحدانیت کی حقیقت ہماری اور تمہاری وحدانیت کی حقیقت سے جدا ہے۔ انسان واحد ہے یعنی نوع واحد ہے۔ اور "خدا واحد ہے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسی حقیقت ہے جس کے بارے میں شبیہ اور مثل کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ذات احدی ہے یعنی اس کی ذات بسیط ہے مرکب نہیں ہے۔ "فقال: اللہ واحد واحدی المعنی والانسان واحد ثنوی المعنی" وہ واحد ہے اس کی ذات، ذات احدی ہے یعنی وہ مرکب نہیں بلکہ بسیط ہے اور انسان واحد دوگانہ ہے یعنی عدد کے اعتبار سے واحد ہے لیکن مختلف عنوان سے اسمیں دوئی پائی جاتی ہے۔

"جسم و عرض و بدن و روح" "انسان جسم و عرض و بدن و روح سے مرکب ہے لہٰذا انسان کی ذات میں ترکیب اور دوئی پائی جاتی ہے لیکن خدا کی ذات میں کسی قسم کی ترکیب اور دوئی کا وجود نہیں ہے "فانما التشبیہ فی المعانی" لہٰذا مفہوم وحدت معنائے ذہنی کے اعتبار سے دونوں پر منطبق ہوتا ہے اور کسی دوسرے اعتبار سے منطبق نہیں ہوتا۔

"قال صدقت یا محمد" اس یہودی نے کہا آپ صحیح فرماتے ہیں۔

ل بحار الانوار ج ۳ ص ۳۰۴ منقول از کفایۃ النصوص

"ولا حقیقتہ اصاب من مثلہ"

خدا کی حقیقت کو اس نے درک نہیں کیا جو اس کے لئے مثل اور نظیر کا قائل ہوگیا۔ اس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے شارحین نہج البلاغہ نے جو مطالب بیان کئے ہیں ان کو سمجھنے کے لئے وجود و ہستی کی بحث دہرانا ضروری ہے اس لئے ہم مجبوراً بعض گذشتہ مطالب کو پھر سے بیان کرتے ہیں۔

اشیاء کا تحقق وجود کے ذریعہ:

جب یہ کہا جاتا ہے کہ انسان موجود ہے یا درخت موجود ہے وغیرہ ... تو ایک قضیہ بنتا ہے یعنی "الانسان موجود" ــــ انسان موجود ہے ــــ ایک قضیہ ہے۔ انسانیت وہ ماہیت ہے کہ جب ہم اس پر ایک مفہوم بنام "وجود" کو حمل کرتے ہیں تو "الانسان موجود" ایک قضیہ بنتا ہے۔ آپ اس پر غور فرمائیں کہ انسانیت "وجود" کے واسطے سے متحقق ہوتی ہے۔ اس لئے اگر ہستی اور وجود کو انسانیت سے سلب کرلیا جائے تو پھر کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی۔ اسی وجہ سے جب یہ کہا جاتا ہے کہ "انسان موجود ہے" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان خارج میں ایک واقعیت رکھتا ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ جو چیز خارج میں پائی جاتی ہے اور واقعیت رکھتی ہے وہ شئے کی "ہستی" ہے۔ اسی لئے ہستی کو نور سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

مثلاً دس، بیس، سو، ہزار شمعوں یا اس سے زیادہ شمعوں والے فانوس کے نور میں آپس میں فرق ہوتا ہے۔ شمعیں جتنی زیادہ ہوتی جائیں گی نور اتنا ہی زیادہ ہوگا اور نورانیت اتنی ہی بڑھتی چلی جائیگی ـــــ اور اگر ایک غیر متناہی نور فرض کیا جائے تو وہ دو نہیں ہوسکتا۔

بات کو واضح کرنے کے لیے یوں فرض کریں کہ فانوس کی روشنی چاہے کتنی ہی کیوں نہ بڑھ جائے پھر بھی وہ نور محدود ہوگا اس لیے کہ اس فانوس کی دوسری جانب ظلمت کا ڈیرہ ہوگا۔ یعنی نور و ظلمت ایک دوسرے کے آس پاس جمع ہوں گے اندھیرا جتنا گھٹتا جائے گا نور اتنا ہی بڑھتا جائیگا ـــــ لیکن لامتناہی نور حدود میں گھرا ہوا نہیں ہوگا اس وجہ سے اس کے لئے دوئی فرض نہیں کی جاسکتی کیونکہ اگر دو فرض کرلیا جائے تو وہ محدود ہوگا اور وہ اس طرح کہ دو میں ایک نور دوسرے نور کی خصوصیت کا حامل نہیں ہوگا۔ اسمیں اس کا کمال اور اس میں اس کا کمال نہیں پایا جائے گا، اس طرح دونوں محدود ہوں گے ـــــ لیکن ہم نے فرض تو یہ کیا ہے کہ نور غیر متناہی ہے اور اس کی کوئی حد نہیں اس لئے قہری طور پر غیر متناہی نور ایک ہوگا۔ اسمیں دوئی نہیں ہوگی۔

ہستی کے جلوے :

بہر حال لامتناہی نور جو قطعاً نور ہے ظلمت کی حد بندیوں سے بالاتر اور واحد ہے جس کے لئے تعدد فرض نہیں کیا جاسکتا ـــ اس نور کا لازمہ یہ ہے کہ اس کا پرتو اور جلوہ ہو۔ آفتاب کے نور کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا نور صحن خانہ کو بھی منور کرتا ہے اور کمرہ بھی اس سے روشن نظر آتا ہے۔ ہاں کمرہ میں پہونچنے والی روشنی آنگن کی روشنی سے کم ضرور ہوتی ہے جس طرح آفتاب کا نور صحن اور کمرہ کو منور کرتا ہے اسی طرح ایک کوٹھری کو بھی روشن کرتا ہے مگر کوٹھری کی روشنی بہت ہلکی ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ صحن خانہ اور مرکز نور سے بہت دور ہوتی ہے۔

لامتناہی ہستی میں مذکورہ مفہوم کو فرض کیا جاسکتا ہے۔ یعنی اس واحد اور غیر متناہی ہستی کے بھی مختلف جلوے ہیں اور وہ سارے جلوے اسی ہستی سے وابستہ ہیں وہ غیر متناہی نور کسی کا محتاج نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ ہستی محض ہے۔ ہاں اس کے جلوے اس کے محتاج ہیں۔ اس لئے کہ وہ جلوے اسی نور کے پرتو ہیں اور غیر متناہی نور بے نیاز ہے۔

ہستی بھی نور کی طرح ہے جس طرح نور خود ظاہر ہوتا ہے اور دوسری چیزوں کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح ہستی بھی خود محقق ہے اور دوسری ماہیتیں بھی اسی کے ذریعہ محقق ہوتی ہیں اس لیے اگر ایک ایسی ہستی ہو جو ہستی محض ہو اور اس میں نیستی کا کہیں سے کبھی گذر نہ ہوسکے تو اس ہستی کو ہستی غیر متناہی کہتے ہیں۔

ذات خدا ایک ایسی لامتناہی حقیقت اور وجود ہے جس کے لئے دوئی محال ہے اور جیسا کہ ہم نے نور کی مثال میں ذکر کیا ہے اس کے بھی جلووں کے مراتب ہیں۔ یعنی ذات باری تعالیٰ کے بھی پرتو اور جلوے ہیں اور ان جلووں میں مراتب بھی پائے جاتے ہیں یہ جلوے سرچشمۂ نور سے جتنے دور ہوتے ہیں اتنے ہی مدھم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

خدا کے جلوے

فلسفیوں کے قول کے مطابق، عالم ملائکہ و مقربین درگاہ خدا، عالم عقول ہے۔ یہ عالم وہ جلوۂ خداوندی ہے جو خدا سے بہت ہی قریب ہے۔ یہ جلوے جب عالم مادہ اور عالم ناسوت تک پہونچتے ہیں تو گھٹتے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ عوالم میں، یہ عالم (عالم مادہ و ناسوت) پست ترین مرتبہ کا حامل ہے۔ فلاسفہ اسے ادنیٰ ترین عالم ... کہتے ہیں،

چنانچہ معلوم ہوا کہ ایک وجود ایسا بھی ہے جو غیر متناہی وجود ہے اور وہ باری تعالیٰ کا وجود ہے، ایسا وجود جس کے جلوے عالم میں بکھرے ہوئے ہیں دنیا کے تمام موجودات خداوند عالم کے جلوے اور سلسلے ہیں مگر یہ تمام جلوے اس کی ذات سے جدا اور مستقل حیثیت نہیں رکھتے بلکہ یہ سب اسی سے وابستہ ہیں۔ خدا کے مقابل میں ان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے جیسا کہ نور کی مثال میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ جو نور کوٹھری کے اندر ہوتا ہے وہ باہر کے نور کا پرتو ہوتا ہے اس کی اپنی الگ کوئی مستقل حیثیت نہیں ہوتی۔

اسی طرح ہم موجودات کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کی بھی مستقل کوئی حیثیت نہیں ہے۔ بلکہ تمام موجودات اسی ہستی سے وابستہ ہیں جو مستقل، قائم بالذات اور قیوم بالذات ہے اور وہ ہستی خداوند عالم کی ہستی ہے۔

حضرت امیر المومنینؑ نے اس خطبہ میں جو یہ فرمایا ہے کہ "ولا حقیقتہ اصاب من مثلہ" حقیقت خدا کو اس نے درک نہیں کیا جس نے خدا کے لئے مثل و مانند فرض کر لیا ـــــ یہاں مثل کا مطلب یہ ہے کہ دو چیزیں باہم مشترک بھی ہوں ایک ہی حقیقت کی مصداق بھی ہوں اور دونوں کی حیثیت مستقل بھی ہو۔ یہ فرض محال ہے اس لئے کہ اگر ایک جیسے دو ہوں گے تو محدود ہوں گے ایک میں دوسرے کے جیسا کمال نہیں ہوگا اس بنا پر دونوں متناہی ہوں گے، اور ذات باری تعالیٰ غیر متناہی ہے اس کی ذات میں نیستی کا گذر نہیں ہے وہ ایسی لامتناہی حقیقت ہے جو اپنی "ضد" سے مرکب نہیں ہے۔ ایسی حقیقت ایک ہی ہوسکتی ہے دو نہیں ہوسکتی لہٰذا جس نے خدا کے لئے کوئی مثل فرض کیا اس نے خدا کی غیر متناہی حقیقت کو درک نہیں کیا۔

خدا کی ذات مرکب نہیں ہے :

شارحین نہج البلاغہ کا اس سلسلہ میں دوسرا بیان ذرا سخت ہے۔ لہٰذا ہم اس کو مختصر طور پر بیان کریں گے ـــــ شارحین کا کہنا ہے کہ اگر خدا کا کوئی مثل ہوتا تو اس کی تین صورتیں فرض کی جاسکتی ہیں ایک تو یہ کہ دونوں کی ذات ماہیت میں ایک ہوتی لیکن عوارض میں فرق ہوتا جیسے ـــــ زید و عمرو ـــــ ان کی ذات ایک ہے یعنی انسانیت میں دونوں شریک ہیں لیکن عوارض میں اختلاف ہے اور وہ اس طرح کہ کوئی سیاہ ہے تو کوئی سفید۔

دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں جزو ذات میں آپس میں شریک ہوں اور فصل میں ایک دوسرے سے جدا ہوں جیسے انسان اور گھوڑا حیوانیت میں (جو جزو ذات ہے) آپس میں شریک ہیں، لیکن انسان وہ حیوان ہے جو ناطق ہے اور گھوڑا وہ حیوان ہے جو صامت ہے (اس طرح دونوں فصل میں جدا ہو جاتے ہیں)

تیسری صورت یہ ہے کہ دونوں تمام ذات میں ایک دوسرے سے امتیاز رکھتے ہوں لیکن ایک عرض میں آپس میں شریک ہوں، جیسے برف باری میں گرنے والی برف اور منجمد برف۔

بہر حال ان تینوں صورتوں میں ذات باری تعالیٰ میں ترکیب لازم آتی ہے درآں حالیکہ وہ بسیط ہے ترکیب کا اس کی ذات میں گذر نہیں ہے۔

"ولا ایاہ عنیٰ من شبہہ"

جو اس کے لئے تشبیہ کا قائل ہوگیا اس نے اس کا (خدا کا) قصد نہیں کیا۔

یہ فقرہ بھی گذشتہ جملے کے انداز کا ہے۔ مولاؑ نے فرمایا کہ جو اس کے لئے تشبیہ فرض کرے اس نے اس کا قصد نہیں کیا، اس لئے کہ اس کی شبیہ فرض کرلینے کے بعد "دو" ہو جائے گا اور دو ہونے کے بعد محدود ہو جائے گا۔ لہٰذا وہ خدا نہیں ہوسکتا اس لئے کہ خدا اس لامحدود ہستی کا نام ہے جسمیں دوئی کا کہیں سے تصور پایا ہی نہیں جاتا۔

تمثیل اور تشبیہ :

____ بعض بزرگ علماء نے ان دونوں جملوں میں فرق بیان کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ جب دو چیزیں ذات میں ایک طرح کی ہوں تو مثل کہتے ہیں جیسے - زید و عمرو ___ دونوں انسان ہیں اور ذات میں ایک ہیں ___ لیکن اگر کیفیت اور عوارض میں ایک جیسے ہوں تو کہا جاتا ہے یہ ایک دوسرے کی شبیہ ہیں جیسے ایک شئے کا قد اگر لمبا ہو اور دوسری چیز کا قد بھی اسی طرح لمبا ہو تو یہاں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک دوسرے کی شبیہ ہیں اس لئے کہ یہاں مقدار کے اعتبار سے (جو عوارض میں سے ہے) شباہت ہوتی ہے۔

لہٰذا "مثل" ذات میں ایک جیسا ہونے کی بنا پر اور "شبیہ" عوارض میں ایک طرح ہونے کی وجہ سے ہے - اور یہ بات بعید بھی نہیں ہے۔

لہٰذا جو خدا کی شبیہ کا قائل ہو گیا اس نے خدا کا قصد نہیں کیا اس لئے کہ خدا کے عوارض نہیں ہیں کوئی شئے اس کی ذات اقدس پر عارض نہیں ہوتی - اس لئے کہ اگر کوئی چیز عارض ہوگی تو حادث بھی ہوگی ایسی صورت میں خدا کا محل حوادث ہونا لازم آئے گا اور محل حوادث ہونے کے بعد وہ دوسرے کا محتاج ہو جائے گا۔ یا پھر یہ کہا جائے کہ وہ "عرض" ازل سے خدا کے ساتھ ہے ایسی صورت میں خدا بھی قدیم ہوگا اور وہ عرض اور صفت بھی قدیم ہوگی اور اس سے تعدد قدماء لازم آتا ہے (جو باطل ہے)۔

لہٰذا خدا کسی قسم کے عارض کا حامل نہیں ہے جس کے ذریعہ وہ موجودات میں سے کسی موجود کے عوارض کی شبیہ ہو سکے۔ صفات خدا عین ذات ہیں، یعنی علم و قدرت زائد بر ذات خدا نہیں ہیں۔ خدا ایک غیر متناہی ہستی ہے اور وہی لامتناہی ہستی علم و قدرت و حیات غیر متناہی بھی ہے۔

"لا صمدہ من اشار الیہ و توھمہ"

جو اس کو (خدا کو) اپنے تصور کا پابند بنائے یا اس کی طرف اشارہ کرے، اس نے خدا کا رخ نہیں کیا۔

اشارہ کی قسمیں :

اشارہ کی دو قسمیں ہیں،

۱۔ اشارۂ حسی، جب ہاتھ یا جسم کے کسی حصہ سے اشارہ کیا جائے تو یہ اشارہ، اشارۂ حسی ہے۔

۲۔ اشارہ توہمی، دماغ میں جب کسی چیز کو جگہ دی جائے اور وہ ذہن کی پیداوار ہو تو یہ اشارہ، اشارۂ توہمی ہے۔

اشارۂ حسی تو بالکل واضح ہے کہ ہم خدا کو انگلیوں کے اشارہ سے نہیں بتا سکتے، اس لئے کہ وہ جسم نہیں ہے جس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جا سکے۔ اسی طرح اشارۂ توہمی اور اشارۂ عقلی کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ خدا غیر متناہی وجود ہے اور ہمارا ذہن محدود ہے، محدود، غیر محدود کا احاطہ نہیں کر سکتا، مثلاً (بلا تشبیہ) اگر دریا کو کوزہ میں سمیٹنا چاہیں تو دریا کوزہ میں نہیں سمٹ سکتا۔

ذہن و دماغ میں آنیوالی چیز خود ہمارے ذہن کی پیداوار اور مخلوق ہوتی ہے، اور خالق، مخلوق نہیں ہو سکتا! ___ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ ہم خدا کو صرف "صفات اضافیہ" یا "صفات سلبیہ" کے ذریعہ ہی پہچان سکتے ہیں - اس لئے کہ صفات اضافیہ میں اضافت کا دوسرا سرا خود ہم ہیں اور صفات سلبیہ کے ذریعہ اس طرح کہ ہم محدود جسم ہیں اور خدا محدود نہیں ہے۔ لہٰذا جو چیز جسم سے متعلق ہے ہم خدا سے اس شئے کی نفی کرتے ہیں۔ لیکن خدا کی حقیقت ذات کا وجود اور نور غیر متناہی ہے ذہن و دماغ میں آجانا محال ہے۔

روایت ہے کہ:

"کل ما میزتموہ باوھامکم فی ادق معانیہ فھو مخلوق لکم، ولعل النمل الصغار تتوھم ان اللہ تعالیٰ زبانیتین"

جو چیز تمہارے اوہام میں آتی ہے وہ چاہے کتنی ہی دقت نظر کی حامل کیوں نہ ہو وہ تمہارے ذہن کی پیداوار ہے۔ شاید چھوٹی سی چیونٹی بھی یہ سمجھتی ہے کہ اللہ کے دو سینگیں ہیں!!

حضرت کا یہ فرمانا کہ "چیونٹی بھی شاید یہ سمجھتی ہے" یہ اس لئے ہے کہ چیونٹی دو سینگوں کو اپنا کمال سمجھتی ہے۔ وہ اپنی فکر اور نظریہ کے مطابق اپنے ذہن میں خدا کو ڈھال لیتی ہے حضرت موسیٰ کے زمانہ کا چرواہا بھی یہ خیال کر رہا تھا کہ خدا بھی ہماری ہی طرح ہوگا جو چیزیں ہم لوگ کھاتے ہیں، اگر خدا کی پذیرائی بھی اسی سے کی جائے تو وہ لطف اندوز ہوگا!! اور یہی سمجھ کر وہ خدا سے کہا کرتا تھا:

تو کجائی تا شوم من چاکرت ✤ چارقت دوزم کنم شانہ سرت

دستکت بوسم، بمالم پایکت ✤ وقت خواب آیم بروبم جایکت

وہ ایسی چیزوں کو اپنے لئے کمال سمجھتا تھا، لہٰذا اس نے خدا کے لئے بھی ایسی ہی باتیں فرض کرلیں اور اپنے چھوٹے سے ذہن میں بھی اس نے ایسے ہی خدا کا تصور کیا۔

بنا برایں کہا جا سکتا ہے کہ جس نے اپنے ہاتھوں سے اس کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے اس کا قصد نہیں کیا، اس لئے کہ خدا جسم نہیں ہے جس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جا سکے اور جس نے اپنے خیالات اور تصور کے ذریعہ خدا کو اپنے دماغ میں جگہ دینے کی کوشش کی اسنے بھی خدا کا رخ نہیں کیا اس لئے کہ یہ ذہن و دماغ محدود ہیں اور خدا لامحدود ہے۔ ہمارے ذہن میں جو بات بھی آتی ہے وہ مخلوق اور ہمارے ذہن کی پیداوار ہے چاہے وہ کتنی ہی باریک اور عمیق کیوں نہ ہو۔ اور خدا ہمارے ذہن و دماغ بلکہ تمام موجودات کا خالق ہے وہ نہ مخلوق ہے اور نہ مخلوق کے ذہن میں سما سکتا ہے۔

(باقی آئندہ)

باقی ص۱۱

طور پر اس بنیادی مفہوم کو جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے کہ قرآنی نظریہ کے تحت گلکار تاریخ کے کچھ اصول ہیں اور اس کے کچھ قواعد و قوانین معین ہیں۔

بعض دوسری آیتوں میں ان قوانین کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جوانسان کے سفر تاریخ پر حکم فرما ہیں نیز ان کی شالیں نمونے اور مصادیق بھی بیان کر دیئے گئے ہیں، اس کے علاوہ دوسرے مقام پر اس نظریہ یعنی فلسفۂ تاریخ کے بنیادی مفہوم کو اس کے مصادیق اور عملی نمونوں کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ بعض دیگر آیات میں تو گذشتہ حالات و واقعات سے سبق اور نصیحت حاصل کرنے کی بے حد تاکید کی گئی ہے اور تاریخ بشریت کی چھان بین اور اس کی گہری تحقیق پر انسانی ہمت کو بھر پور ابھارا گیا ہے۔

جیسا کہ سبھی سمجھتے ہیں کہ پیش آنے والے واقعات و حادثات کی تحقیق و دریافت اور چھان بین کا عمل بذات خود ایک علمی کام ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ تاریخی اصول و ضوابط کا گہرا جائزہ لیا جائے اور اس کے قواعد و قوانین کا باقاعدہ تجزیہ کیا جائے ورنہ بغیر کسی قاعدے قانون کے تحقیق و تجزیہ اور چھان بین کا کوئی مفہوم نہیں۔

غرضکہ قرآن کریم نے مختلف آیتوں میں متعدد لب و لہجہ میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے اور تاریخ کے اصول و ضوابط کے موضوع پر سیر حاصل انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ✤ ✤

پھر اپنے اس وصف و امتیاز کو کھویا نہیں ہے، وہ لوگوں کو تاریکی سے نکال کر نور کی طرف لانے والی کتاب ہے، چنانچہ ہر منزل میں وہ اپنی اس حقیقی شان اور ذاتی خصوصیت کا محافظ رہا ہے۔ اس نے تاریخ و فلسفۂ تاریخ کے موضوع پر جو کچھ بھی بحث کی ہے ان ہی حدود میں باقی رہتے ہوئے کی ہے اور تاریخ کے قواعد و قوانین کے متعلق موشگافیاں بھی بس اسی حد تک کی ہیں جس حد تک عمل تغیر کے پہلوؤں پر روشنی پڑ سکے اور وہ بھی بس اسی دائرے میں رہتے ہوئے جس دائرے میں رہ کر نبی اکرم نے اس کو انجام دیا ہے اور جس حد تک تاریخ و قوانین تاریخ کی جانب بشر کی رہنمائی ہوتی ہے اور وہ رونما ہونے والے واقعات و حادثات اور سامنے آنے والے حالات و کیفیات نیز زندگی کی صورت حال کے بارے میں صحیح رائے اور سچا نظریہ قائم کرنے کے قابل ہوتا ہے۔

قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت کھل کے ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ تاریخ کے بھی کچھ اصول و ضوابط ہیں جس طرح دیگر دنیاوی علوم و فنون کچھ قواعد و قوانین کے حامل ہوتے ہیں اسی طرح تمدن و تحریک دنیا میں بھی اس کے کچھ قواعد و ضوابط معین ہیں قرآن کریم میں یہ حقیقت نہایت واضح اور آشکار ہے، متعدد آیتوں میں مختلف جہات سے مختلف اسلوب اور انداز میں اس کی نشاندہی کی گئی ہے، اتفاقاً واضح

ایران کے مسافر بردار طیارہ پر امریکہ کا وحشیانہ حملہ!

آج ساری دنیا کے تمام کھلے ذہن رکھنے والے انسان ایران کی ایر بس پر خلیج میں امریکی جہاز سے میزائیل کے حملہ کو امریکہ کا وحشیانہ اور مجرمانہ حملہ قرار دے رہے ہیں بجز اُن قلموں کے جو بک گئے ہیں۔ ہر قلم امریکہ کے اس بدبختانہ فعل کی مذمت کر رہا ہے جو انسانیت پر ایک بدنما داغ ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے جنگی جہاز ونسینس جو گذشتہ ایک ماہ سے مسلسل کمرشیل اور مسافر بردار ہوائی جہازوں کی آمد و رفت میں خلل پیدا کرتے چلا آرہا ہے۔ امریکہ اس بات سے بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اس جنگی جہاز پر موجود کمپیوٹر اور عصری آلات میں اس بات کی صلاحیت ہے کہ وہ وقت واحد میں اس کے ذریعہ نہ صرف طیارہ کی شناخت کر سکتے ہیں بلکہ اس کی رفتار اور دیگر معلومات بھی فراہم کر سکتے ہیں۔ ان حقائق کے بنا پر میزائیل کا حملہ اتفاقی حادثہ اور سہو نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ یہ عمداً امریکہ کی اشتعال انگیز سازش ہے جس کے ذریعہ اس کی بد نیتی کا اظہار ہوتا ہے۔ گیارہ گھنٹے کی خاموشی کے بعد امریکہ اقرار خود معنی خیز ہے۔ کیوبا اور لیبیا کے خلاف امریکی سامراج کی اشتعال انگیز کاروائیوں کے بعد اب امریکہ ایران اور خلیج کے ماحول کو پُرخطر بنا چکا ہے۔ امریکی جنگی بیڑہ کا خلیج میں وجود ہی اس خدشہ کا اظہار کر رہا تھا کہ خلیج میں کشیدگی پیدا ہوگی اور اس کی تمام ذمہ داری امریکہ پر ہے۔ امریکہ کے اس اقدام کو سوویت یونین نے بلا جھجک وحشیانہ قتلِ عام قرار دیا حالانکہ حالیہ ریگن و گوربوچوف ملاقات کے بعد امریکہ اور روس کے تعلقات میں بہتری کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ لیکن روس اور دیگر ممالک نے امریکہ کی سرزنش میں مروت نہیں برتی۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ آج بھی امریکہ اپنی ضد پر قائم ہے۔ کہ وہ خلیج سے اس جنگی بیڑہ کو نہیں ہٹائیگا۔ غیر جانبدار ممالک اور اقوام متحدہ کو اس موقع پر بہ بانگ دہل یہ اعلان کرنا چاہیئے کہ امریکہ کی موجودگی خلیج میں کشیدگی اور خطرہ کا باعث ہے۔ اس لئے اسے فوری خلیج سے ہٹ جانا چاہیئے تاکہ حالات مزید دھماکو صورت اختیار نہ کریں۔

ادارہ انتہائی افسوس کے ساتھ اس حملہ کی شدت سے مذمت کرتا ہے۔ اور اس بے دردی سے مارے جانے والوں کی موت پر اظہار غم افسوس کرتے ہوئے مرنے والوں کے اقربا کو تعزیت بھی پیش کرتا ہے۔ بالخصوص ڈاکٹر وحید اختر صاحب کو جن کی اہلیہ (جو نہایت ہی قابل اور قلم کی دھنی خاتون تھیں وہ بھی) اس حادثہ کا شکار ہوگئیں خدا ان کے درجات کو بلند کرے۔ آمین۔

امریکہ کے وحشیانہ حملہ کے خلاف گورنر آندھرا پردیش کو احتجاجی یادداشت

ایران کے مسافر بردار ہوائی جہاز پر امریکہ کے مجرمانہ حملہ کے خلاف ریاست آندھرا پردیش کے علما اور اداروں کے نمائندوں پر مشتمل ایک وفد نے عزت مآب کمودبین جوشی گورنر آندھرا پردیش سے ۱۱ر جولائی کو صبح راج بھون میں ملاقات کرکے ایک یادداشت گورنر صاحب کے حوالے کی جس میں یہ خواہش کی گئی تھی کہ امریکہ کی بربریت اور اس غیر انسانی حرکت کے خلاف وفد کے جذبات سے حکومت ہند کو آگاہ کیا جائے۔ گورنر صاحب نے وفد کے ارکان سے انتہائی تفصیل کے ساتھ اُن کے تاثرات سنے اور اپنے جذبات کا بھی اظہار کیا۔

یادداشت میں وفد کی جانب سے حالیہ ایران کے مسافر بردار طیارہ پر امریکی جہاز کے مجرمانہ حملہ کی شدت سے مذمت کی گئی ہے جس کی وجہ سے تقریباً تین سو افراد ہلاک ہوگئے۔ یادداشت میں حکومت ہند کے ذریعہ یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ امریکہ خلیج سے فوری اپنے جنگی جہاز ہٹائے تاکہ خلیج میں تجارتی اور مسافر بردار جہازوں کی پرواز میں خلل اور خطرہ باقی نہ رہے۔ حکومت ہند کے ذریعہ وفد نے اقوام متحدہ سے مطالبہ کیا کہ وہ امریکہ کے اس غیر انسانی وحشیانہ حملہ کی تحقیقات کرے جو بلاشبہ قصداً کیا گیا ہے۔ گورنر صاحب نے وفد کو یہ یقین دلایا کہ وہ ان مطالبات اور وفد کے جذبات کو حکومت ہند تک پہونچائیگے۔

وفد میں امیر جامعہ نظامیہ مولانا سید شاہ حبیب الدین قادری رشید پاشاہ، جناب عسکری حسن جاوید، حجۃ الاسلام مولانا سید شاہ عباس منصوری خراسانی امام جمعہ و جماعت مسجد علی، مولانا فرید الدین صابری صدر مجلس انتظامی ٹوٹی مسجد مولانا جلال الدین حمای کامل سرپرست امارات شرعیہ مولانا حافظ محمد عثمان امام جماعت مکہ مسجد مولانا سید محمد قادری صدر انجمن قادریہ الحاج سید غوث خاموشی صدر اسلامک اسٹڈیز سرکل حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا سید غلام حسین رضا آقا مجتہد العصر اور کنوینر وفد جناب سید علی عباس موسوی رکن ریاستی وقف بورڈ، جنرل سکریٹری شیعہ اسوسی ایشن آف انڈیا و صدر مجلس انتظامی کوہ امام ضامن (امام موسیٰ رضاؑ) علیہ السلام شامل تھے۔

previously. Before starting on the journey he took lethal poison with him. He knew that cold blooded murder would create trouble for him and incite the Hashimites. He therefore decided to murder him as secretly as possible. The holy Imam (A.S.) was aware of his plan, but as it was destined, he co-operated with the inevitable. Several times he had foretold where and how of his death, so people advised him not to go there. In reply to their suggestions the divine leader said: "Destiny would not leave me."

Hasan bin Ebeda said that when Imam Reza (A.S.) started for Khorasan, I asked him: "When will you reach Baghdad?" The divine leader said: "Only Mamoon will reach that city. I will reach only Khorasan." His wording perplexed me. When we reached Khorasan, Imam said: "I will be buried here beside the grave of Haroon and it will happen this very week."

Ebada continued: "Next day Imam Reza (A.S.) offered morning prayers and donned his dress. He waited until Mamoon's servants came to take him. The Imam put on his shoes and mantle and started towards Mamoon's palace. I also accompanied him. When we reached there we saw many fruit trays lay there before Mamoon and he had a bunch of grapes in his hands Several of the grapes he had poisoned by passing thread soaked in poison through them.

When he saw the Divine leader he stood up to receive him with due honour, kissed him on the forehead, and made him sit beside his seat. The Caliph thereafter lifted some poisoned grapes and presenting them to Imam (A.S.) said: "Take these grapes, these are the most excellent ones I have ever seen." The Imam replied: "The grapes of Paradise are far more excellent than these ones."

Mamoon persisted and the Imam finally took three grapes. His colour began to change. He threw the remaining grapes and rose to leave; saying: "I am going where you had intended to send me. I saw something folded on his head so I did not ask him anything. He entered the room and ordered me to close the doors. Thereafter he sat on the bed in a distressed condition and I sat down near the entrance of the room perplexed and confused. The Imam then died.

After a while Mamoon arrived with his slaves. He came inside and began to weep tearing his clothes he went to the head of the Imam and ordered his men to bathe and shroud the body. Prayers were then offered and the bier was taken to the place where Haroon was buried. When all the funeral attendants dispersed, Mamoon summoned me in strict privacy and enquired: "Tell me whatever you have heard from the late Imam." I replied: "I have already disclosed to you whatever he has told me." He reiterated: "I put you on oath to tell me whatever he had told you beside that.",

Seeing his obstinacy I told him about giving the Holy Imam of poison mixed with pomegranate juice and grapes. With this disclosure his countenance changed. His face turned red, then yellow and then black. he was so shocked that he lost consciousness and he began to mutter: "Curse be on Mamoon from Allah, curse be on Mamoon from the Holy Prophet (S.A.W.) curse be on Mamoon from Ali Murtaza, curse be on Mamoon from Fatemeh-al-Zahra, curse be on Mamoon from the Ahl ul Bait. Indeed! I committed the most heinous crime." Thus he continued to shout and scream. I was terrified and sat silently in a corner. He took strict covenants from me not to disclose things and thereafter I left him and returned to my home in misery."

Imam Reza (A.S.) was buried in a garden at Sanabad, within the tomb of Haroon-ur-Rashid with his feet towards the head of the accursed Caliph. The tomb has become a principal place of Shia pilgrimage, and the town that has grown near it is known as Mashad.

HUJATH-UL-ISLAM WAL MUSLAMEEN
Moulana Syed Mohd. Moosvi.

C H A R I T Y

Allah Almighty has reserved a great reward for charity. It effaces the sins from the account of an individual and also serves as a shield to protect him from a befalling evil.

The person who gives charity will always feel contended for Allah blesses his sustenance and makes his affairs easy for him. It is recommended to develop the habit of regular charity no matter how insignificant the amount one can afford to part with. But remember! Charity begins at home. So first try to gratify the needs of one's own poor and deserving relatives and then embark on charity in general.

narrator objected to him, "O Master, what harm is there if they take their meals separately?" The Imam replied, "Why? all of us are created by one God and the parents of all of us are the same Adam and Eve. Also the reward or punishment in the Hereafter depends upon our deeds, so why this discrimination?"

Regarding taqwa he used to say: "The man who is more pious than I is better than I. Similarly charity was also his manifest trait.

Once the Imam gave away all his belongings in charity. The minister of Caliph Mamoon objected to this and said: "You are doing harm to yourself by this overgenerous disposition. The Imam (A.S.) said: "This is not a loss but I will get a better return from Allah for this performance of mine."

Side by side with possessing so generous a nature, he was also very careful about economy. Yasir said: "Once we were eating fruit in a manner that we ate a little from a piece and threw away the rest. Imam (A.S.) saw this and said: "Do not eat in this manner and do not waste the bounties of Allah. Eat properly and give to the poor what is extra."

Imam Reza (A.S.) used to offer morning prayer at its proper time and after finishing prayer he would begin his prostration and this post-prayer prostration was always a prolonged one. He used to offer at least a thousand rakat prayers, during twentyfour hours. Whenever he would go to bed he would begin to recite Quran. He used to finish the recitation of the holy Quran daily. He used to quote Quranic verses in his reply to religious questions of the visitors.

Imam Reza (A.S.) had particular regard for his followers, and he always attended the funeral if any of his local adherents died.

Some miracles of Imam Reza (A.S.)

A number of miracles in words and actions were witnessed by the people from Imam Reza (A.S.). A few of them are mentioned here:

(1) Once Imam Reza saw Amin and Mamoon together and said: "In the near future Amin will be murdered by Mamoon." Amin was actually murdered on 23rd Muharram 198 A.H.

(2) Once Imam Reza (A.S) saw a man and said to somebody: "Bring that man to me." When that man came to him Imam (A.S,) said: "Make your will and be prepared for the Hereafter." That man died after three days.

(3) Allama Tabrasi has written that once Imam Reza (A.S.) went to visit his fields, He said: "Those who accompany me should take provisions for rain." A man who was with him said: "Oh Master! It is so hot and there is no sign of rain." Imam (A.S.) replied: "It will definitely rain." And as they reached their destination it began to rain and it rained very heavily.

The marvels of the erudition of Imam Reza (A.S.)

All apostolic Imams were divinely endowed with knowledge and their excellence and merits were accepted by friends and foes alike. Imam Jafar-e-Sadiq (A.S.) got the opportunity to spread his teachings and Imam Reza (A.S.) also got some chances to do it. Even when he was not appointed to the post of divine leadership, his father Imam Moosa Kazim (A.S.) used to order his other children: "Ask your brother Reza about the directives of religion and remember what he says."

After becoming divinely a commissioned Imam he used to go to the shrine of the Holy Prophet (S.A.W.) daily and solve the problems of the public in matters of religion and allied topics.

It is unanimously accepted by all the interested historians that though the people of the world disregarded the leadership of the Imams, they accepted their superiority in the matter of the knowledge. Imam Reza's superiority in the sphere of knowledge attained fame even outside Arabia where he travelled through Persia and also in the court of Caliph Mamoon at Merv, many debates were held between him and the scholars of other religions; and in all those discussions Imam (A.S.) scored victory over all of them.

Imam's firmness about religious matters

Mamoon had thought that Imam Reza (A.S.) would be impressed by pomp and pageantry associated with royal authority and then he would lead the divine leader according to his own sweet will. But, with the passing of days Mamoon realised that his presumption was faulty. There was thus a development of clash of ideas which turned Mamoon completely against Imam Reza (A.S.)

Martyrdom of Imam Reza A.S.

Mamoon's behaviour to Imam Reza (A.S.) was no more good. He would seek opportunities to pass unwelcome remarks to the divine leader. He would try to impress upon the divine leader his favours for making him an heir-apparent. The Imam once told him: "This position has not given me any rank or respect. I was passing a rather more honourable life there in Medina. Whenever somebody came to me seeking solutions about religious directives I could answer them freely and help the needy according to my ability. Now, in this position I am completely devoid of freedom. People fear my rank and they cannot visit me as freely as they would. As for this heir-apparentship I would now survive to enjoy it. I have told this to you even before my appointment still I am leader with this burden."

"Yes, I will see the matter over," replied the changrined Caliph. Mamoon decided to do away with the divine leader.

Seeking a proper opportunity Mamoon decided to visit Khorasan and requested the Imam to accompany him. He did not like any person to visit the divine leader and talk to him, so he appointed guards around his house. He wanted to murder the Imam during the journey as he had done with his prime minister

with utmost callousness looted the belongings of the progeny of Fatema (A.S.). Mohammed bin Jafar opposed him but eventually was captured, and sent to Haroon.

After finishing his dirty mission of plundering and looting the houses of other Sayeds, Essa headed towards the house of Imam Reza (A.S.) and expressed a desire to enter the house and plunder his belongings. Imam Reza (A.S.) refused to let him in and said: "You should not enter my house, because I myself will hand over all my wealth to you." At first Essa disagreed with him but later he permitted Imam (A.S.) to do so. Imam Reza (A.S.) then returned to his house and took out everything, including cash, clothings, ornaments etc: and gave it to Essa. He left only the dress that was on his body. Essa took the loot and started towards Baghdad.

In the last years of his life Haroon was so compelled by circumstances that he did not indulge in any activity against Imam (A.S.). Yahya bin Khalid tried to incite him against Imam Reza (A.S.) but Haroon grew angry at him and said: "It is enough for us what we have done with his father. Now you wish to kill all of them." Even when Haroon did not act with any serious and open enmnity against Imam Reza (A.S.) the attitude of his government was so stern that neither the divine leaders could preach their teachings safely nor their followers could go to them to seek solution of religious problems.

Haroon was diverted towards the controversy of his two sons Amin and Mamoon. Amin was son of an Arab princess, who was a cousin of Haroon and grand daughter of Caliph Mansoor. The Arab Chiefs and Officers were on Amin's side. Mamoon was the son of an Iranian slave girl, and so the non-Arab group of Chiefs and officers of the court sided with Mamoon. The quarrel between the two step-brothers was the cause of a headache for Haroon, who decided to divide his kindgom equally between his two sons so that the quarrels might be avoided. He gave Baghdad and its surrounding areas of Arab lands to Amin; and Iran, Turkey and some non-Arab areas to Mamoon.

Immediately after the death of Haroon, however, the brothers began to fight among themselves and after four bloody years Mamoon was victorious. In Moharram 198 A.H. Amin was killed and Mamoon became the sole ruler of the Abbaside empire.

Imam Reza (A.S.) spent ten years of his Imamate in the reign of Haroon and during the early years his house was robbed by Essa Jolondi under the order of the Caliph but therafter Haroon ignored the affairs of Imam Reza (A.S.).

We perceive two reasons for Haroon's change of mind. During the early years of that period the Caliph remained pre-occupied in the extermination of the Bermicide as well as the rebellion of Rafea bin Lais bin Tayyar which sprang in Samarkand and spread in Bactaria as well as some areas of Arabia. Haroon remained so busy in these affairs that he had no time to pay attention to the Alids.

These were the troubles that kept Haroon so pre-occupied that he could not turn his attention towards the persecution of Imam Reza (A.S.). Had he found any peace of mind he would have at once begun to harass the children of Ali (A.S.) and Fatema (A.S.). Once so powerful, Haroon was ultimately deprived of all authority. At last he died in grief and agony in 193 A.H. in Khorasan.

Once Haroon-ur-Rashid Abbasi went to Mecca for Hajj and Imam Reza (A.S.) also went for the pilgrimage of Mecca the same year. After circumbulation the Imam came out from one door, and Haroon from the other. Imam (A.S.) saw him and said: "I and the man who came out of the other door will meet in one place at Toos "

A narrator is quoted to have said: "Imam Reza (A.S.) seeing Haroon, put together the fingers of his two hands and said: "This man and I will meet like this." I could not understand his words at that time, but it became clear to me after the martyrdom of Imam (A.S.) that both Haroon and Imam (A.S.) were buried under the same dome."

In another tradition it is mentioned that Imam Reza (A.S.) saw Yahya bin Khalid the Bermicide in Mecca while he had covered his face with a handkerchief to save it from the dirt, and said: "This man does not know what will happen to him this year. Certainly in the very near future he will be ruined." The prediction of his ruin came true.

Moosa bin Imrah said that when Haroon visited Medina and Imam Reza (A.S.) saw him delivering a sermon, he later said: "In the near future Haroon and I will be buried at the same burial place."

The character of Imam Reza (A.S.) in general

It is not easy to describe the character of Imam Reza (A.S.) because of his innumerable excellent qualities. It is said that Imam Reza (A.S.) never talked sternly with any person and never did he interrupt the conversation of any body. It was his habit to begin talking only when the other person had completed his talk. He was always ready to help others and co-operate with them. He never spoke harshly even to his slaves.

Politeness, humility and other good virtues were so highly developed in him, that he used to dine with his servants. He fasted often, and he wouldn't pass a month without observing at least three fasts. Imam Reza (A.S.) was very generous in giving alms and he distributed charity generally at night. His clothes were simple and of coarse material, but whenever he went out he wore fine clothes lest someone should taunt him for extreme miserliness.

He was so kind-hearted that he would never displease anyone. A Balkhi narrated that once he was in the company of Imam (A.S.) during a journey. At the meal time the Divine Leader summoned all his servants to dine with him. Among the servants was a negro slave. The

Light, Knowledge, Truth

Imam Reza (A.S.)

Imam Reza (A.S.) was the eighth legal successor of the Holy Prophet (S.A.W.) and as such the eighth Prophetic Imam of the Ithna Ashriyah or Twelves. He was the 10th link in the holy chain of 14 infallibles. His father was Imam Musa Kazim (A.S) His mother's name was Ummul Banin who was also known as Tahreh and Najma. She was of Persian origin and considered to be among the noble ladies of that country. She was a pious, sensible and honest lady. Her mother-in-law lady Hameeda Khatoon said that she had never seen any woman worthier than Ummal Banin.

Ali ibn Meetham had said that lady Hameeda Khatoon dreamt the Holy Prophet (S.A.W.) ordered her "to arrange the marriage of Ummal Banin with Moosa Kazim (A.S.) in the very near future. She will give birth to a boy, who will be the most excellent of all the men of his time."

Birth

Imam Reza (A.S.) was born on Thursday 11th Zilqaad, 153 A.H. at Medina. Allama Majlisi has quoted lady Ummal Banin as saying: "I never felt the weight of the conceived child Reza during my pregnancy. During my pregnancy I used to hear the sounds of prayers and supplications coming from my womb during sleep. Immediately after birth my son supported himself on his hands on the floor, and his lips began to move as he turned his head towards the sky, as if he was supplicating. In the meantime Imam Musa Kazim (A.S.) arrived and congratulated me. I gave him the new-born babe, and he said Adhan in the right ear and Iqamet in the left ear of the baby. Thereafter he returned the baby to me and said: "Take this baby, he is the sign of Allah in this world and a divine leader after me."

His father Imam Musa Kazim (A.S.) named him Reza because this name was written for him and it was bequeathed by the Holy Prophet (S A.W.). His filial appellation was Abul Hasan and his titles are. Reza, Sabir, Fazil, Razi, Zaki etc. The most famous of his titles is Reza.

He was given the title Reza because Allah, the Prophets and all the creatures of the world were pleased with him. Once somebody asked Imam Mohammad Taqi (A.S) about the prevalent rumours that the title Reza was given by Mamoon Ali Rashid, Imam Mohammed Taqi (A.S.) refuted this and said the title Reza was the gift of Allah the Almighty and the Holy Prophet (S.A.W.) and the special significance of the title was that both the adherents as well as the antagonists used to remain well pleased with him.

Imam Reza (A.S.) was brought up under the kind guardianship of his father. Though his father had to pass most of his life in the jails of the reigning Caliph Haroon-ur-Rashid, he was fortunate to get the valuable company of his father for about 25 years.

Imam Reza (A.S.) was born during the reign of the second Abbasid Caliph Mansoor who was succeeded by his son Mehdi. Mehdi was succeeded by his son Moosa Hadi who was poisoned by his own mother, who favoured her younger son Haroon. Haroon ruled for a long time and murdered many children of Ali (A.S.) and Fatima (A.S.) including Imam Moosa Kazim (A.S.). Mamoon the son of Haroon was successful in getting control of the Caliphate from his half-brother Amin. Imam Reza (A.S.) was poisoned by Mamoon the Abbaside, and thus in 230 A.H. he bid farewell to this world.

Appointment as Imam

Imam Moosa Kazim (A.S) was aware that the Abbaside government would not permit him to fulfil his mission in peace, and circumstances would make it impossible for him even to meet his friends and followers. He, therefore, gathered seventeen prominent persons from the progeny of Ali (A.S.) and Fatemah (A.S.) and before them he declared Imam Reza (A.S.) as his successor to the post of divine leadership. He also wrote a will and obtained signatures of sixty prominent Medinites on it. This was done before Imam Moosa Kazem (A.S.) had been put in prison.

Such an action was not taken by other Imams, because they did not have to face such circumstances.

In 183 A.H. Imam Moosa Kazim (A.S.) was martyred after prolonged detention by Haroon-ur-Rashid, when Imam Reza (A.S.) was about thirty years old. This was the most critical time for the progeny of Ali (A.S.) and Fatema (A.S.) because of the Caliphate of Haroon was a staunch adversary of the Ahl ul Bait.

For ten long years Haroon continued to rule the Muslim empire after the martyrdom of Imam Moosa Kazem (A.S.) who passed many years in prison before his death which also occurred in jail. This event defamed the Caliph and Haroon did not, therefore, openly wage anti-Imam activities but did so secretly.

Persecution of the adherents of Ali (A.S.)

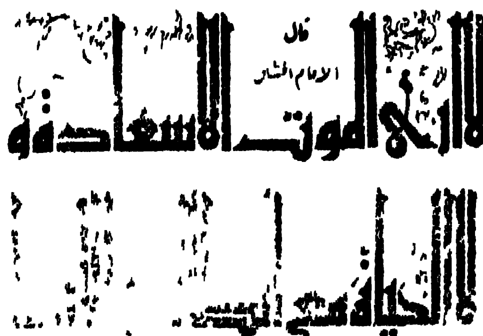
Secretly Haroon tried his utmost to undo the mission of Imamate. He made his agents plunder the house of Imam Reza (A.S.) and also kill a number of persons in the family of his uncle.

It is reported that Essa Jolondi was sent by the Caliph Haroon-ur-Rashid to Medina, to kill Imam Jafar-e-Sadiq (A.S.) who had declined to accept him as a Caliph. Essa Jolondi reached Medina with his army of hired plunderers and

AN OUTRAGE

The shooting down of an Iran Air Passenger Plane by a U S. Navy Warship Vincennes may go down in history as one of the most senseless and brutal acts ever perpetrated by one Nation against another. It is nothing less than the wanton murder of 298 innocent persons who had no means to defend themselves. It is inconceivable as to how an ultramodern warship equipped with State-of-the-art radar and other associated electronic gadgetry could confuse a wide-bodied passenger aircraft with a jet fighter and unleashed its deadly missiles on the hapless aircraft, to snuff out within a moment hundreds of innocent human lives. American military technology has been much touted everywhere as the most modern and infallible. But its so-called infallibility has proven to be a myth. Today a plane load of passengers paid with their lives because of a Naval Commander's panic reaction. Tomorrow World Civilization itself would end in a nuclear holocaust only because a military commander of the U.S. armed forces got panicky and pushed the nuclear button. All right thinking nations have condemned this barbaric act and linked it solely to the American military pressure in the Gulf. The editorial in 'The Hindu' has termed it "a heinous crime". Continuing in the same vein it said "the heinousness of the act is matched only by the apalling insensitivity of whoever was behind the decision to press the button and send a deadly missile to the aircraft." Adding insult to injury the Reagan Administration in cynical disregard of world opinion has chosen to defend an indefensible outrage. It has even insinuated that the Iranian authorities may have deliberately sent that Airbus towards the Warship. In other words, according to Washington, the Iranians may have stage managed the incident to gain propaganda mileage. Can anything be more absurd and reprehensible. Equally reprehensible was the British Prime Minister Margaret Thatcher's contention that the U.S. Navy Commander was perfectly within his rights to shoot down an unarmed passenger aircraft in "self-defence". But of course, Mrs. Thatcher is known to be an unabashed admirer of Ronald Reagan and will go to any lengths to condone the most insensate atrocity perpetrated by his Administration. Iran has rightly called for a thorough investigation into the affair by independent agencies like the International Civil Aviation Authority and the U.N. Only then the Truth will emerge.

The U.S. in accord with its superpower status has always sought to impose its fiat on weaker nations. The 'Gunboat Diplomacy' of the Kissinger-Nixon era coupled with a penchant for fishing in troubled waters has become a permanent feature of U.S. foreign policy. Be as it may last Sunday's incident bodes ill for lasting peace in the Gulf and would increase insecurity in an already volatile region of a palpable degree. Regrettably, no Arab Nation has condemned this barbaric act or even expressed sympathy for the families of those who died. So much for Islamic Solidarity and Brotherhood.



the sake of their dominance, deceive them, it makes them weaker and weaker gradually, brings about much misery for them, and the result will be torture and punishment of God. Therefore, hold fast by the real covenant, Holy Quran, honourable prophet and his household's mission. Come and stop the misery and abjectness of Muslim, come and spread the God's savior orders and the Prophet's Mission surely, God's favours be upon the poor and oppressed nations. Godwilling, by the help of Allah, unity and covenant all together, they will overcome the paganism, cruelty and oppressors. Now the Islamic republic is established in a country which has experimented bitterness of the subservient rulers who had plundered its natural resources. Since this new Islamic Government is going to execute the pure Islamic laws, it has decided to overcome all internal and external plots by God's help and people's faith. In this wav it has submitted many martyrs.

That's why world arrogant and its puppet regimes,fearing from this movement have committed many conspiracies against it, while Iranian Moslems will resist against them untill the last drop of their blood for the sake of Islam.

Godwilling they will gain the final victory, because they don't fear from any oppressor.

Hereby, I express my happiness for the publication of that Noble Journal which has chosen the very beautiful name, Bashir-w-Nazir.

Bashir-w-Nazir is expected to be in the path of Allah and Quranic culture, it will express that spreading truth, giving the good-tidings for facts and warning for ignorance and cruelty.

With the best wishes from Allah for all authorities of the journal.

DIRECTORSHIP OF THE ORGANIZATION OF
HAJ-O-AUKAHF-O-CHARITY AFFAIRS.

SEYED MEHDI EMAM JAMARANY.



State Religious leaders and representatives of social organizations meet Governor Kumudben Joshi on Monday at Raj Bhavan and submit the memorandum, in protest against the unlawful attack on a civilian aircraft of Iran by USA.

شماره ـــــــــــــــ
تاریخ ـــــــــــــــ
پیوست ـــــــــــــــ





جمهوری اسلامی ایران
سازمان حج و اوقاف و امور خیریه

M E S S A G E

IN THE NAME OF ALLAH, THE BENEFICIENT, THE MERCIFUL

RESPECTED PRINCIPAL OF 'BASHIR-W-NAZIR'

Those who deliver the messages of Allah and fear him, and do not fear anyone but Allah; and Allah is sufficient to take account. (Ahzab, V.39)

All praise is due to Allah, the Lord of the worlds who aquainted man with the power of pen and taught him different sciences.

Peace be upon Muhammad, who brought in to existence the highest making-man school and as a kind teacher revived the capacity of facts in man, peace be upon the pure blessed and faithful disciples of the honourable prophet who continued his way and spread his divine culture.

Allah have mercy on all followers and martyrs of God's way who sacrificed their life and property with generousity and passed away. Peace be upon all the pious who struggle .and follow the path of prophets for the sake of Allah, those who spread the Islamic culture and justice, those who fight to efface the leggings of paganism and arrogance throughout the world and give the good news of freedom and brotherhood to the poor and oppressed. Nowadays inspite of all cultural and scientific developments in the world, it has been involved in social and moral mess, cruelties, ignorance, deceitfullness and spoiled human rights. The imperialist superpowers don't leave out any explicity various planning which is apparently benevolently human propaganda, but they seek for their sinister dominance. By vain reasoning they cause brutal massacre and blood sheds. For mastering them and plundering their natural resources, they Strangle any truth-seeking voice. They assassinate any liberal who struggle for freedom in general, by inducing different ways such as deceitful thoughts, they produce a plausible disappointing view for the young and intellectuals. They turn any movement and uprising into terror and panic which results in servitude and captivity.

What is the worst and the most dangerous is that superpowers spread corruption and prostitution with modern styles. They make different conspiracies in order to amuse and addict the young, and even children of the third world, to drugs and dirty plunging them into the pit of sensual affairs. They do it because they want to lead the public thoughts and opinions to a negative and diabolic values and divert them from the vital problems.

Zionist's blood thirsty claws and dependent traders are hidden behind all these problems and difficulties, who are ready to agitate and destroy the whole world for keeping their illegitimate interests.

Surely Islam, the school of justice, equality and brotherhood, the revival of the most highest human values, the supporter of the oppressed and deprived, the cult of worshiping and struggling against cruelty, ignorance and slavery which can present the prophetic mission, the cult which eradicate the cruelty and selfishness of plunderers and establish a society that substitute the diabolically ambitious for the divine values.

The honourable prophet, Mohammad (p.b.) and his pure blessed showed the way of man's greatness and overcoming tyranical bounds by God's revelation to the followers of Allah's path. They accomplished numerous endeavours for man's salvation from plunging into abjectness. But, on this great probation some chose the shining way of God and some the dark way of false.

Regarding all these matters especially characteristics of the divine religion which is beyond the Geographical borders, language and race, it is the only way of man's happiness for all ages. And the important mission that the world Islamic press undertake as the expressive language of truth, necessitates to make clear, the vast and perfect dimension of this shiny school as the most important task for people. For this, it is necessary to make use of suitable and exact sources. Indeed, it is the task of the press to make clear the sinister cruelty of the world arrogant and rekindle the vital effects and blessings of genuine Islam. They must inform people how colonialism and arrogance make ugly the visage of genuine Islam by the deviated and false sects. They must tell the moral values which Islam has ordered are for the sublimity while the materialistic and secular disciples presented by west, causes man's deviation.

The world Islamic press must revive this bravery in people that if they seek for piety good-deeds, science and struggling in the way of God, they can strike the greatest on criminal superpowers, by doing this they can attract the almighty God's, power and glory and if the appearance of the science and technology of the east and west which unfortunately world arrogant use it for

D. SATYANARAYANA
MINISTER FOR TECHNICAL EDUCATION



HYDERABAD
DATE 6.5.1988

Dear Sri Abbas Moosvi,

Thank you for your letter of 22nd instant. I am glad that your are starting a weekly publication in Urdu/ English which will convey great human values, equality justice and truth and that the Weekly is named Basheer-W-Nazeer. I wish your venture all the success.

Yours Sincerely,

(D.SATYANARAYANA)



TO

Sri S.A.Abbas Moosvi,
Architect,
9-1-25/A/1,
Lunger House,
H Y D E R A B A D. - 500 008.

G NARAYAN RAO, B Sc LL B
SPEAKER
ANDHRA PRADESH
LEGISLATIVE ASSEMBLY



TEL No OFF 32377
34076
RES 33763

HYDERABAD

DATE 25-4-1988

Dear Sri Moosvi,

I extend my good wishes for your venture of starting a Bilingual Weekly, Basheer-w-Nazeer.

I hope to write a more detailed openion after going through the issues of your journal, on the first annual day in 1989.

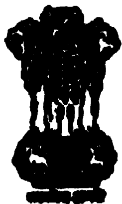
With best wishes,

Yours sincerely,

(G. Narayan Rao).

To
Sri S.A. Abbas Moosvi,
Architect,
H.No.9-1-25/A/1, Langer House,
Hyderabad - 500 008.





No. PC/M(A)/88/ 478

सदस्य
योजना आयोग
योजना भवन
नई दिल्ली-110001
MEMBER
PLANNING COMMISSION
YOJANA BHAVAN
NEW DELHI-110001

ABID HUSSAIN

May 3, 1988.

I am very happy to know that you are starting a Urdu / English Weekly Basheer-w-Nazeer.

Starting a weekly is a noble effort. A well founded journal can serve literature as well as the social case and be a cradle for intellectual development. I think there is much to be attained in these directions. You have set high ideals for your weekly the ideals of spreading great human values of equality, justice and truth. I hope, the weekly Basheer-w-Nazeer comes to be regarded as the model of these ideals. I wish you all success in your efforts.

With Regards.

Yours sincerely,

(ABID HUSSAIN)



Shri S.A. Abbas Moosvi,
Architect,
9-1-25/A/1, Langer House,
Hyderabad - 500 008.



5

[illegible] 27/VIP/MW/88

कल्याण राज्य मंत्री
भारत
नई दिल्ली-110 001.
MINISTER OF STATE
WELFARE
INDIA
NEW DELHI-110 001.

March 17, 1988

Dear Shri Moosvi,

I am glad to learn that you are launching a weekly in Urdu/English called "Basheer-w-Nazeer". The media have to play a vital role in the process of national integration and I trust that your Weekly will contribute in this regard in a positive and constructive way.

I wish the publication all success.

With best wishes,

Yours sincerely,

Rajendra Kumari Bajpai

(Rajendra Kumari Bajpai)

Shri S.A. Abbas Moosvi,
9-1-25/A/1, Langer House
Hyderabad-500008





CHIEF MINISTER
JAMMU AND KASHMIR

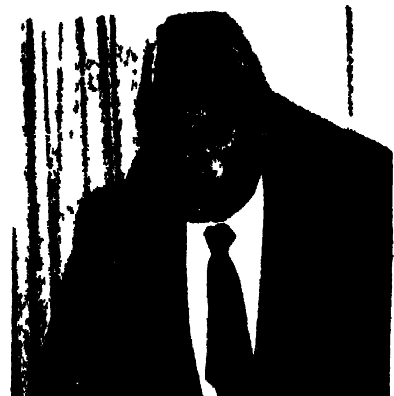
MESSAGE

I am very happy to hear that a Weekly called 'Basheer-w-Nazeer' is going to be brought out, which will be devoted to the promotion of truth, justice and human values. Such publications are very rare.

In the strife torn world of today we need moral and ethical values in an hour of crisis. In our schools, colleges and universities the students need to be made conscious of human values enshrined in our cultural heritage. It would, indeed, be very heartening, if the proposed publication meets this prime need of our society and helps the readers in inculcating the love for higher values.

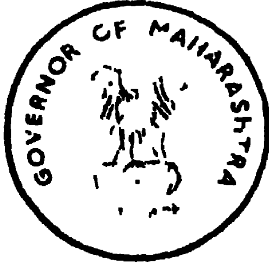
(Farooq Abdullah)

Srinagar,
May 6 ,1988.



3 No. 862 /PS./G/88

RAJ BHAVAN
BOMBAY 400 035



21 March, 1988

Dear Shri Moosvi,

I have received your letter dated 11th March 1988. I am glad to know that you are starting a weekly by the name 'Basheer-w-Nazeer'. To run a weekly or a fortnightly or a daily is not a simple affair. I hope you have taken precaution to provide the required infra-structural facilities. I am sure your journal will try to promote Hindu-Muslim unity and unity of all human beings to whichever religion they may belong.

I wish you success.

Yours sincerely,

(K. Brahmananda Reddy)

Shri S.A.Abbas Moosvi
9-1-25/A/1, Langer Houze
HYDERABAD-500 008
(A.P.)

N.T. RAMA RAO
Chief Minister



Hyderabad
28-3-1988

Dear Janab Abbas Moosvi,

I wish you God speed in your efforts to bring out a weekly journal, Basheer-w-Nazeer

With best regards,

Yours sincerely,

(N.T. RAMA RAO)

To
Sri S.A. Abbas Moosvi,
Architect,
9-1-25/A/1, Langer Houze,
HYDERABAD-500 008.



April 17, 1988.

MESSAGE

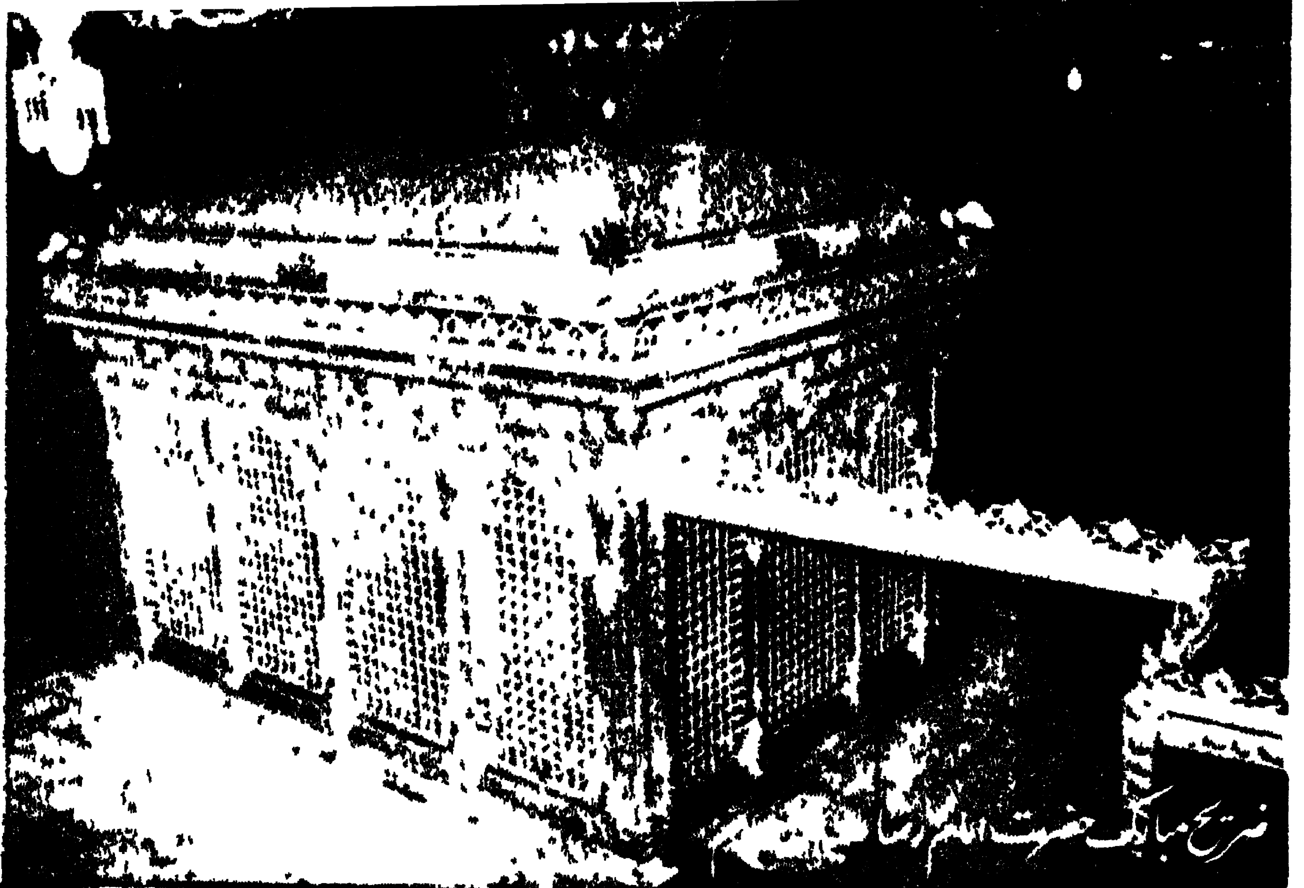
I am glad to know that a new Weekly in the name and style "BASHEER-W-NAZEER" (Urdu) is being brought out from Hyderabad dedicated to the sole purpose of promoting human values, equality, justice and truth.

The Press has a vital role to play in moulding public opinion. Particularly small news papers which analyse events and trends, provide a 'news digest' focusing public attention on the problems confronting the society. This analysis helps the readers to get at the crux of any problem. I am sure the new Weekly will address itself to the laudable objectives of public education and also in reflecting impartial views.

My best wishes for the success of the new Journal.

Kumud Joshi
(KUMUD JOSHI)





ضریح مبارک حضرت امام رضا

حضرت امام رضا علیہ السلام کا مزار

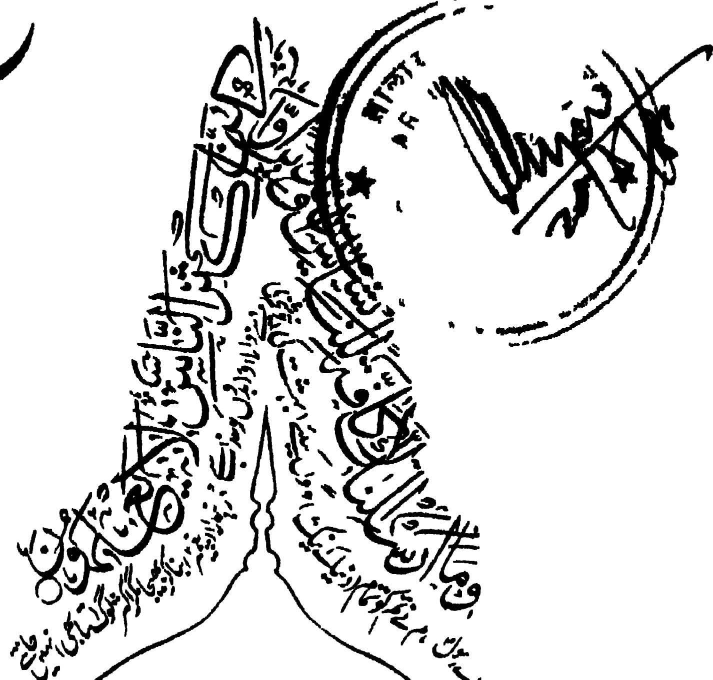
روضہ مبارک امام موسیٰ رضا علیہ السلام





ہفت روزہ

بشیر و نذیر

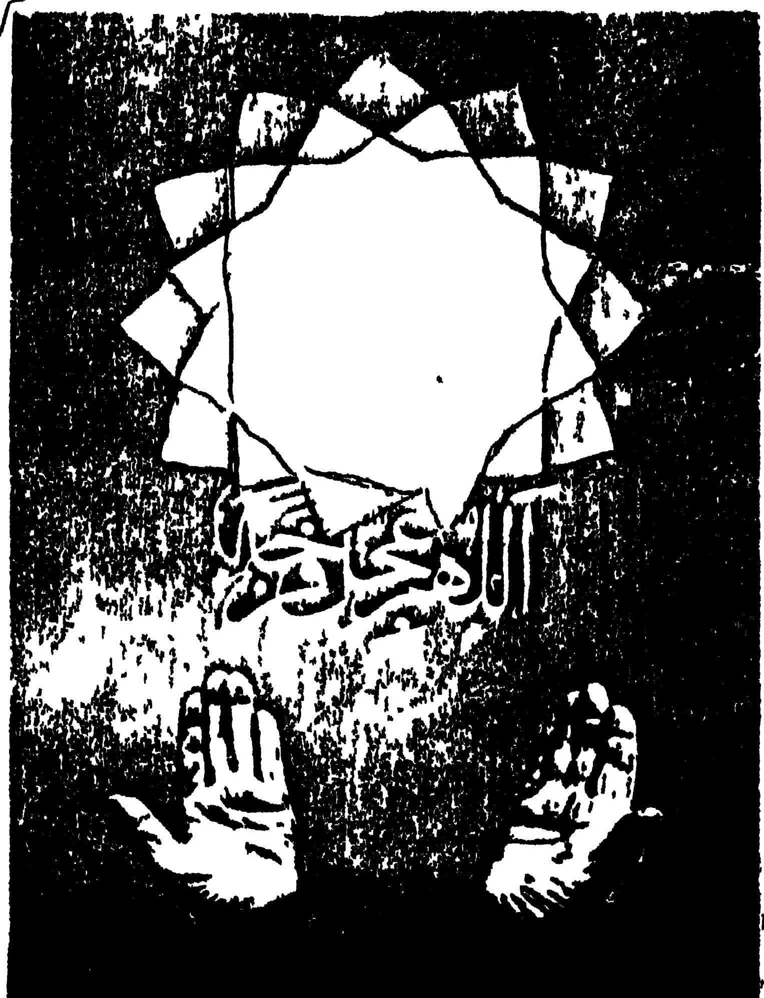


ترتیب

مدیر

سید علی عباس موسوی





جلد (۱) ★ شمارہ ۴

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ، سالانہ ۴۵ روپے

رجسٹرڈ نمبر 47283/20/5/AL/88.TC

اداریہ

اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس کے دامن میں انسان کو ایک ہر عمل کے لئے ہدایت موجود ہے جو اُس کی فلاح اور بہبودی کیلئے ہے اور اللہ تعالےٰ کا یہ قانون اس لئے نہیں بدلتا کیونکہ یہ علم حاصل کرنے والوں کا بنایا ہوا نہیں ہے بلکہ خالقِ کائنات کا مدون کردہ ہے۔ اس لئے ہر فرد اس قانون پر اظہارِ رائے کا اس وقت تک حق نہیں رکھتا جب تک کہ وہ اسلام کی حکمت عملی اور حکمت نظری اور مقاصد کو سمجھ نہ لے۔ اسلام نے معاشرہ کے لئے جو حکمت عملی پیش کی ہے اس پر غور کرنے سے پہلے اس کے بنیادی عقاید کو اچھی طرح سمجھ لینے کی سخت ضرورت ہے۔ اسلامی حکمت نظری میں جھوٹ، مکاری، فریب، دغابازی کو کوئی جگہ نہیں تو لہٰذا اسلام کے دائرہ میں رہ کر ان چیزوں پر عمل پیرا ہونے والا مسلمان، اسلام کا پیرو نہیں کہلا سکتا اس لئے پروردگار نے یوم محشر بندے کی توبہ کو قبول کرنے اس کے گناہوں کو معاف کرنے کا جہاں امکان ظاہر کیا ہے۔ وہیں پر ان مظالم کو ہرگز معاف نہ کرنے کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ جو انسان نے انسانوں پر کئے ہیں اس لئے اسلام کے اصولوں پر قائم رہنے کی کوشش ضروری ہے۔

آج بھی عید مباہلہ اسی بات کا اعلان کر رہی ہے کہ مجسم حق و صداقت کے پیکر جب باطل کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں تو باطل کے قدم اُکھڑ جاتے ہیں ——— قرآن شاہد ہے کہ نصاریٰ نے جب حضرت رسول اکرمؐ سے اس بات پر اصرار کیا کہ حضرت عیسیٰ بندہ نہیں ہیں بلکہ خدا کے بیٹے ہیں اور اگر خدا کے بیٹے نہیں ہیں تو بتاؤ کہ کس کے بیٹے ہیں تو آیتِ قرآن نازل ہوئی کہ جس طرح آدم کو مٹی سے بنا کر جان ڈال دی اور اُن کا کوئی باپ نہیں اس طرح حضرت عیسیٰ کا اگر باپ نہ ہو تو کوئی عجیب بات نہیں۔ مگر اس کے باوجود بھی جب نصاریٰ اس بات کے قائل نہ ہوئے تو ارشادِ قدرت ہوا کہ حق اور باطل کے فیصلہ کی یہ بھی ایک صورت ہے کہ نصاریٰ اپنے بیٹوں کو لائیں تم (اے رسولؐ) اپنے بیٹوں کو لے جاؤ، وہ اپنے نفوس کو لائیں تم اپنے نفوس کو لیجاؤ اور وہ اپنے عورتوں کو لائیں تم اپنی عورتوں کو لے جاؤ تاکہ دونوں مل کر دعا کریں کہ جو کوئی بھی جھوٹا ہے اس پر خدا کی … … جانب سے لعنت اور عذاب نازل ہو۔ اس بناء پر حضرت رسول اکرمؐ نے بیٹوں کی جگہ پر امام حسنؑ و امام حسینؑ، عورتوں میں شہزادی فاطمہ زہراؑ اور نفسوں میں علی مرتضیٰؑ کو لیکر میدان مباہلہ میں تشریف لائے۔ جب یہ پنجتن پاک کو نصاریٰ نے دیکھا تو اُن کے سردار اور عالم نے کہا کہ ان کے چہروں سے صداقت کا نور صادر ہو رہا ہے۔ اسلئے ان سے مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ اور عذاب الٰہی سے ہم نہیں بچ سکیں گے۔ لہٰذا انھوں نے جزیہ دینا قبول کر لیا۔

عید مباہلہ، جہاں رسولؐ اور اہلِ بیت رسولؐ کی صداقت کا ایک کھلا ثبوت ہے وہیں پر یہ دعوتِ فکر بھی دی جا رہی ہے کہ رسولؐ اور اہل بیتؑ کی اتباع کے ذریعہ اگر ہم صداقت کے راستہ پر گامزن ہو جائیں تو باطل ہمارے مقابل نہیں آسکتا۔

لہٰذا اگر آج سُنتِ نبویؐ اور سیرتِ آلِ محمدؐ کو ہم اپنا شعار بنا لیں تو ہمارا ہر قدم نہ صرف ہمارے لیے بلکہ ملت اور ساری انسانیت کے لئے باعثِ تقلید بن جائیگا۔

عید مباہلہ اس بات کا اعلان کر رہی ہے کہ حق و صداقت پر گامزن رہنے والوں کے چہرہ بھی اُن کی سیرت کے آئینہ دار ہو جاتے ہیں اور باطل اور جھوٹ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ ان کا مقابلہ کریں۔

آج ساری دنیا میں سچ اور جھوٹ میں فرق اور امتیاز کے لئے کئی معیار اور کئی طریقے اپنائے گئے ہیں مگر الٰہی قانون میں حق و باطل کے معیار کو انوکھے انداز میں اس طرح پیش کیا کہ باطل پرست ہی عذاب الٰہی سے ڈر کر میدان چھوڑ دیتے ہیں اور حق کے علمبردار کو عذاب الٰہی کا خوف اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہیں۔

==========================

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بَیر رکھنا

- جس سرزمین پر رہنے والوں میں اُونچ نیچ اور انسانیت کے بارہ میں کوئی اختلاف اور نفرت کا جذبہ نہ ہو۔ جو انواع و اقسام کی جڑی بوٹیوں اور طاقتوں کو پیدا کرتی ہے۔ وہی دھرتی ماتا ہمیں پھیلنے میں مدد دے۔ اور ہمارے رشتہ اُلفت کو مضبوط کرے۔ ۱۲-۱-۴۵ (اتھروید)
- اے بھائی۔ دوسرے کا بُرا چاہنا چھوڑ دے۔ یعنی پہلے اپنے اندر کے نقائص دور کر۔ تب تیرے نزدیک بھی کوئی برائی نہیں پھٹکے گی۔ (گوڑی باون اکھری۔ محلہ ۵)
- فرید صاحب فرماتے ہیں۔ کہ جو تم سے برائی کرے۔ اُس کا بھی بھلا چاہو۔ دل میں غصہ نہ رکھو۔ ایسا کرنے سے تمہارے جسم کو کوئی عارضہ لاحق نہ ہوگا اور سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔ (شلوک فرید)
- جو لوگ بُرا سوچ رہے ہیں۔ اُن کو سخت عذاب ہوگا۔ اور ان لوگوں کا یہ منصُوبہ بھی خاک میں مل جاوے گا۔ (الفاطر ۱۰/۲۲)
- رحم کرنے والوں پر اللہ رحم کرتا ہے۔ تم زمین والوں سے بھلائی کرو۔ تم پر آسمان والا رحم کرے گا۔ رحم رحمٰن سے پیوستہ ہے۔ پس جو اُسے اپنائیگا (سب کا بھلا چاہے گا) اللہ اُسے اپنائے گا۔ جو اُسے دُور کرے گا۔ اللہ اُسے دُور کرے گا۔ (ابوداؤد)
- کوئی شخص اپنی (ہی) بہتری کا خواہاں نہ ہو۔ بلکہ ہر ایک اِنسان دُوسرے کی بہتری چاہے۔ (۱۔ قرانتی ۱۰-۲۴)
- نیک کام مِل کر ہی سرانجام ہو سکتے ہیں۔ (اتھر وید۔ ۳۰-۱۲۴-۱۲)
- تم ایک دوسرے کی حِفاظت کرو۔ اور ایک دوسرے کے مددگار بنو۔ (یجر وید ۳۶/۱۸)
- اے میرے بھائیو! سب یک جا ہو کر رہو۔ محبّت سے دُشمنی کو مغلوب کر دو۔ (بسنت محلہ ۵)
- کسی سے مُخالفت یا جھگڑا نہ کرو۔ مُخالفت میں تکلیف ہوتی ہے۔ صُلح کُل ہو کر رہو۔ (پریم سمارگ)
- اور تم لوگ اُن لوگوں کی طرح مت ہو جانا۔ جنھوں نے باہم تفریق کر لی۔ اور باہم اختلاف کر لیا۔ جب کہ اُن کے پاس احکام واضح پہنچ چکے تھے۔ اور اُن لوگوں کے لئے سزائے عظیم ہوگی (جو آپس میں مل کر نہیں رہے) (آلِ عمران ۱۰۵/۴)
- دیکھو کیا اچھی اور خوبی کی بات ہے کہ آپس میں بھائی بھائی مل کر رہیں۔ (زبور ۱۳۳/۱)
- پس آؤ۔ ایسی باتوں کی پیروی کریں۔ جن سے صُلح اور میل ہو۔ اور جن سے ایک دُوسرے کی عزت بڑھے۔ (رومیوں ۱۴-۱۹)

==========================

ہم ان تمام قارئین کے مشکور ہیں جنھوں نے اپنی رائے کے ذریعہ ہماری ہمت افزائی فرمائی۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے مراسلہ یا سالانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر یا چیک روانہ کرتے وقت اپنا حوالہ خریداری نمبر ضرور لکھیں گے۔ (جو آپکے پتہ سے قبل دیا ہے)

جناب سید محمد جواد نقوی

نہج البلاغہ منارۂ ہدایت

قرآن و اہلبیتؑ

قرآن و اہلبیتؑ وہ عظیم امانت اور ثقل ہیں جنہیں رسولؐ اسلام مسلمان معاشرے کے رشد و ہدایت کے لئے چھوڑ کر گئے ہیں اور یہ اعلان کر گئے ہیں کہ اگر مسلمان اس گرانقدر سرمایہ سے متمسک رہے تو کبھی گمراہ نہ ہوں گے۔

قرآن مسلمانوں کے لئے ایک مکمل ضابطہ حیات و آئین زندگی ہے اور اہلبیتؑ اس آئین کے مفسر و ذمہ دار نفاذ ہیں جن کو قرآن ناطق کہا گیا ہے۔

احترام کی حد تک تو مسلمان قرآن و اہلبیت دونوں کو سر آنکھوں پر رکھتے ہیں لیکن جہاں تک عملی زندگی میں ان سے فائدہ اٹھانے کا تعلق ہے تو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عملی زندگی میں مسلمان کی توجہ قرآن کی تعلیمات اور اہلبیتؑ کے ارشادات پر کم ہی رہی ہے آج قرآن ثواب کے لئے تو تلاوت کیا جاتا ہے، قبروں پر یا مجلس فاتحہ میں قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے اسی طرح اہلبیتؑ کے فضائل بڑھ چڑھ کر بیان تو کئے جاتے ہیں ان کا تذکرہ بھی کم و بیش مسلمان معاشرے میں ہر جگہ ہوتا رہتا ہے لیکن نظام زندگی کی بنیاد اہلبیتؑ کی تعلیمات پر استوار نہیں ہے۔

قرآن و اہلبیتؑ کی عظمت کا صحیح اندازہ اور ان دو عظیم ثقل کا مکمل تعارف اور ان کے مختلف پہلو کی شناخت اور تعارف کے لئے مناسب سمجھا کہ خود قرآن ناطق اور ابو الائمہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے کلمات کی طرف رجوع کریں اور دیکھیں کہ مولا قرآن و اہلبیتؑ کا کس طرح سے تعارف فرماتے ہیں؟ حضرت کی نظر میں قرآن و اہلبیتؑ کا کیا مقام ہے؟ اور مسلمانوں کو ان کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں؟

قرآن علیؑ کی نظر میں

مولا امیر المومنینؑ خطبہ ۱۹۶ میں قرآن کا تعارف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ثم انزل عليه الكتاب نوراً لا تطفأ مصابيحه وسراجاً لا يخبو توقده وبحراً لا يدرك قعره ومنهاجاً لا يضل نهجه وشعاعاً لا يظلم ضوءه وفرقاناً لا يخمد برهانه وتبياناً لا تهدم اركانه وشفاءً لا تخشى اسقامه وعزاً لا تهزم انصاره وحقاً لا تخذل اعوانه فهو معدن الايمان وبحبوحته وينابيع العلم وبحوره ورياض العدل وغدرانه واثافي الاسلام وبنيانه واودية الحق وغيطانه وبحر لا ينزفه المستنزفون وعيون لا ينضبها الماتحون ومناهل لا يغيضها الواردون ومنازل لا يضل نهجها المسافرون واعلام لا يعمى عنها السائرون وآكام لا يجوز عنها القاصدون جعله الله رياً لعطش العلماء وربيعاً لقلوب الفقهاء ومحاج لطرق الصلحاء ودواءً ليس بعده داء ونوراً ليس معه ظلمة وحبلاً وثيقاً عروته ومعقلاً منيعاً ذروته وعزاً لمن تولاه وسلماً لمن دخله وهدى لمن ائتم به وعذراً لمن انتحله وبرهاناً لمن تكلم به وشاهداً لمن

خاصم به وفلجاً لمن حاج به وحاملاً لمن حمله ومطية لمن اعمله وآية لمن توسم وجنة لمن استلأم وعلماً لمن وعى وحديثاً لمن روى وحكماً لمن قضى

پھر آپ پر ایک ایسی کتاب نازل فرمائی جو (سراپا) نور ہے جس کی قندیلیں گل نہیں ہوتیں ایسا چراغ ہے جس کی لو خاموش نہیں ہوتی ایسا دریا ہے جس کی تھاہ نہیں لگائی جا سکتی۔ ایسی شاہراہ ہے جس میں راہ پیمائی بے راہ نہیں کرتی ایسی کرن ہے جس کی چھوٹ مدھم نہیں پڑتی وہ ایسا (حق و باطل میں) امتیاز کرنے والا ہے جس کی دلیل کمزور نہیں پڑتی ایسا کھول کر بیان کرنے والا ہے جس کے ستون منہدم نہیں کئے جا سکتے وہ سراسر شفا ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے (روحانی) بیماریوں کا کھٹکا نہیں وہ سراپا عزت و غلبہ ہے جس کے یار و مددگار شکست نہیں کھاتے وہ (سراپا) حق ہے جس کے معین و معاون بے مدد چھوڑے نہیں جاتے وہ ایمان کا معدن اور مرکز ہے اس سے علم کے چشمے پھوٹتے اور دریا بہتے ہیں اس میں عدل کے چمن اور انصاف کے حوض ہیں وہ اسلام کا سنگ بنیاد اور اس کی اساس ہے حق کی وادی اور اس کا ہموار میدان ہے وہ ایسا دریا ہے کہ جسے پانی بھرنے والے ختم نہیں کر سکتے وہ ایسا چشمہ ہے کہ پانی الیچنے والے اسے خشک نہیں کر سکتے وہ ایسا گھاٹ ہے کہ اس پر اترنے والوں سے اس کا پانی گھٹ نہیں سکتا وہ ایسی منزل ہے کہ جس کی راہ میں کوئی راہرو بھٹکتا نہیں وہ ایسا نشان ہے کہ چلنے والے کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتا وہ ایسا ٹیلہ ہے کہ حق کا قصد کرنے والے اس سے آگے گزر نہیں سکتے۔ اللہ نے اسے عالموں کی تشنگی کے لئے سیرابی فقیہوں کے دلوں کے لئے بہار اور نیکوں کی راہ گزر کے لئے شاہراہ قرار دیا ہے یہ ایسی دوا ہے کہ جس سے کوئی مرض نہیں رہتا ایسا نور ہے جس میں تیرگی کا گزر نہیں ایسی رسی ہے کہ جس کے حلقے مضبوط ہیں ایسی چوٹی ہے کہ جس کی پناہ گاہ محفوظ ہے جو اس سے وابستہ ہو اس کے لئے سرمایۂ عزت ہے جو اس کی حدود میں داخل ہو اس کے لئے پیغام صلح و امن ہے۔ جو اس کی پیروی کرے اس کے لئے ہدایت ہے جو اسے اپنی طرف نسبت دے اس کے لئے حجت ہے جو اس کی رو سے بات کرے اس کے لئے دلیل و برہان ہے جو اس کی بنیاد پر بحث و مناظرہ کرے اس کے لئے گواہ ہے جو اسے حجت بنا کر پیش کرے اس کے لئے فتح و کامرانی ہے۔ جو [illegible] کا بار اٹھائے یہ اس کا بوجھ بٹانے والا ہے جو [illegible] ایک واضح نشان ہے [illegible] سلاح بند ہو اس کے لئے [illegible] کو گرہ [illegible] اس کے لئے علم و دانش ہے۔ بیان [illegible] قطعی حکم ہے۔

قرآن [illegible]

مولا [illegible] علیہ السلام [illegible] کرتے ہوئے خطبہ ۱۷۴ میں [illegible] فرماتے ہیں:

واعلموا ان هذا القرآن هو الناصح الذي لا يغش والهادي الذي لا يضل، والمحدث الذي لا يكذب وما جالس هذا القرآن احد الا قام عنه بزيادة او نقصان، زيادة في هدى، او نقصان من عمى. واعلموا انه ليس على احد بعد القرآن من فاقة، ولا لاحد قبل القرآن من غنى فاستشفوه من ادوائكم واستعينوا به على لأوائكم فان فيه شفاء من اكبر الداء وهو الكفر والنفاق والغي والضلال

فاسألوا الله به، وتوجهوا اليه بحبه، ولا تسألوا به خلقه، انه ما توجه العباد الى الله بمثله. واعلموا انه شافع مشفع وقائل مصدق وانه من شفع له القرآن يوم القيامة شفع فيه، ومن محل به القرآن يوم القيامة صدق عليه فانه ينادي مناد يوم القيامة الا ان كل حارث مبتلى فی حرثه وعاقبة عمله غير حرثة القرآن. فكونوا من حرثته واتباعه واستدلوه على ربكم واستنصحوه على انفسكم واتهموا عليه آراءكم واستغشوا فيه اهواءكم

یاد رکھو کہ یہ قرآن ایسا نصیحت کرنے والا ہے جو فریب نہیں دیتا اور ایسا ہدایت کرنے والا ہے جو فریب نہیں دیتا اور ایسا ہدایت کرنے والا ہے جو گمراہ نہیں کرتا اور ایسا بیان کرنے والا ہے جو جھوٹ نہیں بولتا۔ جو بھی اس قرآن کا ہمنشیں ہوا وہ ہدایت کو بڑھا کر اور گمراہی وضلالت کو گھٹا کر اس سے الگ ہوا۔ جان لو کہ کسی کو قرآن (کی تعلیمات) کے بعد کسی اور لائحہ عمل کی احتیاج نہیں رہتی اور نہ کوئی قرآن سے (کچھ سیکھنے) سے پہلے اس سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔ اس سے اپنی بیماریوں کی شفا چاہو اور اپنی مصیبتوں پر اس سے مدد مانگو۔ اس میں کفر و نفاق اور ہلاکت و گمراہی جیسی بڑی بڑی مرضوں کی شفا پائی جاتی ہے۔ اس کے وسیلہ سے اللہ سے مانگو اور اس کی دوستی کو لئے ہوئے اس کا رخ کرو اور اسے لوگوں سے مانگنے کا ذریعہ نہ بناؤ۔ یقیناً بندوں کے لئے اللہ کی طرف متوجہ ہونے کا اس جیسا کوئی ذریعہ نہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن ایسا شفاعت کرنے والا ہے جس کی شفاعت مقبول اور ایسا کلام کرنے والا ہے (جس کی ہر بات) تصدیق شدہ ہے۔ قیامت کے دن جس کی یہ شفاعت کرے گا، وہ اس کے حق میں مانی جائیں گی اور اس روز جس کو عیوب بتلائے گا تو اس کے بارے میں بھی اس کے قول کی تصدیق کی جائے گی قیامت کے دن ایک ندا دینے والا پکار کر کہے گا دیکھو قرآن کی کھیتی بونے والوں کے علاوہ ہر بونے والا اپنی کھیتی اور اپنے اعمال کے نتیجہ میں مبتلا ہے۔ لہٰذا تم قرآن کی کھیتی بونے والے اور اس کے پیروکار بنو، اور اپنے پروردگار تک پہنچنے کے لئے اسے دلیل راہ بناؤ اور اپنے نفسوں کے لئے اس سے پند و نصیحت چاہو اور اس کے مقابلہ میں اپنی خواہشوں کو غلط و فریب خوردہ سمجھو۔

اسی خطبہ کے آخری حصہ میں فرماتے ہیں :-

وان الله سبحانه لم يعظ احداً بمثل هذا القرآن فانه حبل الله المتين وسببه الامين وفيه ربيع القلب وينابيع العلم وما للقلب جلاء غيره مع انه قد ذهب المتذكرون وبقي الناسون او المتناسون

قرآن سے بہتر کوئی وعظ نہیں اس لئے کہ قرآن خدا کی مضبوط رسی ہے اور امانتدار وسیلہ ہے جو دلوں کی بہار اور سرچشمہ ہے، دل اور آنکھوں کی رونق و روشنی ہے خصوصاً ایسے ماحول میں جبکہ جاننے والے جا چکے ہیں اور بھولنے اور تغافل کرنے والے باقی ہیں۔

خطبہ ۱۸۳ میں مولا قرآن کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :-

فالقرآن آمر زاجر وصامت ناطق حجة الله على خلقه اخذ عليه ميثاقهم وارتهن عليهم انفسهم اتم نوره واكمل به دينه وقبض نبيه وقد فرغ الى الخلق من احكام الهدى به

قرآن امر اور نہی کرنے والا ہے قرآن خاموش ہے جبکہ وہ اسی حالت میں بولتا بھی ہے قرآن خدا کی حجت ہے اس کی مخلوق پر اور خدا نے اپنے بندوں سے اس کتاب پر عمل کرنے کا عہد و پیمان لیا ہے اور ان کو قرآنی احکام کا پابند بنایا ہے قرآن مکمل نور ہے خدا نے اس کے ذریعہ اپنے دین کو مکمل کر دیا ہے

اپنے نبیؐ کو اس وقت اس جہان سے اٹھایا جب وہ تبلیغ احکام اور قرآن کے ذریعہ رشد و ہدایت کی تعلیمات کی ترویج سے فارغ ہو چکے تھے۔

خطبہ ۱۳۳ میں فرماتے ہیں :-

وكتاب الله بين اظهركم ناطق لا يعيا لسانه وبيت لا تهدم اركانه وعز لا تهزم اعوانه

قرآن تمہارے درمیان ایسا ترجمان ہے جس کی زبان حق گوئی سے تھکتی نہیں اور ایسا گھر ہے جس کی بنیادیں منہدم نہیں ہوتیں اور ایسی عزت و قدرت ہے جس کے دوست کبھی شکست نہیں کھاتے۔

اسی خطبہ کے آخری حصہ میں ارشاد فرماتے ہیں :-

كتاب الله تبصرون به وتنطقون به وتسمعون به وينطق بعضه ببعض ويشهد بعضه على بعض ولا يختلف في الله ولا يخالف بصاحبه عن الله

یہ اللہ کی کتاب ہے جس کی مدد سے تم حقائق کو دیکھ سکتے ہو اور اس کی مدد سے (حق) کہہ اور سن سکتے ہو جس کی مدد سے بعض دوسرے بعض کے بارے میں اظہار خیال کر سکتے ہیں اور بعض دوسرے بعض پر گواہی دے سکتے ہیں قرآن نے خدا کے بارے میں خلاف واقع کوئی بھی بات نہیں کی اور جو قرآن کی مصاحبت اپنائے اس کو کبھی خدا سے جدا نہیں کرتا۔

آخری زمانہ میں قرآن مہجور ہوگا۔

خطبہ ۱۴۷ میں حضرتؑ آخری زمانے کے حالات کی تصویر کشی کرتے ہوئے قرآن کے بارے میں یوں ارشاد فرماتے ہیں :-

وانه سيأتي عليكم من بعدي زمان ليس فيه شيء اخفى من الحق ولا اظهر من الباطل ولا اكثر من الكذب على الله ورسوله وليس عند اهل ذلك الزمان سلعة ابور من الكتاب اذا تلي حق تلاوته ولا انفق منه اذا حرف عن مواضعه ولا في البلاد شيء انكر من المعروف ولا اعرف من المنكر فقد نبذ الكتاب حملته وتناساه حفظته فالكتاب يومئذ واهله طريدان منفيان وصاحبان مصطحبان في طريق واحد لا يؤويهما مؤو فالكتاب واهله في ذلك الزمان في الناس وليسا فيهم ومعهم وليسا معهم لان الضلالة لا توافق الهدى وان اجتمعا فاجتمع القوم على الفرقة وافترقوا على الجماعة كانهم ائمة الكتاب وليس الكتاب امامهم فلم يبق عندهم منه الا اسمه ولا يعرفون الا خطه وزبره۔

میرے بعد تم پر ایک ایسا دور آنے والا ہے جس میں حق بہت پوشیدہ اور باطل بہت نمایاں ہوگا اور اللہ و رسولؐ پر افترا پردازی کا زور ہوگا اس زمانہ والوں کے نزدیک قرآن سے زیادہ کوئی بے قیمت چیز نہ ہوگی جبکہ اسے اس طرح پیش کیا جائے جیسے پیش کرنے کا حق ہے اور اس قرآن سے زیادہ ان میں کوئی مقبول اور قیمتی چیز نہیں ہوگی اس وقت جبکہ اس کی آیتوں کا بے محل استعمال کیا جائے اور نہ (ان کے) شہروں میں نیکی سے زیادہ کوئی برائی اور برائی سے زیادہ کوئی نیکی ہوگی۔ چنانچہ قرآن کا بار اٹھانے والے اسے پھینک کر الگ کریں گے اور حفظ کرنے والے اس کی (تعلیم) بھلا بیٹھیں گے اور قرآن اور قرآن والے (اہلبیتؑ) بے گھر اور بے در ہوں گے اور ایک ہی راہ میں ایک دوسرے کے ساتھی ہوں گے انہیں کوئی پناہ دینے والا نہ ہوگا۔ وہ (بظاہر) لوگوں میں ہوں گے مگر ان سے الگ تھلگ ——— ان کے ساتھ ہوں گے مگر بے تعلق

اس لئے کہ گمراہی ہدایت سے سازگار نہیں ہو سکتی اگرچہ وہ یکجا ہوں۔ لوگوں نے تفرقہ پردازی پر تو اتفاق کر لیا ہے اور جماعت سے کٹ گئے ہیں گویا کہ وہ کتاب کے پیشوا ہیں کتاب ان کی پیشوا نہیں۔ ان کے پاس تو صرف قرآن کا نام رہ گیا ہے اور اور صرف اس کے خطوط و نقوش کو پہچان سکتے ہیں۔

قرآن سے تمسک کی نصیحت

خطبہ ۱۵۶ میں قرآن سے تمسک کے بارے میں نصیحت فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

وعليكم بكتاب الله فانه الحبل المتين والنور المبين والشفاء النافع والرى النافع والعصمة للمتمسك والنجاة للمتعلق لا يعوج فيقام ولا يزيغ فيستعتب ولا تخلقه كثرة الرد وولوج السمع من قال به صدق ومن عمل به سبق۔

میں تمہیں قرآن سے متمسک رہنے کی نصیحت کرتا ہوں کیونکہ قرآن اللہ کی محکم رسی اور واضح و آشکار نور ہے قرآن نفع بخش شفا ہے پیاس بجھانے والی سیرابی ہے۔ جو اس سے متمسک ہو وہ نجات پائے گا اور جو اس کے دامن کو تھام لے وہ محفوظ رہے گا اس میں کوئی کجی نہیں ہے جس کو درست کرنے کی ضرورت ہو اور نہ تو یہ حق سے منحرف ہوتا اور نہ ہی خطا کرتا ہے۔ اس کی تکرار سے انسان کی سماعت پر گراں نہیں گزرتا جو قرآن کے مطابق باتیں کرے وہ سچا ہے جو اس پر عمل کرے وہ کامیاب ہے۔

خطبہ ۱۷ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

الى الله اشكو من معشر يعيشون جهالا ويموتون ضلالا ليس فيهم سلعة ابور من الكتاب اذا تلى حق تلاوته ولا سلعة انفق بيعا ولا اغلى ثمنا من الكتاب اذا حرف عن مواضعه۔

میں ان لوگوں کی شکایت اللہ سے کروں گا جو جہل و گمراہی میں زندگی بسر کرتے ہیں اور گمراہی میں مرتے ہیں ان کے درمیان قرآن کی کوئی قیمت نہیں ہے جب کہ اس طرح سے تلاوت کی جائے جو حق تلاوت ہے اور کوئی متاع قرآن کی مانند ان کے درمیان بیش قیمت نہیں جبکہ اس کی آیتوں کا بے محل استعمال کیا جائے۔

قرآن کا ظاہر و باطن

حضرت امیر علیہ السلام قرآن کے ظاہر و باطن کے بارے میں خطبہ ۱۸ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

وان القرآن ظاهره انيق وباطنه عميق لا تفنى عجائبه ولا تنقضى غرائبه ولا تكشف الظلمات الا به۔

قرآن کا ظاہر بڑا خوبصورت اور باطن بہت گہرا اور عمیق ہے قرآن کے تعجب انگیز نکتے کبھی فانی ہونے والے نہیں اور اس کے اندر عجائب و اسرار کا خزانہ ختم ہونے والا نہیں ہے جہل کی ظلمت و تاریکی قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کے ذریعے ختم نہیں ہو سکتی۔

قرآن سے گفتگو کی تاکید

خطبہ ۱۵۸ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

ذلك القرآن فاستنطقوه ولن ينطق ولكن اخبركم عنه الا ان فيه علم ما يأتى والحديث عن الماضى ودواء دائكم ونظم ما بينكم۔

یہ قرآن (نور خدا) ہے اس کو گفتگو کرنے پر آمادہ کرو لیکن یہ (عام زبان میں) ہرگز باتیں نہیں کرتا البتہ میں تمہیں قرآن سے متعارف کرتا ہوں کہ اس میں مستقبل کے تمام علوم اور معلومات موجود ہیں اور گذشتہ کی باتیں بھی ہیں یہ قرآن تمہاری بیماریوں کا علاج اور اجتماعی زندگی کا نظام ہے۔

قرآن میں علم اولین و آخرین

کلمات قصار ۳۱۳ میں حضرت، قرآن میں پائے جانے والے علوم اولین و آخرین کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

فى القرآن نبأ ما قبلكم وخبر ما بعدكم وحكم ما بينكم۔

قرآن میں گذشتگان کی تاریخ اور آئندہ حوادث کی پیشگوئی اور موجودہ زمانے میں تمہارے لئے دستور العمل موجود ہے۔

قرآن اور متقین

خطبہ ۱۹۳ معروف بہ خطبہ ہمام میں حضرت امیر علیہ السلام متقین کے اوصاف بیان فرماتے ہوئے انکی تلاوت اور اس سے مستفید ہونے کے بارے میں یوں ارشاد فرماتے ہیں:۔

تالين لاجزاء القرآن يرتلونها ترتيلا يحزنون به انفسهم ويستثيرون به دواء دائهم فاذا مروا بآية فيها تشويق ركنوا اليها طمعا وتطلعت نفوسهم اليها شوقا وظنوا انها نصب اعينهم واذا مروا بآية فيها تخويف اصغوا اليها مسامع قلوبهم وظنوا ان زفير جهنم وشهيقها فى اصول آذانهم۔

قرآن کی آیتوں کی ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کرتے ہیں جس سے اپنے دلوں میں غم و اندوہ تازہ کرتے ہیں اور اپنے مرض کا چارہ ڈھونڈتے ہیں جب کسی ایسی آیت پر ان کی نگاہ پڑتی ہے جس میں جنت کی ترغیب دلائی گئی ہو تو اس کی طمع میں ادھر جھک پڑتے ہیں اور اس کے اشتیاق میں ان کے دل بے تابانہ کھنچتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ (پر کیف) منظر ان کی نظروں کے سامنے ہے اور جب کسی ایسی آیت پر ان کی نظر پڑتی ہے کہ جس میں (دوزخ سے) ڈرایا گیا ہو تو اس کی جانب دل کے کانوں کو جھکا دیتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ جہنم کے شعلوں کی آواز اور وہاں کی چیخ پکار ان کے کانوں کے اندر پہنچ رہی ہے۔

قرآن کے سیکھنے اور سکھانے کا حکم

قرآن مولا امیر المومنین کی نظر میں گنجینہ اسرار و علوم الٰہی ہے جو سرچشمہ سعادت و خوشبختی ہے جس میں خیر دنیا و آخرت اور علوم اولین و آخرین سمایا ہوا ہے جو تمام امراض جسمانی و روحانی کا علاج مکمل ضابطہ حیات اور آئین زندگی ہے اس عظیم سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور اس سے صحیح فائدہ اٹھانے کے لئے مسلمانوں کو حکم دیتے ہیں کہ قرآن کے سیکھنے اور سکھانے میں کوشاں رہیں خطبہ ۱۱۰ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

وتعلموا القرآن فانه احسن الحديث وتفقهوا فيه فانه ربيع القلوب واستشفوا بنوره فانه شفاء الصدور واحسنوا تلاوته فانه انفع القصص۔

قرآن کو سیکھو کہ بہترین کلام ہے اور اس میں غور و فکر کرو اس لئے کہ دلوں کی بہار ہے اور اس کے نور سے شفا حاصل کرنے کی کوشش کرو اس لئے کہ دلوں کے امراض کے لئے بہترین علاج ہے اور اس کی بہترین طریقے (قرات، تجوید، غور و فکر) سے تلاوت کرو اس لئے کہ قرآن بہترین اور عبرت خیز و سبق آموز داستانوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

کلمات قصار ۳۹۹ میں والدین اور اولاد کے ایک دوسرے پر حقوق کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وحق الولد علی الوالد ان یحسن اسمه ویحسن ادبه ویعلمه القرآن۔

باپ پر اولاد کا حق یہ ہے کہ اس کے لئے بہترین نام انتخاب کرے اس کی اچھی تربیت کرے اور اس کو قرآن کی تعلیم دے۔

قرآن پر عمل کرنے کی تاکید

مولا امیر المومنین مسلمانوں کو قرآن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی نصیحت کرتے ہوئے اپنی معروف وصیت میں جو شہادت سے پہلے اپنے فرزند حضرت امام حسنؑ و حضرت امام حسینؑ کو فرمائی ہے اس میں ارشاد فرماتے ہیں:-

اللہ اللہ فی القرآن لا یسبقکم بالعمل به غیرکم

خدارا خدارا قرآن کو نہ بھولنا کہیں غیر (دکھاء) تم سے قرآن پر عمل کرنے میں سبقت نہ لے جائیں۔

گویا مولا امیر المومنینؑ اس وقت کے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ مسلمان قرآنی تعلیمات کے بیش بہا خزانے سے غافل ہو جائیں گے مسلمان قرآن کی حیات بخش تعلیمات کو نظر انداز کر دیں گے جس کے نتیجے میں زندگی کے ہر میدان میں انحطاط و پستی کے شکار ہوں گے لیکن دوسری اقوام و ملل قرآن کے بتائے ہوئے اصول کو سرمشق بنائیں گی اور زندگی کے ہر شعبے میں پیش رفت و ترقی کریں گی لہذا مسلمانوں کو قرآن پر عمل کرنے کی تاکید فرماتے ہیں۔ آج نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولا کو جس چیز کا خوف تھا وہی ہو چکا ہے۔ پروردگار مسلمانوں کو قرآن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی توفیق عنایت فرمائے۔

عترتؑ و اہلبیتؑ، علیؑ کی نظر میں۔

قرآن کے بعد ذرا "ثقل دوم" یعنی عترت کے بارے میں نہج البلاغہ کا مطالعہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ مولا امیر المومنینؑ اہلبیت نبوت کا کس طرح سے تعارف فرماتے ہیں اور انکی شخصیت اور کمالات کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔

خطبہ ۸۵ میں حضرت امیر مسلمانوں کو گمراہی و ضلالت سے بچانے کی خاطر ہادیان دین اور راہنمایان شریعت محمدی علمبرداران حق و حقیقت کا تعارف کرتے ہوئے لوگوں کو راہ حق کی جانب ہدایت کرنے کے لئے ارشاد فرماتے ہیں:-

"فاین تذهبون؟ وانی تؤفکون؟ والاعلام قائمة والآیات واضحة والمنار منصوبة فاین یتاه بکم وکیف تعمهون وبینکم عترة نبیکم وهم ازمة الحق واعلام الدین والسنة الصدق فانزلوهم باحسن منازل القرآن وردوهم ورود الهیم العطاش ایها الناس خذوها عن خاتم النبیین صلی اللہ علیه وآله وسلم " انه یموت من مات منا ولیس بمیت ویبلی من بلی منا ولیس ببال" فلا تقولوا بما لا تعرفون فان اکثر الحق فیما تنکرون واعذروا من لا حجة لکم علیه وهو انا الم اعمل فیکم بالثقل الاکبر واترک فیکم الثقل الاصغر قد رکزت فیکم رایة الایمان ووقفتکم علی حدود الحلال والحرام والبستکم العافیة من عدلی وفرشتکم المعروف من قولی وفعلی واریتکم کرائم الاخلاق من نفسی فلا تستعملوا الرای فیما لا یدرک قعره البصر ولا تتغلغل الیه الفکر۔

اب تم کہاں جا رہے ہو اور تمہیں کدھر موڑا جا رہا ہے؟ حالانکہ ہدایت کے جھنڈے بلند، نشانات ظاہر و روشن اور حق کے مینار نصب ہیں، اور تمہیں کہاں بہکایا جا رہا ہے اور کیوں ادھر ادھر بھٹک رہے ہو؟ جبکہ تمہارے نبیؐ کی عترت تمہارے اندر موجود ہے، جو حق کی باگیں، دین کے پرچم اور سچائی کی زبانیں ہیں۔ جو قرآن کی بہتر سے بہتر منزل سمجھ سکو، وہیں انہیں بھی جگہ دو اور پیاسے اونٹوں کی طرح ان کے سرچشمہ ہدایت پر اترو۔

اے لوگو! خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کو سنو کہ (انہوں نے فرمایا) ہم میں سے جو مر جاتا ہے، وہ مردہ نہیں ہے۔ اور ہم میں سے (جو بظاہر مر کر) بوسیدہ ہو جاتا ہے، وہ حقیقت میں کبھی بوسیدہ نہیں ہوتا۔ جو باتیں تم نہیں جانتے ان کے متعلق زبان سے کچھ نہ نکالو۔ اس لیے کہ حق بیشتر انہی چیزوں میں ہوتا ہے کہ جن سے تم بیگانہ و ناآشنا ہو۔ (جس شخص کی تم پر حجت تمام ہو) اور تمہاری کوئی حجت اس پر تمام نہ ہو اسے معذور سمجھو اور وہ میں ہوں، کیا میں نے تمہارے سامنے ثقل اکبر (قرآن) پر عمل نہیں کیا، اور ثقل اصغر (اہلبیتؑ) کو تم میں نہیں رکھا۔ میں نے تمہارے درمیان ایمان کا جھنڈا گاڑا، حلال و حرام کی حدیں بتائیں اور اپنے عدل سے تمہیں عافیت کے جامے پہنائے اور اپنے قول و عمل سے حسن سلوک کا فرش تمہارے لئے بچھا دیا۔ اور تم سے ہمیشہ پاکیزہ اخلاق کے ساتھ پیش آیا، جس چیز کی گہرائیوں تک نگاہ نہ پہنچ سکے اور فکر کی جولانیاں عاجز رہیں، اس میں اپنی رائے کو کارفرما نہ کرو۔

آل محمدؑ۔ ہدایت کے ستارے

خطبہ ۱۰۰ میں حضرت امیرؑ آل محمد کو آسمان کے ستاروں سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:-

الا ان آل محمد کمثل نجوم السماء اذا خوی نجم طلع نجم فکانکم قد تکاملت من اللہ فیکم الصنائع واراکم ما کنتم تاملون۔

جان لو کہ آل محمدؑ آسمان کے ستاروں کے مانند ہیں جب ان میں سے ایک ستارہ غروب کرتا ہے تو دوسرا ستارہ اس کی جگہ نکل آتا ہے۔ آل محمدؑ کے صدقے اللہ کی نعمتیں تم پر نازل ہوئی ہیں اور جس چیز کی تم لوگ آرزو کرتے تھے وہ مل چکی ہے۔

اہلبیتؑ سرچشمہ علم و حکمت

خطبہ ۱۰۹ میں ارشاد فرماتے ہیں:-

نحن شجرة النبوة ومحط الرسالة ومختلف الملائکة ومعادن العلم وینابیع الحکم ناصرنا ومحبنا ینتظر الرحمة وعدونا ومبغضنا ینتظر السطوة۔

ہم شجرہ نبوت ہیں ملائکہ کی رفت و آمد اور رسالت کا مرکز ہیں ہم علم کا خزانہ اور حکمت کا سرچشمہ ہیں ہمارے محب اور دوست اللہ کی رحمت اور ہمارے دشمن اللہ کی غضب کے منتظر ہیں۔

خطبہ ۱۲۰ میں فرماتے ہیں:-

ونحن اهل البیت ابواب الحکم وضیاء الامر

علم کے دروازے اور مسائل کی روشنی (حل)، ہم اہلبیتؑ ہی کے پاس ہے۔

خطبہ ۱۴۴ میں فضائل اہلبیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:-

این الذین زعموا انهم الراسخون فی العلم دوننا کذبا وبغیا علینا۔ ان رفعنا اللہ ووضعهم واعطانا وحرمهم وادخلنا واخرجهم بنا یستعطی الهدی ویستجلی العمی ان الائمة من قریش غرسوا فی هذا البطن من هاشم لا تصلح

على سواهم ولا تصلح الولاة من غيرهم۔

کہاں ہیں وہ جو راسخون فی العلم ہونے کے مدعی تھے جو جھوٹ اور مکر سے ہماری دشمنی میں اس قسم کے جھوٹے دعوے کرتے تھے۔ (کہاں ہیں یہ لوگ تاکہ دیکھ لیں) کہ خدا نے ہمیں عظمت عطا کی اور انھیں ذلیل کیا ہمیں سب کچھ عنایت فرمایا اور انھیں محروم کیا ہمیں پروردگار نے اپنے حریم نعمت میں داخل اور انھیں خارج کر دیا ہمارے صدقے سے ہدایت کی درخواست کی جاتی ہے ہمارے ہی صدقے سے اندھے بینا ہو جاتے ہیں ائمہ سب قریش میں سے ہیں جن کا شجرہ نسل ہاشم میں کاشت کیا گیا ہے یہ مقام کسی اور کو زیب نہیں دیتا اور دوسرے اس مقام کے لائق نہیں ہیں۔

اہلبیتؑ کنوز الرحمٰن

خطبہ ۱۵۴ میں حضرت امیرؑ اہلبیتؑ کا تعارف یوں فرماتے ہیں :۔

نحن الشعار والاصحاب والخزنة والابواب ولا تؤتى البيوت الا من ابوابها فمن اتاها من غير ابوابها سمّي سارقا فيهم كرائم القرآن وهم كنوز الرحمان ان نطقوا صدقوا وان صمتوا لم يسبقوا فليصدق رائد اهله وليحضر عقله

ہم اسرار الٰہی کے محرم اور پیامبر اسلام کے حقیقی اصحاب اور ان کے علوم کے خزانے اور دروازے ہیں کبھی کوئی شخص کسی گھر میں دروازے کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا اگر دروازے کے بغیر کسی اور راستے سے داخل ہو جائے تو وہ چور کہلاتا ہے اہلبیت کے بارے میں قرآن کی آیات نازل ہوئی ہیں وہ خدا کے علوم کے خزانہ ہیں جب وہ بولتے ہیں تو سچ بولتے ہیں اور اگر خاموش رہتے ہیں تب بھی کوئی ان سے آگے نہیں بڑھ سکتا معاشرے کے راہنما کو چاہیئے کہ وہ راستگو ہو اور رعیت کو حقائق سے آگاہ رکھے اور اپنی عقل کو بروئے کار لائے۔

خطبہ ۲۳۹ میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

هم عيش العلم وموت الجهل يخبركم حلمهم عن علمهم وظاهرهم عن باطنهم وصمتهم عن حكم منطقهم لا يخالفون الحق ولا يختلفون فيه وهم دعائم الاسلام وولائج الاعتصام بهم عاد الحق الى نصابه وانزاح الباطل عن مقامه وانقطع لسانه عن منبته۔

آل محمدؐ باعث حیات علم و سبب موت جہل ہیں ان کا حلم تمہیں ان کی علمی عظمت سے آگاہ کر دیتا ہے اور ان کا ظاہر تمہیں ان کے باطن سے آگاہ کرتا ہے ان کی خاموشی تمہیں ان کی حکمت و منطق سے آگاہ کرتی ہے کبھی حق کی مخالفت نہیں کرتے اور اس میں اختلاف نہیں رکھتے وہ اسلام کے ارکان اور لوگوں کے لئے پناہ گاہ ہیں ان کے ذریعے سے حق اپنے نصاب کو پہنچتا ہے باطل ختم ہو جاتا ہے اور اس کی زبان قطع ہو جاتی ہے۔

خطبہ ۲۳۳ میں فرماتے ہیں :۔

وانا لامراء الكلام وفينا تنشبت عروقه وعلينا تهدلت غصونه

ہم خطابت کے بادشاہ ہیں خطابت کی جڑیں ہمارے ہاں محفوظ اور اس کا سایہ ہمارے سروں پر ہے۔

پیروی اہلبیتؑ

خطبہ ۹۵ میں اہلبیت اطہارؑ کی پیروی کا حکم دیتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

انظروا اهل بيت نبيكم فالزموا سمتهم واتبعوا اثرهم فلن يخرجوكم من هدى ولن يعيدوكم في ردى فان لبدوا فالبدوا وان نهضوا فانهضوا ولا تسبقوهم فتضلوا ولا تتاخروا عنهم فتهلكوا۔

اپنے پیغمبر کے اہلبیت کو دیکھو اور انہی کی سمت اور راہ کو اپناؤ اور ان کے نقش قدم پر چلو وہ کبھی تمہیں جادۂ حق سے منحرف نہیں کریں گے اور ہلاکت و گمراہی کی طرف نہیں لے جائیں گے اگر وہ سکوت اختیار کریں تو تم بھی خاموش رہو اور اگر وہ قیام کریں تو تم بھی قیام کرو ان سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے اور ان سے پیچھے بھی نہ رہنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

معرفت اہلبیتؑ

خطبہ ۱۵۲ میں ائمہ اہلبیت کی معرفت کو ضروری قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں

وانما الائمة قوام الله على خلقه وعرفاؤه على عباده ولا يدخل الجنة الا من عرفهم وعرفوه ولا يدخل النار الا من انكرهم وانكروه۔

ائمہ (دین) معاشرے کی بنیادیں ہیں اور بندگان خدا کے رہنما ہیں کوئی بھی بہشت میں داخل نہیں ہو سکتا مگر وہ جو ائمہ علیہم السلام کو پہچان لے اور جن کو ائمہ پہچان لیں جو ان کا منکر ہو اور ائمہ اس کا انکار کریں وہ جہنم میں جائے گا۔

خطبہ ۲ میں عظمت عترت اہلبیتؑ کا تذکرہ یوں ہوتا ہے :۔

هم موضع سره ولجاء امره وعيبة علمه وموئل حكمه وكهوف كتبه وجبال دينه بهم اقام انحناء ظهره واذهب ارتعاد فرائصه . . . .

لا يقاس بآل محمد من هذه الامة احد ولا يسوى بهم من جرت نعمتهم عليه ابدا هم اساس الدين وعماد اليقين اليهم يفيء الغالي وبهم يلحق التالي ولهم خصائص حق الولاية وفيهم الوصية والوراثة الان اذ رجع الحق الى اهله ونقل الى منتقله۔

وہ سرِ خدا کے امین اور اس کے دین کی پناہ گاہ ہیں۔ علم الٰہی کے مخزن اور حکمتوں کے مرجع ہیں۔ کتب (آسمانی) کی گھاٹیاں اور دین کے پہاڑ ہیں۔ انہی کے ذریعے اللہ نے اس کی پشت کا خم سیدھا کیا اور اس کے پہلوؤں سے ضعف کی کپکپی دور کی (اسی خطبہ کا ایک حصہ جو دوسروں سے متعلق ہے) انہوں نے فسق و فجور کی کاشت کی غفلت و فریب کے پانی سے اسے سینچا اور اس سے ہلاکت کی جنس حاصل کی۔ اس امت میں کسی کو آل محمدؐ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا جن لوگوں پر ان کے احسانات ہمیشہ جاری رہے ہوں وہ ان کے برابر نہیں ہو سکتے وہ دین کی بنیاد اور یقین کے ستون ہیں۔ آگے بڑھ جانے والے کو ان کی طرف پلٹ کر آنا ہے اور پیچھے رہ جانے والے کو ان سے آکر ملنا ہے۔ حق ولایت کے خصوصیات ان ہی کے لئے ہیں اور انہی کے بارے میں پیغمبر کی وصیت اور انہی کے لئے (نبی کی) وراثت ہے اب یہ وقت وہ ہے کہ حق اپنے اہل کی طرف پلٹ آیا اور اپنی صحیح جگہ پر منتقل ہو گیا۔

اہلبیتؑ منجی بشریت

خطبہ ۴ میں طلحہ و زبیر کے قتل کے بعد اہل بصرہ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

بنا اهتديتم في الظلماء وتسنمتم ذروة العلياء وبنا انفجرتم عن السرار۔

(اے اہل بصرہ) تم لوگ ہماری وجہ سے ہدایت یافتہ ہوئے اور ہماری ہی وجہ سے بلندی تک پہنچے تمہاری قسمت کا طالع ہماری برکت سے نمودار ہوا۔

درس: آیت اللہ العظمیٰ منتظری
ترجمہ: جناب ممتاز علی

معرفتِ خدا

"وبمقارنته بين الاشياء عرف ان لا قرين له"
خدا نے چیزوں کو ایک دوسرے کا ہمنشین قرار دیا ہے (ساتھ ساتھ رکھا ہے)
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود کوئی قرین (ساتھی) نہیں رکھتا۔

تقارن (قربت، ہمنشینی) کی قسمیں۔

قربت، تقارن، پانچ قسموں پر مشتمل ہے۔

(۱) تقارن زمانی۔

دو چیزیں ایک ہی زمانہ میں ہوں جیسے ہم اور آپ ایک ہی زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اس کو تقارن زمانی کہتے ہیں۔

(۲) تقارن مکانی۔

دو چیزیں ایک مکان میں ہوں جیسے دو آدمی ایک ہی گاڑی پر سوار ہوں یا کسی جگہ ایک ساتھ بیٹھے ہوئے ہوں تو ان دونوں آدمیوں میں تقارن مکانی ہوگا۔

(۳) تقارن عرض ومعروض۔

جیسے گچ اور سفیدی، گچ معروض ہے اور سفیدی عرض ہے۔ یہاں سفیدی گچ کے ساتھ ہے۔

(۴) تقارن مادہ وصورت۔

جیسے لکڑی جو مادہ ہے۔ بڑھئی کی مخصوص کاریگری کی بدولت کرسی یا دروازہ کی شکل میں ڈھل جاتی ہے۔ یہاں اس لکڑی اور کرسی میں جو تقارن ہے اسے تقارن مادہ وصورت کہتے ہیں۔

(۵) تقارن بدن وروح۔

ہر انسان کی روح اس کے بدن کے ساتھ ہوتی ہے اس لئے کہ روح، مادۂ بدن کا محصول عالی ہے یعنی بدن نے حرکت جوہری کی وجہ سے کمال کی منزلیں طے کیں اور اس میں نفس مجرد (روح) پیدا ہو گیا۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ مقارنت دو چیزوں کی ہمنشینی و ہمراہی کو کہتے ہیں یہ ہمنشینی، تقارن زمانی، تقارن مکانی، تقارن عرض ومعروض، تقارن مادہ وصورت کی شکل میں ہو یا تقارن بدن وروح کی صورت میں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی خدا کی ذات کے لئے ممکن نہیں ہے اس لئے خدا زمان ومکان سے خالی، عرض ومعروض سے بری، مادہ وصورت سے پاک اور بدن وروح سے منزہ ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک کے لئے ترکیب ضروری ہے۔ اگر خدا مرکب ہوگا تو محتاج ہو جائیگا اور خدا کے لئے محتاج ہونا محال ہے۔

بہر حال قرین و ہمنشین ہونے کی مذکورہ صورتوں میں سے اگر ہر ایک کی الگ الگ تحقیق کی جائے تو ہر ایک کا لازمہ جسم نکلے گا اور جسم کا محتاج ہونا بدیہی بات ہے لیکن خدا چونکہ بے نیاز ہے اس لئے اس کا کوئی ساتھی اور ہمنشین نہیں ہو سکتا، خدا کی ذات کے لئے کوئی "دوسرا" فرض ہی نہیں کیا جا سکتا جو اس کا ہم نشین اور ساتھی بن سکے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی توجہ کے قابل ہے کہ خدا ان تمام چیزوں کا خالق ہے، زمانہ کو اسی نے پیدا کیا، مکان کا وہی خالق ہے پھر بھلا یہ چیزیں اس کی ہم نشین کیسے بن سکتی ہیں۔

مکان۔

فلسفیوں کے درمیان مکان کے سلسلہ میں دو قول پائے جاتے ہیں۔
(۱) فلسفہ مشاء کے پیرو جیسے ارسطو کہتے ہیں کہ:۔

مکان، جسم کی اس سطح مقعر کو کہتے ہیں جو کسی جسم کا احاطہ کئے ہوئے ہو۔
مثلاً ایک ایسا کونڈا جس میں آپ پانی ڈالتے ہیں اس کی دو سطحیں ہیں:۔
۱۔ ایک وہ سطح جو ظاہری ہے اور ابھری ہوئی ہے۔
۲۔ دوسری وہ سطح جو باطنی، گہری اور پانی سے ملی ہوئی ہے، فلاسفہ مشاء اس گہری سطح کو ابھری ہوئی سطح آب کا مکان کہتے ہیں۔

(۲) فلسفہ اشراق کے پیرو جن کے سربراہ شیخ اشراق ہیں، فرماتے ہیں کہ:۔
"مکان سے مراد بُعد مجرد ہے"۔

اگر ہم یہ فرض کریں کہ عالم کی کوئی چیز فضا نہ ہوتی حتیٰ کہ ہوا بھی نہ ہوتی اور ایک ایسی فضا موجود ہوتی جس میں لمبائی چوڑائی اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ وہ فضا جو بعد میں اجسام سے پُر ہو گئی ہے تو اس فضا کو مکان کہتے ہیں جیسے اگر ایک کتاب کے مکان کی تعریف کرنا چاہیں تو کہیں گے کہ کتاب جسم ہے، اس کا مکان وہ فضا اور حجم ہے جس کو کتاب نے پُر کر رکھا ہے اگر یہ کتاب نہ بھی ہوتی، پھر بھی ایک فضا تو بہر حال ہوتی، فلاسفہ اشراق اسی فضا کو مکان کہتے ہیں۔۔ مکان کے چاہے جو بھی معنی بیان کئے جائیں وہ مخلوق خدا ہے لہٰذا ممکن نہیں ہے کہ مکان خدا کا ساتھی ہو جائے ساتھ اور مقارنت تو اس صورت میں ہوتی جب مذکورہ پانچ صورتوں میں سے ہم نشینی کی کوئی صورت خدا کے ساتھ متصور ہوتی خدا کے ساتھ اس کا کوئی دوسرا ساتھی فرض نہیں ہو سکتا اس لئے کہ جو کچھ ہے وہ پرتو خدا ہے۔

"ضادّ النور بالظلمة"
خدا نے نور کو ظلمت کی ضد قرار دیا ہے۔

نور و ظلمت۔

یہ حصہ درحقیقت گذشتہ جملہ "وبمضادته بين الاشياء عرف ان لا ضد له" کی شرح و تفسیر ہے۔ ہم یہ گذارش کر چکے ہیں کہ ضدین ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن میں ایک ساتھ جمع ہونے کی قابلیت نہیں پائی جاتی ضدین چاہے دو امر وجودی ہوں یا ایک وجودی اور ایک ایسا عدمی ہو جس میں موجود ہونے کی شان پائی جاتی ہو مگر فی الحال موجود نہ ہو جیسے ظلمت "الظلمة عدم النور عما من شانه ان يكون نوراً" ۔۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ عدم کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ عدم مطلق ۲۔ عدم ملکہ عدم ملکہ وہ عدم ہے جس میں وجود کی صلاحیت ہوتی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ فضا میں نور آفتاب پھیلنے کی استعداد موجود ہے لیکن جس وقت نور آفتاب نہیں ہوگا تاریکی ہو گی، فضا میں چھانے والی یہ تاریکی عدم ملکہ والی تاریکی ہے عدم محض والی نہیں ہے۔

بہر حال حضرتؑ کے مذکورہ جملہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے نور و ظلمت کے درمیان تضاد قرار دیا ہے۔۔ نور کی تعریف میں کہا گیا تھا کہ "الظاهر بالذات المظهر للغير" نور وہ ہے جو خود ظاہر ہوتا ہے اور دوسری چیزوں کو بھی ظاہر کرتا ہے جو شئے بھی دکھائی دیتی ہے وہ نور کی وجہ سے دکھائی دیتی ہے ہم نور کا ادراک کرتے ہیں اور پھر اسی کے ذریعہ دوسری چیزوں کو دیکھتے ہیں۔

"والوضوح بالبهمة"
اس نے واضح اور مبہم کے درمیان تضاد قرار دیا ہے۔

واضح اور مبہم۔

شارحین نہج البلاغہ میں سے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ واضح سے مراد سفیدی اور مبہم سے مراد سیاہی ہے۔ لیکن یہ درست نہیں ہے اس لئے کہ "واضح" اور "مبہم" کا تضاد بہت ہی واضح ہے یہاں بات کو کنایہ میں بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔۔ ہاں یہاں "مبہم" ہونا عدم ملکہ کی قسم سے ہے اس لئے کہ وضوح ایک وجودی امر ہے اور ابہام عدمی شئے ہے۔ مبہم وہ غیر واضح چیز ہے جس میں واضح ہونے کی صلاحیت ہو۔

"الجمود بالبلل"
اس نے خشکی اور تری (رطوبت) کے درمیان تضاد قرار دیا ہے۔

عناصر اربعہ۔

زمانۂ قدیم سے ہی عناصر کو فلاسفہ چار بتاتے ہیں۔ یہ عناصر: پانی، مٹی، آگ، ہوا ہیں اور عناصر اربعہ

کے نام سے مشہور ہیں۔ فلاسفہ نے ان میں سے ہر ہر عنصر کی الگ الگ خصوصیت بیان کی ہے۔ پانی کی خصوصیت رطوبت، خاک کی خصوصیت یبوست، آگ کی خصوصیت حرارت اور ہوا کی خصوصیت برودت ہے۔ آج کے بہت سے ڈاکٹر ان خصوصیتوں کو درست نہیں سمجھتے لیکن پھر بھی اجمالی طور پر ان کا وجود بہت ہی واضح ہے یہ خاصیتیں غذاؤں میں مکمل طور پر محسوس کی جاسکتی ہیں۔

خشکی اور تری۔

بہرحال حضرتؑ نے فرمایا کہ خدا نے خشکی اور تری کے درمیان تضاد قرار دیا ہے لہٰذا پانی جس میں رطوبت ہے اور خاک جس میں خشکی پائی جاتی ہے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

"والحرور بالصرد"

اس نے سردی اور گرمی میں تضاد قرار دیا ہے۔

حرارت و برودت۔

"حرور" حرارت کی صفت مشبہ ہے اور لفظ "صرد" جو صاد سے لکھا جاتا ہے وہ سین سے لکھے جانیوالے "سرد" کے معنی میں ہے۔ لفظ "سرد" عربی کے لفظ "صرد" سے بنا ہے جسمیں "ص" کو "س" سے بدل دیا گیا ہے۔ بہرحال "حرور" گرمی کے معنی میں اور "صرد" سردی کے معنی میں ہے۔

حضرتؑ نے مذکورہ بالا دونوں جملوں میں ان چاروں خاصیتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے فلاسفہ جن کو عناصر اربعہ کی خاصیت کہتے ہیں (یعنی پانی کی خاصیت رطوبت، خاک کی خاصیت یبوست، آگ کی خاصیت حرارت اور ہوا کی خاصیت برودت) ان چاروں خاصیتوں کو جو ایک دوسرے کی ضد ہیں فلاسفہ کی اصطلاح میں مزاج بھی کہا جاتا ہے۔ انسانوں میں اگر درجہ حرارت ۳۷ ڈگری سے بڑھ جاتا ہے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ یا اگر خشکی بڑھ جائے اور جسم میں پانی کم ہو جائے تو یہ بات مزاج انسانی اور اسکی سلامتی کے لئے خطرناک ہوتی ہے۔

مؤلف بین متعادیاتھا، مقارن بین متباینا تھا، مقرب بین متباعداتھا، مفرق بین متدانیاتھا۔

جو چیزیں ایک دوسرے کے لئے ناسازگار اور دشمن ہیں ان کو آپس میں ملانے والا جدا جدا چیزوں کو نزدیک کرنے والا، ایک دوسرے سے دور کو قریب کرنیوالا، اور جو چیزیں نزدیک ہیں ان کو دور کرنے والا ہے۔

دوستی اور دشمنی

جن موجودات میں آپس میں بیر ہے خدا نے ان کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے ان کو آپس میں ملا دیا ہے۔ جیسے حرارت و برودت اور رطوبت و یبوست ان میں آپس میں تضاد ہے لیکن اس کے باوجود یہ ساری چیزیں بدن میں ایک ساتھ جمع ہیں ان ہی کے اختلاط کو مزاج کہا جاتا ہے۔

تعادی۔ عداوت سے ہے یہ دشمنی کے معنی میں ہے۔

متعادیات۔ وہ چیزیں جن میں آپس میں تضاد اور دشمنی ہو جیسے آب و خاک۔

مقارنہ۔ نزدیک کرنے اور قرین قرار دینے کے معنی میں ہے۔

متباینات۔ بینونت سے بمعنائے جدائی اور تفرقہ ہے۔

خدا نے ان چیزوں کو جو دور اور جدا ہیں، قریب کر دیا ہے، قریب ہی نہیں بلکہ باہم جمع بھی کر دیا ہے جیسے حرارت اور برودت، پانی اور خشکی، یہ ساری چیزیں بدن میں پائی جاتی ہیں۔ ان ہی کے اختلاط کو مزاج کا نام دیا جاتا ہے اسی طرح ان چیزوں کو جو ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں جدا قرار دیا ہے۔

کون و فساد۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ کون و فساد خدا کے قبضہ میں ہے یعنی ہمارا اور آپ کا وجود اس بات پر منحصر ہے کہ وہ چیزیں جو دور ہیں نزدیک ہو جائیں (جیسے حرارت اور رطوبت) پھر ایک وقت وہ بھی آئیگا جب بدن کے اجزاء جو آپس میں مضبوطی سے پیوست ہیں جدا ہو جائینگے، گوشت گل جائیگا ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی، اعضاء و جوارح الگ الگ ہو جائیں گے۔

غرضکہ عالم طبیعت عالم کون و فساد ہے ایک طرف سے پیدا ہوتا ہے تو دوسری طرف سے فنا کی گود میں سوتا چلا جاتا ہے۔

حضرتؑ کے گذشتہ تین جملے عالم کون سے متعلق ہیں اور آخری جملہ "مفرق بین متدانیاتھا" کا تعلق عالم فساد سے ہے۔ "دنو" اور "تدانی" نزدیکی کے معنی میں ہے۔ ہمارے جسم کے اجزاء جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں سب ایک روح کے ذریعہ کنٹرول کئے جاتے ہیں ایک وقت وہ آئے گا کہ سب جدا ہو جائیں گے۔ ہوا ہر ذرہ کو اڑا لے جائے گی۔ حضرتؑ نے اس جملہ میں فرمایا ہے کہ خدا ان اشیاء میں جدائی اور تفرقہ ڈالدیگا جو ایک دوسرے کے قریب اور نزدیک ہیں۔

لایشمل بحد ولایحسب بعد

وہ حد میں محدود نہیں ہے اور نہ شمار کرنے سے شمار میں آتا ہے۔

حد لغوی اور حد فلسفی

حد کا لغوی معنی بھی ہے اور اصطلاحی معنی بھی جو منطق میں موجود ہے۔ لغت میں حد کسی چیز کی انتہا کو کہتے ہیں جیسے یہ کہا جاتا ہے کہ "اس چیز کی حد وہاں تک ہے" یعنی اس کی انتہا وہاں تک ہے۔ یا یہ کہا جائے کہ اس گھر کے چار حد ہیں۔ (شمال، جنوب، مشرق، مغرب) یہ حد کے لغوی معنی ہیں۔

لیکن اصطلاح منطق میں ذاتیات کی تعریف کو حد کہتے ہیں یعنی اگر آپ کسی چیز کی تعریف کرنا چاہیں تو کبھی عوارض کے ذریعہ اس کی تعریف کرتے ہیں اور کبھی ذاتیات کے ذریعہ اس کی تعریف کی جاتی ہے۔ عوارض کے ذریعہ کی جانے والی تعریف کو منطق میں "رسم" اور ذاتیات کے ذریعہ کی جانے والی تعریف کو "حد" کہتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ سے پوچھا جائے کہ "ماھو الانسان؟" انسان کیا ہے؟ اور آپ جواب میں اس بات کو بتائیں جو انسان کی ذات میں دخل رکھتی ہے تو اس کو "حد" کہتے ہیں۔ اگر آپ نے جواب میں فرمایا کہ "الانسان حیوان ناطق" انسان حیوان ناطق ہے تو اس میں حیوانیت اور ناطقیت دونوں، انسان اور اس کی ذات کا جزو ہیں اس تعریف کو منطق کی اصطلاح میں "حد" کہا جاتا ہے۔

لیکن اگر آپ تعریف میں اس کے خاص اور عوارض کو ذکر فرمائیں اور یوں کہیں کہ "انسان وہ ہے جو کھاتا ہے، پیتا ہے، چلتا ہے، ہنستا ہے وغیرہ" تو یہ ساری باتیں انسان کے عوارض اور خواص ہیں، منطق میں اس تعریف کو "رسم" کہتے ہیں۔

بنابرایں ذاتیات کی تعریف کو یعنی جنس اور فصل کے ذریعہ جو تعریف ہوتی ہے اس کو حد کہتے ہیں۔ خدا نہ حد لغوی رکھتا ہے نہ حد منطقی۔

خداوند عالم کے لئے جنس و فصل اور حد منطقی نہیں ہے اس لئے کہ جنس و فصل ان موجودات کی تعریف کی چیزیں ہیں جو ماہیت رکھتی ہیں اور مرکب ہیں، جیسے ہم اور آپ۔ لیکن خدا کی ذات نہ مرکب ہے نہ ماہیت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ خدا ہستی غیر متناہی ہے۔ وہ حد لغوی بھی نہیں رکھتا، اس لئے کہ وہ جسم نہیں ہے جس کی کوئی حد اور انتہا ہو۔ اسی وجہ سے حضرتؑ نے فرمایا کہ خدا کسی قسم کی حد میں محدود نہیں ہے۔

وہ بغیر شمار کے واحد ہے۔

"ولایحسب بعد" خدا گننے سے شمار میں نہیں آتا لہٰذا جس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ خدا واحد ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ کوئی "دوسرا" بھی اس کے لئے فرض ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ "دوسرے" کا تصور ہی اس کے لئے محال ہے۔ اس کے پہلے میں حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی حدیث نقل کر چکا ہوں جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ "لفظ واحد کا اطلاق خدا کے لئے دو معنوں میں صحیح اور دو معنوں میں غلط ہے۔ میں اس وقت اس روایت کو دہرانا نہیں چاہتا لیکن اجمالاً اتنا کہوں گا کہ جو عدد مقدار بتلانے کیلئے استعمال ہوتا ہے وہ ذات خدا کیلئے درست نہیں ہے۔

مقدار بتانے والا عدد کم منفصل ہے۔ خدا مقدار اور اندازہ والا نہیں ہے۔ اس کے لئے "دوسرا" فرض نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کے اجزاء نہیں ہیں جو یہ کہا جائے کہ وہ اتنے ہزار سال پہلے سے موجود ہے۔ عدد یا تو اس کی ذات کو شمار کرے گا یا زمانہ کو یا اس کے اجزاء کا اور خدا نہ زمانہ رکھتا ہے نہ اجزاء کا حامل ہے نہ وہ خود شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ لہٰذا عدد (کہ جو کم منفصل ہے) خدا کی ذات میں گنجائش نہیں ہے۔ جس طرح کم متصل "یعنی خط، سطح، جسم تعلیمی (طول و عرض و عمق) کا اس کی ذات میں گذر نہیں ہے اس لئے کہ کم متصل" اجسام سے متعلق ہے۔

"انما تحد الادوات انفسھا"

آلات تو اپنے ہی جیسے (جسموں) کو محدود کر سکتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

Upon hearing the news of the Imam's martyrdom, Mansur wrote to the governor of Medina instructing him to go to the house of the Imam on the pretext of expressing his condolences to the family, to ask for the Imam's will and testament and read it. Whoever was chosen by the Imam as his inheritor and successor should be beheaded on the spot. Of course the aim of Mansur was to put an end to the whole question of the imamate and to Shi'ite aspirations. When the governor of Medina, following orders, read the last will and testament, he saw that the Imam had chosen four people rather than one to administer his last will and testament: the caliph himself, the governor of Medina, 'Abdallāh Aftaḥ, the Imam's older son, and Musa, his younger son. In this way the plot of Mansur failed.[80]

The Seventh Imam

Imam Mūsā ibn Ja'far Kāẓim, the son of the sixth Imam, was born in 128/744 and was poisoned and martyred in prison in 183/799.[81] He became Imam after the death of his father, through Divine Command and the decree of his forefathers. The seventh Imam was contemporary with the Abbasid caliphs, Mansur, Hādī, Mahdi and Harun. He lived in very difficult times, in hiding, until finally Harun went on the hajj and in Medina had the Imam arrested while praying in the Mosque of the Prophet. He was chained and imprisoned, then taken from Medina to Basra and from Basra to Baghdad where for years he was transferred from one prison to another. Finally he died in Baghdad in the Sindī ibn Shāhak prison through poisoning[82] and was buried in the cemetery of the Quraysh which is now located in the city of Kazimayn.

The Eighth Imam

Imam Riḍā (Ali ibn Musa) was the son of the seventh Imam and according to well-known accounts was born in 148/765 and died in 203/817.[83] The eighth Imam reached the imamate, after the death of his father, through Divine Command and the decree of his forefathers. The period of his imamate coincided with the caliphate of Harun and then his sons Amīn and Ma'mūn. After the death of his father, Ma'mun fell into conflict with his brother Amin which led to bloody wars and finally the assassination of Amin, after which Ma'mun became caliph.[84] Until that day the policy of the Abbasid caliphate toward the Shi'ites had been increasingly harsh and cruel. Every once in a while one of the supporters of Ali (*'alawis*) would revolt, causing bloody wars and rebellions which were of great difficulty and consequence for the caliphate

The Shi'ite Imams would not cooperate with those who carried out these rebellions and would not interfere with their affairs. The Shi'ites of that day, who comprised a considerable population, continued to consider the Imams as their religious leaders to whom obedience was obligatory and believed in them as the real caliphs of the Holy Prophet. They considered the caliphate to be far from the sacred authority of their Imams, for the caliphate had come to seem more like the courts of the Persian kings and Roman emperors and was being run by a group of people more interested in worldly rule than in the strict application of religious principles. The continuation of such a situation was dangerous for the structure of the caliphate and was a serious threat to it.

Ma'mun thought of finding a new solution for these difficulties which the seventy-year old policy of his Abbasid predecessors had not been able to solve. To accomplish this end he chose the eighth Imam as his successor, hoping in this way to overcome two difficulties: first of all to prevent the descendants of the Prophet from rebelling against the government since they would be involved in the government themselves, and secondly, to cause the people to lose their spiritual belief and inner attachment to the Imams. This would be accomplished by having the Imams become engrossed in wordly matters and the politics of the caliphate itself, which had always been considered by the Shi'ites to be evil and impure. In this way their religious organization would crumble and they would no longer present any dangers to the caliphate. Obviously, after accomplishing these ends, the removal of the Imam would present no difficulties to the Abbasids.[85]

In order to have this decision put into effect, Ma'mun asked the Imam to come to Marw from Medina. Once he had arrived there, Ma'mun offered him first the caliphate and then the succession to the caliphate. The Imam made his apologies and turned down the proposal, but he was finally induced to accept the successorship, with the condition that he would not interfere in governmental affairs or in the appointment or dismissal of government agents.[86]

This event occurred in 200/814. But soon Ma'mun realised that he had committed an error, for there was a rapid spread of Shi'ism, a growth in the attachment of the populace to the Imam and an astounding reception given to the Imam by the people and even by the army and government agents. Ma'mun sought to find a remedy for this difficulty and had the Imam poisoned and martyred. After his death the Imam was buried in the city of Tus in Iran, which is now called Mashhad.

Ma'mun displayed great interest in having works on the intellectual sciences translated into Arabic. He organized gatherings in which scholars of different religions and sects assembled and carried out scientific and scholarly debates. The eighth Imam also participated in these assemblies and joined in the discussions with scholars of other religions. Many of these debates are recorded in the collections of Shi'ite hadiths.[87]

The Ninth Imam

Imam Muhammad (ibn Ali) Taqī (sometimes called Jawād and Ibn al-Riḍā) was the son of the eighth Imam. He was born in 195/809 in Medina and according to Shi'ite traditions was martyred in 220/835, poisoned by his wife, the daughter of Ma'mun, at the instigation of the Abbasid caliph Mu'taṣim. He was buried next to his grandfather, the seventh Imam, in Kazimayn. He became Imam after the death of his father through Divine Command and by the decree of his forefathers. At the time of the death of his father he was in Medina. Ma'mun called him to Baghdad which was then the capital of the caliphate and outwardly showed him much kindness. He even gave the Imam his daughter in marriage and kept him in Baghdad. In reality he wanted in this way to keep a close watch upon the Imam from both outside and within his own household. The Imam spent some time in Baghdad and then with the consent of Ma'mum set out for Medina where he remained until Ma'mun's death. When Mu'taṣim became the caliph he called the Imam back to Baghdad and, as we have seen, through the Imam's wife had him poisoned and killed.[88]

The Tenth Imam

Imam Ali ibn Muhammad Naqī (sometimes referred to by the title of Hādī), was the son of the ninth Imam. He was born in 212/827 in Medina and according to Shi'ite accounts was martyred through poisoning by Mu'tazz the Abbasid caliph, in 254/868.[89]

During his lifetime the tenth Imam was contemporary with seven of the Abbasid caliphs: Ma'mun, Mu'tasim, Wāthiq, Mutawakkil, Muntaṣir, Musta'īn and Mu'tazz. It was during the rule of Mu'tasim in 220/835 that his noble father died through poisoning in Baghdad. At that time Ali ibn Muhammad Naqi was in Medina. There he became the Imam through Divine Command and the decree of the Imams before him. He stayed in Medina teaching religious sciences until the time of Mutawakkil In 243/857, as a result of certain false charges that were made, Mutawakkil ordered one of his government officials to invite the Imam from Medina to Samarrah which was then the capital He himself wrote the Imam a letter full of kindness and courtesy asking him to come to the capital where they could meet.[90] Upon arrival in Samarrah the Imam was also shown certain outward courtesy and respect. Yet at the same time Mutawakkil tried by all possible means to trouble and dishonor him. Many times he called the Imam to his presence with the aim of killing or disgracing him and had his house searched.

In his enmity toward the Household of the Prophet Mutawakkil had no equal among the Abbasid caliphs. He was especially opposed to Ali, whom he cursed openly. He even ordered a clown to ridicule Ali at voluptuous banquets. In the year 237/850 he ordered the mausoleum of Imam Husayn in Karbala and many of the houses around it to be torn down to the ground. Then water was turned upon the tomb of the Imam. He ordered the ground of the tomb to be plowed and cultivated so that any trace of the tomb would be forgotten.[91] During the life of Mutawakkil the condition of life of the descendants of Ali in the Hijaz had reached such a pitiful state that their womenfolk had no veils with which to cover themselves Many of them had only one old veil which they wore at the time of the daily prayers Pressures of a similar kind were put on the descendants of Ali who lived in Egypt.[92] The tenth Imam accepted in patience the tortures and afflictions of the Abbasid caliph Mutawakkil until the caliph died and was followed by Muntaṣir, Musta'īn and finally Mu'tazz, whose intrigues led to the Imam's being poisoned and martyred.

NEXT ISSUE

and analyses this chapter of Islamic history, will have no doubt that in those circumstances there was no choice before Imam Husayn but to be killed. Swearing allegiance to Yazid would have meant publicly showing contempt for Islam, something which was not possible for the Imam, for Yazid not only showed no respect for Islam and its injunctions but also made a public demonstration of impudently treading under foot its basis and its laws. Those before him, even if they opposed religious injunctions, always did so in the guise of religion, and at least formally respected religion. They took pride in being companions of the Holy Prophet and the other religious figures in whom people believed. From this it can be concluded that the claim of some interpreters of these events is false when they say that the two brothers, Hasan and Husayn, had two different tastes and that one chose the way of peace and the other the way of war, so that one brother made peace with Mu'awiyah although he had an army of forty thousand while the other went to war against Yazid with an army of forty. For we see that this same Imam Husayn, who refused to pay allegiance to Yazid for one day, lived for ten years under the rule of Mu'awiyah, in the same manner as his brother who also had endured for ten years under Mu'awiyah, without opposing him.

It must be said in truth that if Imam Hasan or Imam Husayn had fought Mu'awiyah they would have been killed without there being the least benefit for Islam. Their deaths would have had no effect before the righteous-appearing policy of Mu'awiyah, a competent politican who emphasized his being a companion of the Holy Prophet, the "scribe of the revelation," and "uncle of the faithful" and who used every stratagem possible to preserve a religious guise for his rule. Moreover, with his ability to set the stage to accomplish his desires he could have had them killed by their own people and then assumed a state of mourning and sought to revenge their blood, just as he sought to give the impression that he was avenging the killing of the third caliph.

The Fourth Imam

Imam Sajjād (Ali ibn Husayn entitled Zayn al-'ābidīn and Sajjad) was the son of the third Imam and his wife, the queen among women, the daughter of Yazdigird the king of Iran. He was the only son of Imam Husayn to survive, for his other three brothers Ali Akbar, aged twenty-five, five year old Ja'far and Ali Asghar (or 'Abdallāh) who was a suckling baby were martyred during the event of Karbala.[71] The Imam had also accompanied his f. her on the journey that terminated fatally in Karbala, but because of severe illness and the inability to carry arms or participate in fighting he was prevented from taking part in the holy war and being martyred. So he was sent with the womenfolk to Damascus. After spending a period in imprisonment he was sent with honor to Medina because Yazid wanted to conciliate public opinion. But for a second time, by the order of the Umayyad caliph, 'Abd al-Malik, he was chained and sent from Medina to Damascus and then again returned to Medina.[72]

The fourth Imam, upon returning to Medina, retired from public life completely, closed the door of his house to strangers and spent his time in worship. He was in contact only with the elite among the Shi'ites such as Abū Ḥamzah Thumālī, Abū Khālid Kābulī and the like. The elite disseminated among the Shi'ah the religious sciences they learned from the Imam. In this way Shi'ism spread considerably and showed its effects during the imamate of the fifth Imam. Among the works of the fourth Imam is a book called *Ṣaḥīfah sajjādiyah*. It consists of fifty-seven prayers concerning the most sublime Divine sciences and is known as "The Psalm of the Household of the Prophet."

The fourth Imam died (according to some Shi'ite traditions poisoned by Walīd ibn 'Abd al-Malik through the instigation of the Umayyad caliph Hishām[73]) in 95/712 after thirty-five years of imamate.

The Fif. ι Imam

Imam Muhammad ibn Ali Bāqir (the word *bāqir* meaning he who cuts and dissects, a title given to him by the Prophet)[74] was the son of the fourth Imam and was born in 57/675. He was present at the event of Karbala when he was four years old. After his father, through Divine Command and the decree of those who went before him, he became Imam. In the year 114/732 he died, according to some Shi'ite traditions poisoned by Ibrahim ibn Walid ibn 'Abdallah, the nephew of Hisham, the Umayyad caliph.

During the imamate of the fifth Imam, as a result of the injustice of the Umayyads, revolts and wars broke out in some corner of the Islamic world every day. Moreover, there were disputes within the Umayyad family itself which kept the caliphate busy and to a certain extent left the members of the Household of the Prophet alone. From the other side, the tragedy of Karbala and the oppression suffered by the Household of the Prophet, of which the fourth Imam was the most noteworthy embodiment, had attracted many Muslims to the Imams.[75] These factors combined to make it possible for people and especially the Shi'ites to go in great numbers to Medina and to come into the presence of the fifth Imam. Possibilities for disseminating truths about Islam and the sciences of the Household of the Prophet, which had never existed for the Imams before him, were presented to the fifth Imam. The proof of this fact is the innumerable traditions recounted from the fifth Imam and the large number of illustrious men of science and Shi'ite scholars who were trained by him in different Islamic sciences. These names are listed in books of biographies of famous men in Islam.[76]

The Sixth Imam

Imam Ja'far ibn Muhammad, the son of the fifth Imam, was born in 83/702. He died in 148/765 according to Shi'ite tradition, poisoned and martyred through the intrigue of the Abbasid caliph Manṣūr. After the death of his father he became Imam by Divine Command and decree of those who came before him.

During the imamate of the sixth Imam greater possibilities and a more favorable climate existed for him to propagate religious teachings. This came about as a result of revolts in Islamic lands, especially the uprising of the Muswaddah to overthrow the Umayyad caliphate, and the bloody wars which finally led to the fall and extinction of the Umayyads. The greater opportunities for Shi'ite teachings were also a result of the favorable ground the fifth Imam had prepared during the twenty years of his imamate through the propagation of the true teachings of Islam and the sciences of the Household of the Prophet.

The Imam took advantage of the occasion to propagate the religious sciences until the very end of his imamate, which was contemporary with the end of the Umayyad and beginning of the Abbasid caliphates. He instructed many scholars in different fields of the intellectual and transmitted sciences, such as Zarārah, Muhammad ibn Muslim, Mu'min Ṭāq, Hisham ibn Ḥakam, Abān ibn Taghlib, Hisham ibn Sālim, Ḥurayz, Hisham Kalbī Nassābah, and Jābir ibn Ḥayyān, the alchemist. Even some important Sunni scholars such as Sufyān Thawrī, Abu Hanifah, the founder of the Hanafi school of law, Qāḍī Sukūnī, Qadi Abu'l-Bakhtarī, and others, had the honor of being his students. It is said that his classes and sessions of instruction produced four thousand scholars of hadith and other sciences.[77] The number of traditions preserved from the fifth and sixth Imams is more than all the hadith that have been recorded from the Prophet and the other ten Imams combined.

But toward the end of his life the Imam was subjected to severe restrictions placed upon him by the Abbasid caliph Mansur, who ordered such torture and merciless killing of many of the descendants of the Prophet who were Shi'ite that his actions even surpassed the cruelty and heedlessness of the Umayyads. At his order they were arrested in groups, some thrown into deep and dark prisons and tortured until they died, while others were beheaded or buried alive or placed at the base of or between walls of buildings, and walls were constructed over them.

Hisham, the Umayyad caliph, had ordered the sixth Imam to be arrested and brought to Damascus. Later, the Imam was arrested by Saffāḥ, the Abbasid caliph, and brought to Iraq. Finally, Mansur had him arrested again and brought to Samarrah where he had the Imam kept under supervision, was in every way harsh and discourteous to him, and several times thought of killing him.[78] Eventually the Imam was allowed to return to Medina where he spent the rest of his life in hiding, until he was poisoned and martyred through the intrigue of Mansur.[79]

all opposition, Mu'awiyah had undertaken newer and more severe measures By force and necessity Imam Husayn had to endure these days and to tolerate every kind of mental and spiritual agony and affliction from Mu awiyah and his aides until in the middle of the year 60 A H Mu awiyah died and his son Yazid took his place [58]

Paying allegiance (bay ah) was an old Arab practice which was carried out in important matters such as that of kingship and governorship Those who were ruled and especially the well known among them would give their hand in allegiance agreement and obedience to their king or prince and in this way would show their support for his actions Disagreement after allegiance was considered as disgrace and dishonor for a people and like breaking an agreement after having signed it officially, it was considered as a definite crime Following the example of the Holy Prophet people believed that allegiance when given by free will and not through force carried authority and weight

Mu awiyah had asked the well known among the people to give their allegiance to Yazid but had not imposed this request upon Imam Husayn [59] He had especially told Yazid in his last will that if Husayn refused to pay allegiance he should pass over it in silence and overlook the matter for he had understood correctly the disastrous consequences which would follow if the issue were to be pressed But because of his egoism and recklessness Yazid neglected his father s advice and immediately after the death of his father ordered the governor of Medina either to force a pledge of allegiance from Imam Husayn or send his head to Damascus [60]

After the governor of Medina informed Imam Husayn of this demand the Imam in order to think over the question asked for a delay and overnight started with his family toward Mecca He sought refuge in the sanctuary of God which in Islam is the official place of refuge and security This event occurred toward the end of the month of Rajab and the beginning of Sha ban of 60 A H For nearly four months Imam Husayn stayed in Mecca in refuge This news spread throughout the Islamic world On the one hand many people who were tired of the iniquities of Mu awiyah s rule and were even more dissatisfied when Yazid became caliph corresponded with Imam Husayn and expressed their sympathy for him On the other hand a flood of letters began to flow especially from Iraq and particularly the city of Kufa inviting the Imam to go to Iraq and accept the leadership of the populace there with the aim of beginning an uprising to overcome injustice and iniquity Naturally such a situation was dangerous for Yazid

The stay of Imam Husayn in Mecca continued until the season for pilgrimage when Muslims from all over the world poured in groups into Mecca in order to perform the rites of the hajj The Imam discovered that some of the followers of Yazid had entered Mecca as pilgrims (*hajjis*) with the mission to kill the Imam during the rites of hajj with the arms they carried under their special pilgrimage dress (*ihram*) [61]

The Imam shortened the pilgrimage rites and decided to leave Amidst the vast crowd of people he stood up and in a short speech announced that he was setting out for Iraq [62] In this short speech he also declared that he would be martyred and asked Muslims to help him in attaining the goal he had in view and to offer their lives in the path of God On the next day he set out with his family and a group of his companions for Iraq

Imam Husayn was determined not to give his allegiance to Yazid and knew full well that he would be killed He was aware that his death was inevitable in the face of the awesome military power of the Umayyads supported as it was by corruption in certain sectors, spiritual decline and lack of will power among the people especially in Iraq Some of the outstanding people of Mecca stood in the way of Imam Husayn and warned him of the danger of the move he was making But he answered that he refused to pay allegiance and give his approval to a government of injustice and tyranny He added that he knew that wherever he turned or went he would be killed [63] He would leave Mecca in order to preserve the respect for the house of God and not allow this respect to be destroyed by having his blood spilled there

While on the way to Kufa and still a few days journey away from the city he received news that the agent of Yazid in Kufa had put to death the representative of the Imam in that city and also one of the Imam s determined supporters who was a well known man in Kufa Their feet had been tied and they had been dragged through the streets [64] The city and its surroundings were placed under strict observation and countless soldiers of the enemy were awaiting him There was no way open to him but to march ahead and to face death It was here that the Imam expressed his definitive determination to go ahead and be martyred and so he continued on his journey [65]

Approximately seventy kilometres from Kufa in a desert named Karbala the Imam and his entourage were surrounded by the army of Yazid For eight days they stayed in this spot during which the circle narrowed and the number of the enemy s army increased Finally the Imam with his household and a small number of companions were encircled by an army of thirty thousand soldiers [66] During these days the Imam fortified his position and made a final selection of his companions At night he called his companions and during a short speech stated that there was nothing ahead but death and martyrdom He added that since the enemy was concerned only with his person he would free them from all obligations so that anyone who wished could escape in the darkness of the night and save his life Then he ordered the lights to be turned out and most of his companions who had joined him for their own advantage dispersed Only a handful of those who loved the truth about forty of his close aides and some of the Banu Hashim remained [67]

Once again the Imam assembled those who were left and put them to a test He addressed his companions and Hashimite relatives saying again that the enemy was concerned only with his person Each could benefit from the darkness of the night and escape the danger But this time the faithful companions of the Imam answered each in his own way that they would not deviate for a moment from the path of truth of which the Imam was the leader and would never leave him alone They said they would defend his household to the last drop of their blood and as long as they could carry a sword [68]

On the ninth day of the month the last challenge to choose between allegiance or war was made by the enemy to the Imam The Imam asked for a delay in order to worship overnight and became determined to enter battle on the next day [69]

On the tenth day of Muharram of the year 61/680 the Imam lined up before the enemy with his small band of followers less than ninety persons consisting of forty of his companions thirty some members of the army of the enemy that joined him during the night and day of war and his Hashimite family of children brothers nephews nieces and cousins That day they fought from morning until their final breath and the Imam the young Hashimites and the companions were all martyred Among those killed were two children of Imam Hasan who were only thirteen and eleven years old and a five year old child and a suckling baby of Imam Husayn

The army of the enemy after ending the war plundered the *haram* of the Imam and burned his tents They decapitated the bodies of the martyrs denuded them and threw them to the ground without burial Then they moved the members of the haram all of whom were helpless women and girls along with the heads of the martyrs to Kufa Among the prisoners there were three male members a twenty two year old son of Imam Husayn who was very ill and unable to move namely Ali ibn Husayn the fourth Imam his four year old son Muhammad ibn Ali who became the fifth Imam and finally Hasan Muthanna the son of the second Imam who was also the son in law of Imam Husayn and who having been wounded during the war lay among the dead They found him near death and through the intercession of one of the generals did not cut off his head Rather they took him with the prisoners to Kufa and from there to Damascus before Yazid

The event of Karbala the capture of the women and children of the Household of the Prophet their being taken as prisoners from town to town and the speeches made by the daughter of Ali Zaynab and the fourth Imam who were among the prisoners disgraced the Umayyads Such abuse of the Household of the Prophet annulled the propaganda which Mu awiyah had carried out for years The matter reached such proportions that Yazid in public disowned and condemned the actions of his agents The event of Karbala was a major factor in the overthrow of Umayyad rule although its effect was delayed It also strengthened [illegible] of Shi ism Among its immediate results were the revolts and rebellions combined with bloody wars which continued for twelve years Among those who were instrumental in the death of the Imam not one was able to escape revenge and punishment

Anyone who studies closely the history of the life of Imam Husayn and Yazid and the conditions that prevailed at that time

KNOWLEDGE OF THE IMAM

[illegible] MUHAMMAD HUSAYN TABATABAI

Translated by [illegible] HUSAYN NASR

A BRIEF HISTORY OF THE LIVES OF THE TWELVE IMAMS

PART - 2

The First Imam CONT

In order to quell the civil strife and sedition Ali fought a war in Basra known as the "Battle of the Camel" against Talhah and Zubayr in which Aishah "the Mother of the Faithful" was [illegible] involved. He fought another war against Mu'awiyah on the [illegible] of Iraq and Syria which lasted for a year and a half and is [illegible] as the "Battle of Siffin." He also fought against the Khawarij at Nahrawan in a battle known as the "Battle of Nahrawan." Therefore most of the days of Ali's caliphate were spent in overcoming internal opposition. Finally, in the morning of the 19th of Ramadan in the year 40 A.H., while praying in the [illegible] he was wounded by one of the Khawarij and died as a martyr during the night of the 21st.[45]

According to the testimony of friend and foe alike Ali had no shortcomings from the point of view of human perfection. And in the Islamic virtues he was a perfect example of the upbringing and training given by the Prophet. The discussions that have taken [illegible] concerning his personality and the books written on this subject by Shi'ites, Sunnis and members of other religions, as well as the simply curious outside any distinct religious bodies, are [illegible] equaled in the case of any other personality in history. In [illegible] and knowledge Ali was the most learned of the companions of the Prophet, and of Muslims in general. In his learned discourses he was the first in Islam to open the door for logical demonstration and proof and to discuss the "divine sciences" or metaphysics [illegible] ma'arif ilahiyah). He spoke concerning the esoteric [illegible] of the Quran and devised Arabic grammar in order to preserve the Quranic form of expression. He was the most eloquent Arab [illegible] has been mentioned in the first part of this book).

[illegible] Ali [illegible] proverbial. In all the wars in which he [illegible] during the lifetime of the Prophet, and also after [illegible] fear or anxiety. Although in many battles [illegible] those of Uhud, Hunayn, Khaybar and Khandaq [illegible] Prophet [illegible] Muslim army trembled [illegible] or [illegible] turned his back to the enemy. Never [illegible] in a battle and come out of it [illegible] all his valor [illegible] would never [illegible] a weak enemy [illegible] He would not engage in surprise attacks [illegible] streams of water upon the enemy. It has been [illegible] established historically that in the Battle of Khaybar in the attack against the fort he reached the ring of the door and with a sudden motion tore off the door and cast it away.[46] Also on the day when Mecca was conquered the Prophet ordered that the idols be broken. The idol "Hubal" was the largest idol in Mecca [illegible] stone statue placed on the top of the Ka'bah. Following the command of the Prophet Ali placed his feet on the Prophet's shoulders, climbed to the top of the Ka'bah, pulled "Hubal" from its place and cast it down.[47]

Ali was also without equal in religious asceticism and the worship of God. In answer to some who had complained of Ali's anger toward them the Prophet said, "Do not reproach Ali for he is in a state of Divine ecstasy and bewilderment."[48] Abu Darda [illegible] of the companions [illegible] the body of Ali in one of the palm plantations of Medina lying on the ground as stiff as wood. He went to Ali's house to inform his noble wife the daughter of the Prophet and to express his condolence. The daughter of the Prophet said, "My cousin (Ali) has not died. Rather in fear of God he has fainted. This condition overcomes him often."

There are many stories told of Ali's kindness to the lowly, compassion for the needy and the poor, and generosity and munificence toward those in misery and poverty. Ali spent all that he earned to help the poor and the needy, and himself lived in the strictest and simplest manner. Ali loved agriculture and spent much of his time digging wells, planting trees and cultivating fields. But all the fields that he cultivated or wells that he built he gave in endowment (*waqf*) to the poor. His endowments, known as the "alms of Ali," had the noteworthy income of twenty four thousand gold dinars toward the end of his life.[49]

The Second Imam

Imam Hasan Mujtaba — upon whom be peace — was the second Imam. He and his brother Imam Husayn were the two sons of Amir al-mu'minin Ali and Hadrat Fatimah, the daughter of the Prophet. Many times the Prophet had said, "Hasan and Husayn are my children." Because of these same words Ali would say to his other children, "You are my children and Hasan and Husayn are the children of the Prophet."[50]

Imam Hasan was born in the year 3 A.H. in Medina[51] and shared in the life of the Prophet for somewhat over seven years, growing up during that time under his loving care. After the death of the Prophet which was no more than three, or according to some six months earlier than the death of Hadrat Fatimah, Hasan was placed directly under the care of his noble father. After the death of his father, through Divine Command and according to the will of his father, Imam Hasan became Imam; he also occupied the outward function of caliph for about six months, during which time he administered the affairs of the Muslims. During that time Mu'awiyah, who was a bitter enemy of Ali and his family and had fought for years with the ambition of capturing the caliphate, first on the pretext of avenging the death of the third caliph and finally with an open claim to the caliphate, marched his army into Iraq, the seat of Imam Hasan's caliphate. War ensued during which Mu'awiyah gradually subverted the generals and commanders of Imam Hasan's army with large sums of money and deceiving promises until the army rebelled against Imam Hasan. Finally the Imam was forced to make peace and to yield the caliphate to Mu'awiyah, provided it would again return to Imam Hasan after Mu'awiyah's death and the Imam's household and partisans would be protected in every way.

In this way Mu'awiyah captured the Islamic caliphate and entered Iraq. In a public speech he officially made null and void all the peace conditions[52] and in every way possible placed the severest pressure upon the members of the Household of the Prophet and the Shi'ah. During all the ten years of his imamate, Imam Hasan lived in conditions of extreme hardship and under persecution, with no security even in his own house. In the year 50 A.H. he was poisoned and martyred by one of his own household who, as has been accounted by historians, had been motivated by Mu'awiyah.[53]

In human perfection Imam Hasan was reminiscent of his father and a perfect example of his noble grandfather. In fact, as long as the Prophet was alive, he and his brother were always in the company of the Prophet who even sometimes would carry them on his shoulders. Both Sunni and Shi'ite sources have transmitted this saying of the Holy Prophet concerning Hasan and Husayn: "These two children of mine are Imams whether they stand up or sit down" (allusion to whether they occupy the external function of caliphate or not). Also there are many traditions of the Holy Prophet and Ali concerning the fact that Imam Hasan would gain the function of imamate after his noble father.

The Third Imam

Imam Husayn (Sayyid al-Shuhada, "the lord among martyrs"), the second child of Ali and Fatimah, was born in the year 4 A.H. and after the martyrdom of his brother, Imam Hasan Mujtaba, became Imam through Divine Command and his brother's will.[57] Imam Husayn was Imam for a period of ten years, all but the last six months coinciding with the caliphate of Mu'awiyah. Imam Husayn lived under the most difficult outward conditions of suppression and persecution. This was due to the fact that, first of all, religious laws and regulations had lost much of their weight and credit, and the edicts of the Umayyad government had gained complete authority and power. Secondly, Mu'awiyah and his aides made use of every possible means to put aside and move out of the way the Household of the Prophet and the Shi'ah, and thus obliterate the name of Ali and his family. And above all, Mu'awiyah wanted to strengthen the basis of the caliphate of his son, Yazid, who because of his lack of principles and scruples was opposed by a large group of Muslims. Therefore, in order to quell

And also

وجعلنا على قلوبهم اكنة ان يفقهوه...

We lay veils upon their hearts lest they understand it (6 25)

كذلك يطبع الله على قلوب الكافرين

so does God seal the heart of the unbeliever (7 101)

فقست قلوبهم وكثير منهم فاسقون

so that their hearts have become hard and many of them are ungodly (57 16)

All these verses point to the fact that the Quran recommends a sublime, spiritual atmosphere for mankind and deems it necessary for every individual to strive to keep it clean and unpolluted. In addition, since an unsound social atmosphere renders fruitless the efforts of most individuals to keep pure and wholesome, the Quran recommends that the people should employ all their endeavour in the direction of purification of their social atmosphere. The Quran unequivocally propounds the view that the continued existence of all those sublime values, beliefs and ideas, and continued social receptivity to all its moral advice and counsels, depend upon individual and collective struggle to eradicate all types of meanness, sensuality and lewdness.

Human history itself is a witness to the fact that whenever despotic regimes have wanted to bring other societies under their autocratic rule they have tried to corrupt their social spirit and pollute their social atmosphere. They provided enormous facilities for the people to indulge in licentiousness and gave them every kind of freedom in this regard. A heart rending account of this unholy treatment meted out to Muslims of Spain, a region which is regarded to have played an effective role in initiating the Renaissance and had the most advanced culture in Europe, throws enough light on this phenomenon. In order to divest Spain out of Muslims' hand, the Christians resorted to defilement of the morals of Muslim youth by providing ample facilities for their debaucheries. They even went to the extent of alluring and enticing the army generals and government officials in topmost ranks. They thus succeeded in diverting Muslims from the path of determination and purpose and in divesting them of their power, their strength of faith and purity of soul, converting them into profligate weaklings addicted to drinking and licentiousness. It is obvious that it is not very difficult to subdue such individuals. Christians took revenge on nearly eight hundred years of Muslim rule in such a way that history is ashamed at recounting their deeds. The same Christians who according to the teachings of Jesus Christ (offer your left cheek if your right cheek is slapped) were supposed to behave in a different way surpassed the bloodthirsty [illegible] in [illegible] the massacre of Muslims in Spain. Nevertheless the ruin that Muslims suffered was the result of their own spiritual deterioration and [illegible] it was their punishment for abandoning the Quranic command.

In our times also wherever the [illegible] [illegible] the same practices are vigorously adopted [illegible] [illegible] Quran emphatically warns [illegible] The [illegible] try to corrupt the [illegible] the heart is thus debilitated [illegible] first function properly but is [illegible] into [illegible] The colonialists and the exploiting [illegible] not [illegible] to establish schools and universities [illegible] on the other hand they [illegible] to corrupt and destroy the spirit of [illegible] They are fully aware of the fact [illegible] cannot make any decisive move and [illegible] exploitation and depredation.

This is why the Quran gives ample importance to the idea of exaltation, edification and purity of the soul of society. In one of its verses it says

وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان

And help one another to piety and God fearing do not help each other to sin and enmity (5 2)

Men are, firstly, enjoined to pursue piety and are warned against sinning, secondly, they are asked to perform righteous deeds collectively, not individually.

Here I shall mention two or three sayings of the Prophet (S) and the Imams (A) in order to elucidate this point. There is a tradition that once a person came in the presence of the Prophet (S) and told him that he wished to ask certain questions. The Prophet asked him whether he wanted to listen to the answers, or if he wished to ask questions first. He asked the Prophet (S) to give the answers. The Prophet (S) told him that his question was concerned with the meaning of virtue and goodness. The man affirmed that he intended to ask exactly the same question. The Prophet gently knocked the man's chest with his three fingers, saying "Put this question to your own heart" then he added

This heart is so made that it is harmonious with virtue, it is put at ease by virtue and piety, but disturbed by vice and villainy. In the same way, as presence of an alien disharmonious object in the human body causes uneasiness and discomfort, and disturbs its order, the human soul is thrown off its balance and ease on account of faulty behaviour. What is commonly called the pain and torment of the conscience, is the same state of inconformity and alienation of the soul.

استفت قلبك وان افتاك المفتون

[For an honest insight] ask your own heart though the masters may have their own (different) opinion

Rumi has translated this tradition into fine poetry

کوش کن استفت قلبک ای رسول   گرچه مفتی سروی گویند فضول

and also in another couplet

پس پیمبر گفت استفت القلوب   گرچه مفتیشان برون گوید خطوب

The Prophet (S) points out the fact that if a person endeavours to seek reality and truth with an open and impartial mind his heart can never deceive him in this regard, it will always guide him towards the straight path. Basically as long as man is in search of truth and reality, and treads the path of truth, whatever he encounters in this course is nothing but truth. This is, of course, a very delicate point which is often misunderstood. When someone falls into misguidance and loses his path, it is because he was following a certain direction which was not determined by sincere search of truth. Answering someone who had asked the Prophet "What is virtue?" he said "If you really want to know what is virtue then understand that when your heart is serene and your conscience at rest, whatever has caused them to be such is virtue. But when you are attracted toward something and that does not bring peace and serenity to your heart, then you should know that it is vice and sin."

Elsewhere when the Prophet (S) was asked about the meaning of faith (*iman*) he said "When one performs an ugly deed and is overwhelmed with the feeling of reproach and displeasure, and when one performs virtuous deeds and feels happy and joyous, it means that he is endowed with faith."

It has been quoted from Imam Ja'far al-Sadiq (A) that when a believer liberates himself from all worldly bondages[1] he feels the delight of nearness to God within his heart; in this state the whole world appears to him very small and insignificant; he strives with all power to liberate himself from the bondage of the material world. This is a reality attested by the lives of the men of God. In the biographies of the Prophet (S) it is written that once after his morning prayers the Prophet (S) went to visit the Ashab al-Suffah. They were a group of poor men who did not possess any worldly belongings and used to live by the side of Prophet's Mosque in al-Madinah. When the Prophet (S) happened to see one of them, Harith ibn Zayd, [illegible] his eyes sunk deep inside his skull, [illegible] "How are you?" He answered "I have woken up in a state of certain faith." The Prophet asked him what proved his claim. [illegible] keep [illegible] nights and engage in fasting during the days. The Prophet told him that this was insufficient. "Tell me more about it." He said "Hardly. O Messenger of God, my condition is such that I can [illegible] hear the people of heaven [illegible] If you permit I will inform you about the secret thoughts and [illegible] of everyone of your companions." The Prophet [illegible] told him to hold his tongue and say no more, but asked him "What is your desire?" He said "To fight in the way of God."

According to the Quran, furbishing of the human heart exalts a human being to such a point that in the words of Ali (A) even if the veils that conceal the Unseen be removed from in front of him, there is nothing that can enhance his faith. The teachings of the Quran are meant to educate man to become a being equipped with the power of knowledge and reason on the one hand, and possessed of a pure heart and sound feeling on the other. They aim to train a human being who is able to employ his reason and heart in the most proper and exalted fashion. The Imams (S) and their true pupils were examples of such human beings.

Concluded wal hamdu lillah

NOTES

1. In my book *Sayri dar Nahj al-balaghah* (A journey through the *Nahj al-Balaghah*) I have explained the distinction made by Islam between loving the world and being attached and bonded to it.

Understanding the Uniqueness of the Qur'ān

Part 3

by Martyr Murtadā Muṭahharī

translated from Persian by Mahliqā Qarā'ī

Quranic Outlook Regarding the 'Heart'

Perhaps I need not explain here that in the language of literature and mysticism the term *heart* does not mean the organ situated in the left side of the human body which pumps blood into the blood vessels. What is implied is the sublime and distinguishing faculty of the human soul, as can be readily understood from the following examples from the Quran and verses of Sa'di:

ان فى ذلك لذكرى لمن كان له قلب...

Surely in that there is a reminder to him who has a heart (50 37)

دلـم رمـيـده ... و ... مـس ...

كـه اين شـكـارى سـرگـشـه ... آمـد بـس

My heart was alarmed [on sensing the coming danger],
While I, a thoughtless dervish,
Do not know what this wandering prey has come across

These two examples make it obvious that the connoted meaning of the *heart* is quite different from the bodily organ. Elsewhere, the Quran refers to the ailments of the heart:

فى قلوبهم مرض فزادهم الله مرضاً .

In their hearts is a sickness and God has increased their sickness (2 10)

To cure this sickness is beyond the powers of any man of medicine, even the heart specialist; only the doctors of the spirit can diagnose such diseases and suggest proper remedies.

Definition of the Heart

What is the definition of this heart then? An answer to this question is to be sought in the reality of human existence. Every human being, although he is a single individual, possesses myriads of existential dimensions. The human 'self' encompasses myriads of thoughts, desires, fears, hopes and inclinations. Like the ocean which links all rivers with one another, all these components of the human personality are related to the same center, which unites them with one another. The 'self' itself is the deep and unfathomable ocean whose depths no one can claim to have charted out and to have discovered all its mysteries. Philosophers, mystics and psychologists, each of them has tried in his own specific way to explore its depths, and has succeeded only to a certain degree in discovering its secrets. Perhaps the mystics, a bit more than others, have been successful in this regard. What the Quran refers to as the heart, is the reality of that ocean, which includes all that we name as the manifestations of the soul, to which all its rivers and tributaries are connected. Even reason is one of the various rivers associated with this sea.

In places where the Quran speaks of revelation it does not make any mention of reason; rather it is merely concerned with the heart of the Prophet (S). This does not mean an absence of rational and demonstrative reception of the Holy Quran on the part of the Prophet, but it was his heart which, in a state that we cannot imagine, obtained the direct experience and awareness of those transcendental realities. The verses of *Surat al Najm* and *Surat al Takwir* describe the state of this union to some extent:

وما ينطق عن الهوى * ان هو الا وحىٌ يوحى * علمهٔ شديد القوى * ذو مرّة فاستوى *

وهو بالأفق الأعلى * ثم دنا فتدلى * فكان قاب قوسين او ادنى * فاوحى الى عبده ما

اوحى * ما كذب الفؤاد ما راى *

Nor speaks he out of caprice. This is naught but a revelation revealed, taught him by one terrible in power, very strong; he stood poised, being on the higher horizon, then drew near and approached nearer, two bows' length away, or nearer; then revealed to His servant that He revealed. His heart lies not of what he saw (53 3 11)

The Quran mentions all these things to show that these matters are basically beyond the range of rational understanding:

إنّهُ لقولُ رسُولٍ كريمٍ * ذِى قوّةٍ عِنْدَ ذِى العرْشِ مَكينٍ * مُطاعٍ ثَمّ امينٍ * وما صاحِبُكُمْ

بِمجْنُونٍ * وَلقدْ رَآهُ بِالأُفُقِ المُبِينِ * وما هُوَ على الغيْبِ بِضنِينٍ *

Truly this is the word of a noble messenger having power, of honoured place with the Lord of the Throne, obeyed, moreover trusty. Your companion is not possessed; he truly saw him on the clear horizon, he is not niggardly of the Unseen (81 19 23)

Muhammad Iqbal offers a fine interpretation of this subject. He says that the prophet is one who, at first, imbibes the entire truth, and later on, in order to enrich the world and to alter the course of history, communicates everything that has reached him by the way of Revelation.

Wherever the Quran speaks of the revelation and the heart, although its import transcends the limits of reason and thought, its speech is not irrational or anti-rational. It expounds a vision which surpasses human reason and sensibility, and enters a domain which is, basically, beyond reason and intellect.

Characteristics of the Heart

The Quran regards the heart also, as an instrument of understanding. In fact, the greater part of the Quranic message is addressed to the human heart, a message which is audible to the ears of the heart alone, and is inscrutable to other receptive faculties. Accordingly, it attaches great importance to the care, protection, and development of this instrument. In the Quran we recurringly come across such notions as purification of the self, purity and enlightenment of the heart, and purification of the heart:

قد افلح من زكّها *

Prosperous is he who purifies it [the self] (91 9)

كلاّ بل ران على قلوبهم ما كانوا يكسبون *

No indeed but that they were earning has overwhelmed their hearts (83 14)

And about the salvation and enlightening of the heart the Quran says:

ان تتقوا الله يجعل لكم فرقاناً ..

If you fear God He will assign you [the capacity of] distinguishing (8 29)

والذين جاهدوا فينا لنهدينّهم سُبُلنا..

But those who struggle in Our [cause], surely We shall guide them in Our ways (29 69)

Contrarily, the Quran recurringly reminds that indecencies infect and darken the human soul and deprive the human heart of sublime inclinations and virtuous tendencies. At one place, speaking on behalf of the believers, it says:

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا

Our Lord, make not our hearts to swerve after Thou hast guided us (3 8)

Describing the qualities of the evildoers, the Quran says:

كلاّ بل ران على قلوبهم ما كانوا يكسبون *

No indeed but that they were earning has overwhelmed their hearts (83 14)

The darkness of sin and injustice has engulfed their hearts:

فلمّا زاغوا ازاغ الله قلوبهم...

When they swerved God caused their hearts to swerve (61 5)

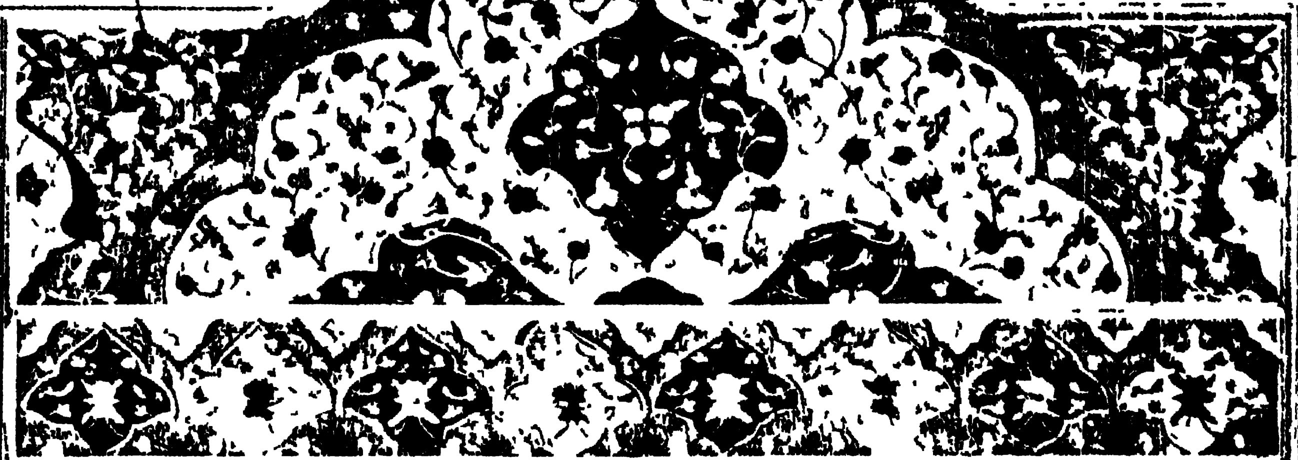
About the sealing and hardening of the hearts, it says:

ختم الله على قلوبهم وعلى سمعهم وعلى ابصارهم غشاوة .

God has set a seal on their hearts and on their hearing, and on their eyes is a covering (2 7)

BASHEER-W-NAZEER

Weekly



نهج البلاغة — من كتاب علي الى عثمان بن حنيف

وَلَوْ شِئْتُ لَاهْتَدَيْتُ الطَّرِيقَ إِلَى مُصَفَّى هٰذَا الْعَسَلِ

وَلُبَابِ هٰذَا الْقَمْحِ وَنَسَائِجِ هٰذَا الْقَزِّ، وَلٰكِنْ هَيْهَاتَ

أَنْ يَغْلِبَنِي هَوَايَ وَيَقُودَنِي جَشَعِي إِلَى تَخَيُّرِ الْأَطْعِمَةِ، وَلَعَلَّ

بِالْحِجَازِ أَوِ الْيَمَامَةِ مَنْ لَا طَمَعَ لَهُ فِي الْقُرْصِ وَلَا عَهْدَ لَهُ

بِالشِّبَعِ، أَوْ أَبِيتَ مِبْطَاناً وَحَوْلِي بُطُونٌ غَرْثَى

وَأَكْبَادٌ حَرَّى

If I wished, I could have taken the path of [relishing such pleasures as] pure honey, refined wheat, and silk clothing; but it cannot be that my passions should lead me and my greed should make me enjoy good meals, while there may be people in Ḥijāz or Yamāmah who have no hope of getting bread and who do not get a full meal. Should I lie with a satiated belly in the midst of hungry bellies and thirsty livers?

—'Ali ibn Abi Ṭālib (A)

(In a letter to 'I thman ibn Hunayf al 'Ansari, who was appointed by 'Ali (A) as goternor of Basrah Nahj al balaghah, epistle 15)

S. A. ABBAS MOOSVI
EDITOR.

VOLUME 1 NO 4
[illegible] AUGUST 19[illegible]
PRICE PER COPY Rs 1/-
YEARLY Subscription Rs 45/-

شاہ ہست حسین پادشاہ ہست حسین — دیں ہست حسین دیں پناہ ہست حسین

سر داد نہ داد دست در دست یزید — حقا کہ بنائے لاالہ ہست حسین

بسم اللہ الرحمن الرحیم ٥

۱۲۱

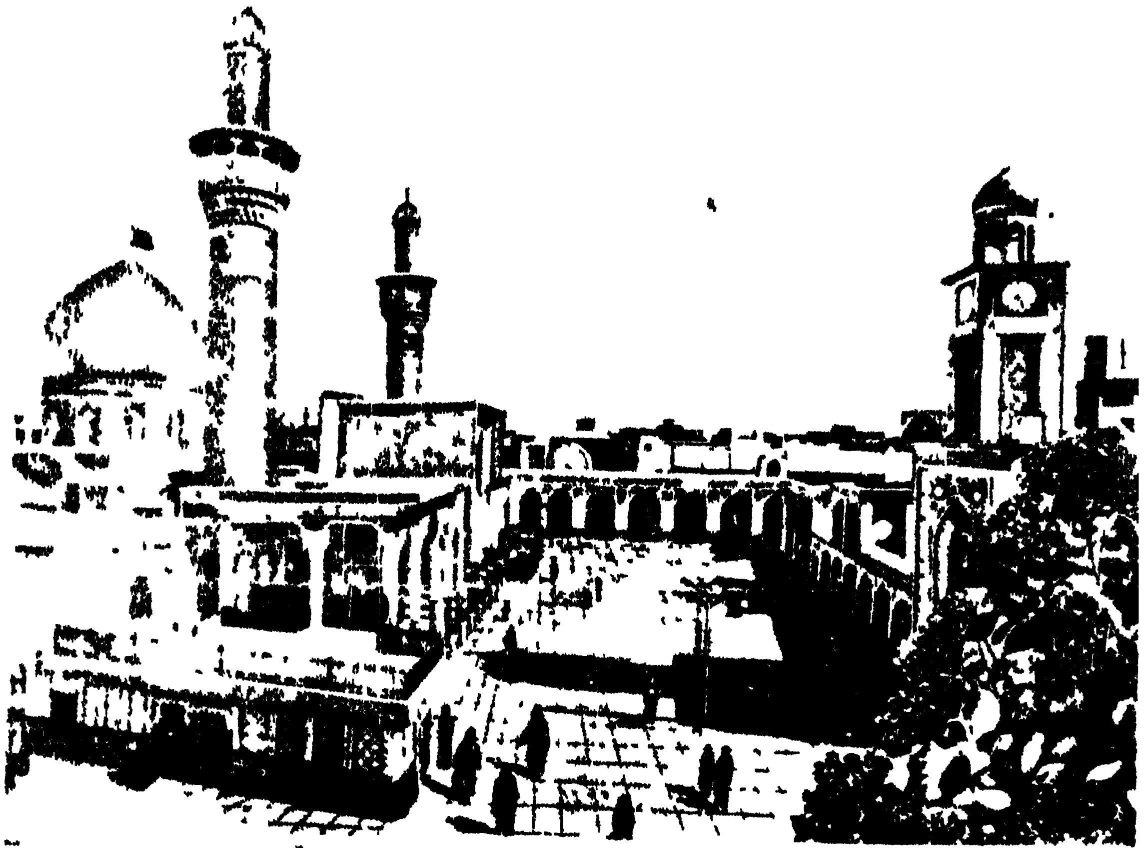
ہفتہ وار

بشیر و نذیر

ترتیب

مدیر

سید علی عباس موسوی



جلد ۱ ★ شمارہ ۵

41283/20/ AL/88 TC

اداریہ

تاریخ انسانیت نے اقتدار کی ہوس میں کتنے ہی ایسے حادثوں کو محفوظ کیا جو ساری انسانیت کے لئے باعث شرم ہیں۔ قرآن کے دامن میں بھی عبرت و نصیحت کے لئے پیغمبروں کے ساتھ ان سرکشوں کا سلوک جو حق کے مقابل صف آرا ہوئے تھے۔ .... موجود ہے۔ ان واقعات کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ دنیا یہ سمجھ سکے کہ آدم سے لیکر خاتمؐ تک کن مراحل سے گذر کر یہ کاروان ،الیوم اکملت لکم دینکم کی منزل تک پہونچا۔

واقعہ کربلا انسانی تاریخ کا وہ منفرد سانحہ ہے۔ جہاں نور و ظلمت حق و باطل ایک دوسرے کے مقابل کھل کر سامنے آگئے۔ ظالموں نے انوکھے ظلم ڈھائے تو مظلوموں نے بھی فطری تقاضوں کو مقصد کے حصول کے لئے قربان کیا اور استقامت و پائیداری کے ساتھ مظالم سہے۔ خون امام حسینؑ کا اثر یہ ہوا کہ حق و باطل کی پہچان آسان ہوگئی اور ساتھ ہی فتح اور شکست کا ایک نیا پیمانہ سامنے آیا۔ جہاں 'ظلم' 'طاقت' 'اقتدار' 'کثرت' کے مقابل 'مظلومی' 'ذوق شہادت' 'ظاہری اقتدار سے گریز' اور مختصر سے حق کے پروانوں کی شہادت ملتی ہے اور جسے قرآن نے ذبح عظیم قرار دیا اور ہر انصاف پسند نے اسے فتح عظیم تسلیم کیا۔

حسینیؑ انقلاب کے نتائج نہ صرف فوراً ظاہر ہونے بلکہ اس کے اثرات ابد تک کے لئے ہر 'مظلوم' کو ظلم سے' غلاموں کو غلامی سے' باطل کو تابوتی طاقتوں سے' آزاد کرانے کے لئے' ساری انسانیت کے لئے مینار نور بنے ہوئے ہیں۔

شہادت حسینؑ سے قبل حاکم کا تسلط اس حد تک بڑھ چکا تھا۔ کہ ہر مسلمان ایسی بیعت کو تیار ہو جاتا تھا۔ مسلمان کی فکر زنگ آلود ہو چکی تھی۔ بلکہ وہ فطری روحانی و اخلاقی طور پر کمزور ہو چکے تھے۔ صحیح اسلامی تبلیغات پر پابندی اور علماء کی گوشہ نشینی سے اسلام خطرہ میں تھا۔ شہادتِ عظمیٰ نے ان مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور بتلایا کہ کیوں کثرت' دولت کے بل بوطے پر تخت حکومت پر قبضہ جما لینے والا ہر شخص واجب طاعت نہیں ہو سکتا۔ حاکم کے لئے جو شرائط اور صفات ہیں' اُن کو حسینؑ نے میدان کربلا میں پیش کیا۔ اور آئندہ آنیوالی نسلوں کو یہ درس دیا کہ شہادت کا جام پی کر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔

ہر سال اسلامی سال کا آغاز ماہ محرم سے ہوتا ہے۔ آج چودہ سو برس سے ذکر حسینؑ جو اسلام اور مقصد حسینؑ کو ظاہر کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔ انسانیت کو دعوت فکر دے رہا ہے۔ اور ہر سال حسینؑ کے چاہنے والوں نے جذبہ ایمانی کی جلاح بھی کرتا ہے۔ اور حق پر جان فدا کرنے والوں کو حوصلہ بھی عطا ہوتا ہے۔ جس کی مثال آج بھی صفحہ ہستی پر نظر آتی ہے۔

کربلا کے میدان میں حسینؑ ابن علی اور ان کے ساتھیوں نے جس انداز سے جام شہادت نوش کیا۔ اس کی نظر نہیں مل سکتی۔ ایک طرف تو حسینؑ نے لشکر یزید کو ایک اشارہ کے ذریعہ خاموش کر کے اپنی خدائی طاقت کا مظاہرہ کیا تو دوسری طرف چھ مہینے کے بچے کو اپنے ہاتھوں پر تیر سے زخمی دیکھ کر بھی صرف صبر اور استقلال کے جوہر دکھائے۔ یزیدی فوج نے نویں محرم (شب عاشور) کو جنگ کی تیاریوں کے ذریعہ ان کا مقصد ظاہر کیا تو حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے ساری رات عبادت کر کے واضح کیا کہ ان کا مقصد حیات اسلام اور صاحب امرؑ ہر حال میں دامن تھامے رہنا ہے۔ گویا کربلا والوں کی زندگی کا مقصد ہی اطاعت و عبادت ہے۔ اور قربانی و ایثار اس کی دلیل ہیں۔

واقعہ کربلا کے لازوال اثرات آج بھی ہیں اور قیامت تک باقی رہینگے ان اثرات کو قبول کرنے کے لئے بیداری کی ضرورت ہے بقول جوشؔ

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکاریگی ہمارے ہیں حسینؑ

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان حسینؑ کے اُس پیغام کو سمجھے جو انھوں نے کربلا کے میدان میں دیا ہے تو یقیناً سارے عالم میں ایک عظیم انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔ کیونکہ حسینؑ نے ہزاروں کے لشکر کے مقابلہ صرف (۷۲) نفوس کو پیش کیا گویا دنیا کو تبلادیا کہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے عددی طاقت کی برتری سے خوفزدہ نہیں ہونا اور اگر حق کا دامن ہاتھ میں ہو تو تنہائی کے عالم میں بھی حق کی آواز کو بلند کرنے سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیئے، چاہے اس کے لیے .... اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔

آج ساری انسانیت ظلم و جور اور غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہونا چاہتی ہے۔ اقتدار کے بھوکے اور جابر حکمرانوں سے نجات پانا چاہتی ہے۔ طاقت اور دولت کے ذریعہ تفرقہ ڈالنے والی طاقتوں کو بے نقاب کرنا چاہتی ہے۔ اگر آج کوئی ایسا طریقہ ہے جو انسانیت کو اُس کے ان ارادوں میں کامیاب کر سکتا ہے تو وہ صرف حسینیت کا درس ہے جو کربلا کے میدان میں دیا گیا کہ اقتدار، دولت، ظلم و جبر، باطل اور تابوتی طاقتوں کو فنا کرنا ہو اور اَن کے چہروں سے نقاب اٹھانا ہے تو حسینؑ ابن علیؑ کی طرح صف آراء ہو جاؤ چاہے جام شہادت کیوں نہ پینا پڑے اور یقیناً وہ معاشرہ جس نے باطل، ظلم کا ساتھ دیا ہے وہ ظاہری فتح کا اعلان بھی نہیں کر پائیگا کیونکہ یہ قربانی، ظالم کے چہرہ سے نقاب اٹھا دے گی اور معاشرہ کو دعوتِ فکر دے گی کہ وہ اپنے عمل کا جائزہ لے اور حق کا ساتھ دے۔

سنہ ۶۰ ہجری میں بھی یہی ہوا اسلام کے ماننے والوں نے ایک ایسا نظام قبول کر لیا تھا جو قرآن اور تعلیماتِ قرآن کے خلاف تھا ایسا معاشرہ جنم لے چکا تھا جو حلال و حرام کے فرق کو بھلا چکا تھا۔ اسلامی اقتدار کو منتشر کرنے کی سازش جھوٹے احادیث کے ذریعہ پھیلتی جا رہی تھی ان حالات میں رسولؐ کے نواسے نے نہ صرف تنہا رسول مقبول بلکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کی محنتوں کو بچانے بھرے گھر کو لے کر کربلا کا رخ کیا۔ ایک دوپہر میں حسینؑ اور حسینؑ کے ساتھی شہید ہوگئے مگر خونِ حسین رائیگاں نہیں گیا بلکہ قیامت تک کے لئے آنے والی نسلوں کو حق و باطل میں فرق کرنے کا شعور عطا کر گیا۔

جناب مفتی سید طیب آغا جزائری، قم،

امام حسین علیہ السلام کے ارشادات

کے آئینہ میں

حکومت اسلامی کے خدوخال

اس کرۂ زمین ہی کی حکومت نہیں — بلکہ سارے جہان کی حکومت و ملکیت صرف اللہ کے لیے ہے — و للّٰہ ملک السموات والارض (آل عمران ۱۸۹)

یوں تو اللہ کا ارادۂ تشریعی یہی ہے کہ یہ حکومت ہمیشہ "امام معصوم" کے ہاتھوں میں رہے، اور اس نے ایسا کرکے دکھا بھی دیا تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ مردانِ خدا ہی صحیح معنوں میں حکومت کرنا جانتے ہیں اور گرگ و انسان، شیر و بکری کو ایک گھاٹ میں پانی پلا سکتے ہیں، چنانچہ اس نے بطور نمونہ حضرت نوح کو بعد طوفان، حضرت طالوت، حضرت یوسف، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان و حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ریاست و حکومت دینی کے ساتھ ساتھ دنیوی حکومتیں بھی عطا کیں —— لیکن

چونکہ ابلیس سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ اس کو بھی اپنی شیطنت کے رنگ و روپ دکھانے کا موقعہ دے گا تاکہ اس ضمن میں اس کی سابقہ عبادت کا عوض بھی ادا ہو جائے اور اللہ کے مخلص بندوں کی شناخت بھی ہو جائے اس لیے ان "الٰہی حکومتوں" کے روکنے کو شیطانی حکومتیں آتی رہیں، انہوں نے نوعِ انسان کے خون سے خوب ہولی کھیلی اور دل کھول کر ظلم و ستم کئے پھر بھی خدا بھی مجبور نہ ہوا — جس نے بندہ کو مختار جو پیدا کیا ہے (لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی) اب جبکہ لوگوں نے ظالموں ہی کو اپنی گردن پر سوار کیا ہے تو وہ بھی سہی — آخر کسی نہ کسی کو تو اس دنیا کا نظام چلانا ہے (لابد للناس من حاکم بر او فاجر)

اگر لوگ نیک بندوں کی حکومت کو قبول نہ کریں گے تو بدکاروں کا تختِ حکومت پر آجانا لازمی نتیجہ ہے، یہ نظامِ قدرت بھی ہے اور قانونِ فطرت بھی۔ پھر خدا کو کوئی جلدی بھی نہیں ہے — و للّٰہ عاقبۃ الامور (لقمان ۲۲)

جب یہ طرح طرح کی ابلیسی و طاغوتی نظام فیل ہو جائیں گے، اور ساری دنیا فیل ہونے لگے گی تو آخر میں خدا اس زمین کے وارثانِ حقیقی کو تختِ حکومت سونپ دے گا :

«ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثها عبادی الصالحون» (انبیاء ۱۰۵)

ہم نے قرآن کے علاوہ زبور میں بھی یہ لکھ دیا تھا کہ "آخر میں زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔"

لیکن یہاں پر ایک اہم سوال یہ ہوتا ہے کہ :

"ظالم اور طاغوتی حکومتیں کیا چاہتی ہیں، اور عادل و لاہوتی حکومتوں کا کیا منشا ہے ؟"

اس مقالہ میں ہم ارشاداتِ امام عالی مقام حضرت حسین علیہ الصلوٰۃ و السلام کی روشنی میں اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔

کون حسینؑ ؟ وہ حسینؑ جن کی نہضت سے بڑھ کر دنیا میں کسی کی نہضت نہ تھی۔

یہ نکتہ کہ — ہم نے نہضتِ حسینی کو نہضتِ محمدی سے بھی آگے بڑھایا نہیں ہے، بڑھنے کا سوال وہاں ہوتا ہے جہاں دو چیزیں ایک دوسرے سے الگ ہوں، جبکہ واقعہ یہ ہے کہ "نہضتِ حسینی" ہمارے "نہضتِ محمدی" کا دوسرا مقدمہ ہے "نہضتِ قائمی" کا — نہضتِ محمدی — نہضتِ حسینی — نہضتِ قائمی "ایک حکومتِ اسلامی" کا تین صورتیں ہیں

پیغمبر اسلامؐ کس طرح کی حکومت چاہتے تھے ؟

"حسنِ عقیدہ" اور "حسنِ عمل" یہی دونوں چیزوں کے لیے سارے رسول آئے اور آخری رسول بھی اسی دین کی تبلیغ کے لیے بھیجا گیا — یہی خلاصہ ہے اس دینِ الٰہی کا جس کے لیے ارشاد ہوا ہے : ان الدین عند اللّٰہ الاسلام (آل عمران ۱۹)

"حسنِ عقیدہ" اور "حسنِ عمل" ان دونوں کا اگر تجزیہ کیجئے تو یہ پانچ اصول برآمد ہوتے ہیں .

1. اس خدا کو مانیں جو واقعی خدا ہے ۔
2. اس نبی کو تسلیم کریں جو واقعی نبی ہے ۔
3. اس امام (نائب نبی) کو قبول کریں جو واقعی امام ہے ۔
4. ان عبادات کو بجا لائیں جو واقعی عبادت ہے ۔
5. ان معاملات پر عمل کریں جو واقعی معاملات ہیں ۔

یہ پانچ اصول نہیں ہیں — بلکہ پانچ سمندر ہیں، انکو اگر ایک کوزہ میں بند کرنا چاہتے ہیں تو ایک جامع لفظ میں سمیٹ لیجئے۔ وہ لفظ ہے "حق" اس لفظ کے اندر سارے معانی سمٹ کر آگئے ہیں

قرآن نازل ہوا ہے تو اسی لئے : نزل علیک الکتاب بالحق (آل عمران ۳)

سارے رسول آئے تو اسی لیے : لقد جاءت رسل ربنا بالحق (اعراف/ ۴۳)

ہمارا رسول آیا تو اسی لیے۔ قد جاءکم الرسول بالحق (نساء/ ۱۷۰)

ملائکہ نازل ہوتے ہیں تو اسی لیے : ما ننزل الملائکۃ الا بالحق (حجر/ ۸)

بلکہ ذاتِ واجب الوجود کی بھی ایک تعبیر قرآنی ہے حق : ذلک بان اللّٰہ هو الحق (حج/ ۶)۔

وہ جو کچھ کہتا ہے وہ بھی حق ہوتا ہے : و اللّٰہ یقول الحق (احزاب ۴)،

یہ کہ حکومتِ الٰہی اور ولایتِ حقیقی بھی خدائے برحق کے لئے ہے :

هنالک الولایۃ للّٰہ الحق (کہف ۴۴)

پیغمبر اسلامؐ نے بھی ایک ایسی حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی جس میں ہر طرف حق کا بول بالا تھا، یعنی انسانی اقدار کی قیمت تھی، مظلوموں کی حمایت اور ظالموں کی سرکوبی تھی، معروف کی ترغیب، منکرات سے بچنے کی تعلیم تھی، اطاعتِ خالق، محبتِ مخلوق کی طرف ہدایت تھی، غرور و تمکنت کی وجہ سے کوئی سرفراز نہ تھا، امیر و فقیر کا امتیاز نہ تھا، ایک ہی لشکر میں سارے غازی، اور ایک ہی صف میں سارے نمازی دکھلائی دیتے تھے۔ یعنی خالق و مخلوق دونوں کا حق ادا ہو رہا تھا۔

یہی وہ حسین نقوش ہیں جو حسینؑ کے خطاب اور ارشادات میں جواہر پاروں کی طرح بکھرے نظر آتے ہیں۔

دربارِ ولید میں امام حسینؑ کا اظہارِ حق .

امام حسین علیہ السلام کی باطل سے سب سے پہلی مڈبھیڑ دربارِ ولید بن عتبہ میں ہوئی جہاں اس نے آپ سے یہ خواہش کی کہ آپ یزید کی بیعت کریں، آپ نے اس کا جو جواب دیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومتِ الٰہی کے لیے وہ افراد مناسب

ہیں جن کا رابطہ اللہ سے ہو نہ کہ وہ جو ابلیس سے مرتبط ہوں ،
آپ نے فرمایا :

« ایہا الامیر إنا أهل بیت النبوة، ومعدن الرسالة، ومختلف الملائكة، ومحل الرحمة، بنا فتح الله، وبنا ختم، و یزید رجل فاسق، شارب خمر، قاتل النفس المحرمة، معلن بالفسق، ومثلی لا یبایع مثله، ولكن نصبح وتصبحون وننظر وتنظرون أینا أحق بالخلافة والبیعة، »

اے امیر! یقیناً ہم اہل بیت نبوت ہیں ، اور رسالت کی کان ہیں ، ملائکہ کی آماجگاہ ، رحمت الٰہی کا ٹھکانا ہیں ، ہم سے اللہ نے اس کائنات کا آغاز کیا ، اور ہم پر ہی اس کا خاتمہ کرے گا ، اور یزید ایک فاسق و شرابی و نفس محترمہ کا قاتل شخص ہے جو علی الاعلان فسق و فجور کرتا ہے اور مجھ جیسا کبھی اس جیسے کی بیعت نہیں کر سکتا ، لیکن ہم بھی صبح کریں اور تم بھی صبح کرو ، ہم بھی نظر کریں اور تم بھی نظر کرو کہ ہم میں سے کون خلافت اور بیعت کا سزاوار ہے ۔

حضرت کی اس گفتگو سے واضح ہوتا ہے کہ بعد رسول سزاوار حکومت صرف اہل بیت رسول ہیں ، اگر یزید فاسق و فاجر نہ بھی ہوتا تب بھی خلافت کی اہلیت نہیں رکھتا تھا چہ جائیکہ وہ ان خرابیوں میں بھی مبتلا تھا ۔

امام حسین علیہ السلام کی وصیت

انسان کا حقیقی کردار ، اور اس کے اصلی اقدار اس کی وصیت میں نمایاں ہوتے ہیں ، مدینہ سے چلتے وقت آپ نے جو وصیت اپنے بھائی حضرت محمد حنفیہ کو لکھ کر دی اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ کیسی حکومت چاہتے تھے ، آپ حق کی حکومت چاہتے ، ایسی حکومت جس میں ہر طرف حق کی روشنی ہو :

بسم الله الرحمن الرحیم

هذا ما اوصى به الحسین بن علی بن ابی طالب الی اخیه محمد المعروف بابن الحنفیه ان الحسین (ع) یشهد ان لا اله الا الله وحده لا شریك له و

۴ شیر الاحزان ابن نما حلی (چھٹی صدی ہجری) ، تاریخ اعثم کوفی ۵/۱۸

أن محمدا صلی الله علیه وآله عبده ورسوله جاء بالحق من عند الحق وان الجنة والنار حق وأن الساعة آتیة لا ریب فیها وأن الله یبعث من فی القبور وانی لم أخرج أشرا ولا بطرا ولا مفسدا ولا ظالما وانما خرجت لطلب الاصلاح فی امة جدی (ص) ارید أن آمر بالمعروف وانهى عن المنكر واسیر بسیرة جدی (ص) وأبی علی بن ابی طالب (ع) فمن قبلنی بقبول الحق فالله اولى بالحق ومن رد علی هذا اصبر حتى یقضی الله بینی وبین القوم بالحق وهو خیر الحاكمین وهذه وصیتی یا اخی الیك وما توفیقی الا بالله علیه توكلت والیه انیب.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ وہ امر ہے جس کی وصیت کی حسین بن علی بن ابی طالب نے اپنے برادر محمد عرف ابن حنفیہ کی جانب کہ حسین گواہی دیتا ہے کہ خدائے وحدہ لاشریک کے سوا کوئی خدا نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں جو حق کی طرف سے حق لے کر آئے اور یہ کہ جنت و دوزخ برحق ہیں ، قیامت آکے رہے گی ، اس میں کوئی شک نہیں ہے ، اور خدا قبر والوں کو اٹھائے گا ، اور یہ کہ میں نے جو قدم اٹھایا ہے کسی نادانی اور طغیانی کی وجہ سے نہیں ، نہ میں مفسد ہوں نہ ظالم ، میں نے محض اپنے جد کی امت کی اصلاح کی غرض سے یہ پیش قدمی کی ہے میں چاہتا ہوں کہ امر بالمعروف اور نہی از منکر کروں اور اپنے جد اور باپ کی سیرت پر چلوں ، پس جس نے بھی اس کو قبول کیا حق کے قبول کرنے کے ساتھ تو اللہ حق کے لیے زیادہ سزاوار ہے اور بہتری

حاکم ہے ، اور یہ میری وصیت ہے تم سے اے بھائی ! اور اللہ ہی سے توفیق چاہتا ہوں ، اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں ۔

یہ لکھ کر آپ نے وہ نوشتہ لپیٹا اور اس پر اپنی مہر لگادی اور اپنے بھائی محمد کو دیدیا اور پھر ان سے رخصت ہو کر آدھی رات کو روانہ ہو گئے ۔

نیز یہی الفاظ " انی لم أخرج اشرا ولا بطرا ۔۔۔ وانما خرجت لطلب الصلاح فی امة جدی محمد " اسی حضرت نے ابن عباس کے جواب میں بھی فرمائے تھے ۔[۱]

امام علیہ السلام کے مذکورہ الفاظ سے دو باتیں واضح ہوئیں :

۱۔ " اشر و بطر " کے معنی ہیں زیادتی نعمت کی وجہ سے اپنے آپ سے باہر ہو جانا ، مقصد یہ ہے کہ میں رسول اللہ کا نواسہ یا علی و فاطمہ کا فرزند ہونے کی وجہ سے کسی غرور و تمکنت میں مبتلا نہیں ہوں کہ اپنی خاندانی وجاہت بچانے کے لیے بغیر سوچے سمجھے اتنا بڑا اقدام کر بیٹھوں ۔ نہیں ، میرا قیام عاقلانہ و حکیمانہ ہے ۔

۲۔ حکومت اسلامی وہ حکومت ہے جس میں حق کا بول بالا ہو ، سنت محمدی اور سیرت حیدری پر مؤبہ مو عمل کیا جائے ۔

اہل کوفہ کے خطوط کا جواب

اہل کوفہ کے ہزاروں خطوط کے جواب میں آپ نے اپنا آخری خط ہانی بن ہانی اور سعید بن عبداللہ کے ہاتھ جو بھیجا تو اس کے الفاظ یہ تھے :

. . . اما بعد فان هانیا وسعیدا قدما علی بكتبكم
. . . . . فلعمری ما الامام الا الحاكم بالكتاب القائم بالقسط الدائن بدین الحق الحابس نفسه على ذات الله
والسلام ۔[۲]

ہانی اور سعید کے ذریعہ جو خط تم (اہل کوفہ) نے مجھ کو بھیجے میں ان کے مضمون سے آگاہ ہوا ۔۔۔ اپنی جان کی قسم امام نہیں ہو سکتا مگر وہ شخص جو کتاب خدا کے مطابق حکم کرے ، انصاف پر قائم رہے ، دین حق کا پابند ہو ، اپنے نفس کو ذات خداوندی کا اسیر کر دے ، والسلام ۔

۱۔ مقتل خوارزمی ص ۸۸ ، مقتل خوارزمی ۱/۱۸۹ ۲۔ مناقب ابن شہر آشوب چھٹی صدی ، ۴/۸۹ ۳۔ نفس مہموم ص ۸۵ ، بیروت ۔ تحقیق عید

لشکر حر کے سامنے حضرت کا پہلا خطبہ ۔

امام حسین علیہ السلام نے حر بن یزید ریاحی کے لشکر کے سامنے تین خطبے دیئے جن سے پتہ چلتا ہے کہ " حکومت اسلامی " کا خاکہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں امام کیا چاہتے تھے ، پہلا خطبہ نماز ظہر سے پہلے ارشاد کیا ، اس میں آپ نے فرمایا :

ایها الناس ! انها معذرة الى الله عزوجل والیكم ، انی لم آتكم حتى اتتنی كتبكم وقدمت بها علی رسلكم أن أقدم علینا فانه لیس لنا امام ولعل الله أن یجمعنا بك على الهدى ۔ فان كنتم على ذلك فقد جئتكم فاعطونی ما اطمئن به من عهودكم ومواثیقكم ۔ وان كنتم لمقدمی كارهین ، انصرفت عنكم الى المكان الذی جئت منه الیكم[۳]

اے لوگو ! یہ میرا عذر ہے اللہ کے سامنے اور تمہارے سامنے ، میں تمہارے پاس اس وقت تک نہیں آیا جب تک کہ تمہارے خطوط نہ آئے اور تمہارے فرستادہ نمایندے نہ آئے ، انہوں نے کہا کہ آپ ہماری طرف آجائیے ، ہمارا کوئی امام نہیں ہے ۔ شاید اللہ آپ کی وجہ سے ہم کو ہدایت پر اکٹھا کر دے ، پس اگر تم اپنے اس قول پر باقی ہو تو لو میں تمہارے پاس آگیا ہوں ۔ اپنے عہدوں کو پورا کرو ، اور اگر تم کو میرا آنا ناگوار ہے تو میں وہیں پلٹا جاتا ہوں جدھر سے آیا ہوں ۔

حضرت کے اس کلام سے دو چیزیں معلوم ہوئیں:

۱۔ حضرت خود نہیں آئے بلکہ لوگوں کے اصرار پر آئے، انہوں نے کہا کہ ہم بغیر امام کے ہیں کوئی ہماری ہدایت کرنے والا نہیں ہے، ظاہر ہے اس صورت میں رہبر کا فریضہ ہے کہ اپنی امت کی رہبری کرے ورنہ بروز قیامت خدا کو کیا جواب دے گا۔ امام حسین علیہ السلام اسلامی سیاست اور قانونی حیثیت کے رو برو تھے سیاسی نقطۂ نظر سے عوام کا واقعی ایک بڑا گروہ یزید سے بیزار تھا اور وہ اخجمت[1] کے لیے باہر نکلنے کو تیار تھا۔ اسے ایک رہنما چاہیے تھا۔ مذہبی لحاظ سے امام حسینؑ سلسلہ وار ایک بہت بڑی سیاسی تاریخ اور دینی پس منظر کی روایت رکھتے تھے اور اب وقت آچکا تھا کہ انحراف و منحرفین پر سخت چوٹ لگائیں۔

[1] تاریخ ابن اثیر ۳ / ۲۸۰ بحوالہ حیات امام حسینؑ تالیف باقر شریف ۳ / ۷۸

یہ کہنا کہ چونکہ اہل کوفہ نے ان کے بابا اور بھائی کے ساتھ بے وفائی کی تھی لہذا امام حسین علیہ السلام کو ان کی بات نہ ماننا چاہیے تھی، عوام الناس کے لئے تو شاید درست ہو، مگر امام حسین علیہ السلام جیسا عظیم رہنما اس بات کو قاعدۂ کلیہ کیسے سمجھ سکتا تھا! جبکہ اہل کوفہ میں میثم تمار، رشید ہجری، مسلم بن عوسجہ، حبیب بن مظاہر جیسے عاشقان خدا و فدائیان حسینؑ موجود تھے۔

۲۔ آپ کی قانونی اور سیاسی ذمے داری و منصب امامت کا تقاضا تھا کہ حالات کے بارے میں موثر کردار ادا کریں اور اندھیروں میں روشنی کی ایک ایسی لکیر ڈال دیں جو آہستہ آہستہ شعلہ اور مینارِ نور بن جائے۔ امام حسین علیہ السلام نے قدم بڑھایا اور کربلا کا رخ کیا۔ وقت اتنا نازک اور اقدام اتنا اہم تھا کہ سب ہکا بکا رہ گئے۔ یزید کی شہنشاہی کا طنطنہ، عوام کی دعوت، امام حسین علیہ السلام کی للکار نے حکومت دوستوں کو لرزا دیا ان کی منطق لاجواب تھی۔

لشکر حُر کے سامنے امام حسینؑ کا دوسرا خطبہ

امام حسین علیہ السلام نے پہلا خطبہ دے کر نماز ظہر ادا کی آپ کے اصحاب اور لشکر حر دونوں نے آپ کی اقتداء میں نماز پڑھی، نماز کے بعد کھانا کھایا گیا تھوڑی دیر کے بعد نماز عصر کا وقت آگیا۔ نماز عصر بھی دونوں لشکروں نے آپ کے پیچھے پڑھی جب پورا مجمع نماز و تعقیبات سے فارغ ہو گیا تو حضرت دوبارہ کھڑے ہوئے اور خدا کی حمد و ثنا و نعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد یہ تقریر کی:

> [illegible]

اے لوگو! اگر تم متقی رہو اور اہل حق کے حق کو پہچانو تو یہ اللہ کی خوشنودی کا زیادہ باعث ہوگا اور ہم اہلبیت رسول اللہ ان لوگوں سے امر حکومت کے زیادہ حقدار ہیں جو ان کے جھوٹے دعوے دار ہیں اور تم پر ظلم و جور کر رہے ہیں۔ پس اگر تم ہم کو ناپسند کرتے ہو اور ہمارے حق کے منکر ہو گئے ہو اور اب تمہاری رائے تمہارے خطوط کے مضمون سے مختلف ہو گئی ہے تو میں تم سے قطع نظر کرتا ہوں۔

اس خطبہ میں بھی حضرت نے اس بد قسمت قوم کو چند اہم نکات کی طرف توجہ دلائی وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ حکومت اسلامی کے جائز مسند اہل بیت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

۲۔ یزید اور اس جیسے افراد جھوٹے دعویدار ہیں۔

۳۔ ان کے اس دعوے کے بطلان کی دلیل ان کا ظلم و عدوان ہے کیونکہ حاکم عادل حکومت اسلامی کبھی رعایا پر ظلم نہیں کرتا۔

۴۔ اگر تم اپنے خطوط میں لکھے ہوئے مطالبے سے منحرف ہو گئے ہو ہمارے حق کو فراموش کر رہے ہو اور ہمارا آنا پسند نہیں کرتے۔ تو ہم بھی تم سے کوئی مطلب نہیں رکھتے۔ ہم جو راستہ اپنے لیے طے کر چکے ہیں اس پر آگے بڑھتے ہی رہیں گے۔ تم سے ہمیں نہ پہلے امید تھی نہ اب ہے ہم تو اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

لشکر حُر کے سامنے حضرت کا تیسرا خطبہ

جب امام حسین علیہ السلام مقام "بیضہ" میں پہنچے، لشکر حر بھی آپ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، اس مقام پر حضرت نے منزل کی اور ایک ایسا خطبہ ارشاد کیا جس میں "حکومت اسلامی" اور "حکومت باطل" کے نقوش و حدود اچھی طرح واضح کر دیے۔ حضرت اپنی شمشیر پر سہارا دے کے کھڑے ہوئے اور خدائے متعال کی حمد و ثنا اور صلوات بر رسول خدا کے بعد یوں ارشاد فرمایا:

[1] تاریخ ابن اثیر ۳ / ۲۸، بحوالہ حیات امام حسین ۳ / ۸۰، ارشاد مفید بحوالہ مقتل سید مقرم ص ۲۱۷

> «ايها الناس إن رسول الله (ص) قال: «من رأى سلطانا جائرا مستحلاً لحرم الله، ناكثاً لعهدالله، مخالفاً لسنة رسول الله (ص) يعمل في عبادالله بالاثم والعدوان: فلم يغير ما عليه بفعل ولاقول كان حقاً على الله أن يدخله مدخله الخ»[1]

لوگو! حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی ظالم بادشاہ کو دیکھے کہ وہ محرمات الٰہی کو حلال کرنے والا ہو، اور اللہ کے عہد کو توڑنے والا ہو، رسول اللہؐ کی سنت کا مخالف ہو، اللہ کے بندوں میں گناہ اور سرکشی کا برتاؤ کرے، اور اس کو اپنے فعل سے بدلنے کی کوشش نہ کرے اور نہ اس پر اپنے قول سے اعتراض کرے تو اللہ کو اس کا حق ہے کہ وہ اس شخص کو جہنم میں داخل کرے جس جگہ ظالم بادشاہ کو داخل کرے گا۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

"آگاہ ہو جاؤ! کہ ان لوگوں نے شیطان کی اطاعت کو اختیار کیا ہے اور رحمان کی اطاعت کو ترک کر دیا ہے۔ فتنہ و فساد کو آشکار کیا ہے، اور حدود الٰہی کو معطل کر دیا ہے اور مالِ خدا پر قبضہ کر لیا ہے، اور میں اپنے غیر سے اس حکومت الٰہی کے لیے اولیٰ ہوں۔ میرے پاس تمہارے خطوط آئے، اور نمایندے بھی آئے اور انہوں نے کہا کہ تم نے میری بیعت کی ہے اور اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ آخر وقت تک اس بیعت پر باقی رہو گے اور مجھ کو تنہا نہ چھوڑو گے۔ پس اگر تم اپنی بیعت پر باقی ہو تو راہ ہدایت پاؤ گے کیونکہ میں حسینؑ بن علیؑ اور پسر فاطمہ زہراؑ بنت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں، میری جان تمہاری جان کے ساتھ ہے اور میرے متعلقین تمہارے متعلقین کے ساتھ ہیں (یعنی جو تم پر گذرے گی وہ مجھ پر بھی گذرے گی اور دونوں کا ایک انجام ہوگا)

اور اگر تم نے ایسا نہ کیا اور میری بیعت کو توڑ دیا اور اپنے وعدے سے پھر گئے تو اپنی جان کی قسم یہ تم سے کوئی بعید نہیں ہے کیونکہ تم نے یہی سلوک میرے باپ، بھائی اور ابن عم مسلم کے ساتھ بھی کیا تھا اب اگر کوئی تم سے دھوکا کھائے گا تو وہ بڑا دھوکا اٹھانے والا ہوگا تم نے (میرا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ) اپنا ہی نقصان کیا ہے، کیونکہ جو بیعت توڑتا ہے وہ اپنے کو نقصان پہنچاتا ہے اور مجھ کو عنقریب

باقی ص ۹ پر

کربلا

تاریخ اسلامی کا انقلاب آفریں موڑ

ڈاکٹر وحید اختر
پروفیسر فلسفہ، مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ (ہندوستان)

انسانی تہذیب کے بے کراں سیلِ رواں میں ان گنت واقعات، حادثات حبابوں کی طرح رونما ہوئے۔ ایک دو نفس کے لیے سر اٹھایا، پھر وقت کی موجوں میں اس طرح گم ہوئے کہ ان کا سراغ بھی نہ ملا۔ ہاں، چند واقعات نے ایسی لہریں پیدا کیں جن کا سلسلہ برسوں اور کبھی کبھی صدیوں پانی میں تموج پیدا کرتا رہا۔ ان واقعات کے پس پشت کبھی کبھی لاکھوں کے لشکر کارفرما ہوئے، کبھی چند افراد۔ سکندر کا سیل لشکرکشی ہندوستان کی سرحدوں سے ٹکرا کر پلٹ گیا۔ تاریخ نے اسے بڑے فاتح کا نام دیا۔ چنگیز اور ہلاکو کی فوجوں نے پورے ایشیا کو چین سے ترکی تک اور اطراف کے یورپی ممالک سے ایران و عرب و مصر تک بار بار تہ و بالا کیا۔ تیمور کی فوجیں یورپ کے قلب تک در آئیں، ماسکو میں پرچم لہرائے۔ تاریخ نے ان فاتحین کو تباہ کار کہا۔ افراد، جنھوں نے اپنی فکر و نظر سے سیل تاریخ کا رخ موڑا ان عظیم فاتحوں اور تباہ کاروں سے کہیں زیادہ عرصے تک تاریخ کے سینے میں دھڑکتے رہے۔ سقراط، گوتم بدھ، کنفیوشس، افلاطون، ارسطو، اور تمام فنی، سائنسدان، شعرا، ادبا اور فنکار تاریکی کے تند و سمندر میں روشنی کے مینار بن کر ابھرے۔ سیل وقت نے احترام کے ساتھ ان کے سامنے سر جھکایا اور ان کی آواز کی لہروں کو اپنے سینے میں جذب کر کے آنے والی نسلوں تک منتقل کیا لیکن روشنی کے ان سلسلوں میں ایک سلسلہ وہ ہے جس کا نور ذہن انسانی کے بجائے الوہی سرچشمہ کا فیضان تھا۔ یہ سلسلہ انبیائے کرام کا نجم نور ہے۔ ان کے انفاس قدسی کی وہ شعاعیں پھیلیں جن سے دلوں میں حرارت جگمگائی، ذہنوں میں صحیح تر یں راستے روشن ہوئے، اخلاق کا نزول ہوا، نفوس کا تصفیہ ہوا۔ ان کے سینوں میں تپنے والی وحی بعد میں آنے والی نسلوں کے اخلاق و کردار کے فانوسوں میں ہمیشہ شمع سے شمع جلتی رہی۔ یہ سلسلہ انبیا قبل سے بڑھتا پہنچی کعبہ کی بنا پڑی۔ ابراہیم و اسمٰعیل نے قربانی کی ایک اٹوٹ روایت قایم کی۔ وادی بے زراعت میں چشمۂ زمزم پھوٹا۔ دعائے خلیل نے باب اجابت دیکھا۔ ابراہیم کے شجرِ آرزو میں دو برگ و بار پیدا ہوئے کہ ذریت ابراہیم نے اسحٰق و اسمٰعیل کے وسیلے سے ہزاروں سال مستضعفینِ عالم کی رہنمائی کی۔ مصر کی ظلمات سے موسیٰ کر ہدایت کی روشنی کا راستہ دکھایا۔ موسیٰ کے عصا نے فرعون کا زعم خدائی توڑا۔ ید بیضا نے پسماندگان کو پیش رفتگی کی منزل تک پہنچایا۔ عیسیٰ نے اخلاق کا وہ درس دیا کہ مردہ ضمیروں میں نئی اخلاقی زندگی کسمسائی، دنیا کے ٹھکرائے ہوؤں کو دنیا سر کرنے کا حوصلہ ملا۔ یہ سلسلہ نور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مکمل ہوا۔ ارض کعبہ سے اذان حق کی صدا بلند ہوئی۔ حرا کی خلوت میں "اقرأ باسم ربک" کی آوازیں گونجی کہ اس کی لہروں نے بہت جلد پورے جزیرہ نمائے عرب کو اپنے سایے میں لے لیا۔ ہجرت نے مدینہ بسایا، یثرب کا ستارا چمکا کہ آفتاب رسالت نے اسے اپنا مامن و مرکز بنایا۔ عرب کے خانہ بدوش بدو، آپس میں صدیوں سے دست و گریباں قبایل، نسل و نسب کے گزیدہ اسیر اسلام کے حصار میں آکر خدائے واحد کے حضور سر بسجود ہوئے تو توحید نے ان کے ہاتھوں میں وہ عالم شکار تلوار دی کہ قیصر کا قصر لرزا، کسریٰ کا محل گرا، آتش خانوں کی آگ بجھی۔ رحمۃ للعالمین کے دامانِ کرم سے وابستہ دریدہ دامنوں اور بوسیدہ عباؤں نے قبائے شاہان اور تخت و تاج سلاطین پر اپنے قدم رکھے۔ طلوعِ اسلام کا واقعہ ایک نئی تاریخ کا آغاز ہے۔ محمدؐ کا پیغام ابدی ہے۔ ان کی رسالت تمام عالموں اور کل زمانوں کی ہدایت ہے۔ یہ سیل لشکرکشی نہیں، فتوحات کا اٹوٹ سلسلہ نہیں، سیاست کی آدم کشی نہیں، جاہ طلبی کی کشمکش نہیں۔ استحصال و استثمار کی قلعہ کشائی نہیں۔ یہ ہدایت ہے صلابتِ کردار کی اساس۔ یہ رسالت ہے حریتِ انسان و انسانیت کی ضمانت۔ اگر اس ہدایت و رسالت پر ہوسِ لشکرکشی غالب آئی۔ فتوحات نے اس کی قلبِ ماہیت کی سیاست نے اسے مکروہ مصلحت کی آماجگاہ بنایا۔ جاہ طلبی نے اسے دنیا کوشی و حاکم پرستی میں بدلا، استحصال و استثمار نے اس کے اسلحوں سے زر و مال کے قلعے غریبوں کی لاشوں پر تعمیر کیے تو نور کا یہ لافانی سرچشمہ خشک ہو سکتا تھا۔ مستضعفین جہاں کی امیدیں ہمیشہ کے لیے مر سکتی تھیں، حریت کا جذبہ دلوں میں دفن ہو سکتا تھا، صلابت کردار غلامی کی خوگر ہو سکتی تھی۔ کذب صدق پر، باطل حق پر، اندھیرا نور پر فتح پا نہ سکا تو اس کا سبب یہ تھا کہ رسالت نے اپنے پیغام کی حفاظت کے لیے ایسے افراد کی تربیت کر دی تھی جو ناساعد حالات اور امتیوں کی گمراہیوں میں بھی دعائے ابراہیم کے ثمرات کی حفاظت کر سکیں۔ اس پیغام کی ابدی بقا کو ذبح عظیم کی ضرورت تھی۔ آغوش رسالت کے کسی پروردہ کو کل پر ملتوی قربانی اسمٰعیل کا قرض ادا کرنا تھا۔ حسینؑ نے یہ قرض اپنے اور اپنے اعزا و اصحاب کے خون سے ادا کیا۔ سلسلۂ انوار انبیا کو اپنی بقا کے لیے امامت کی شہادت درکار تھی۔ اس ادائے قرض اور اس شہادت کا نام کربلا ہے۔ اگر کربلا تاریخ انسانیت کے سیل تباہ کار میں نہ ابھرتی اور اس کا رخ نہ موڑتی تو اس کا وہ دھارا جس کا نام اسلام ہے، اپنے کلمہ گویوں کی دنیا پرستی و جاہ طلبی، مستضعفین کشی و استحصال پسندی، اور توحید کے نام پر جابر و ظالم حکومت کی سجدہ گزاری کے باعث کبھی کا تاریخ کے سینے سے محو ہو جاتا۔

ظاہر بیں آنکھوں سے تاریخ پڑھیے تو کربلا چند ساعت کی مختصر سی لڑائی ہے جس میں ۷۲ یا زیادہ سے زیادہ ایک سو کچھ افراد اپنی بے سر و سامانی کے ساتھ ہزاروں کے لشکر سے ٹکرائے اور موت کی آغوش میں جا سوئے۔ ان میں وہ بوڑھے بھی تھے جنھیں سہارا دے کر گھوڑے پر بٹھایا گیا، وہ جوان بھی تھے جن کی تلواروں نے ذوالفقار سے شجاعت و عدالت کا درس لیا تھا، وہ کمسن بھی تھے جو جنگ و جدال کو کھیل سمجھ کر ماں کی گود لوریوں سے مچلتے ہوئے میدان میں آگئے تھے۔ اور ان کے پس پشت عورتوں اور معصوم بچوں کا ایک قافلہ تھا جس کی نگہبانی و سالاری کے لیے ایک بیمار رہ گیا تھا یا تیغ حق کی وارثہ دختران زہراؑ۔ اس جنگ کا موازنہ یونان و ایران کی معرکہ آرائیوں اور عرب و عجم کی لشکرکشیوں سے کیجیے تو شہید ہونے والوں کی تعداد بھی اور جنگ کی مدت کو بھی نہ ماہ و سال سے ناپیے تو برسوں اور مدتوں جاری رہنے والی جنگوں کے مقابل میں نماز صبح سے عصر تک جاری ہونے والی لڑائی کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟ خود صفین کی جنگ میں دونوں جانب ہزارہا مسلمانوں کے سر جدا، سر دار زنہار ہوئے تھے اور مہینوں معرکہ آرائی نے طول کھینچا تھا۔ پھر آخر چند گھنٹوں کی اسی مختصر لڑائی کو آج تک کیوں یاد کیا جاتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس جنگ نے لا الٰہ الا اللہ کی بنیاد مضبوط کر دی۔ رسول اکرمؐ کے سارے غزووں اور سریوں کی فتحوں پر مہر توثیق ثبت کی۔ جمل و صفین و نہروان کا آخری فیصلہ کیا، صلح حسنؑ کے معاہدے کے ساتھ

معاویہ کی ملوکیت کی پیمان شکن سیاست کا پردہ چاک کیا۔ نفاق کے چہرے سے نقاب اٹھائی اور ایمان کا چہرہ روشن کر دیا۔ اگر کربلا کی جنگ وقوع پذیر نہ ہوتی تو اسلام کی رسالت و امامت ملوکیت کے تخت تلے دب کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی ہوتی۔ اس جنگ میں ظلم کے لشکروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں تلے پامال ہو جانے والی لاشوں نے اسلام کو نئی زندگی بخشی۔ اس جنگ کے شہیدوں کی بے کفنی نے چادر تطہیر کا سایہ انسانیت کے سر سے نہ اٹھنے دیا۔ اس جنگ کے اسیروں کی مظلومی و جرأت نے مسلمانوں کو بے باکی و حق گوئی کا درس دیا، آنے والے زمانے کے آشفتہ سروں کو بتایا کہ اسیری آزادی کی تمہید ہے۔ گرفتاری، طوق و سلاسل عزت اور تخت نشینی و خون آشامی ابدی ذلت۔ کسی جنگ کی تاریخی اہمیت کا اندازہ اس میں شرکت کرنے والے افراد کی تعداد، اس میں قتل ہونے والوں کی قلت اور اس کے جاری رہنے کی مدت سے نہیں لگایا جا سکتا بلکہ اس کے فوری اور دور رس اثرات سے لگایا جاتا ہے۔ جنگ کی قاطعیت و عظمت کا یہ معیار بھی کربلا نے قائم کیا۔

اسلامی تاریخ میں کربلا کی انقلاب آفریں اہمیت کو سمجھنے کے لیے ابو الاعلیٰ مودودی کی "خلافت و ملوکیت" اور طٰہٰ حسین کی "علیؑ اور ان کے فرزند" پڑھنا کافی ہے۔ صفین میں "لا حکم الا للہ" کے نعرے نے ناگزیر شکست سے بچنے کے لیے جس طرح قرآن کو نیزوں پر بلند کیا وہ تمہید تھی اس بات کی کہ آج اگر قرآن صامت نیزے پر ہے تو کل قرآن ناطق بھی نیزے پر بلند کیا جا سکتا ہے۔

معاویہ کی وفات کے بعد صلح حسنؑ کے مطابق مسلمانوں کو اپنا خلیفہ منتخب کرنے کا حق تھا، اور اس وقت مسلمانوں کی نظر رسول اسلام کے فرزند پر تھی اسی سے وہ ہدایت کے طالب ہوئے اور اسی کو یزید کے خلاف نبرد آزما ہونے کی دعوت دی۔ اگر اس وقت فاطمہؑ کا لال گوشہ نشین رہتا، مصلحتاً بیعت کر لیتا تو خود کو اور اپنے خاندان کو ہلاکت سے بچا لیتا۔ مگر اسلام اور اس کی اقدار کو ہلاکت سے نہ بچا سکتا تھا۔ حسین علیہ السلام نے شہادت کو لبیک کہا، مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلا تک کا راستہ پیغام اسلام کی اشاعت اور ظلم کے خلاف جنگ کا سفر تھا۔ یہ جنگ عاشور کے دن بظاہر اختتام کو پہنچی۔ لیکن دراصل جاری رہی۔ کربلا کے بعد یہ جنگ کوفہ اور دمشق کے بازاروں اور درباروں میں بے کسی کے منبر سے اور مظلومیت کی زبان سے لڑی گئی۔ حسینؑ نے تو صرف اس جنگ کا آغاز کیا تھا۔ کربلا کی آواز کوفے میں زینبؑ کی زبان بن گئی۔ بعد حمد و نعت مجمع عام کو یوں مخاطب کیا:

> "اے اہل کوفہ! کیا تم ہم پر رو رہے ہو؟ تمہارے آنسو کبھی خشک نہ ہوں اور تمہارے نالے کبھی بند نہ ہوں۔ تمہاری مثال اس عورت کی سی ہے جو مضبوط دھاگہ کاتتی ہے اور پھر خود اسے توڑ دیتی ہے۔ تم نے اپنے ایمانوں کو خود دھوکا دیا، خود اپنے ساتھ خیانت کی، خود ہی ایک عہد باندھا اور اسے پھر توڑ دیا۔ تم میں کون ہے جو یہ کہ تم خودستائی، لاف و فساد اور کینہ توزی جانتے ہو۔ کنیزوں کی طرح خوشامد و تملق تمہارا شیوہ ہے۔ اور دشمنوں کی غمازی تمہارا وطیرہ۔ تم گندگی میں اگی ہوئی گھاس ہو جو کھائے جانے کے لائق نہیں۔ تم اس چاندی کی طرح ہو جو صرف قبر پر منڈھی جا سکتی ہے۔ تم نے دوسری دنیا کے لیے کتنا برا توشہ تیار کیا ہے۔ وہ توشہ جو غضب خداوندی کو دعوت دیتا اور بھڑکاتا ہے اور عذاب جاودانی کو خود تمہارے لیے فراہم کرتا ہے۔
>
> تم ہمیں قتل کرنے کے بعد ہم پر روتے ہو اور خود پر لعنت کرتے ہو؟ ہاں بخدا! بعد میں تم بہت زیادہ روؤ گے اور شاید ہی کبھی ہنس سکو کیونکہ تم نے اپنے لیے ننگ اور بدنامی و شرم کی خریداری کی ہے....."

اس خطبے میں علیؑ ابن ابی طالب کی اس سرزنش کی گونج ہے، جو آپ نے اہل کوفہ کی جنگ و جہاد میں سستی پر انھیں فرمائی تھی اور مستقبل کی پیش بینی کرتے ہوئے کہا تھا کہ "تم آج میرے ساتھ دشمن کے خلاف جنگ نہ کرو گے تو کل تمہیں دشمن کے ہاتھوں ذلیل ہونا پڑے گا۔ تمہارے گھر تاراج، تمہاری کھیتیاں برباد اور تمہاری اولاد قتل ہوگی ... اس وقت تم پچھتاؤ گے اور کہو گے کہ کاش ہم نے علیؑ کی بات سنی ہوتی اور ان کا ساتھ دیا ہوتا۔" اور واقعی ایسا ہی ہوا، علیؑ کی شہادت کے بعد اپنے ساتھیوں کی سستی اور مخالفت دیکھ کر امام حسنؑ کو صلح کرنی پڑی معاویہ نے کوفہ میں داخلے کے بعد جب تک امام حسن وہاں سے عازم مدینہ نہ ہوئے مدارات کا مظاہرہ کیا۔ لیکن اس کے بعد اہل کوفہ پر ظلم و تعدی کا دور شروع ہوا اور لوگوں نے علیؑ کو یاد کرنا شروع کیا۔ یہی پشیمانی تھی جس نے حسین ابن علیؑ کو مدینے آنے کی دعوت دی تاکہ گذشتہ سستیوں کی تلافی ہو اور ظلم سے نجات ملے۔ لیکن اموی سیاست نے ابن زیاد سے وہی کام لیا جو اس سے قبل اس کے باپ سے لے چکی تھی۔ وہ جو واقعی دوستان حسینؑ تھے، قید کیے گئے۔ قتل ہوئے اور وہ جن کے ایمان سست، وعدے کچے تھے، گھروں میں بیٹھ رہے اور پھر کونوں سے نکال کر حسین کے خلاف لڑنے کے لیے بھیجے گئے۔ جناب زینبؑ کے مختصر سے خطبے نے اہل کوفہ کو اپنے حال پر روتا دیکھ کر معاویہ و یزید کی سیاست کے نتیجے میں خود ان کی ذلت یاد دلائی اور اپنے باپ کے لفظوں میں مستقبل کی بربادی کا نقشہ پیش کیا۔ زینبؑ کے ملامت آمیز لفظوں میں اپنا نوحہ نہیں بلکہ خود امت کی گمراہی و گرفتاری کا مرثیہ ہے۔ اسلامی اصولوں سے منحرف سیاست و انتظام ملک کی تنقید ہے۔ یہ آواز تاریخ کے سینے سے نکلی ہے۔

ابو منصور طبرسی نے احتجاج میں خدام اسدی سے روایت کی ہے اس مختصر خطبے نے مجمع میں تلاطم پیدا کر دیا۔ امام زین العابدین، علی ابن الحسینؑ نے آگے بڑھ کر مجمع کو سکوت کا اشارہ کیا، قاتلوں کے خانوادوں کو ان کے ظلم یاد دلائے، کربلا میں شہید ہونے والوں کی مظلومیت بیان کی، پیمان شکنی اور مہمان کشی کے عواقب سے آگاہ کیا اور انھیں عبرت دلائی کہ تم نے رسول خدا کے دل کو زخمی کیا ہے، کیا اسی منہ سے ان کے سامنے جاؤ گے؟

یزید کے دربار میں زینبؑ کی شمشیر بیاں پھر چلی جس نے یزید کے نشے آفریدہ لاف و گزاف کی زبان قطع کر دی۔ ثانی زہراؑ کا منی طلب خفیف وقت کو دعوی دار ہے:

> "خدائے نہانیاں کی تعریف اور پیغمبر اور ان کی آل پر درود خدائے پاک و منزہ نے سچ فرمایا ہے کہ "وہ لوگ جو بدی کرتے ہیں اور جرم و زشتیاں سے اپنے دامن آلودہ کرتے ہیں انجام کار بدی ہی کو پہنچتے ہیں۔" تو اس حال کو پہنچ گیا۔ آیات خدا کی تکذیب کی اور ان کا مذاق اڑانے لگا۔ اے یزید! تو نے یہ گمان کیا کہ گویا ہم پر دنیا کی وسعت اور فضا کی پہنائی تنگ کر دی گئی ہے۔ ہمیں تو نے اسیر کر کے شہروں اور ملکوں میں پھرایا اور یہ خیال کیا کہ ہم خدا کے نزدیک بھی خوار و رسوا ہو اور تیری بزرگی میں اضافہ ہوا۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ واقعی تجھے عظمت حاصل ہو گئی ہے جو اپنے آپ پر اس طرح ناز کرتا ہے۔

اس بات پر تو خوش ہے کہ تیری دنیا آباد ہے تیرا کام مراد کو پہنچا اور تیری بادشاہی محکم ہو گئی؟ ٹھہر جا، سوچ! کیا ذرہ کے سخن کو تو نے فراموش کر دیا" جو کفر کے راستے پر چلتے ہیں گمان نہ کریں کہ انھیں دی گئی یہ چند روزہ مہلت ان کے لیے سود مند ہو گی۔ نہیں، یہ مہلت اس لیے ہے کہ وہ اپنے گناہوں میں اضافہ کریں۔ بے شک ان کے لیے عذاب و ذلت مقدر ہو چکے ہیں" اے اسلام کے احسان سے آزادی پانے والے (طلیق) کے بیٹے! کیا تو نے "انصاف سمجھا ہے کہ تیری عورتیں اور کنیزیں پردہ نشین ہوں اور پیمبرؐ کی بیٹیاں اسیر کر کے شہر بہ شہر پھرائی جائیں .... اگرچہ انقلاب زمانہ نے مجھے تیرے سامنے تقریر کرنے کے لیے لا کھڑا کیا ہے، مگر میں تجھے اس قابل نہیں سمجھتی کہ تجھ سے بات کروں اور تجھے سرزنش کروں۔ تو اس سے کہیں زیادہ پست و ادنی ہے (یعنی میرے سخن کا شایاں نہیں)۔ لیکن کیا کروں کہ ہماری آنکھوں سے اشکوں کی بارش ہو رہی ہے اور ہمارے سینے آتش غم سے بھڑک رہے ہیں آہ! کتنا عبرت ناک و عجیب ہے یہ واقعہ کہ حزب خدا کے بزرگ و سردار حزب شیطان اور طلقا کے ہاتھوں قتل ہو گئے .... شکر ہے خدا کا کہ اس نے ہمارا آغاز سعادت و آمرزش سے کیا، اور ہماری انتہا شہادت اور اپنی رحمت پر فرمائی۔

ان لفظوں کے ایجاز و ایمائیت میں اسلام کی تاریخ کا ماضی و مستقبل سمٹ ہے۔ یہ احتجاج کا درس ہے، مرثیہ خوانی کا اسلوب ہے، موعظت و پند کی بدید آمیز زبان ہے، تاریخ کے شعور کی ترجمانی ہے۔ ان خطبات کے ساتھ زینب، ام کلثومؑ، فاطمہ بنت الحسینؑ اور سب سے بڑھ کر امام علیؑ ابن الحسینؑ کی دو رسی تقریروں نے کربلا کی مظلومیت و حقانیت کی تبلیغ کا کام شروع کیا۔ ندامت کے سوؤں کے ساتھ سینوں میں ظلم کے خلاف نفرت و بغاوت کی آگ بھڑکائی بیت اطہارؑ تو اسیری سے آزادی کے بعد مدینہ رسولؐ میں سوجنگ میں مصروف و گئے لیکن ان کے حیرت آفریں صبر اور شہیدوں کے خون بے گناہ نے بہت سے جوانوں اور اسلام دوست دلاوروں کو شمشیر بکف کر دیا۔ چنانچہ ایک قابل گروہ کے بعد دوسرا گروہ میدان میں آتا رہا۔ مختار ثقفی نے خروج کیا ور قاتلان انصار و اقربا و امام کو انتقام خدا کے قہر سے دنیا ہی میں روشناس کیا۔ یزید کی ناگہانی موت کے بعد خود اس کے بیٹے معاویہ ثانی نے اس تخت پر قدم رکھنے سے انکار کر دیا جس کے پایے خون حسینؑ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اسی طرح خلافت معاویہ و یزید کی نسل سے نکل کر مروان اور اس کی آل کو ملی۔ پوری تاریخ میں ان ظالموں کو حق پرستوں نے روکا بھی اور رسوا بھی کیا۔ شاعروں کی زبانیں اور عوام کے دلوں میں آل رسول کے لیے جذبۂ عقیدت و احترام انھیں اپنی بے مایگی و ذلت کا احساس دلاتا رہا۔

کربلا کے تذکرہ خوان شعرا کی زبانیں حق کی منور شمعیں بنی رہیں۔ دعبل خزاعی نے کہا:

"چالیس برس سے میں اپنی دار کی لکڑی اپنے کاندھوں پر اٹھائے گھوم رہا ہوں لیکن اب تک وہ شخص کوئی نہیں دیا جو مجھے اس دار پر کھینچ دے۔"

دب و سعت سے تفکر کر کے اگر ما بعد کربلا تاریخ اسلام میں فکر و فلسفہ ذکر و فکر کے آغاز و ارتقا پر غور کیا جائے تو محسوس ہو گا کہ ان کی فکری سمت زندگی آفریں انداز میں قرآن و حدیث اور نہج البلاغہ میں ہے اور کربلا میں عملی صورت کی نقش بندی ہے سرکاری اداروں کا پروپیگنڈا اور اہل بیتؑ کی طرف سے حقائق کی نقاب کشائی، جبر و قدر اور حکمرانی کی مذہبی حیثیت کی نفی و اثبات، قرآن مجید کی تاویل و تفسیر، اسلام و زہد، اسلام و سیاست۔

تکبیر و تہلیل و جہاد کے فریضے کو انجام دیا جا سکتا ہے۔ یہی یک جائی اور ہم آہنگی مرثیہ گو اور مجلس خوان خطیبوں کی گرج کچھ عرصے کے بعد مزار سید الشہداؑ کربلا، پیغمبر سینیوں سے نمایاں ہوئی۔

اموی حکمرانوں کی اسلام کے نام سے لبادہ پوشی کے باوجود کافرانہ رویوں کے تضاد نے اہل عقل و ہوش کو نئے تضاد سے دوچار کر دیا۔ وظیفہ خواران دربار و طرفداران سرکار نے اس تضاد میں تاویل کا عمل شروع کیا اور آزاد فکر اہل نظر نے استدلال و عقل کا بازو تھاما۔ کہتے ہیں کہ کلام و مباحث عقائد نے کربلا کے بعد واضح طور پر خد و خال حاصل کر لیے۔

تصوف، عرفان اور للہیت ملتے جلتے اصطلاحات ہیں۔ ان میں سے کون سا نام پرانا ہے کون سا نیا؟ بحث طلب بات ہے۔ کربلا کے بعد صف نشینی کو خانقاہی نظام کی شکل دینے کے خلاف جمود و سکوت و ترک دنیا کے بدلے۔ رجوع الی اللہ، ذکر الٰہی، اور صرف اللہ سے ربط رکھنے کی ایک نمایاں سمت وہ ہے جو صحیفۂ کاملہ میں نظر آتی ہے۔ صحیفۂ کاملہ۔ صرف اور فقط وظائف و تعقیبات کا مجموعہ نہیں، اس میں توجہ الی اللہ اور فکر دین اللہ، دونوں کے روشن چراغ موجود ہیں۔ فرد۔ معاشرہ۔ حقوق خدا اور رسول ضوابط امر و نہی، طریق موت و آداب زندگی سب کا فلسفہ اور نفسیاتی ابلاغ موجود ہے۔

کربلا سیاست و سماج کی سطح پر ادب، عرفان اور فلسفہ کے وسیلے سے ہمیشہ کارفرما رہی: بنی امیہ کا زوال اور بنی عباس کا عروج کربلا کے تھمائے سے ممکن ہوا علویین کی بغاوتیں اور فاطمین کی شاندار حکومت کے قیام کا سرچشمہ کربلا ہی تھی۔ صدیوں بعد صفویوں کا ایران میں قیام و استحکام کربلا ہی کے فیض کا ایک کرشمہ ہے۔ تقیہ اور انتظار کے طویل دور کے بعد پھر کربلا ہی نے ایران میں شاہی جبر کے خلاف مسلمانوں کی بغاوت کو کامیاب کیا، کربلا کا عطا کیا ہوا جذبۂ شہادت ایران کی مسلسل جنگ دفاعی سے لے کر لبنان کے کمزور اور ستم رسیدہ لبنانی عاشقان حسینؑ تک یوں بروئے کار آیا کہ ایک طرف تو امریکہ ایسی طاقت کو شکست کھانی پڑی، دوسری طرف اسرائیل ایسی جابرانہ طاقت کو جو جدید ترین اسلحوں سے لیس تھی، لبنان کے نہتے عاشقان کربلا کے سامنے سپر ڈالنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اقبال کو شکوہ تھا کہ لاکھوں یزید ایک طرف صف آرا ہیں، مگر دوسری طرف "قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں" کون عنوان نجات کی سطر لکھے گا۔ ۱۹۷۹ء میں حسینیوں نے جواب دیا کہ کربلا کا جذبہ آج بھی سامراجی یزیدیت اور اموی انداز کی ملوکیت کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ چودہ سو سال[۱۴۰۰] کی اسلامی تاریخ میں پہلا اسلامی انقلاب کربلا ہی کو مقصود نظر بنا کر کامیاب ہو سکا۔ اس طرح کربلا میں حسینؑ اور ان کے رفقا کی شہادت، جس نے ۱۰۰ سال کے اندر اموی ملوکیت کو خون کے سیلاب میں غرق کر دیا تھا ایک بار پھر عصر حاضر کی یزیدیت یعنی سامراجیت کے ایشیا میں اثر و نفوذ کی موت کا دیباچہ بن گئی۔ ایران کے انقلاب اور لبنان میں کمزور مسلمانوں کی فتح کو کربلا کے حوالے کے بغیر سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔

کربلا نے ایک طرف تیغ اسلام اور اس کی اقدار کا تحفظ کیا اور خون حسینؑ نے ان اقدار کی بقا کی ضمانت لی، دوسری طرف کربلا نے فکر و نظر کے جادے روشن کر کے عالم اسلام کی ذہنی و علمی ترقی کا اثاثہ فراہم کیا، تیسری طرف ایسے جذبۂ آزادی کو فروغ دیا جو ہر دور میں انقلابی رجحانات و تحریکات کو اسلحے فراہم کرتا رہا۔ کربلا کا تیسرا فیضان عالم اسلام ہی سے مخصوص نہیں، تاریخ انسانیت کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ کربلا کے کثیر الجہات اثرات کو دیکھا جائے تو کربلا تاریخ اسلامی ہی کا انقلاب آفریں موڑ نہیں، تاریخ انسانیت کا وہ روشن سنگ میل بن کر ابھرتا ہے جس نے تمام انقلابوں، آزادی کی تحریکوں اور عدل و مساوات کے نظریات کے لیے

آیت اللہ العظمیٰ منتظری
ترجمہ، جناب ممتاز علی

معرفت خدا

آلات ادراک کی محدودیت۔

گذشتہ بیان میں عرض کر چکا ہوں کہ نفس انسان میں پانچ خبر رساں وسائل ہیں، جن کو حواس خمسہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ان حواس کے ذریعہ باہر کی دنیا اور مادی دنیا سے رابطہ قائم کیا جاتا ہے۔ ان حواس کو "ادوات" بھی کہتے ہیں۔ ادوات، بمعنائے آلۂ ادراک ہے جو ادات کی جمع ہے، جیسے آنکھ دیکھنے کا اور کان سننے کا آلہ ہے، ہمارے علوم ان ہی آلات کے مرہون منت ہیں اسی لئے کہا جاتا ہے "من فقد حسا فقد علما" جو حواس پنجگانہ میں سے کسی ایک سے محروم ہے تو گویا علم کا ایک راستہ اس کے لئے مسدود ہے۔

آلات ادراک جو علم و ادراک کا ذریعہ ہیں چونکہ وہ جسم ہیں اس لئے جسم ہی کو درک کرتے ہیں ان ہی کو محدود کرتے ہیں یعنی آپ کے حواس ان ہی چیزوں کی معلومات فراہم کرتے ہیں جو ان کی طرح جسم کے حامل ہیں۔ آپ اپنی آنکھوں سے ٹیلویژن کو دیکھ سکتے ہیں اس لئے کہ آنکھ بھی جسم ہے اور ٹیلویژن بھی جسم ہے۔ آپ اپنی آنکھوں سے اپنی روح اور نفس کو نہیں دیکھ سکتے کیونکہ یہ روح مجردات میں سے ہے بلاشبہ آنکھوں سے اس کا ادراک ممکن نہیں۔

"وتشیر الآلات الیٰ نظائرھا"

آلات اپنے ہی جیسی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

آپ کے، ادراک کرنے والے آلات ان ہی چیزوں کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں جو ان ہی جیسے ہیں۔ آپ اپنی انگلیوں یا آنکھوں سے ان کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں۔ لیکن خدا کی طرف اشارہ کرنا ممکن نہیں ہے اس لئے کہ ذات باری تعالیٰ ادراک کے قابل نہیں ہے۔ اس کی کنہ تک کوئی نہیں پہونچ سکتا۔ یہاں تک کہ عقل بھی جو عالم مادہ سے مجرد ہے خدا کو درک نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ عقل محدود ہے اور محدود، لامتناہی کا احاطہ کرے یہ ناممکن ہے۔

لہٰذا آلات ادراک اپنی ہی طرح کی چیزوں کا ادراک کر سکتے ہیں وہ ان چیزوں کا تعارف کرا سکتے ہیں جو جسم ہیں، ہستی غیر متناہی خدا کی معرفت نہیں عطا کر سکتی۔ خداوند عالم نہ صرف یہ کہ اجسام سے درک نہیں ہوسکتا بلکہ وہ عقل کی دسترس سے بھی باہر ہے اس لئے کہ عقل محدود ہے وہ خدا کا ادراک کرنے یا اس کی کنہ ذات تک پہونچنے سے عاجز ہے۔

میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے اس خطبہ میں بڑے دقیق فلسفی مسائل بیان کئے ہیں ہماری کوشش ہے کہ جہاں تک ممکن ہو علم فلسفہ کی صعب اصطلاحوں کو استعمال کئے بغیر مطالب کو ذہنوں تک پہونچا دیا جائے۔ اس لئے کہ معرفت خدا ہمارے تمام عقیدوں کی بنیاد ہے۔ اگر ہم خدا کو پہچان لیں گے تو ہمارے اخلاق و اعمال بھی مطابق اسلام ہو جائیں گے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو خدا کی معرفت رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ خدا ہمارے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے اور آیہ "ھو معکم اینما کنتم" کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھتا ہے وہ کبھی بھی دوسروں پر ظلم و تعدی کرے گا نہ کسی کے حق کو پامال کرے گا اور نہ کبھی ایسے کام کرے گا جو نامناسب ہوں۔

اگر کوئی نامناسب یا برا کام کرنا چاہتا ہے تو اپنے اطراف و جوانب کی طرف نگاہ کرتا ہے کہ کہیں کوئی اس کو دیکھ تو نہیں رہا ہے کہیں کوئی اس کی باتوں سے باخبر تو نہیں ہے کہ یہ چیزیں بعد میں رسوائی اور شرمندگی کا باعث ہوں ـــ لہٰذا جو انسان اس بات کا راسخ عقیدہ رکھتا ہوگا کہ اس کے تمام اعمال سب سے زیادہ اور سب سے پہلے خدا کے حضور پیش ہوتے ہیں جو دوسرے نہیں دیکھ سکتے وہ خدا دیکھ لیتا ہے تنہائی کے لمحات میں خدا اس کے ساتھ ہے۔ اس کے تمام اعمال اور سارے نیک و بد کاموں پر نگاہ رکھتا ہے۔ تو ایسا انسان ایسے عقیدہ کے بعد کبھی بھی کوئی کام انجام نہیں دے سکتا۔ معرفت خدا اس کے اخلاق، کردار اور گفتار میں اپنا اثر دکھا کے رہے گی۔

اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت اپنے خطبوں میں ہمیشہ خدا کا تعارف کراتے ہیں اور ہم کو متنبہ کرتے ہیں کہ خدا ہر حال میں حاضر و ناظر ہے اور ہمارے کاموں پر نگاہ رکھتا ہے۔

اب ہم خطبہ کے دوسرے حصہ کو بیان کر رہے ہیں۔ حضرت نے فرمایا:

منعتها (منذ) القدمية وحمتها (قد) الازلية وجنبتها (لولا) التكملة۔

انہیں (آلات کو، لفظ (منذ) نے قدیم ہونے سے منع کر دیا اور لفظ (قد) نے ہمیشگی سے روک دیا اور لفظ (لولا) نے کامل ہونے سے باز رکھا۔

اس جملہ میں حضرت امیر المومنین نے فلسفہ و ادبیات عرب دونوں ہی کو سمو دیا ہے اس جملہ میں دو احتمالات ہیں ہم خدا کی مدد سے دونوں کی تشریح کریں گے اور خواتین و حضرات سے بھرپور توجہ کے طالب ہیں۔

ادبیات عرب کے تین حروف (منذ، قد، لولا) کو حضرت نے یہاں استعمال فرمایا ہے۔

منذ

علماء نحو کا بیان ہے کہ "مذ" اور "منذ" زمانہ کی ابتدا کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اگر آپ کسی سے سوال کریں کہ آپ نے کب سے اپنے والد کی زیارت نہیں کی ہے تو مثلاً اس کا جواب ہوگا ما رأیتہ منذ یوم الجمعۃ میں نے ان کو جمعہ سے آج تک نہیں دیکھا یہاں کلمہ منذ ابتدائے زمانہ کو معین کر رہا ہے۔

قد

"قد" جب فعل ماضی پر آتا ہے تو گزرے ہوئے زمانہ کو حال سے قریب کر دیتا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ قد فعل ماضی پر تحقیق کے لئے آتا ہے" تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ گزرا ہوا زمانہ جتنا نزدیک ہوگا اتنا ہی محقق اور یقینی ہوگا مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ آپ نے فلاں شخص کو دیکھا ہے؟ ـــ اگر آپ نے جواب میں فرمایا کہ "رأیتہ" (ہاں) میں نے اس کو دیکھا ہے تو اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ دس سال پہلے آپ نے اس شخص کو دیکھا ہو ـــ لیکن اگر آپ نے جواب میں یہ فرمایا "قد رأیتہ" میں نے اسے یقیناً دیکھا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ابھی چند دنوں پہلے آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے ـــ لہٰذا معلوم ہوا کہ قد ماضی کو حال سے نزدیک کر دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

لولا

"لولا" پہلے جملہ کے وجود کے سبب دوسرے جملہ کی نفی کے لئے آتا ہے مثلاً آپ کسی کمالات کو شمار کرنا چاہیں اس کی تعریف کریں اور آخر میں کہیں کہ (لولا) اگر یہ صفت نہ ہوتی تو ہر جگہ آپ نے اس کے کمالات کے باوجود کلمۂ لولا کے ذریعہ اس کے عیب و نقص کو بیان فرمایا نمونہ کے طور پر اس قسم کا ایک جملہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں ـــ [illegible] آدمی ہے پڑھا لکھا ہے صاحب فضل و کمال ہے لولا حاسد ہے ـــ یہ لولا جو اس بات کی نفی کرتا ہے اس معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی تمام مذکورہ کمالات کی نفی لولا کے ذریعہ کی جاتی ہے۔

ان تینوں کلموں (منذ، قد، لولا) کا استعمال ان تینوں کے [illegible] خدا کے بارے میں درست نہیں ہے اس لئے کہ خدا کے لئے ابتداء و انتہا نہیں ہے کلمہ منذ کو استعمال کیا جائے۔ یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خدا مثلاً دس کروڑ سال سے موجود ہے۔ اس لئے کہ خدا زمانہ ہی نہیں رکھتا ـــ اسی طرح کلمہ "قد" کا استعمال بھی درست نہیں ہے اس لئے کہ یہ کلمہ بھی زمانہ ہی سے تعلق رکھتا ہے ماضی کو حال سے قریب کرنے کے لئے اس کلمہ کو استعمال کیا جاتا ہے ـــ کلمۂ "لولا" بھی خدا کے لئے صحیح نہیں ہے اس لئے کہ [illegible] ہے کوئی عیب اس کی ذات میں متصور ہی نہیں ہے کہ ہم اس کے لئے کہہ دیں کہ وہ تمام کمالات کا حامل ہے مگر ـــ فلاں عیب نہ ہوتا۔

دو احتمال

اب ہم ان دو احتمالات کو بیان کریں گے جن کو اکثر شارحین نہج البلاغہ نے بیان کیا ہے۔

ایک احتمال تو یہ ہے کہ "ھا" کو "منعتھا" میں آلات و وسائل ادراک کی طرف پلٹتا ہے ـــ اس صورت میں "منذ" فاعل "ھا" اس کا مفعول اول اور "القدمیۃ" مفعول دوم ہوگا ـــ [illegible]

جملہ "منعتہا منذ القدمیۃ" کا مطلب یہ ہوگا کہ کلمۂ لولا، قد اور منذ کا مفہوم آلات ادراک کے لئے متصور ہے ان کا استعمال ہم انسانوں کے لئے درست ہے مثلاً اگر یہ سوال ہو کہ آپ کب پیدا ہوئے؟ تو جواب ہوگا کہ منذ اربعین سنۃ — مثلاً ہم چالیس سال پہلے پیدا ہوئے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم قدیم نہیں ہیں محتاج زمانہ ہیں کیونکہ منذ وہ حرف ہے جو زمانہ کو معین کرتا ہے اس طرح حضرت کے جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ منذ نے ہم کو قدیم ہونے سے روک دیا اسی طرح بقیہ دو کلموں کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔

کلمۂ قد بھی ہم انسانوں ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے اور وہ اس لئے کہ ہم پابند و محتاج زمانہ ہیں — یہ کلمۂ قد نے ہمارے آلات ادراک (حواس خمسہ) کو ازلیت سے روک دیا ہے یعنی ہم ازلی نہیں ہیں اس لئے کہ ہمارا آغاز ہے اور خدا کے لئے آغاز کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔

اور کلمۂ لولا نے ہمارے آلات ادراکیہ کو کامل ہونے سے روک دیا ہے چونکہ ہمارے اندر عیوب و نقائص پائے جاتے ہیں اس لئے ہم کامل نہیں ہیں۔ جو ذات ہر عیب سے پاک ہر نقص سے مبرا اور کامل مطلق ہے وہ خدا کی مقدس ذات ہے بنابریں اس کلمۂ لولا نے ہم کو کامل ہونے سے روک دیا ہے جو ہمارے لئے استعمال ہوتا ہے۔

یہ تینوں کلمے اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ہم ازلی نہیں ہیں کامل نہیں ہیں۔

۲۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ ہم جملہ کے معنی کو خدا کے سلسلہ میں بیان کریں یعنی "القدمیۃ" "الازلیۃ" اور "التکملۃ" کو فعل کا فاعل مان لیں اور "منذ" — "قد" — اور "لولا" کو مفعول قرار دیں اس وقت حضرت کے جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ — خدا کے قدیم ہونے نے خدا کی ذات مقدس کے بارے میں کلمہ منذ کو استعمال کرنے سے روک دیا ہے" — چونکہ خدا قدیم ہے لہذا اس کی ذات کے لئے کلمۂ "منذ" کا استعمال روا نہیں ہے — اور خدا کی ازلیت نے ہم کو کلمۂ "قد" کے استعمال سے منع کر دیا ہے۔ اس کے کمال نے اس کی ذات کے سلسلہ میں کلمۂ "لولا" کے استعمال سے روک دیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ خدا کے قدیم، ازلی اور کامل ہونے نے ہم کو ان تینوں کلموں کے استعمال سے روک دیا ہے۔

بنابریں مقصود میر مؤمنین یہ ہے کہ چونکہ ان میں سے ایک کلمہ ابتدائے زمانہ کے لئے دوسرا گذرے ہوئے زمانہ کو حال سے قریب کرنے کے لئے اور تیسرا کلمہ عیب اور نقص کی نشاندہی کے لئے استعمال ہوتا ہے اس لئے ان تینوں کلموں کو خدا کیلئے استعمال کرنا درست نہیں ہے ہاں ہم انسانوں کے لئے درست ہے اس لئے کہ ہم قدیم نہیں ہیں ہمارا آغاز ہے اور ہر طرح کا عیب بھی ہمارے اندر موجود ہے لیکن خدا نہ زمانہ رکھتا ہے نہ حادث ہے اور نہ کوئی عیب اور نقص اس کے اندر پایا جاتا ہے۔

ب۔ اتجلی صانعہا للعقول

چونکہ خدا عقل، وجود، روح اور حواس و مشاعر کا خالق ہے اس لئے انہیں آلات کے ذریعہ وہ عقول کے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے۔

آلات ادراک: ذریعہ معرفت خدا

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ آلات ادراک حواس خمسہ ذائقہ، شامہ، باصرہ، سامعہ، لامسہ ہیں اور یہ حواس خدا کو درک نہیں کر سکتے اس لئے کہ خدا جسم نہیں ہے جو اسے دیکھا سنا جا سکے لیکن انہی حواس میں غور و فکر کرنے سے ہم خدا کو پہچان سکتے ہیں اور وہ اس طرح اگر ہم آنکھوں کی بناوٹ اور اس میں پوشیدہ لطیف اور باریک کاریگری پر غور کریں تو پتہ چل جائے گا کہ بڑے بڑے علماء فیزیکس PHYSIQUE نے انتھک تحقیق و جستجو کے بعد جس کاریگری اور باریکی کا ثبوت خوردبین اور دوربین کے بنانے میں دیا ہے وہ ساری فنی باریکیاں آنکھوں میں موجود ہیں صرف انسان کی آنکھوں میں نہیں بلکہ ایک چھوٹی سی چیونٹی کی آنکھوں میں بھی وہ تمام باریکیاں پائی جاتی ہیں ہم ان ہی آنکھوں سے عالم کی وسعتوں، دنیا میں موجود چیزوں اور مخلوقات خدا کا مشاہدہ کرتے ہیں لہذا باوجودیکہ ہم ان آنکھوں سے خدا کو درک نہیں کر سکتے لیکن آنکھوں کی بناوٹ میں غور و فکر کرنا خدا کی معرفت کا موجب ہے صرف آنکھیں ہی خدا کی معرفت نہیں عطا کرتیں بلکہ عالم کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی نشانیوں نیز خود انسان کے نفس میں غور و فکر کرنا معرفت خدا کے ذرائع فراہم کرتا ہے۔ انسان اپنی عقل کے سہارے یہ سمجھ جاتا ہے کہ کوئی ان چیزوں کا پیدا کرنے والا اور خالق ہے۔ خداوند عالم خود قرآن میں ارشاد فرماتا ہے: "سنریہم آیاتنا فی الآفاق و فی انفسہم" ہم دنیا میں اور خود ان کے نفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے۔

اگر حقیقت بین نگاہوں سے صرف آنکھوں کی بناوٹ پر غور کر لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اندھے اور بے شعور ذروں (ایٹم) میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ بغیر کسی بنانے والے کی مدد کے باہم مل کر خود بخود اور اتفاقی طور پر آنکھوں کو ایجاد کر دیں پس لامحالہ ماننا پڑے گا کہ اس عالم کے پس پشت کوئی صاحب قدرت ہاتھ ہے جس نے نظام عالم کو زیور وجود سے آراستہ کیا ہے اور یہ سارا عالم ایک لامتناہی صاحب ارادہ و علم و قدرت ہستی سے وابستہ ہے۔

اسی وجہ سے حضرت نے فرمایا کہ ان آلات ادراک کے ذریعہ جو بہت ہی چھوٹے اور باریک ہیں خدا کو پہچانا جا سکتا ہے وہ ذات نہیں کے توسط سے ہمارے لئے آشکار ہوتی ہے۔

وبہا امتنع عن نظر العیون

انہیں آلات کی وجہ سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ خدا کا آنکھوں سے دکھائی دینا محال ہے۔

موجودات عالم چونکہ جسم اور محدود ہیں اس لئے آنکھیں انہیں دیکھ لیتی ہیں لیکن ان موجودات کا خالق محدود نہیں ہو سکتا اسلئے ہم اس کو آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے ہم ان ہی آنکھوں کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اجسام محدود ہیں مگر ان اجسام کا خالق محدود نہیں ہوتا اس لئے کہ اگر وہ بھی محدود ہو تو ایک دوسرے پیدا کرنے والے کی ضرورت ہوگی، جو اسے پیدا کر سکے۔

بنابریں ان ہی آلات ادراک سے جن میں سے آنکھ بھی ہے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کو آنکھوں کی مدد سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ گویا حضرت یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ یہ آلات خدا کو درک نہیں کر سکتے لیکن تم کو مایوس نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ انہیں آلات کی مدد سے عقل تمہارے خالق کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

امام حسن کے ارشادات
=======================

"تم لوگوں سے اللہ بے نیاز کر دے گا۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"

ہمارے موضوع "خطبات امام حسین میں حکومت اسلامی کے نقوش" سے تو یہ آخری خطبہ ہے، کیونکہ اس کے بعد کے خطبات و ارشادات میں زیادہ تر موعظہ و ارشاد کا پہلو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

بہرحال مذکورہ بالا خطبہ سے حسب ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ "سلطان جائر" چاہے بادشاہ کے لباس میں ہو یا خلافت کا روحانی لبادہ اوڑھے ہو اس کے مظالم کے سامنے سکوت حرام ہے، اگر شرائط قدرت موجود ہوں تو اس کے خلاف اقدام کرنا چاہیے ورنہ اپنے قول سے اس کے اعمال بد سے بیزاری کا اظہار کرنا چاہیے، یہ بھی اس وقت ہے جبکہ منافی حکم تقیہ نہ ہو ورنہ بعض اوقات ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک حرف حق کہنے کی وجہ سے اپنی یا کسی دوسرے مومن کی جان بھی چلی جاتی ہے اور دین کے لیے کوئی نتیجہ بھی برآمد نہیں ہوتا۔

کہاں اقدام و قیام کرنا چاہیے، اور کہاں خاموشی اختیار کرنا چاہیے؟ یہ سمجھنا عام اشخاص کا کام نہیں ہے، اس کو تو صرف "فقیہ جامع الشرائط" ہی سمجھ سکتا ہے کیونکہ ہمارے سامنے امام حسین علیہ السلام اور امام حسن علیہ السلام دونوں اماموں کی سیرتیں موجود ہیں، تشخیص فعل امام، نائب امام برحق کا کام ہے۔

۲۔ اس خطبہ میں امام عالی مقام نے یہ بتلا دیا کہ جس حکومت کی بنیاد شیطان کی پیروی پر ہو، اور اس میں خدائی فرامین کی مخالفت کی جائے، ظلم و فساد کا رواج ہو، حدود الٰہی میں تحریف کی جائے، حلال کو حرام، حرام کو حلال کر دیا جائے وہ باطل حکومت ہے، خلافت الٰہیہ اور "حکومت اسلامی" سے اس کو دور کا لگاؤ نہیں — اور یزیدی حکومت اس کا بہت واضح نمونہ ہے۔

۳۔ "حکومت الٰہی" کی ذمہ داری کا جائز وارث امام وقت ہے، اس کی موجودگی میں یزید جیسوں کو کسی قسم کا کوئی حق نہیں۔

۴۔ ناواقف حقائق عوام کی مخالفت سے امام وقت کے فیصلے اور اقدام کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ امام براہ راست فیصلہ کرتا ہے۔ امام ان لوگوں کا ہرگز پابند نہیں جو آئے دن رائے بدلتے اور ہر ہوا کے ساتھ جگہ بدلتے ہوں۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ ہم تمہارے پابند ہیں۔ اگر تم کہو تو میں یہاں سے چلا جاؤں، کوفہ نہ سہی کربلا، کربلا نہ سہی نجف و بغداد۔ مجھے کرنا تو وہی ہے جو میری ذمہ داری ہے۔ تم کو تکلیف دینا ہمارا مقصد نہیں ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ حضرت نے کسی قسم کی کمزوری یا خوف کا اظہار فرمایا تھا۔ اس وہم کو آپ نے اس وقت دور کردیا جب اس خطبہ کے بعد حرؓ نے کہا:

«انی اذکرک اللہ فی نفسک فانی اشہد لئن قاتلت لتقتلن»

میں آپ کی جان کے بارے میں آپ کو خدا یاد دلاتا ہوں، کیوں کہ مجھ کو یقین ہے کہ اگر آپ نے جنگ کی تو آپ ضرور قتل کئے جائیں گے۔

آپ نے فرمایا "أبالموت تخوفنی" کیا تو مجھ کو موت سے ڈراتا ہے؟ اس کے جواب میں میں تجھ سے کیا کہوں سوائے اس کے کہ میں وہی اشعار پڑھے دیتا ہوں جو مرد اوسی نے اپنے چچا زاد بھائی کے سامنے اس وقت پڑھے تھے جب اس نے اس کو رسول اللہؐ کی مدد کرنے سے روکا تھا اور یہ کہا تھا کہ "این تذھب فانک مقتول" تو کہاں جاتا ہے؟ تو مار دیا جائے گا۔ اس کے بعد آپ نے یہ اشعار پڑھے:

سأمضی وما بالموت عار علی الفتی ‏ ‏ اذا ما نوی حقا وجاهد مسلما

وآسی الرجال الصالحین بنفسه ‏ ‏ وخالف مثبورا وفارق مجرما

فان عشت لم أندم وان مت لم ألم ‏ ‏ کفی بک ذلا أن تعیش وترغما

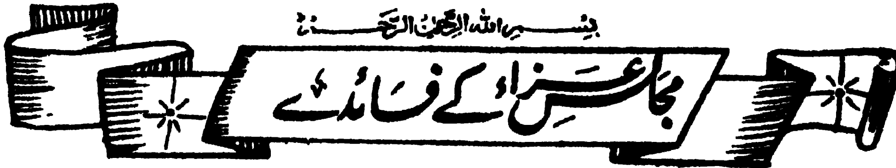
میں اپنے اسی راستہ پر چلوں گا، اور مرد آزاد کے لیے مرنے میں کوئی ذلت نہیں ہے جبکہ اس کی نیت خیر ہو، اور مسلمان ہونے کی حالت میں جہاد کرے۔ اور اپنی جان کو نیکوکار لوگوں پر فدا کردے، اور ملعون و مجرم لوگوں سے مخالفت کرے۔

بس اگر میں زندہ رہا تو مجھ کو ندامت نہ ہوگی۔ اور اگر مارا گیا تو ملامت نہ ہوگی۔ بہرحال تیرے لیے یہ ذلت کافی ہے کہ تو ایسی زندگی حاصل کرے کہ تیری ناک رگڑ دی جائے۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا اَبَا عَبْدِ اللّٰهِ الْحُسَیْنِ عَلَیْهِ السَّلَام

حضرت امام حسینؑ کی شہادت سے متعلق امام انقلاب اسلامی و بانی جمہوری اسلامی ایران نائب امام حضرت آیت اللہ العظمیٰ السید روح اللہ الموسوی خمینی مدظلہ العالی کے پیامات جو انہوں نے انقلاب اسلامی ایران کی فتح کے بعد ایام عزا کے دوران بیان فرمائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



مجالس عزاء کے فائدے

اگر ہم یہ جان لیں کہ ان مجالس عزاء کے کیا فائدے ہیں اور یہ جان لیں کہ کیوں اسلام نے ان اجتماعات کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ ان سے کس طرح کے سیاسی مسائل اور پیچیدگیوں کو حل کیا جا سکتا ہے۔ ہماری مسجدیں صرف چند بوڑھے مردوں اور سالخوردہ عورتوں کے لئے نہیں ہیں بلکہ یہاں ذی علم افراد کا اجتماع ہوتا ہے۔ عوام جمع ہوتے ہیں اور مقرر ان کے روزمرہ مسائل سے اظہار خیال کرتا ہے اور جو مسائل اور مشکلات درپیش ہیں ان کا حل بیان کرتا ہے۔ ماہ محرم صفر اور رمضان کی جو برکتیں ہیں ان کا احصا نہیں کیا جا سکتا عاشورہ محرم میں دنیا بھر کے عظیم المرتبت شہید کا تذکرہ اقوام عالم کے لئے اس قدر برکتوں کا حامل ہے کہ کوئی ان کو گنا نہیں سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مجالس عزاء اور روضہ خوانی کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت اور اہمیت ہے۔ اگر ہم پانچ کروڑ دس لاکھ ایرانی عاشورہ محرم میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عزاداری حضرت سید الشہداؑ کا موقع ملا ہے اور آئمہ اطہارؑ نے عزاداری کی تاکید کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے عزاداری کا بے حساب ثواب رکھا ہے۔ اگر سارے ایرانی جمع ہوں اور مجالس عزا منعقد کریں اور ذاکرین ان مجلسوں میں عوام کے روزمرہ مسائل بیان کریں اور واقعات کربلا اور امام مظلومؑ پر گریہ کریں یہ ایک فرض ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم پر عائد کیا گیا ہے۔ عاشورہ محرم کا برپا کرنا حیات ملت کے لئے عبادت بھی ہے اور سیاسی مسائل کا حل بھی ہے۔ عزاداری اس شہید اعظم کی ہوتی ہے جس نے ساری متاع حیات اسلام کی زندگی کے لیے راہ حق میں لٹا دی۔ ہم امام حسینؑ پر آنسو بہاتے ہیں اور آنسوؤں کے سیلاب سے اسلام کے خلاف جو دیواریں کھڑی کی گئی ہیں ان کو مسمار کردیں گے۔

محرم اور صفر بڑی برکتوں کے مہینے ہیں یہ اسلام کو زندہ رکھنے والے مہینے ہیں۔ ان مہینوں کو زندہ رکھنا چاہیئے کیونکہ مذہب تشیع انہی مہینوں میں مصائب اہل بیت اطہارؑ کے ازکار مرثیہ خوانی اور روضہ خوانی سے اب تک زندہ ہے۔

مراسم عزاداری کو انتہائی جوش و خروش کے ساتھ زندہ رکھنا چاہیئے ان اسلامی سنتوں کو جاری رکھو میں تاکید کرتا ہوں کہ محرم صفر میں یہ دستو قدیم ماتمی دستوں کے جلوس بڑے تزک و احتشام سے نکالیں۔

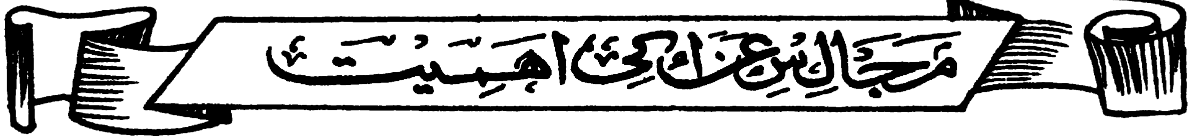
محرم اور صفر یہ دو مہینے جنہوں سے اسلام کے محافظ ہیں۔ یہ حضرت سید الشہداؑ کی فداکاری کا نتیجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات ایک زندہ حقیقت کی طرح ہم کو ورثے میں ملی ہیں۔ اور عاشورہ کی روایات کو زندہ رکھنا علماء اور ذاکروں کا فرض ہے اور عوام پر لازم ہے کہ حسب عمل در آمد قدیم عزاداری کا اہتمام کریں اور ماتمی دستوں کو منظم کریں۔ عزاداری ملت کی زندگی کو سنوارنے اور ابھارنے کی روایات کی آئینہ ہے۔

مراسم عزاداری کی بپا آوری میں اضافہ ہو تو تاثیر اور زیادہ کارگر ہو۔ ذاکروں کو چاہیئے کہ صحیح روایات کے مطابق روضہ خوانی کریں، مرثیہ خوانی کریں اور عوام کے دلوں میں فداکاری کے جذبہ کو بیدار کریں۔
حضرت سید الشہداءؑ کا مقدس لہو مسلمانوں کے سینوں کو گرماتا ہے۔ ان میں احساسات شجاعت و شہامت کی تجلیاں پیدا کرتا ہے۔ روز عاشورا ماتمی دستے ہر محفل والے کے دلوں میں ہیجان پیدا کرتے ہیں اور ان کو اسلام اور اسلامی مقاصد کی حفاظت و صیانت پر آمادہ کرتے ہیں۔

مسلمانوں کو روز عاشورا سابقہ روایتوں کے مطابق منانا چاہیئے۔ عزاداری کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ نوحہ خوانی اور سینہ زنی سے عالم افکار میں زلزلہ برپا ہونا چاہیئے کیونکہ ملت کا وجود مجالس عزا، روضہ خوانی اور ماتم داری پر منحصر ہے۔

ذاکروں پر لازم ہے کہ وہ اخلاقی مسائل، اعتقادی مسائل اور تہذیب نفس کے مسائل بیان کریں اور عوام کو ان مسائل پر عمل کرنے کی ہدایت کریں اور آخر میں مصائب حضرت سید الشہداءؑ اشارے کرتے میں نہیں شرح و بسط کے ساتھ پڑھیں روضہ خوانی عمل در آمد قدیم کے مطابق ہونی چاہیئے۔ مرثیے پڑھیں جن میں اہل بیت اطہارؑ کے فضائل اور مصائب نثر و نظم میں سنائے جائیں تاکہ لوگ تیار رہیں۔ متاثر رہیں اور جوانان کے حملے آئندہ زندگی میں اسلام کی اشاعت کرتے ہیں۔

انہوں نے خود کو اسلام پر فدا کر دیا اور ظالموں سے تعاون نہیں کیا۔ عوام کو ان کے فرائض سے واقف کرایا جائے اور بتایا جائے کہ روایتی جلوس صرف ماتمی دستوں کی شکل میں ہو۔ مراسم عاشورا کو زندہ رکھو عاشورہ کے اہتمام سے تمہارا ملک آفات و بلیات سے محفوظ رہے گا۔



مجالس عزاداری کی اہمیت بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ روایات میں ہے کہ مظلوم کربلاؑ کے غم میں ایک آنسو کی اس قدر اہمیت ہے حتیٰ کہ صرف رونے کی شکل بنانے کو بھی بڑی اہمیت دی گئی ہے اس لئے نہیں کہ سید مظلومانؑ کو اس کی ضرورت اور اس لئے بھی نہیں کہ ہمارے اور دوسرے مسلمانوں کے لئے صرف ثواب کی حد تک ہو' اگرچہ یہ سب کچھ ثواب عظیم ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہوگا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ان مجالس عزا کے لئے اتنا بڑا ثواب مقرر کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ رونے کی شکل بنانے کا اتنا بڑا ثواب ہے۔ اس مسئلہ کی اہمیت آہستہ آہستہ معلوم ہو رہی ہے اور ان شاء اللہ آگے چل کے اور زیادہ معلوم ہوگی۔ عزاداری مجالس عزاء اور نوحہ خوانی پر اتنا بڑا ثواب، عبادت اور روحانیت کے علاوہ سیاسی پہلو بھی رکھتا ہے۔ جن دنوں یہ روایت وارد ہوئی ہیں ان دنوں شیعہ، اموی اور زیادہ تر عباسی حکومتوں کے غیض و غضب کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ ایک چھوٹی سی تعداد (شیعہ) اتنی بڑی حکومتوں کے برابر تھی اس وقت اس محدود تعداد کو منظم کرنے اور اس کی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لئے ایک راہ بتائی گئی جو وحی کے ذریعہ سے بیان کی گئی۔ ان ذریعوں نے بتایا کہ ان مجالس عزاء کی اس قدر عظمت ہے۔ آنسوؤں کا اس قدر ثواب ہے۔ ان فرمائشات کے پیش نظر اس وقت کے شیعہ آپس میں مل بیٹھے۔ تاریخی طور پر یہ مجالس عزاء اسلامی ممالک میں شیعوں کو آپس میں منظم کرنے کا ایک بہترین ذریعہ چلی آرہی ہے۔ اور خاص طور پر ایران میں جو کہ تشیع اور اسلام کا گہوارہ ہے جب بھی کوئی حکومت اسلام اور علمائے اسلام کی بیخ کنی چاہتی یہی مجالس عزاء اور ماتمی دستے تھے جو ان کے آڑے آجاتے اور ایسا اقدام کرنے سے باز رکھتے۔

جب پہلی مرتبہ مجھے قم سے گرفتار کرکے لے جانے لگے تو گاڑی میں سوار ایک ملازم نے مجھے کہا ہم قم میں آپ کو گرفتار کرنے گئے تو ان ماتمیوں کے دستوں سے ہمیں بہت ڈر لگا۔ مبادا انھیں علم ہو جائے اور ہم اپنا کام انجام نہ دے سکیں۔ یہ تو خیر کچھ بھی نہیں دنیا کی تمام بڑی طاقتیں بھی ان ماتمی دستوں سے ڈرتی ہیں۔ مجالس عزاء کو منظم کرنے کے لئے کسی ایک فرد کی ضرورت نہیں بلکہ ایک وسیع و عریض ملک میں ایام عاشورہ محرم و صفر کے مہینوں اور ماہ رمضان میں خود بخود منظم ہو جاتی ہیں۔ یہی مجالس عزا ہی تو ہیں جنھوں نے لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کیا ہوا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اسلام کی خدمت کرنا چاہتا ہے تو مجالس عزا کے ذریعہ کر سکتا ہے۔ بات جب ایک مرتبہ عوام کے کانوں تک پہونچ جائے لوگ اس خدائی پرچم اس حسینیؑ علم کے نیچے خود بخود جمع ہو جاتے ہیں

اہل بیت اطہارؑ نے ابتدائے اسلام میں مجالس عزاء کی اس طرح بنیاد ڈال دی ہے جو قیامت تک باقی رہے گی۔ اور وہ ایک پرچم اور عقیدہ کے تحت اجتماع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنا سید الشہداءؑ کی عزاداری مؤثر ہے دنیا کی کوئی چیز اس قدر اثر نہیں رکھتی۔ آج ایران پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہیں بڑی طاقتوں کی طرف سے سازشیں کی جا رہی ہیں' ان حملوں اور سازشوں کو صرف سید الشہداءؑ کی عزاداری ہی ناکام بنا سکتی ہے۔ اگر مخالفین عزاداری کو اس عزاداری سید الشہداءؑ رونے اور رلانے کا فلسفہ معلوم ہو جائے تو وہ ہمیں رونے والی قوم کہنے کی بجائے شجاع و دلیر قوم کہیں گے۔

obey him is to obey me The Imam after him is his son, Hasan His command is the command of his father, his word is the word of his father, to obey him is to obey his father ' After these words the Imam remained silent I said to him, 'Oh son of the Prophet who will be the Imam after Hasan?' The Imam cried hard, then said Verily after Hasan his son is the awaited Imam who is "al-qā im bi'l ḥaqq' (He who is supported by the Truth) ' "[103]

Musa ibn Ja'far Baghdādī said, "I heard from the Imam Abu Muhammad al Hasan ibn Ali [the eleventh Imam] who said, 'I see that after me differences will appear among you concerning the Imam after me Whoso accepts the Imams after the Prophet of God but denies my son is like the person who accepts all the prophets but denies the prophethood of Muhammad, the Prophet of God upon whom be peace and blessing And whoso denies [Muhammad] the Prophet of God is like one who has denied all the prophets of God for to obey the last of us is like obeying the first and to deny the last of us is like denying the first But beware' Verily for my son there is an occultation during which all peopl will fall into doubt except those whom Allah protects "[104]

The opponents of Shi'ism protest that according to the beliefs of this school the Hidden Imam should by now be nearly twelve centuries old whereas this is impossible for any human being In answer it must be said that the protest is based only on the unlikelihood of such an occurrence not its impossibility Of course such a long lifetime or a life of a longer period is unlikely But those who study the hadiths of the Holy Prophet and the Imams will see that they refer to this life as one possessing miraculous qualities Miracles are certainly not impossible nor can they be negated through scientific arguments It can never be proved that the causes and agents that are functioning in the world are solely those that we see and know and that other causes which we do not know or whose effects and actions we have not seen nor understood do not exist It is in this way possible that in one or several members of mankind there can be operating certain causes and agents which bestow upon them a very long life of a thousand or several thousand years Medicine has not even lo t hope of discovering a way to achieve very long life spans In any case such protests from peoples of the Book such as Jews, Christians and Muslims are most strange for they accept the miracles of the prophets of God according to their own sacred scriptures

The opponents of Shi'ism also protest that although Shi'ism considers the Imam necessary in order to expound the injunctions and verities of religion and to guide the people the occultation of the Imam is the negation of this very purpose for an Imam in occultation who cannot be reached by mankind cannot be in any way beneficial or effective The opponents say that if God wills to bring forth an Imam to reform mankind He is able to create him at the necessary moment and does not need to create him thousands of years earlier In answer it must be said that such people have not really understood the meaning of the Imam, for in the discussion on the imamate it became clear that the duty of the Imam is not only the formal explanation of the religious sciences and exoteric guidance of the people In the same way that he has the duty of guiding men outwardly, the Imam also bears the function of walayat and the esoteric guidance of men It is he who directs man s spiritual life and orients the inner aspect of human action toward God Clearly his physical presence or absence has no effect in this matter The Imam watches over men inwardly and is in communion with the soul and spirit of men even if he be hidden from their physical eyes His existence is always necessary even if the time has not as yet arrived for his outward appearance and the universal reconstruction that he is to bring about

CONTINUED FROM PAGE NO (1)

Ommayed ruler wanted him to endorse his anti Islamic rule by pleading allegiance No! No No Hussain (AS) He was surrounded by Yazid's army it was the desert of Karbala He lost his friends and family all butchered right before his eyes There he stood all alone completely worn out physically withered and lean pale and thin on the sand of Karbala a daring feat it was It required much more than robust energy more than enduring vitality more than unyielding will more than patience it required a firm belief

In this cause and in Allah itself A belief that is the foundation of Islam He was slaughtered mercilessly but his mission survived the revolution of Muhammad (SAW) was rekindled Hope was revived courage reinstilled in masses By martyring Hussain (AS) and plundering his family Yazid assured his own defeat It is more than thirteen centuries and Hussain (AS) is still the source of inspiration for humanity at large

Divine Justice

Hussain (AS) did not die in vain The mission for which he laid down his life gained strength till the Ommayed powers finally crumbled down The tragedy of Karbala shook the foundations of the empire which had been built up with such foresight and tact The Karbala tragedy made Yazid the most hated man of the Muslim world

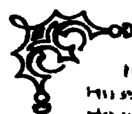
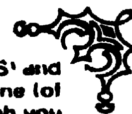
Hussain's prophetic words uttered a little before he was martyred also proved literally true His enemies were soon punished in a manner they had never dreamed of He himself was exalted to a height which has become the envy of all good men He reached this height because he was the embodiment of the true spirit of Islam

The life and character of Imam Hussain (AS) his struggle against the forces of darkness and tyranny and the glorious example of his martyrdom have been a source of inspiration and spiritual strength to people through the succeeding centuries The bright light of his self sacrifice shines through the intervening years illuminating the path to Truth and calling men to selfless struggle against falsehood and oppression in the defence of the true faith This light is especially needed in the dark times in which we live for it shows that the inevitable victory of Truth over Falsehood can only come through selfless sacrifice and the witholding of nothing in the struggle against evil

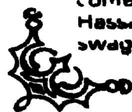
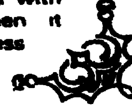
The impact of life of Imam Hussain (AS) and the model of his martyrdom is deeply felt throughout the Islamic world irrespective of other superficial differences The power of his example transcends all differences affects the innermost part of people s hearts and unifies all believers in their common cause of struggle against the dark forces of falsehood The light of his example has deeply affected people from outside the Islamic world for the message it illuminates is universal Allah s peace and blessing be on Muhammad (SAW) and his descendents

Because of Hussain there is painful sweetness in the song of life
And from Hussain the righteous have heard the lesson of freedom

IQBAL
The Poet of the East

The Messenger of Allah said Hassan (AS) and Hussain (AS) are the ornaments of the throne (of Heaven) Indeed Heaven itself said, O Allah you have filled me with weak and poor inhabitants Allah the Exalted replied to it Are you not content that I have adorned your corners with Hassan (AS) and Hussain (AS)? Then it swaggered as a bride swaggers with happiness

The Eleventh Imam

Imam Hasan ibn Ali 'Askari, the son of the tenth Imam, was born in 232/845 and according to some Shi'ite sources was poisoned and killed in 260/872 through the instigation of the Abbasid caliph Mu'tamid.[93] The eleventh Imam gained the imamate, after the death of his noble father, through Divine Command and through the decree of the previous Imams. During the seven years of his imamate, due to untold restrictions placed upon him by the caliphate, he lived in hiding and dissimulation (*taqiyah*). He did not have any social contact with even the common people among the Shi'ite population. Only the elite of the Shi'ah were able to see him. Even so, he spent most of his time in prison.[94]

There was extreme repression at that time because the Shi'ite population had reached a considerable level in both numbers and power. Everyone knew that the Shi'ah believed in the imamate, and the identity of the Shi'ite Imams was also known. Therefore, the caliphate kept the Imams under its close supervision more than ever before. It tried through every possible means and through secret plans to remove and destroy them. Also, the caliphate had come to know that the elite among the Shi'ah believed that the eleventh Imam, according to traditions cited by him as well as his forefathers, would have a son who was the promised Mahdi. The coming of the Mahdi had been foretold in authenticated hadiths of the Prophet in both Sunni and Shi'ite sources.[95] For this reason the eleventh Imam, more than other Imams, was kept under close watch by the caliphate. The caliph of the time had decided definitely to put an end to the imamate in Shi'ism through every possible means and to close the door to the imamate once and for all.

Therefore, as soon as the news of the illness of the eleventh Imam reached Mu'tamid, he sent a physician and a few of his trusted agents and judges to the house of the Imam to be with him and observe his condition and the situation within his house at all times. After the death of the Imam, they had the house investigated and all his female slaves examined by the midwife. For two years the secret agents of the caliph searched for the successor of the Imam until they lost all hope.[96] The eleventh Imam was buried in his house in Samarrah next to his noble father.

Here it should be remembered that during their lifetimes the Imams trained many hundreds of scholars of religion and hadith, and it is these scholars who have transmitted to us information about the Imams. In order not to prolong the matter, the list of their names and works and their biographies have not been included here.[97]

The Twelfth Imam

The promised Mahdi, who is usually mentioned by his title of Imâm-i 'Aṣr (the Imam of the "Period") and Ṣāḥib al-Zamān (the Lord of the Age), is the son of the eleventh Imam. His name is the same as that of the Holy Prophet. He was born in Samarrah in 256/868 and until 260/872 when his father was martyred, lived under his father's care and tutelage. He was hidden from public view and only a few of the elite among the Shi'ah were able to meet him.

After the martyrdom of his father he became Imam and by Divine Command went into occultation (*ghaybat*). Thereafter he appeared only to his deputies (*nā'ib*) and even then only in exceptional circumstances.[98]

The Imam chose as a special deputy for a time Uthman ibn Sa'īd 'Umarī, one of the companions of his father and grandfather who was his confidant and trusted friend. Through his deputy the Imam would answer the demands and questions of the Shi'ah. After Uthman ibn Sa'id, his son Muhammad ibn Uthman Umari was appointed the deputy of the Imam. After the death of Muhammad ibn Uthman, Abu'l Qāsim Husayn ibn Rūḥ Nawbakhtī was the special deputy, and after his death Ali ibn Muhammad Simmarī was chosen for this task.[99]

A few days before the death of Ali ibn Muhammad Simmari in 329/939 an order was issued by the Imam stating that in six days Ali ibn Muhammad Simmari would die. Henceforth the special deputation of the Imam would come to an end and the major occultation (*ghaybat-i kubrā*) would begin and would continue until the day God grants permission to the Imam to manifest himself.

The occultation of the twelfth Imam is, therefore, divided into two parts: the first, the minor occultation (*ghaybat-i ṣughrā*) which began in 260/872 and ended in 329/939, lasting about seventy years; the second, the major occultation which commenced in 329/939 and will continue as long as God wills it. In a hadith upon whose authenticity everyone agrees, the Holy Prophet has said, "If there were to remain in the life of the world but one day, God would prolong that day until He sends in it a man from my community and my household. His name will be the same as my name. He will fill the earth with equity and justice as it was filled with oppression and tyranny."[100]

On the Appearance of the Mahdi

In the discussion on prophecy and the imamate it was indicated that as a result of the law of general guidance which governs all of creation, man is of necessity endowed with the power of receiving revelation through prophecy, which directs him toward the perfection of the human norm and the well-being of the human species. Obviously, if this perfection and happiness were not possible for man, whose life possesses a social aspect, the very fact that he is endowed with this power would be meaningless and futile. But there is no futility in creation.

In other words, ever since he has inhabited the earth, man has had the wish to lead a social life filled with happiness in its true sense and has striven toward this end. If such a wish were not to have an objective existence it would never have been imprinted upon man's inner nature, in the same way that if there were no food there would have been no hunger. Or if there were to be no water there would be no thirst and if there were to be no reproduction there would have been no sexual attraction between the sexes.

Therefore, by reason of inner necessity and determination the future will see a day when human society will be replete with justice and when all will live in peace and tranquillity, when human beings will be fully possessed of virtue and perfection. The establishment of such a condition will occur through human hands but with Divine succor. And the leader of such a society who will be the savior of man, is called in the language of the hadith, the Mahdi.

In the different religions that govern the world such as Hinduism, Buddhism, Judaism, Christianity, Zoroastrianism and Islam there are references to a person who will come as the savior of mankind. These religions have usually given happy tidings of this coming, although there are naturally certain differences in detail that can be discerned when these teachings are compared carefully. The hadith of the Holy Prophet upon which all Muslims agree, "The Mahdi is of my progeny," refers to this same truth.

There are numerous hadiths cited in Sunni and Shi'ite sources from the Holy Prophet and the Imams concerning the appearance of the Mahdi, such as that he is of the progeny of the Prophet and that his appearance will enable human society to reach true perfection and the full realization of spiritual life.[101] In addition, there are numerous other traditions concerning the fact that the Mahdi is the son of the eleventh Imam, Hasan al-'Askari. They agree that after being born and undergoing a long occultation the Mahdi will appear again, filling with justice the world that has been corrupted by injustice and iniquity.

As an example, Ali ibn Musa al-Riḍa (the eighth Imam) has said, in the course of a hadith, "The Imam after me is my son, Muhammad, and after him his son Ali, and after Ali his son, Hasan, and after Hasan his son Ḥujjat al-Qā'im, who is awaited during his occultation and obeyed during his manifestation. If there remain from the life of the world but a single day, Allah will extend that day until he becomes manifest, and fill the world with justice in the same way that it had been filled with iniquity. But when? As for news of the 'hour,' verily my father told me, having heard it from his father who heard it from his father who heard it from his ancestors who heard it from Ali, that it was asked of the Holy Prophet, 'Oh Prophet of God, when will the "support" (qa'im) who is from thy family appear?' He said, 'His case is like that of the Hour (of the Resurrection). "He alone will manifest it at its proper time. It is heavy in the heavens and the earth. It cometh not to you save unawares" (Quran, VII, 187).'"[102]

Ṣaqr ibn Abī Dulaf said, "I heard from Abu Ja'far Muhammad ibn Ali al-Rida [the ninth Imam] who said, 'The Imam after me is my son, Ali; his command is my command; his word is my word; to

Hussain (AS)

The saviour of Islam the embodiment of self sacrifice self denial and selflessness

A few days before the birth of Hussain Ommul Fadhl the wife of Abbas Ibne Abdul Muttalib dreamt that a bit of flesh flew from the body of the Holy Prophet and fell in her lap When referred to the Holy Prophet (SAW) interpreted the dream telling Ommul Fadhl that A son will be born to my daughter Fatema (AS) and the baby will be given to you for nursing This explanation made Ommul Fadhl very happy She eagerly waited for the happy day when her dream was going to be realised

At last the great day came On Thursday the 3rd of Shaban in the fourth year of Hijrat i e the migration of the Holy Prophet from Mecca to Medina Hussain (AS) was born with supernatural signs which have usually accompanied the birth of some chosen ones of Allah

Hussain s Martyrdom prophesied

When Hussain was born Gabriel the Messenger Angel appeared before the Holy Prophet and after paying his respects to the Prophet (SAW) said O the Most beloved one of Allah the Almighty presents His blessings and felicitations to thee and wills that thou should t felicitate Ali and Fatema on the birth of the Baby be named Hussain for he is known in heavens in this name

The Angel continued saying O Prophet of Allah it is for the newly born son of Fatema (AS) who will suffer innumerable difficulties miseries wounds and pains that I feel concerned He will at last be martyred with all his faithful supporters in a desert called Karbala on the banks of the Euphrates in Iraq it will be a crisis and the existence of this revealed religion for Mankind will rest upon the sacrifices of Hussain your grandson

Hearing this the Holy Prophet (SAW) naturally felt sorrowful

Immediately after the birth of Hussain (AS) Fatema was indisposed and the Holy Child was given to Ommul Fadhl for nursing and for forty days consequently the great Messenger of Allah used to place his holy finger in the mouth of the innocent and thus the child was sustained for forty days without anything else It is inferred by great divines that it was the pre determined Divine Process to condition the holy child with the divinity endowed in the apostolic physic of its Holy Grandfather the Chief and the Last of the Messengers of Allah for Hussain (AS) had to play the apostolic role on behalf of his Grandfather to save the Truth Islam

Hussain a Duplicate of Muhammad

Historians report that besides the native endowments identical with those of the Holy Prophet (SAW) the outward appearance (i e physical features) of Hussain was a moving picture of his Grandfather the Holy Prophet (SAW)

Ibne Katheer says I never saw a more beautiful man than Hussain The function of heredity had its full play in Hussain (AS) He had inherited all the divine native endowments from his Grandfather the Holy Prophet (SAW) and his divine parents Ali (AS) and Fatema (AS)

The Holy Prophets Personal Regard for Hussain (AS)

Prophet Muhammad (SAW) has said about his two grandsons Hassan (AS) and Hussain (AS)

Oh Allah I love both of them Therefore love them and love whoever loves them Whoever loves Hassan (AS) and Hussain(AS) is one whom I love Whomever I love Allah loves and whomever Allah loves He will have cause to enter Heaven Who ever hates them I hate and Allah hates Whomever Allah hates He will cause to enter the Fire Then he said These two sons of mine are my two plants of sweet basil (to sweeten) the world

The Prophet (SAW) had abounded love for his two grandsons Hassan (AS) and Hussain (AS) The mere sight of them filled his heart with joy It was to get this joy that he daily visited Fatema s house He usually took with him something for them to eat and fed them with his own hands He sat them on his knees and caressed them with extreme fondness He liked to see them cheerful The slightest sign of distress from them made him unhappy One day as he passed by Fatema s (AS) house he heard Hussain crying This made him feel uneasy Stepping inside he said What makes my dear one cry Fatema? Don t you know that his weeping distresses me?

It is also one of the universally acknowledged events of the life history of the Holy Prophet (SAW) that once when he was prostrating in prayer in the mosque Hussain (AS) came and getting over the back of his Grandfather the Holy Prophet (SAW) sat on it The Holy Prophet (SAW) repeated the prayer phrase Subhaana Rabbiyal a la wa behamdeh seventy times in the state of prostration instead of the only three prescribed repetitions until Hussain (AS) himself of his own accord got down from his back and then he raised his head from the prostration After the prayer was over people asked Messenger of Allah How is it that one of the prostrations took up so much time? Were you receiving a revelation? The Holy Prophet (SAW) replied that he had to do it until Hussain (AS) got down from his back of his own accord the Messenger of Allah acteth not but in the Revealed Will of Allah

It is reported that once the Holy Prophet (SAW) was on the pulpit of the Mosque in Medina giving a sermon when Hussain (AS) who was yet a child entered the Mosque and proceeded towards his Grandfather and his garment got twisted in his feet the Holy Prophet (SAW) stopped the sermon and rushed from the pulpit to the child lest he might fall

Hussain (AS) was only seven and a half when the Prophet (SAW) passed away This was a very severe shock to him as well as to his elder brother Hassan (AS) So far the two had been brought up under the loving care of their fond Grandfather The security of this love was no longer there This had a visible effect on the natural cheerfulness of the two brothers

Six months later Fatema (AS) also passed away leaving Hassan and Hussain without motherly love (Ali (AS) was an exceedingly kind father He did all he could do to make up for the motherly love

Despite all his efforts a slight gloom seemed to hang on them No longer were they their old selves bubbling with boyish activity The education of Hussain (AS) began at home He learned how to read and write He grew up in the most stimulating environments His parents were the models of human virtue He belonged to the holiest family and passed his time in an ideal home His father Ali(AS) was the bravest and the most learned man of his time His mother was the noblest lady that ever lived These factors provided young Hussain (AS) with an environment which no youngster ever had Slowly but surely his growing mind absorbed the family traditions of exalted virtue unflinching truthfulness and unbounded love for Allah and mankind In course of time he grew up to be the noblest youth of Islam

Salman e Farsi says I saw one day Hussain (AS) seated beside his Grandfather the Holy Prophet (SAW) who was addressing Hussain (AS) saying You are a Syed (Chief) son of a Syed and the father of the Syeds You are an Imam (Heavenly guide) son of an Imam the father of an Imam

The following is the famous saying of the Holy Prophet (SAW) Hassan and Hussain are the two youths of Paradise (divinely commissioned guides) in all circumstances

The instances of the open acts of the heavenly regard for the Ahlul Bait demonstrating their unique divine position are so many that volumes will be needed to enumerate them all These few brief references will do to bring home to any sincere person the idea about the unique excellences and the greatness of the holy souls and the degree of the divinity endowed in them

The Imamate of Hussain (AS) was confirmed after the death of his brother Hassan (AS) and the obedience of all creatures to him was binding although he did not summon them to follow him because of precautionary dissimulation (taqiyya) which he was following and because of the truce which existed between him and Muawiya ibn Abi Sufyan and the need to fulfill it In that he followed the same course as his father Ali (AS) in terms of the establishment of his Imamate after the Prophet (SAW) despite (his own) silence (about it) and also of the Imamate of his brother after the truce despite (his) abstention (from politics) and (his) silence In that they were acting according to the practices of the Prophet of Allah (SAW) when he was blockaded in al Shib and when he escaped Mecca as an immigrant by hiding in a cave and he was hidden from his enemies

The Imamate of Hussain

Like his great father Hussain (AS) was a dauntless soldier He had such an overpowering passion for Truth that he never made the slightest compromise with Falsehood In this he was very different from his elder brother Hassan who was peace loving

Hussain (AS) was a young man of twenty when Osman became Caliph The North African campaign began shortly afterwards Hassan and Hussain (AS) took part in this holy war They also joined the army that conquered Tabristan

Hussain (AS) took a notable part in all the battles fought during Ali s (AS) Caliphate He fought fearlessly in the battles of Jamal Siffin and Nehrwan

The most striking feature of Hussain (AS) was his passion for communion with Allah He spent the last night of his earthly life in earnest prayer and supplication On the following day the one thing he did not forget even with death staring him in the face was his prayers Thus Hussain (AS) showed by his immortal example how a Muslim should be concerned more about things spiritual than the things of this world

The history of mankind is a chain of successful and failing revolutions one replacing another only to be replaced by yet another Revolutions have always been a tool of evolution A sure sign that change must occur The message of Mohammad (SAW) was in the true sense a word of revolution

It gave mankind a new vision a new sense of purpose it was the message of peace and goodwill of love and tolerance in a society where hatred corruption and lust of power ruled high It was beyond social cultural and geographical barriers

It perceived all human beings to be one originating from the one creator And yes difficult though it was Mohammad (SAW) did succeed in creating a society based upon the values he preached But alas within a brief period of less than half a century after his death the society he had conceived crumbled the values he held dear were lost By careful manipulation and shrewd planning those who opposed him during his life grasped the power Their rule was a reign of terror The oppressive authority of Banuommaya was bent upon systematically dismantling Islamic jurisprudence

It seemed that no one would be able to challenge the oppressors The situation demanded timely action otherwise the shariat of Mohammad (SAW) was bound to be doomed and the sacrifices made for it would have come to naught If Muhammad s (SAW) message was right someone had to take a stand Hussain (AS) the grandson of Prophet stood up Yazid the

CONTD.ON PAGE 3

BASHEER-W-NAZEER

Weekly



من خطبة العقيلة زينب سلام الله عليها

وَيلكُم يا أَهلَ الكوفة، أتدرون أيَّ
كَبِدٍ لِرَسولِ اللهِ فَرَيتُم وأيَّ كَريمةٍ لَه
أبرَزتُم، وأيَّ دَمٍ لَه سَفَكتُم، وأيَّ حُرمةٍ
لَه انتَهَكتُم، لَقَد جِئتُم شَيئاً إدّاً،
تَكادُ السَّمٰواتُ يَتَفَطَّرنَ مِنهُ وَتَنشَقُّ
الأرضُ وتَخِرُّ الجِبالُ هَدّاً .

Woe to you, O people of Kufah! Do you realize what heart of the Prophet of God (S) you have cut into pieces? What dignified ladies of his household you have unveiled! What sacred blood of his you [illegible]! What sanctities of him you have violated! You have [illegible] something hideous! The heavens are well nigh [illegible] because of it and the earth split asunder and the mountains well nigh fall down crashing!

From [illegible] Zaynab [illegible] address [illegible] the people of Kufah

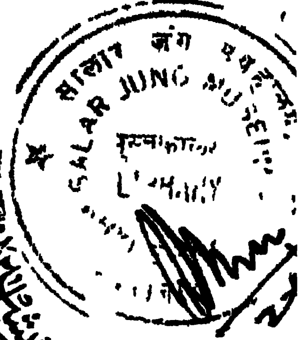
S. A. ABBAS MOOSVI
EDITOR.

VOLUME 1 NO 5
15 th AUGUST 1990
PRICE PER COPY Rs 1/-
YEARLY Subscription Rs 45/-

IF NOT DELIVERED PLEASE RETURN TO: BASHEER-W-NAZEER, HYDERABAD-500 008. INDIA.

POSTAL REGD.No.H/HD-4728 REGD.No.62283. TEL: 253877/253392. TLX: 425-6603 TTI-IN





هفته وار

بشیر و نذیر

ترتیب

مدیر
سید علی عباس موسوی



جلد (۱) ☆ شمارہ ۴
قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ سالانہ ۴۵ روپے
رجسٹرڈ نمبر 47263/20/5/AL/88.TC



اداریہ

اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس کے دامن میں انسان کیلئے ہر عمل کے لئے ہدایت موجود ہے جو اُس کی فلاح اور بہبودی کیلئے ہے اور اللہ تعالےٰ کا یہ قانون اس لئے نہیں بدلتا کیونکہ یہ علم حاصل کرنے والوں کا بنایا ہوا نہیں ہے بلکہ خالق کائنات کا مدوّن کردہ ہے۔ اس لئے ہر فرد اس قانون پر اظہار رائے کا اس وقت تک حق نہیں رکھتا جب تک کہ وہ اسلام کی حکمت عملی اور حکمت نظری اور مقاصد کو سمجھ نہ لے۔ اسلام نے معاشرہ کے لئے جو حکمت بھی پیش کی ہے اس پر غور کرنے سے پہلے اس کے بنیادی عقاید کو اچھی طرح سمجھ لینے کی سخت ضرورت ہے۔ اسلامی حکمت نظری میں جھوٹ، مکاری، فریب، دغابازی کو کوئی جگہ نہیں تو لہٰذا اسلام کے دائرہ میں رہ کر ان چیزوں پر عمل پیرا ہو کر انسان اسلام کا پیرو نہیں کہلا سکتا۔ اس لئے پروردگار نے یوم محشر بندے کی توبہ کو قبول کرنے اس کے گناہوں کو معاف کرنے کا جہاں امکان ظاہر کیا ہے۔ وہیں پر ان مظالم کو ہرگز معاف نہ کرنے کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ جو انسان نے انسانوں پر کئے ہیں اس لئے اسلام کے اصولوں پر قائم رہنے کی کوشش ضروری ہے۔

آج بھی عید مباہلہ اسی بات کا اعلان کر رہی ہے کہ مجسم حق و صداقت کے پیکر جب باطل کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں تو باطل کے قدم اُکھڑ جاتے ہیں ـــــ قرآن شاہد ہے کہ نصاریٰ نے جب حضرت رسول اکرمؐ سے اس بات پر اصرار کیا کہ حضرت عیسیٰ بندہ نہیں ہیں بلکہ خدا کے بیٹے ہیں اور اگر خدا کے بیٹے نہیں ہیں تو بتاؤ کہ کس کے بیٹے ہیں۔ تو آیت قرآن نازل ہوئی کہ جس طرح آدم کو مٹی سے بنا کر جان ڈال دی اور ان کا کوئی باپ نہیں اس طرح حضرت عیسیٰ کا اگر باپ نہ ہو تو کوئی عجیب بات نہیں۔ مگر اس کے باوجود بھی جب نصاریٰ اس بات کے قابل نہ ہوئے تو ارشاد قدرت ہوا کہ حق اور باطل کے فیصلہ کی یہ بھی ایک صورت ہے کہ نصاریٰ اپنے بیٹوں کو لائیں تم (اے رسولؐ) اپنے بیٹوں کو لے جاؤ، وہ اپنے نفوس کو لائیں تم اپنے نفوس کو لیجاؤ اور وہ اپنے عورتوں کو لائیں تم اپنی عورتوں کو لے جاؤ تاکہ دونوں مل کر دعا کریں کہ جو کوئی بھی جھوٹا ہے۔ اُس پر خدا کی جانب سے لعنت اور عذاب نازل ہو۔ اس بناء پر حضرت رسول اکرمؐ نے بیٹوں کی جگہ پر امام حسنؑ و امام حسینؑ، عورتوں میں شہزادی فاطمہ زہراؑ اور نفسوں میں علی مرتضیٰؑ کو لیکر میدان مباہلہ میں تشریف لائے۔ جب یہ پنجتن پاک کو نصاریٰ نے دیکھا تو اُن کے سردار اور عالم نے کہا کہ ان کے چہروں سے صداقت کا نور ظاہر ہو رہا ہے۔ اسلئے ان سے مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ اور عذاب الٰہی سے ہم نہیں بچ سکیں گے۔ لہٰذا انھوں نے جزیہ دینا قبول کیا۔

عید مباہلہ، جہاں رسولؐ اور اہل بیت رسولؐ کی صداقت کا ایک کھلا ثبوت ہے وہیں پر یہ دعوتِ فکر بھی دی جا رہی ہے کہ رسولؐ اور اہل بیتؑ کی اتباع کے ذریعہ اگر ہم صداقت کے راستہ پر گامزن ہو جائیں تو باطل ہمارے مقابل نہیں آسکتا۔

لہٰذا اگر آج سنّت نبویؐ اور سیرتِ آلِ محمدؐ کو ہم اپنا شعار بنالیں تو ہمارا ہر قدم نہ صرف ہمارے لیے بلکہ ملّت اور ساری انسانیت کے لئے باعث تقلید بن جائیگا۔

عید مباہلہ اس بات کا اعلان کر رہی ہے کہ حق و صداقت پر گامزن رہنے والوں کے چہرے بھی اُن کی سیرت کے آئینہ دار ہو جاتے ہیں اور باطل اور جھوٹ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ ان کا مقابلہ کریں۔

آج ساری دنیا میں سچ اور جھوٹ میں فرق اور امتیاز کے لئے کئی معیار اور کئی طریقے اپنائے گئے ہیں مگر الٰہی قانون میں حق و باطل کے معیار کو اس انداز میں اس طرح پیش کیا کہ باطل پرست ہی عذاب الٰہی سے ڈر کر میدان چھوڑ دیتے ہیں اور حق کے علمبردار کو عذاب الٰہی کا خوف اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ صراط مستقیم پر گامزن ہیں۔

==========================

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

- جس سرزمین پر رہنے والوں میں اُونچ نیچ اور انسانیت کے بارہ میں کوئی اختلاف اور نفرت کا جذبہ نہ ہو۔ جو انواع و اقسام کی جڑی بوٹیوں اور طاقتوں کو پیدا کرتی ہے وہی دھرتی ماتا ہمیں پھیلنے میں مدد دے۔ اور ہمارے رشتہ اُلفت کو مضبوط کرے۔ (اتھروید ۱۲-۱-۳)
- اے بھائی۔ دُوسرے کا بُرا چاہنا چھوڑ دے۔ یعنی پہلے اپنے اندر کے نقائص دور کر۔ تب تیرے نزدیک بھی کوئی برائی نہیں بھٹکے گی۔ (گوری باون اکھری محلہ ۵)
- فرید صاحب فرماتے ہیں۔ کہ جو تم سے برائی کرے۔ اُس کا بھی بھلا چاہو۔ دل میں غصہ نہ رکھو۔ ایسا کرنے سے تمہارے جسم کو کوئی عارضہ لاحق نہ ہوگا اور سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔ (شلوک فرید)
- جو لوگ بُرا سوچ رہے ہیں۔ اُن کو سخت عذاب ہوگا۔ اور ان لوگوں کا یہ منصوبہ بھی خاک میں مل جاوے گا۔ (الفاطر)
- رحم کرنے والوں پر اللہ رحم کرتا ہے۔ تم زمین والوں سے بھلائی کرو۔ تم پر آسمان والا رحم کرے گا۔ رحم رحمٰن سے پیوستہ ہے۔ پس جو اُسے اپنائے گا (سب کا بھلا چاہے گا) اللہ اُسے اپنائے گا۔ جو اُسے دور کرے گا۔ اللہ اُسے دور کرے گا۔ (ابوداؤد)
- کوئی شخص اپنی (ہی) بہتری کا خواہاں نہ ہو۔ بلکہ ہر ایک انسان دُوسرے کی بہتری چاہے۔ (۱۔ قرنتھی ۱۰-۲۴)
- نیک کام مل کر ہی سرانجام ہو سکتے ہیں۔ (اتھروید ۳۰-۱۲۴-۱۲)
- تم ایک دوسرے کی حفاظت کرو۔ اور ایک دوسرے کے مددگار بنو۔ (یجروید)
- اے میرے بھائیو! سب یک جا ہو کر رہو۔ محبت سے دشمنی کو مغلوب کر دو۔ (بسنت محلہ ۵)
- کسی سے مخالفت یا جھگڑا نہ کرو۔ مخالفت میں تکلیف ہوتی ہے۔ صلح کل ہو کر رہو۔ (پریم سمارگ)
- اور تم لوگ اُن لوگوں کی طرح مت ہو جانا۔ جنھوں نے باہم تفریق کر لی۔ اور باہم اختلاف کر لیا۔ جب کہ اُن کے پاس احکام واضح پہنچ چکے تھے۔ اور اُن لوگوں کے لئے سزائے عظیم ہوگی (جو آپس میں مل کر نہیں رہتے) (آل عمران ۱۰۵)
- دیکھو کیا اچھی اور خوبی کی بات ہے۔ کہ آپس میں بھائی بھائی مل کر رہیں۔ (زبور ۱۳۳)
- پس آؤ۔ ایسی باتوں کی پیروی کریں۔ جن سے صلح اور میل ہو۔ اور جن سے ایک دُوسرے کی عزت بڑھے۔ (رومیوں ۱۴-۱۹)

==========================

ہم ان تمام قارئین کے شکر گزار ہیں جنھوں نے اپنی رائے کے ذریعہ ہماری ہمت افزائی فرمائی۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے ماہانہ یا سالانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر یا چیک روانہ کرتے وقت اپنا حوالہ خریداری نمبر ضرور لکھیں گے (جو آپکے پتہ سے قبل درج ہے)

جناب سید محمد جواد ہادی

نہج البلاغہ منارۂ ہدایت

قرآن و اہلبیت ؑ

قرآن و اہلبیت وہ عظیم امانت اور ثقل ہیں جنہیں رسول اسلام مسلمان معاشرے کے رشد و ہدایت کے لئے چھوڑ کر گئے ہیں اور یہ اعلان کر گئے ہیں کہ اگر مسلمان اس گرانقدر سرمایہ سے متمسک رہے تو کبھی گمراہ نہ ہوں گے۔

قرآن مسلمانوں کے لئے ایک مکمل ضابطہ حیات و آئین زندگی ہے اور اہلبیت ؑ اس آئین کے مفسر و ذمہ دار نفاذ ہیں جن کو قرآن ناطق کہا گیا ہے۔

احترام کی حد تک تو مسلمان قرآن و اہلبیت دونوں کو سر آنکھوں پر رکھتے ہیں لیکن جہاں تک عملی زندگی میں ان سے فائدہ اٹھانے کا تعلق ہے تو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عملی زندگی میں مسلمان کی توجہ قرآن کی تعلیمات اور اہلبیت ؑ کے ارشادات پر کم ہی رہتی ہے آج قرآن ثواب کے لئے تو تلاوت کیا جاتا ہے، قبروں پر یا مجلس فاتحہ میں قرآن کی تلاوت تو کی جاتی ہے اسی طرح اہلبیت ؑ کے فضائل بڑھ چڑھ کر بیان تو کئے جاتے ہیں ان کا تذکرہ بھی کم و بیش مسلمان معاشرے میں ہر جگہ ہوتا رہتا ہے لیکن نظام زندگی کی بنیاد اہلبیت ؑ کی تعلیمات پر استوار نہیں ہے۔

قرآن و اہلبیت ؑ کی عظمت کا صحیح اندازہ اور ان دو عظیم ثقل کا مکمل تعارف اور ان کے مختلف پہلو کی شناخت اور تعارف کے لئے مناسب سمجھا کہ خود قرآن ناطق اور ابو الائمہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے کلمات کی طرف رجوع کریں اور دیکھیں کہ مولا قرآن و اہلبیت ؑ کا کس طرح سے تعارف فرماتے ہیں؟ حضرت کی نظر میں قرآن و اہلبیت ؑ کا کیا مقام ہے؟ اور مسلمانوں کو ان کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں؟

قرآن علی ؑ کی نظر میں

مولا امیر المؤمنین ؑ خطبہ ۱۹۶ میں قرآن کا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں:

ثم انزل علیہ الکتاب نوراً لا تطفأ مصابیحہ وسراجاً لا یخبو توقدہ وبحراً لا یدرک قعرہ ومنہاجاً لا یضل نہجہ وشعاعاً لا یظلم ضوءہ وفرقاناً لا یخمد برہانہ وتبیاناً لا تہدم ارکانہ وشفاءً لا تخشیٰ اسقامہ وعزاً لا تہزم انصارہ وحقاً لا تخذل اعوانہ فہو معدن الایمان وبحبوحتہ وینابیع العلم وبحورہ ورِیاض العدل وغدرانہ واثافی الاسلام وبنیانہ واودیۃ الحق وغیطانہ وبحر لا ینزفہ المستنزفون وعیون لا ینضبہا الماتحون ومناہل لا یغیضہا الواردون ومنازل لا یضل نہجہا المسافرون واعلام لا یعمیٰ عنہا السائرون وآکام لا یجوز عنہا القاصدون جعلہ اللہ ریّاً لعطش العلماء وربیعاً لقلوب الفقہاء ومحاجّ لطرق الصلحاء ودواءً لیس بعدہ داءٌ ونوراً لیس معہ ظلمۃ وحبلاً وثیقاً عروتہ ومعقلاً منیعاً ذروتہ وعزاً لمن تولاہ وسلماً لمن دخلہ وہدیً لمن ائتم بہ وعذراً لمن انتحلہ وبرہاناً لمن تکلم بہ وشاہداً لمن خاصم بہ وفلجاً لمن حاجّ بہ وحاملاً لمن حملہ ومطیۃً لمن اعملہ وآیۃ لمن توسم وجنۃ لمن استلأم وعلماً لمن وعیٰ وحدیثاً لمن رویٰ وحکماً لمن قضیٰ

پھر آپ پر ایک ایسی کتاب نازل فرمائی جو (سراپا) نور ہے جس کی قندیلیں گل نہیں ہوتیں ایسا چراغ ہے جس کی لو خاموش نہیں ہوتی ایسا دریا ہے جس کی تھاہ نہیں لگائی جا سکتی۔ ایسی شاہراہ ہے جس میں راہ پیمائی بے راہ نہیں کرتی ایسی کرن ہے جس کی چھوٹ مدھم نہیں پڑتی وہ ایسا (حق و باطل میں) امتیاز کرنے والا ہے جس کی دلیل کمزور نہیں پڑتی ایسا کھول کر بیان کرنے والا ہے جس کے ستون منہدم نہیں کئے جا سکتے وہ سراسر شفا ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے روحانی بیماریوں کا کھٹکا نہیں وہ سرتاسر عزت و غلبہ ہے جس کے یار و مددگار شکست نہیں کھاتے وہ (سراپا) حق ہے جس کے معین و معاون بے مدد چھوڑے نہیں جاتے وہ ایمان کا معدن اور مرکز ہے اس سے علم کے چشمے پھوٹتے اور دریا بہتے ہیں اس میں عدل کے چمن اور انصاف کے حوض ہیں وہ اسلام کا سنگ بنیاد اور اس کی اساس ہے حق کی وادی اور اس کا ہموار میدان ہے وہ ایسا دریا ہے کہ جسے پانی بھرنے والے ختم نہیں کر سکتے وہ ایسا چشمہ ہے کہ پانی الچنے والے اسے خشک نہیں کر سکتے وہ ایسا گھاٹ ہے کہ اس پر اترنے والوں سے اس کا پانی گھٹ نہیں سکتا وہ ایسی منزل ہے کہ جس کی راہ میں کوئی راہرو بھٹکتا نہیں وہ ایسا نشان ہے کہ چلنے والے کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا وہ ایسا ٹیلہ ہے کہ حق کا قصد کرنے والے اس سے آگے گزر نہیں سکتے۔ اللہ نے اسے عالموں کی تشنگی کے لئے سیرابی فقیہوں کے دلوں کے لئے بہار اور نیکوں کی راہ گزر کے لئے شاہراہ قرار دیا ہے، یہ ایسی دوا ہے کہ جس سے کوئی مرض نہیں رہتا ایسا نور ہے جس میں تیرگی کا گزر نہیں ایسی رسی ہے کہ جس کے حلقے مضبوط ہیں ایسی چوٹی ہے کہ جس کی پناہ گاہ محفوظ ہے جو اس سے وابستہ ہو اس کے لئے سرمایۂ عزت ہے جو اس کی حدود میں داخل ہو اس کے لئے پیغام صلح و امن ہے۔ جو اس کی پیروی کرے اس کے لئے ہدایت ہے جو اسے اپنی طرف نسبت دے اس کے لئے حجت ہے جو اس کی رو سے بات کرے اس کے لئے دلیل و برہان ہے جو اس کی بنیاد پر بحث و مناظرہ کرے اس کے لئے گواہ ہے جو اسے حجت بنا کر پیش کرے اس کے لئے فتح و کامرانی ہے، جو اس کا بار اٹھائے یہ اس کا بوجھ بٹانے والا ہے جو اسے اپنا دستور العمل بنائے [illegible] یہ حقیقت شناس کے لئے ایک واضح نشانی ہے جو [illegible] سلاح بند ہو اس کے لئے [illegible] جو اس کی [illegible] اس کے لئے علم و دانش ہے۔ بیان [illegible] کے لئے [illegible] کے لئے قطعی حکم ہے۔

[illegible]

[illegible] المؤمنین علیہ السلام [illegible] دیتے ہوئے خطبہ ۱۷۴ میں [illegible] فرمایا ہے:

واعلموا ان ہذا القرآن ہو الناصح الذی لا یغش والہادی الذی لا یضل، والمحدث الذی لا یکذب وما جالس ہذا القرآن احد الا قام عنہ بزیادۃ او نقصان: زیادۃ فی ہدی، او نقصان من عمی. واعلموا انہ لیس علی احد بعد القرآن من فاقۃ، ولا لاحد قبل القرآن من غنی فاستشفوہ من ادوائکم واستعینوا بہ علی لاوائکم فان فیہ شفاءً من اکبر الداء وہو الکفر والنفاق والغی والضلال

فاسألوا الله به، وتوجّهوا اليه بحبّه، ولا تسألوا به خلقه انّه ما توجّه العباد الی الله بمثله. واعلموا انّه شافع مشفّع وقائل مصدّق وانّه من شفع له القرآن یوم القیامة شفّع فیه. ومن محل به القرآن یوم القیامة صدّق علیه فانّه ینادی منادٍ یوم القیامة الا انّ کلّ حارث مبتلی فی حرثه وعاقبة عمله غیر حرثة القرآن. فکونوا من حرثته واتباعه واستدلّوه علی ربّکم واستنصحوه علی انفسکم واتّهموا علیه آراءکم واستغشّوا فیه اهواءکم

یاد رکھو! کہ یہ قرآن ایسا نصیحت کرنے والا ہے جو فریب نہیں دیتا اور ایسا ہدایت کرنے والا ہے جو فریب نہیں دیتا اور ایسا ہدایت کرنے والا ہے جو گمراہ نہیں کرتا اور ایسا بیان کرنے والا ہے جو جھوٹ نہیں بولتا۔ جو بھی اس قرآن کا ہمنشیں ہوا وہ ہدایت کو بڑھا کر اور گمراہی وضلالت کو گھٹا کر اس سے الگ ہوا۔ جان لو کہ کسی کو قرآن (کے تعلیمات) کے بعد کسی اور لائحہ عمل کی احتیاج نہیں رہتی اور نہ کوئی قرآن سے (کچھ سیکھنے) سے پہلے اس سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔ اس سے اپنی بیماریوں کی شفا چاہو اور اپنی مصیبتوں پر اس سے مدد مانگو اس میں کفر و نفاق اور ہلاکت و گمراہی جیسی بڑی بڑی مرضوں کی شفا پائی جاتی ہے۔ اس کے وسیلے اللہ سے مانگو اور اس کی دوستی کو لئے ہوئے اس کا رخ کرو اور اسے لوگوں سے مانگنے کا ذریعہ نہ بناؤ۔ یقیناً بندوں کے لئے اللہ کی طرف متوجہ ہونے کا اس جیسا کوئی ذریعہ نہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ قرآن ایسا شفاعت کرنے والا ہے جس کی شفاعت مقبول اور ایسا کلام کرنے والا ہے (جس کی ہر بات) تصدیق شدہ ہے۔ قیامت کے دن جس کی یہ شفاعت کرے گا، وہ اس کے حق میں مانی جائیں گی اور اس روز جس کو عیوب بتلائے گا تو اس کے بارے میں بھی اس کے قول کی تصدیق کی جائے گی قیامت کے دن ایک ندا دینے والا پکار کر کہے گا دیکھو قرآن کی کھیتی بونے والوں کے علاوہ ہر بونے والا اپنی کھیتی اور اپنے اعمال کے نتیجہ میں مبتلا ہے۔ لہٰذا تم قرآن کی کھیتی بونے والے اور اس کے پیرو کار بنو، اور اپنے پروردگار تک پہنچنے کے لئے اسے دلیل راہ بناؤ اور اپنے نفسوں کے لئے اس سے پند و نصیحت چاہو اور اس کے مقابلہ میں اپنی خواہشوں کو غلط و فریب خوردہ سمجھو۔

اسی خطبہ کے آخری حصہ میں فرماتے ہیں:۔

وانّ الله سبحانه لم یعظ احداً بمثل هذا القرآن فانّه حبل الله المتین وسببه الامین وفیه ربیع القلب وینابیع العلم وما للقلب جلاءٌ غیره مع انّه قد ذهب المتذکّرون وبقی الناسون او المتناسون

قرآن سے بہتر کوئی وعظ نہیں اس لئے کہ قرآن خدا کی مضبوط رسی ہے اور امانتدار وسیلہ ہے جو دلوں کی بہار اور سرچشمہ ہے، دل اور آنکھوں کی رونق و روشنی ہے خصوصاً ایسے ماحول میں جبکہ جاننے والے جا چکے ہیں اور بھولنے اور تغافل کرنے والے باقی ہیں۔

خطبہ ۱۸۳ میں مولا قرآن کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

فالقرآن آمر زاجر وصامت ناطق حجّة الله علی خلقه اخذ علیه میثاقهم وارتهن علیهم انفسهم اتمّ نوره واکمل به دینه وقبض نبیّه وقد فرغ الی الخلق من احکام الهدی به

قرآن امر اور نہی کرنے والا ہے قرآن خاموش ہے جبکہ وہ اسی حالت میں بولتا بھی ہے قرآن خدا کی حجت ہے اس کی مخلوق پر اور خدا نے اپنے بندوں سے اس کتاب پر عمل کرنے کا عہد و پیمان لیا ہے اور ان کو قرآنی احکام کا پابند بنایا ہے قرآن مکمل نور ہے خدا نے اس کے ذریعہ اپنے دین کو مکمل کر دیا ہے پیغمبر کو اس وقت اس جہان سے اٹھایا جب وہ تبلیغ احکام اور قرآن کے ذریعہ رشد و ہدایت کی تعلیمات کی ترویج سے فارغ ہو چکے تھے۔

خطبہ ۱۳۳ میں فرماتے ہیں:۔

وکتاب الله بین اظهرکم ناطق لا یعیا لسانه وبیت لا تهدم ارکانه وعزّ لا تهزم اعوانه

قرآن تمہارے درمیان ایسا ترجمان ہے جس کی زبان حق گوئی سے تھکتی نہیں اور ایسا گھر ہے جس کی بنیادیں منہدم نہیں ہوتیں اور ایسی عزت و قدرت ہے جس کے دوست کبھی شکست نہیں کھاتے۔

اسی خطبے کے آخری حصہ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

کتاب الله تبصرون به وتنطقون به وتسمعون به وینطق بعضه ببعض ویشهد بعضه علی بعض ولا یختلف فی الله ولا یخالف بصاحبه عن الله

یہ اللہ کی کتاب ہے جس کی مدد سے تم حقائق کو دیکھ سکتے ہو اور اس کی مدد سے (حق) کہہ اور سن سکتے ہو، جس کی مدد سے بعض دوسرے بعض کے بارے میں اظہار خیال کر سکتے ہیں اور بعض دوسرے بعض پر گواہی دے سکتے ہیں قرآن نے خدا کے بارے میں خلاف واقع کوئی بھی بات نہیں کی اور جو قرآن کی مصاحبت اپنائے اس کو کبھی خدا سے جدا نہیں کرتا۔

آخری زمانہ میں قرآن مہجور ہوگا۔

خطبہ ۱۴۷ میں حضرتؑ آخری زمانے کے حالات کی تصویر کشی کرتے ہوئے قرآن کے بارے میں یوں ارشاد فرماتے ہیں:۔

وانّه سیأتی علیکم من بعدی زمان لیس فیه شیءٌ اخفی من الحقّ ولا اظهر من الباطل ولا اکثر من الکذب علی الله ورسوله ولیس عند اهل ذلک الزمان سلعة ابور من الکتاب اذا تلی حقّ تلاوته ولا انفق منه اذا حرّف عن مواضعه ولا فی البلاد شیءٌ انکر من المعروف ولا اعرف من المنکر فقد نبذ الکتاب حملته وتناساه حفظته فالکتاب یومئذ واهله طریدان منفیّان وصاحبان مصطحبان فی طریق واحد لا یؤویهما مؤوٍ فالکتاب واهله فی ذلک الزمان فی الناس ولیسا فیهم ومعهم ولیسا معهم لانّ الضلالة لا توافق الهدی وان اجتمعا فاجتمع القوم علی الفرقة وافترقوا علی الجماعة کانّهم ائمّة الکتاب ولیس الکتاب امامهم فلم یبق عندهم منه الّا اسمه ولا یعرفون الّا خطّه وزبره۔

میرے بعد تم پر ایک ایسا دور آنے والا ہے جس میں حق بہت پوشیدہ اور باطل بہت نمایاں ہوگا اور اللہ و رسولؐ پر افترا پردازی کا زور ہوگا اس زمانہ والوں کے نزدیک قرآن سے زیادہ کوئی بے قیمت چیز نہ ہوگی جبکہ اسے اس طرح پیش کیا جائے جیسے پیش کرنے کا حق ہے اور اس قرآن سے زیادہ ان میں کوئی مقبول اور قیمتی چیز نہیں ہوگی اس وقت جبکہ اس کی آیتوں کا بے محل استعمال کیا جائے اور نہ (ان کے) شہروں میں نیکی سے زیادہ کوئی برائی اور برائی سے زیادہ کوئی نیکی ہوگی۔ چنانچہ قرآن کا بار اٹھانے والے اسے پھینک کر الگ کریں گے اور حفظ کرنے والے اس کی (تعلیم) بھلا بیٹھیں گے اور قرآن اور قرآن والے (اہلبیتؑ) بے گھر اور بے در ہوں گے اور ایک ہی راہ میں ایک دوسرے کے ساتھی ہوں گے انہیں کوئی پناہ دینے والا نہ ہوگا۔ وہ (بظاہر) لوگوں میں ہوں گے مگر ان سے الگ تھلگ ـــــ ان کے ساتھ ہوں گے مگر بے تعلق

اس لئے کہ گمراہی ہدایت سے سازگار نہیں ہو سکتی اگرچہ وہ یکجا ہوں۔ لوگوں نے تفرقہ پروازی پر تو اتفاق کر لیا ہے اور جماعت سے کٹ گئے ہیں گویا کہ وہ کتاب کے پیشوا ہیں کتاب ان کی پیشوا نہیں۔ ان کے پاس تو صرف قرآن کا نام رہ گیا ہے اور اور صرف اس کے خطوط و نقوش کو پہچان سکتے ہیں۔

قرآن سے تمسک کی نصیحت

خطبہ ۱۵۶ میں قرآن سے تمسک کے بارے میں نصیحت فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

وعلیکم بکتاب فانہ الحبل المتین والنور المبین والشفاء النافع والری النافع والعصمۃ للمتمسک والنجاۃ للمتعلق لا یعوج فیقام ولا یزیغ فیستعتب ولا تخلقہ کثرۃ الرد وولوج السمع من قال بہ صدق ومن عمل بہ سبق۔

میں تمہیں قرآن سے متمسک رہنے کی نصیحت کرتا ہوں کیونکہ قرآن اللہ کی محکم رسی اور واضح و آشکار نور ہے قرآن نفع بخش شفا ہے پیاس بجھانے والی سیرابی ہے۔ جو اس سے متمسک ہو وہ نجات پائے گا اور جو اس کے دامن کو تھام لے وہ محفوظ رہے گا اس میں کوئی کجی نہیں ہے جس کو درست کرنے کی ضرورت ہو اور نہ تو مسیر حق سے منحرف ہوتا اور نہ ہی خطا کرتا ہے۔ اس کی تکرار سے انسان کی سماعت پر گراں نہیں گزرتا جو قرآن کے مطابق باتیں کرے وہ سچا ہے جو اس پر عمل کرے وہ کامیاب ہے۔

خطبہ ۱۷ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

الی اللہ اشکو من معشر یعیشون جہالاً ویموتون ضلالاً لیس فیہم سلعۃ ابور من الکتاب اذا تلی حق تلاوتہ ولا سلعۃ انفق بیعا ولا اغلی ثمنا من الکتاب اذا حرف عن مواضعہ۔

میں ان لوگوں کی شکایت اللہ سے کروں گا جو جہل و گمراہی میں زندگی بسر کرتے ہیں اور گمراہی میں مرتے ہیں ان کے درمیان قرآن کی کوئی قیمت نہیں ہے جب کہ اس طرح سے تلاوت کی جائے جو حق تلاوت ہے اور کوئی متاع قرآن کی مانند ان کے درمیان بیش قیمت نہیں جبکہ اس کی آیتوں کا بے محل استعمال کیا جائے۔

قرآن کا ظاہر و باطن

حضرت امیر علیہ السلام قرآن کے ظاہر و باطن کے بارے میں خطبہ ۱۸ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

وان القرآن ظاہرہ انیق وباطنہ عمیق لا تفنی عجائبہ ولا تنقضی غرائبہ ولا تکشف الظلمات الا بہ۔

قرآن کا ظاہر بڑا خوبصورت اور باطن بہت گہرا اور عمیق ہے قرآن کے تعجب انگیز نکتے کبھی فانی ہونے والے نہیں اور اس کے اندر عجائب و اسرار کا خزانہ ختم ہونے والا نہیں ہے جہل کی ظلمت و تاریکی قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کے ذریعے ختم نہیں ہو سکتی۔

قرآن سے گفتگو کی تاکید

خطبہ ۱۵۸ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

ذلک القرآن فاستنطقوہ ولن ینطق ولکن اخبرکم عنہ الا ان فیہ علم ما یاتی والحدیث عن الماضی ودواء دائکم ونظم ما بینکم۔

یہ قرآن (نور خدا) ہے اس کو گفتگو کرنے پر آمادہ کرو لیکن یہ (عام زبان میں) ہرگز باتیں نہیں کرتا البتہ میں تمہیں قرآن سے متعارف کرتا ہوں کہ اس میں مستقبل کے تمام علوم اور معلومات موجود ہیں اور گذشتہ کی باتیں بھی ہیں یہ قرآن تمہاری بیماریوں کا علاج اور اجتماعی زندگی کا نظام ہے۔

قرآن میں علم اولین و آخرین

کلمات قصار ۳۱۳ میں حضرت ؑ، قرآن میں پائے جانے والے علوم اولین و آخرین کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

فی القرآن نبأ ما قبلکم وخبر ما بعدکم وحکم ما بینکم۔

قرآن میں گذشتگان کی تاریخ اور آئندہ حوادث کی پیشگوئی اور موجودہ زمانے میں تمہارے لئے دستور العمل موجود ہے۔

قرآن اور متقین

خطبہ ۱۹۳ معروف بہ خطبہ ہمام میں حضرت امیر علیہ السلام متقین کے اوصاف بیان فرماتے ہوئے انکی تلاوت اور اس سے مستفید ہونے کے بارے میں یوں ارشاد فرماتے ہیں:۔

تالین لاجزاء القرآن یرتلونہا ترتیلا یحزنون بہ انفسہم ویستثیرون بہ دواء دائہم فاذا مروا بآیۃ فیہا تشویق رکنوا الیہا طمعا وتطلعت نفوسہم الیہا شوقا وظنوا انہا نصب اعینہم واذا مروا بآیۃ فیہا تخویف اصغوا الیہا مسامع قلوبہم وظنوا ان زفیر جہنم وشہیقہا فی اصول آذانہم۔

قرآن کی آیتوں کی ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کرتے ہیں جس سے اپنے دلوں میں غم و اندوہ تازہ کرتے ہیں اور اپنے مرض کا چارہ ڈھونڈتے ہیں جب کسی ایسی آیت پر ان کی نگاہ پڑتی ہے جس میں جنت کی ترغیب دلائی گئی ہو تو اس کی طمع میں ادھر جھک پڑتے ہیں اور اس کے اشتیاق میں ان کے دل بے تابانہ کھینچتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ (پر کیف) منظر ان کی نظروں کے سامنے ہے اور جب کسی ایسی آیت پر ان کی نظر پڑتی ہے کہ جس میں (دوزخ سے) ڈرایا گیا ہو تو اس کی جانب دل کے کانوں کو جھکا دیتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ جہنم کے شعلوں کی آواز اور وہاں کی چیخ پکار ان کے کانوں کے اندر پہنچ رہی ہے۔

قرآن کے سیکھنے اور سکھانے کا حکم

قرآن مولا امیر المومنین ؑ کی نظر میں گنجینہ اسرار و علوم الٰہی ہے جو سرچشمہ سعادت و خوشبختی ہے جس میں خیر دنیا و آخرت اور علوم اولین و آخرین سمایا ہوا ہے جو تمام امراض جسمانی و روحانی کا علاج مکمل ضابطہ حیات اور آئین زندگی ہے اس عظیم سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور اس سے صحیح فائدہ اٹھانے کے لئے مسلمانوں کو حکم دیتے ہیں کہ قرآن کے سیکھنے اور سکھانے میں کوشاں رہیں

خطبہ ۱۱۰ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

وتعلموا القرآن فانہ احسن الحدیث وتفقہوا فیہ فانہ ربیع القلوب واستشفوا بنورہ فانہ شفاء الصدور واحسنوا تلاوتہ فانہ انفع القصص۔

قرآن کو سیکھو کہ بہترین کلام ہے اور اس میں غور و فکر کرو اس لئے کہ دلوں کی بہار ہے اور اس کے نور سے شفا حاصل کرنے کی کوشش کرو اس لئے کہ دلوں کے امراض کے لئے بہترین علاج ہے اور اس کی بہترین طریقے (قرأت، تجوید، غور و فکر) سے تلاوت کرو اس لئے کہ قرآن بہترین اور عبرت خیز و سبق آموز داستانوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

کلمات قصار ۳۹۹ میں والدین اور اولاد کے ایک دوسرے پر حقوق کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وحق الولد على الوالد ان يحسن اسمه ويحسن ادبه ويعلمه القرآن۔

باپ پر اولاد کا حق یہ ہے کہ اس کے لئے بہترین نام انتخاب کرے اس کی اچھی تربیت کرے اور اس کو قرآن کی تعلیم دے۔

قرآن پر عمل کرنے کی تاکید

مولا امیرالمومنین مسلمانوں کو قرآن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی نصیحت کرتے ہوئے اپنی معروف وصیت میں جو شہادت سے پہلے اپنے فرزند حضرت امام حسنؑ و حضرت امام حسینؑ کو فرمائی ہے اس میں ارشاد فرماتے ہیں۔

الله الله فى القرآن لا يسبقكم بالعمل به غيركم

خدارا خدارا قرآن کو نہ بھولنا کہیں غیر دکھا، تم سے قرآن پر عمل کرنے میں سبقت نہ لے جائیں۔

گویا مولا امیرالمومنینؑ اس وقت کے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ مسلمان قرآنی تعلیمات کے بیش بہا خزانے سے غافل ہو جائیں گے مسلمان قرآن کی حیات بخش تعلیمات کو نظر انداز کر دیں گے جس کے نتیجے میں زندگی کے ہر میدان میں انحطاط و پستی کے شکار ہوں گے لیکن دوسری اقوام وملل قرآن کے بتائے ہوئے اصول کو مشعل راہ بنائیں گی اور زندگی کے ہر شعبے میں پیش رفت و ترقی کریں گی لہٰذا مسلمانوں کو قرآن پر عمل کرنے کی تاکید فرماتے ہیں۔ آج نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولا کو جس چیز کا خوف تھا وہی ہو چکا ہے۔ پروردگار مسلمانوں کو قرآن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی توفیق عنایت فرمائے۔

عترتؑ و اہلبیتؑ، علیؑ کی نظر میں۔

قرآن کے بعد ذرا "ثقل دوم" یعنی عترت کے بارے میں نہج البلاغہ کا مطالعہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ مولا امیرالمومنینؑ اہلبیت نبوت کا کس طرح سے تعارف فرماتے ہیں اور انکی شخصیت اور کمالات کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔

خطبہ ۸۵ میں حضرت امیر مسلمانوں کو گمراہی وضلالت سے بچانے کی خاطر ہادیان دین اور راہنمایان شریعت محمدی علمبرداران حق وحقیقت کا تعارف کرتے ہوئے لوگوں کو راہ حق کی جانب ہدایت کرنے کے لئے ارشاد فرماتے ہیں:-

"فاين تذهبون؟ وانى تؤفكون والاعلام قائمة والآيات واضحة والمنار منصوبة فاين يتاه بكم وكيف تعمهون وبينكم عترة نبيكم وهم ازمة الحق واعلام الدين والسنة الصدق فانزلوهم باحسن منازل القرآن وردوهم ورود الهيم العطاش ايها الناس خذوها عن خاتم النبيين صلى الله عليه وآله وسلم " انه يموت من مات منا وليس بميت ويبلى من بلى منا وليس ببال" فلا تقولوا بما لا تعرفون فان اكثر الحق فيما تنكرون واعذروا من لا حجة لكم عليه وهو انا الم اعمل فيكم بالثقل الاكبر واترك فيكم الثقل الاصغر قد ركزت فيكم راية الايمان ووقفتكم على حدود الحلال والحرام والبستكم العافية من عدلى وفرشتكم المعروف من قولى وفعلى واريتكم كرائم الاخلاق من نفسى فلا تستعملوا الرأى فيما لا يدرك قعره البصر ولا تتغلغل اليه الفكر۔

اب تم کہاں جا رہے ہو اور تمہیں کدھر موڑا جا رہا ہے؟ حالانکہ ہدایت کے جھنڈے بلند، نشانات ظاہر و روشن اور حق کے مینار نصب ہیں، اور تمہیں کہاں بہکایا جا رہا ہے اور کیوں ادھر ادھر بھٹک رہے ہو جبکہ تمہارے نبیؐ کی عترت تمہارے اندر موجود ہے، جو حق کی باگیں، دین کے پرچم اور سچائی کی زبانیں ہیں۔ جو قرآن کی بہتر سے بہتر منزل سمجھ سکو وہیں انہیں بھی جگہ دو اور پیاسے اونٹوں کی طرح ان کے سرچشمہ ہدایت پر اترو۔

اے لوگو! خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کو سنو کہ (انہوں نے فرمایا) ہم میں سے جو مر جاتا ہے، وہ مردہ نہیں ہے۔ اور ہم میں سے (جو بظاہر مر کر) بوسیدہ ہو جاتا ہے، وہ حقیقت میں کبھی بوسیدہ نہیں ہوتا۔ جو باتیں تم نہیں جانتے ان کے متعلق زبان سے کچھ نہ نکالو۔ اس لیے کہ حق بیشتر انہی چیزوں میں ہوتا ہے کہ جن سے تم بیگانہ و ناآشنا ہو۔ (جس شخص کی تم پر حجت تمام ہو) اور تمہاری کوئی حجت اس پر تمام نہ ہو اسے معذور سمجھو اور وہ میں ہوں، کیا میں نے تمہارے سامنے ثقل اکبر (قرآن) پر عمل نہیں کیا، اور ثقل اصغر (اہلبیتؑ) کو تم میں نہیں رکھا۔ میں نے تمہارے درمیان ایمان کا جھنڈا گاڑا، حلال و حرام کی حدیں بتائیں اور اپنے عدل سے تمہیں عافیت کے جامے پہنائے اور اپنے قول وعمل سے حسن سلوک کا فرش تمہارے لئے بچھا دیا۔ اور تم سے ہمیشہ پاکیزہ اخلاق کے ساتھ پیش آیا جس چیز کی گہرائیوں تک نگاہ نہ پہنچ سکے اور فکر کی جولانیاں عاجز رہیں، اس میں اپنی رائے کو کارفرما نہ کرو۔

آل محمدؐ ۔ ہدایت کے ستارے

خطبہ ۱۰۰ میں حضرت امیرؑ آل محمدؐ کو آسمان کے ستاروں سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:-

الا ان آل محمد كمثل نجوم السماء اذا خوى نجم طلع نجم فكانكم قد تكاملت من الله فيكم الصنائع واراكم ما كنتم تاملون۔

جان لو کہ آل محمدؐ آسمان کے ستاروں کے مانند ہیں جب ان میں سے ایک ستارہ غروب کرتا ہے تو دوسرا ستارہ اس کی جگہ نکل آتا ہے۔ آل محمدؐ کے صدقے، اللہ کی نعمتیں تم پر نازل ہوئی ہیں اور جس چیز کی تم لوگ آرزو کرتے تھے وہ مل چکی ہے۔

اہلبیتؑ سرچشمہ علم وحکمت

خطبہ ۱۰۷ میں ارشاد فرماتے ہیں:-

نحن شجرة النبوة ومحط الرسالة ومختلف الملائكة ومعادن العلم وينابيع الحكم ناصرنا ومحبنا ينتظر الرحمة وعدونا ومبغضنا ينتظر السطوة۔

ہم شجرہ نبوت ہیں ملائکہ کی رفت و آمد اور رسالت کا مرکز ہیں ہم علم کا خزانہ اور حکمت کا سرچشمہ ہیں ہمارے محب اور دوست اللہ کی رحمت اور ہمارے دشمن اللہ کی غضب کے منتظر ہیں۔

خطبہ ۱۲۰ میں فرماتے ہیں:-

وعندنا اهل البيت ابواب الحكم وضياء الامر

علم کے دروازے اور مسائل کی روشنی چل، ہم اہلبیتؑ ہی کے پاس ہے۔

خطبہ ۱۴۴ میں فضائل اہلبیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:-

اين الذين زعموا انهم الراسخون فى العلم دوننا كذبا وبغيا علينا۔ ان رفعنا الله ووضعهم واعطانا وحرمهم وادخلنا واخرجهم بنا يستعطى الهدى ويستجلى العمى ان الائمة من قريش غرسوا فى هذا البطن من هاشم لا تصلح

علی سواهم ولا تصلح الولاة من غيرهم۔

کہاں ہیں وہ لوگ راسخان فی العلم ہونے کے مدعی تھے جو جھوٹ اور مکر سے ہماری دشمنی میں اس قسم کے جھوٹے دعوے کرتے تھے ۔ (کہاں ہیں یہ لوگ تاکہ دیکھ لیں) کہ خدا نے ہمیں عظمت عطا کی اور انہیں ذلیل کیا ہمیں سب کچھ عنایت فرمایا اور انہیں محروم کیا ہمیں پروردگار نے اپنے حریم نعمت میں داخل اور انہیں خارج کر دیا ہمارے صدقے سے ہدایت کی درخواست کی جاتی ہے ہمارے ہی صدقے سے اندھے بینا ہو جاتے ہیں ائمہ سب قریش میں سے ہیں جن کا شجرہ نسل ہاشم میں کاشت کیا گیا ہے یہ مقام کسی اور کو زیب نہیں دیتا اور دوسرے اس مقام کے لائق نہیں ہیں۔

اہلبیتؑ کنوز الرحمٰن

خطبہ ۱۵۴ میں حضرت امیرؑ اہلبیتؑ کا تعارف یوں فرماتے ہیں :۔

نحن الشعار والاصحاب والخزنة والابواب ولا تؤتی البیوت الا من ابوابها فمن اتاها من غیر ابوابها سمی سارقا فیهم کرائم القرآن وهم کنوز الرحمان ان نطقوا صدقوا وان صمتوا لم یسبقوا فلیصدق رائد اهله ولیحضر عقله

ہم اسرار الٰہی کے محرم اور پیامبر اسلام کے حقیقی اصحاب اور ان کے علوم کے خزانے اور دروازے ہیں کبھی کوئی شخص کسی گھر میں دروازے کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا اگر دروازے کے بغیر کسی اور راستے سے داخل ہو جائے تو وہ چور کہلاتا ہے اہلبیت کے بارے میں قرآن کی آیات نازل ہوئی ہیں وہ خدا کے علوم کے خزانہ ہیں جب وہ بولتے ہیں تو سچ بولتے ہیں اور اگر خاموش رہتے ہیں تب بھی کوئی ان سے آگے نہیں بڑھ سکتا معاشرے کے راہنما کو چاہئے کہ وہ راستگو ہو اور رعیت کو حقائق سے آگاہ رکھے اور اپنی عقل کو بروئے کار لائے۔

خطبہ ۲۳۹ میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

هم عیش العلم وموت الجهل یخبرکم حلمهم عن علمهم وظاهرهم عن باطنهم وصمتهم عن حکم منطقهم لا یخالفون الحق ولا یختلفون فیه وهم دعائم الاسلام وولائج الاعتصام بهم عاد الحق الی نصابه وانزاح الباطل عن مقامه وانقطع لسانه عن منبته۔

آل محمد باعث حیات علم وسبب موت جہل ہیں ان کا علم تمہیں ان کی علمی عظمت سے آگاہ کر دیتا ہے اور ان کا ظاہر تمہیں ان کے باطن سے آگاہ کرتا ہے ان کی خاموشی تمہیں ان کی حکمت و منطق سے آگاہ کرتی ہے کبھی حق کی مخالفت نہیں کرتے اور اس میں اختلاف نہیں رکھتے وہ اسلام کے ارکان اور لوگوں کے لئے پناہ گاہ ہیں ان کے ذریعے سے حق اپنے نصاب کو پہنچتا، باطل ختم ہو جاتا ہے اور اس کی زبان قطع ہو جاتی ہے۔

خطبہ ۲۳۳ میں فرماتے ہیں :۔

وانا لامراء الکلام وفینا تنشبت عروقه وعلینا تهدلت غصونه

ہم خطابت کے بادشاہ ہیں خطابت کی جڑیں ہمارے ہاں محفوظ اور اس کا سایہ ہمارے سروں پر ہے۔

پیروی اہلبیتؑ

خطبہ ۹۵ میں اہلبیت اطہارؑ کی پیروی کا حکم دیتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

انظروا اهل بیت نبیکم فالزموا سمتهم واتبعوا اثرهم فلن یخرجوکم من هدی ولن یعیدوکم فی ردی فان لبدوا فالبدوا وان نهضوا فانهضوا ولا تسبقوهم فتضلوا ولا تتاخروا عنهم فتهلکوا۔

اپنے پیغمبرؐ کے اہلبیت کو دیکھو اور انہی کی سمت اور راہ کو اپناؤ اور ان کے نقش قدم پر چلو وہ کبھی تمہیں جادۂ حق سے منحرف نہیں کریں گے اور ہلاکت و گمراہی کی طرف نہیں لے جائیں گے اگر وہ سکوت اختیار کریں تو تم بھی خاموش رہو اور اگر وہ قیام کریں تو تم بھی قیام کرو ان سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے اور ان سے پیچھے بھی نہ رہنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

معرفت اہلبیتؑ

خطبہ ۱۵۲ میں ائمہ اہلبیت کی معرفت کو ضروری قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں

وانما الائمة قوام الله علی خلقه وعرفاؤه علی عباده ولا یدخل الجنة الا من عرفهم وعرفوه ولا یدخل النار الا من انکرهم وانکروه۔

ائمہ (دین) معاشرے کی بنیادیں ہیں اور بندگان خدا کے رہنما ہیں کوئی بھی بہشت میں داخل نہیں ہو سکتا مگر وہ جو ائمہ علیہم السلام کو پہچان لے اور جن کو ائمہ پہچان لیں جو ان کا منکر ہو اور ائمہ اس کا انکار کریں وہ جہنم میں جائے گا۔

خطبہ ۲ میں عظمت عترت اہلبیتؑ کا تذکرہ یوں ہوتا ہے :۔

هم موضع سره ولجاء امره وعیبة علمه وموئل حکمه وکهوف کتبه وجبال دینه بهم اقام انحناء ظهره واذهب ارتعاد فرائصه . . . .

لا یقاس بآل محمد من هذه الامة احد ولا یسوی بهم من جرت نعمتهم علیه ابدا هم اساس الدین وعماد الیقین الیهم یفیء الغالی وبهم یلحق التالی ولهم خصائص حق الولایة وفیهم الوصیة والوراثة الان اذ رجع الحق الی اهله ونقل الی منتقله۔

وہ سر خدا کے امین اور اس کے دین کی پناہ گاہ ہیں۔ علم الٰہی کے خزان اور حکمتوں کے مرجع ہیں۔ کتب (آسمانی) کی گھاٹیاں اور دین کے پہاڑ ہیں۔ انہی کے ذریعے اللہ نے اس کی پشت کا خم سیدھا کیا اور اس کے پہلوؤں سے ضعف کی کپکپی دور کی (اسی خطبہ کا ایک حصہ جو دوسروں سے متعلق ہے) انہوں نے فسق و فجور کی کاشت کی غفلت و فریب کے پانی سے اسے سینچا اور اس سے ہلاکت کی جنس حاصل کی۔ اس امت میں کسی کو آل محمدؐ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا جن لوگوں پر ان کے احسانات ہمیشہ جاری رہے ہوں وہ ان کے برابر نہیں ہو سکتے وہ دین کی بنیاد اور یقین کے ستون ہیں۔ آگے بڑھ جانے والے کو ان کی طرف پلٹ کر آنا ہے اور پیچھے رہ جانے والے کو ان سے آکر ملنا ہے۔ حق ولایت کے خصوصیات ان ہی کے لئے ہیں اور انہی کے بارے میں پیغمبرؐ کی وصیت اور انہی کے لئے (نبی کی) وراثت ہے اب یہ وقت وہ ہے کہ حق اپنے اہل کی طرف پلٹ آیا اور اپنی صحیح جگہ پر منتقل ہو گیا۔

اہلبیتؑ منجی بشریت

خطبہ ۴ میں طلحہ و زبیر کے قتل کے بعد اہل بصرہ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

بنا اهتدیتم فی الظلماء وتسنمتم ذروة العلیاء وبنا انفجرتم عن السرار۔

(اے اہل بصرہ) تم لوگ ہماری وجہ سے ہدایت یافتہ ہوئے اور ہماری ہی وجہ سے بام ترقی تک پہنچے تمہاری قسمت کا طالع ہماری برکت سے نمودار ہوا۔

درس، آیت اللہ العظمیٰ منتظری
ترجمہ، جناب ممتاز علی

معرفتِ خدا

"وبمقارنتہ بین الاشیاء عرف ان لا قرین لہ"
خدا نے چیزوں کو ایک دوسرے کا ہمنشین قرار دیا ہے (ساتھ ساتھ رکھا ہے)
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود کوئی قرین (ساتھی) نہیں رکھتا۔

تقارن (قربت، ہمنشینی) کی قسمیں۔

قربت (تقارن)، پانچ قسموں پر مشتمل ہے۔

(۱) تقارن زمانی۔

دو چیزیں ایک ہی زمانہ میں ہوں جیسے ہم اور آپ ایک ہی زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اس کو تقارن زمانی کہتے ہیں۔

(۲) تقارن مکانی۔

دو چیزیں ایک مکان میں ہوں جیسے دو آدمی ایک ہی گاڑی پر سوار ہوں یا کسی جگہ ایک ساتھ بیٹھے ہوئے ہوں تو ان دونوں آدمیوں میں تقارن مکانی ہوگا۔

(۳) تقارن عرض و معروض۔

جیسے گچ اور سفیدی گچ معروض ہے اور سفیدی عرض ہے یہاں سفیدی گچ کے ساتھ ہے۔

(۴) تقارن مادہ و صورت۔

جیسے لکڑی جو مادہ ہے۔ بڑھئی کی مخصوص کاریگری کی بدولت کرسی یا دروازہ کی شکل میں ڈھل جاتی ہے۔ یہاں اس لکڑی اور کرسی میں جو تقارن ہے اسے تقارن مادہ و صورت کہتے ہیں۔

(۵) تقارن بدن و روح۔

ہر انسان کی روح اس کے بدن کے ساتھ ہوتی ہے اس لئے کہ روح، مادۂ بدن کا محصول عالی ہے یعنی بدن نے حرکت جوہری کی وجہ سے کمال کی منزلیں طے کیں اور اس میں نفس مجرد (روح) پیدا ہو گیا۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ تقارن دو چیزوں کی ہمنشینی و ہمراہی کو کہتے ہیں یہ ہمنشینی، تقارن زمانی، تقارن مکانی، تقارن عرض و معروض، تقارن مادہ و صورت کی شکل میں ہو یا تقارن بدن و روح کی صورت میں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی خدا کی ذات کے لئے ممکن نہیں ہے اس لئے خدا زمان و مکان سے خالی، عرض و معروض سے بری، مادہ و صورت سے پاک اور بدن و روح سے منزہ ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک کے لئے ترکیب ضروری ہے۔ اگر خدا مرکب ہوگا تو محتاج ہو جائیگا اور خدا کے لئے محتاج ہونا محال ہے۔

بہرحال قرین و ہمنشین ہونے کی مذکورہ صورتوں میں سے اگر ہر ایک کی الگ الگ تحقیق کی جائے تو ہر ایک کا لازمہ جسم نکلے گا اور جسم کا محتاج ہونا بدیہی بات ہے لیکن خدا چونکہ بے نیاز ہے اس لئے اس کا کوئی ساتھی اور ہمنشین نہیں ہو سکتا، خدا کی ذات کے لئے کوئی "دوسرا" فرض ہی نہیں کیا جا سکتا جو اس کا ہمنشین اور ساتھی بن سکے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی توجہ کے قابل ہے کہ خدا ان تمام چیزوں کا خالق ہے، زمانہ کو اسی نے پیدا کیا، مکان کا وہی خالق ہے پھر بھلا یہ چیزیں اس کی ہمنشین کیسے بن سکتی ہیں۔

مکان۔

فلسفیوں کے درمیان مکان کے سلسلہ میں دو قول پائے جاتے ہیں۔

(۱) فلسفہ مشاء کے پیرو جیسے ارسطو کہتے ہیں کہ:۔

مکان، جسم کی اس سطح مقعر کو کہتے ہیں جو کسی جسم کا احاطہ کئے ہوئے ہو۔
مثلاً ایک ایسا کوزہ جس میں آپ پانی لاتے ہیں اس کی دو سطحیں ہیں:۔

۱۔ ایک وہ سطح جو ظاہری ہے اور ابھری ہوئی ہے۔

۲۔ دوسری وہ سطح جو باطنی، گہری اور پانی سے ملی ہوئی ہے، فلاسفۂ مشاء اس گہری سطح کو ابھری ہوئی سطح آب کا مکان کہتے ہیں۔

(۲) فلسفہ اشراق کے پیرو جس کے سربراہ شیخ اشراق ہیں، فرماتے ہیں کہ:۔

"مکان سے مراد بُعد مجرد ہے"۔

اگر ہم یہ فرض کریں کہ عالم کی کوئی چیز بھی نہ ہوتی حتی کہ ہوا بھی نہ ہوتی اور ایک ایسی فضا موجود ہوتی جس میں لمبائی چوڑائی اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ وہ فضا جو بعد میں اجسام سے پُر ہو گئی ہے تو اس فضا کو مکان کہتے ہیں جیسے اگر ایک کتاب کے مکان کی تعریف کرنا چاہیں تو کہیں گے کہ کتاب جسم ہے، اس کا مکان وہ فضا اور حجم ہے جس کو کتاب نے پُر کر رکھا ہے اگر یہ کتاب نہ بھی ہوتی، پھر بھی ایک فضا تو بہرحال ہوتی، فلاسفۂ اشراق اسی فضا کو مکان کہتے ہیں۔ مکان کے چاہے جو بھی معنی بیان کئے جائیں وہ مخلوق خدا ہے لہٰذا ممکن نہیں ہے کہ مکان خدا کا ساتھی ہو جائے ساتھ اور مقارنت تو اس صورت میں ہوتی جب مذکورہ پانچ صورتوں میں سے ہمنشینی کی کوئی صورت خدا کے ساتھ متصور ہوتی خدا کے ساتھ اس کا کوئی دوسرا ساتھی فرض نہیں ہو سکتا اس لئے کہ جو کچھ ہے وہ پرتو خدا ہے۔

"ضادّ النور بالظلمۃ"
خدا نے نور کو ظلمت کی ضد قرار دیا ہے۔

نور و ظلمت۔

یہ حصہ درحقیقت گذشتہ جملہ "وبمضادتہ بین الاشیاء عرف ان لا ضد لہ" کی شرح و تفسیر ہے۔ ہم یہ گذارش کر چکے ہیں کہ ضدین ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن میں ایک ساتھ جمع ہونے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی ضدین چاہے دو امر وجودی ہوں یا ایک وجودی اور ایک ایسا عدمی ہو جس میں موجود ہونے کی شان پائی جاتی ہو مگر فی الحال موجود نہ ہو جیسے ظلمت "الظلمۃ عدم النور عما من شانہ ان یکون نوراً"۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ عدم کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ عدم مطلق ۲۔ عدم ملکہ
عدم ملکہ وہ عدم ہے جس میں وجود کی صلاحیت ہوتی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ فضا میں نور آفتاب پھیلنے کی استعداد موجود ہے لیکن جس وقت نور آفتاب نہیں ہوگا تاریکی ہوگی فضا میں چھا جانے والی یہ تاریکی عدم ملکہ والی تاریکی ہے عدم محض والی نہیں ہے۔

بہرحال حضرتؑ کے مذکورہ جملہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے نور و ظلمت کے درمیان تضاد قرار دیا ہے۔ نور کی تعریف میں کہا گیا تھا کہ "الظاھر بالذات المظھر للغیر" نور وہ ہے جو خود ظاہر ہوتا ہے اور دوسری چیزوں کو بھی ظاہر کرتا ہے جو شئے بھی دکھائی دیتی ہے وہ نور کی وجہ سے دکھائی دیتی ہے ہم نور کا ادراک کرتے ہیں اور پھر اسی کے ذریعہ دوسری چیزوں کو دیکھتے ہیں۔

"والوضوح بالبھمۃ"
اس نے واضح اور مبہم کے درمیان تضاد قرار دیا ہے۔

واضح اور مبہم۔

شارحین نہج البلاغہ میں سے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ واضح سے مراد سفیدی اور مبہم سے مراد سیاہی ہے لیکن یہ درست نہیں ہے اس لئے کہ "واضح" اور "مبہم" کا تضاد بہت ہی واضح ہے یہاں بات کو کنایہ میں بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں یہاں "مبہم" ہونا عدم ملکہ کی قسم سے ہے اس لئے کہ وضوح ایک وجودی امر ہے اور ابہام عدمی شئے ہے مبہم وہ غیر واضح چیز ہے جس میں واضح ہونے کی صلاحیت ہے۔

"الجمود بالبلل"
اس نے خشکی اور تری (رطوبت) کے درمیان تضاد قرار دیا ہے۔

عناصر اربعہ۔

زمانہ قدیم سے ہی عناصر کو فلاسفہ چار بتلاتے ہیں۔ یہ عناصر، پانی، مٹی، آگ، ہوا ہیں اور عناصر اربعہ

کے نام سے مشہور ہیں۔ فلاسفہ نے ان میں سے ہر ہر عنصر کی الگ الگ خصوصیت بیان کی ہے۔ پانی کی خصوصیت رطوبت، خاک کی خصوصیت یبوست، آگ کی خصوصیت حرارت اور ہوا کی خصوصیت برودت ہے۔ آج کے بہت سے ڈاکٹر ان خصوصیتوں کو درست نہیں سمجھتے لیکن پھر بھی اجمالی طور پر ان کا وجود بہت ہی واضح ہے یہ خاصیتیں غذاؤں میں مکمل طور پر محسوس کی جا سکتی ہیں۔

خشکی اور تری۔

بہرحال حضرتؑ نے فرمایا کہ خدا نے خشکی اور تری کے درمیان تضاد قرار دیا ہے لہٰذا پانی جس میں رطوبت ہے اور خاک جس میں خشکی پائی جاتی ہے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

"والحرور بالصرد"

اس نے سردی اور گرمی میں تضاد قرار دیا ہے۔

حرارت و برودت۔

"حرور" حرارت کی صفت مشبہ ہے اور لفظ "صرد" جو صاد سے لکھا جاتا ہے وہ سین سے لکھے جانے والے "سرد" کے معنی میں ہے۔ لفظ "سرد" عربی کے لفظ "صرد" سے بنا ہے جس میں "ص" کو "س" سے بدل دیا گیا ہے۔ بہرحال "حرور" گرمی کے معنی میں اور "صرد" سردی کے معنی میں ہے۔

حضرتؑ نے مذکورہ بالا دو فقروں میں ان چاروں خاصیتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ فلاسفہ جن کو عناصر اربعہ کی خاصیت کہتے ہیں (یعنی پانی کی خاصیت رطوبت، خاک کی خاصیت یبوست، آگ کی خاصیت حرارت اور ہوا کی خاصیت برودت) ان چاروں خاصیتوں کو جو ایک دوسرے کی ضد ہیں فلاسفہ کی اصطلاح میں مزاج بھی کہا جاتا ہے۔ انسانوں میں اگر درجہ حرارت ۳۷ ڈگری سے بڑھ جاتا ہے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ یا اگر خشکی بڑھ جائے اور جسم میں پانی کم ہو جائے تو یہ بات مزاج انسانی اور اس کی سلامتی کے لئے خطرناک ہوتی ہے۔

مؤلف بین متعادیاتها، مقارن بین متبایناتها، مقرب بین متباعداتها، مفرق بین متدانیاتها۔

جو چیزیں ایک دوسرے کے لئے ناسازگار اور دشمن ہیں ان کو آپس میں ملانے والا اور جدا جدا چیزوں کو نزدیک کرنے والا، ایک دوسرے سے دور کو قریب کرنے والا، اور جو چیزیں نزدیک ہیں ان کو دور کرنے والا ہے۔

دوستی اور دشمنی

جن موجودات میں آپس میں بیر ہے خدا نے ان کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے ان کو آپس میں ملا دیا ہے۔ جیسے حرارت و برودت اور رطوبت و یبوست ان میں آپس میں تضاد ہے لیکن اس کے باوجود یہ ساری چیزیں بدن میں ایک ساتھ جمع ہیں ان ہی کے اختلاط کو مزاج کہا جاتا ہے۔

تعادی — عداوت سے ہے یہ دشمنی کے معنی میں ہے۔

متعادیات — وہ چیزیں جن میں آپس میں تضاد اور دشمنی ہو جیسے آب و خاک۔

مقارنہ — نزدیک کرنے اور قرین قرار دینے کے معنی میں ہے۔

متباینات — بینونت سے مطلب جدائی اور تفرقہ ہے۔

خدا نے ان چیزوں کو جو دور اور جدا ہیں، قریب کر دیا ہے، قریب ہی نہیں بلکہ باہم جمع بھی کر دیا ہے جیسے حرارت اور برودت، پانی اور خشکی، یہ ساری چیزیں بدن میں پائی جاتی ہیں۔ ان ہی کے اختلاط کو مزاج کا نام دیا جاتا ہے اسی طرح ان چیزوں کو جو ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں جدا قرار دیا ہے۔

کون و فساد۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ کون و فساد خدا کے قبضہ میں ہے یعنی جامد اور آپ کا وجود اس بات پر منحصر ہے کہ وہ چیزیں جو دور ہیں نزدیک ہو جائیں (جیسے حرارت اور رطوبت) پھر ایک وقت وہ بھی آئے گا جب بدن کے اجزاء جو آپس میں مضبوطی سے پیوست ہیں جدا ہو جائیں گے، گوشت گل جائے گا ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی، اعضاء و جوارح الگ الگ ہو جائیں گے۔

غرضکہ عالم طبیعت عالم کون و فساد ہے ایک طرف سے پیدا ہوتا ہے تو دوسری طرف سے فنا کے دور میں ہوتا چلا جاتا ہے۔

حضرتؑ کے گذشتہ تین جملے عالم کون سے متعلق ہیں اور آخری جملہ "مفرق بین متدانیاتها" کا تعلق عالم فساد سے ہے۔ "دنو" اور "تدانی" نزدیکی کے معنی میں ہے۔ ہمارے جسم کے اجزاء جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں سب ایک سوئچ کے ذریعہ کنٹرول کئے جاتے ہیں ایک وقت وہ آئے گا کہ سب جدا ہو جائیں گے۔ ہوا ہر ذرہ کو اڑا لے جائے گی۔ حضرتؑ نے اس جملہ میں فرمایا ہے کہ خدا ان اشیاء میں جدائی اور تفرقہ ڈال دے گا جو ایک دوسرے کے قریب اور نزدیک ہیں۔

لایشمل بحد ولا یحسب بعد

وہ حد میں محدود نہیں ہے اور نہ شمار کرنے سے شمار میں آتا ہے۔

حد لغوی اور حد فلسفی

حد کا لغوی معنی بھی ہے اور اصطلاحی معنی بھی جو منطق میں موجود ہے۔ لغت میں حد کسی چیز کی انتہا کو کہتے ہیں جیسے یہ کہا جاتا ہے کہ "اس چیز کی حد وہاں تک ہے" یعنی اس کی انتہا وہاں تک ہے۔ یا یہ کہا جائے کہ اس گھر کے چار حد ہیں۔ (شمال، جنوب، مشرق، مغرب) یہ حد کے لغوی معنی ہیں۔

لیکن اصطلاح منطق میں ذاتیات کی تعریف کو حد کہتے ہیں یعنی اگر آپ کسی چیز کی تعریف کرنا چاہیں تو کبھی عوارض کے ذریعہ اس کی تعریف کرتے ہیں اور کبھی ذاتیات کے ذریعہ اس کی تعریف کی جاتی ہے۔ عوارض کے ذریعہ کی جانے والی تعریف کو منطق میں "رسم" اور ذاتیات کے ذریعہ کی جانے والی تعریف کو "حد" کہتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ سے پوچھا جائے کہ "ما هو الانسان؟" "انسان کیا ہے؟" اور آپ جواب میں اس بات کو بتائیں جو انسان کی ذات میں دخل رکھتی ہے تو اس کو "حد" کہتے ہیں۔ اگر آپ نے جواب میں فرمایا کہ "الانسان حیوان ناطق" "انسان حیوان ناطق ہے" تو اس میں حیوانیت اور ناطقیت دونوں، انسان اور اس کی ذات کا جزو ہیں اس تعریف کو منطق کی اصطلاح میں "حد" کہا جاتا ہے۔

لیکن اگر آپ تعریف میں اس کے خواص اور عوارض کو ذکر فرمائیں اور یوں کہیں کہ "انسان وہ ہے جو کھاتا ہے، پیتا ہے، چلتا ہے، ہنستا ہے وغیرہ" تو یہ ساری باتیں انسان کے عوارض اور خواص ہیں، منطق میں اس تعریف کو "رسم" کہتے ہیں۔

بنابرایں ذاتیات کی تعریف کو یعنی جنس اور فصل کے ذریعہ جو تعریف ہوتی ہے اس کو حد کہتے ہیں۔ خدا نہ حد لغوی رکھتا ہے نہ حد منطقی۔

خداوند عالم کے لئے جنس و فصل اور حد منطقی نہیں ہے اس لئے کہ جنس و فصل ان موجودات کی تعریف کی چیزیں ہیں جو ماہیت رکھتی ہیں اور مرکب ہیں، جیسے ہم اور آپ۔ لیکن خدا کی ذات نہ مرکب ہے نہ ماہیت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ خدا ہستی غیر متناہی ہے — وہ حد لغوی بھی نہیں رکھتا، اس لئے کہ وہ جسم نہیں ہے جس کی کوئی حد اور انتہا ہو۔ اسی وجہ سے حضرتؑ نے فرمایا کہ خدا کسی قسم کی حد میں محدود نہیں ہے۔

وہ بغیر شمار کے واحد ہے۔

"ولا یحسب بعد" خدا گننے سے شمار میں نہیں آتا لہٰذا جس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ خدا واحد ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ کوئی "دوسرا" بھی اس کے لئے فرض ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ "دوسرے" کا تصور ہی اس کے لئے محال ہے — اس سے پہلے ہی حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی حدیث نقل کر چکا ہوں جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ "لفظ واحد کا اطلاق خدا کے لئے دو معنوں میں صحیح اور دو معنوں میں غلط ہے۔" میں اس وقت اس روایت کو دہرانا نہیں چاہتا لیکن اجمالاً اتنا کہوں گا کہ جو عدد مقدار بتلانے کیلئے استعمال ہوتا ہے وہ ذات خدا کیلئے درست نہیں ہے۔

مقدار بتانے والا عدد "کم منفصل" ہے۔ خدا مقدار اور اندازہ والا نہیں ہے۔ اس کے لئے "دوسرا" فرض نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کے اجزاء نہیں ہیں جو یہ کہا جائے کہ وہ اتنے ہزار سال پہلے سے موجود ہے۔ عدد یا تو اس کی ذات کو شمار کرے گا یا زمانہ کو یا اس کے اجزاء کو اور خدا نہ زمانہ رکھتا ہے نہ اجزاء کا حامل ہے نہ وہ خود شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ لہٰذا عدد کا جو کم منفصل ہے، خدا کی ذات میں گذر نہیں ہے۔ جس طرح کم متصل (یعنی خط، سطح، جسم تعلیمی (طول و عرض و عمق) کا اس کی ذات میں گذر نہیں ہے اس لئے کہ کم متصل اجسام سے متعلق ہے۔

"انما تحد الادوات انفسها"

آلات تو اپنے ہی جیسے (جسموں) کو محدود کر سکتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

Upon hearing the news of the Imam's martyrdom, Mansur wrote to the governor of Medina instructing him to go to the house of the Imam on the pretext of expressing his condolences to the family, to ask for the Imam's will and testament and read it Whoever was chosen by the Imam as his inheritor and successor should be beheaded on the spot Of course the aim of Mansur was to put an end to the whole question of the imamate and to Shi'ite aspirations When the governor of Medina, following orders, read the last will and testament, he saw that the Imam had chosen four people rather than one to administer his last will and testament the caliph himself, the governor of Medina, 'Abdallāh Aftaḥ, the Imam's older son, and Musa, his younger son In this way the plot of Mansur failed [80]

The Seventh Imam

Imam Mūsā ibn Ja'far Kāẓim, the son of the sixth Imam, was born in 128/744 and was poisoned and martyred in prison in 183/799 [81] He became Imam after the death of his father, through Divine Command and the decree of his forefathers The seventh Imam was contemporary with the Abbasid caliphs, Mansur, Hādī, Mahdi and Harun He lived in very difficult times, in hiding, until finally Harun went on the hajj and in Medina had the Imam arrested while praying in the Mosque of the Prophet He was chained and imprisoned, then taken from Medina to Basra and from Basra to Baghdad where for years he was transferred from one prison to another Finally he died in Baghdad in the Sindi ibn Shāhak prison through poisoning[82] and was buried in the cemetery of the Quraysh which is now located in the city of Kazimayn

The Eighth Imam

Imam Riḍā (Ali ibn Musa) was the son of the seventh Imam and according to well known accounts was born in 148/765 and died in 203/817 [83] The eighth Imam reached the imamate, after the death of his father, through Divine Command and the decree of his forefathers The period of his imamate coincided with the caliphate of Harun and then his sons Amīn and Ma'mūn After the death of his father, Ma'mun fell into conflict with his brother Amin which led to bloody wars and finally the assassination of Amin, after which Ma'mun became caliph [84] Until that day the policy of the Abbasid caliphate toward the Shi'ites had been increasingly harsh and cruel Every once in a while one of the supporters of Ali (*alawis*) would revolt causing bloody wars and rebellions which were of great difficulty and consequence for the caliphate

The Shi'ite Imams would not cooperate with those who carried out these rebellions and would not interfere with their affairs The Shi'ites of that day who comprised a considerable population continued to consider the Imams as their religious leaders to whom obedience was obligatory and believed in them as the real caliphs of the Holy Prophet They considered the caliphate to be far from the sacred authority of their Imams, for the caliphate had come to seem more like the courts of the Persian kings and Roman emperors and was being run by a group of people more interested in worldly rule than in the strict application of religious principles The continuation of such a situation was dangerous for the structure of the caliphate and was a serious threat to it

Ma'mun thought of finding a new solution for these difficulties which the seventy-year old policy of his Abbasid predecessors had not been able to solve To accomplish this end he chose the eighth Imam as his successor, hoping in this way to overcome two difficulties first of all to prevent the descendants of the Prophet from rebelling against the government since they would be involved in the government themselves, and secondly, to cause the people to lose their spiritual belief and inner attachment to the Imams This would be accomplished by having the Imams become engrossed in wordly matters and the politics of the caliphate itself, which had always been considered by the Shi'ites to be evil and impure In this way their religious organization would crumble and they would no longer present any dangers to the caliphate Obviously, after accomplishing these ends, the removal of the Imam would present no difficulties to the Abbasids [85]

In order to have this decision put into effect, Ma'mun asked the Imam to come to Marw from Medina Once he had arrived there, Ma'mun offered him first the caliphate and then the succession to the caliphate The Imam made his apologies and turned down the proposal, but he was finally induced to accept the successorship, with the condition that he would not interfere in governmental affairs or in the appointment or dismissal of government agents [86]

This event occurred in 200/814 But soon Ma'mun realized that he had committed an error, for there was a rapid spread of Shi'ism, a growth in the attachment of the populace to the Imam and an astounding reception given to the Imam by the people and even by the army and government agents Ma'mun sought to find a remedy for this difficulty and had the Imam poisoned and martyred After his death the Imam was buried in the city of Tus in Iran, which is now called Mashhad

Ma'mun displayed great interest in having works on the intellectual sciences translated into Arabic He organized gatherings in which scholars of different religions and sects assembled and carried out scientific and scholarly debates The eighth Imam also participated in these assemblies and joined in the discussions with scholars of other religions Many of these debates are recorded in the collections of Shi'ite hadiths [87]

The Ninth Imam

Imam Muhammad (ibn Ali) Taqī (sometimes called Jawād and Ibn al Riḍā) was the son of the eighth Imam He was born in 195/809 in Medina and according to Shi'ite traditions was martyred in 220/835 poisoned by his wife the daughter of Ma'mun, at the instigation of the Abbasid caliph Mu'taṣim He was buried next to his grandfather, the seventh Imam, in Kazimayn He became Imam after the death of his father through Divine Command and by the decree of his forefathers At the time of the death of his father he was in Medina Ma'mun called him to Baghdad which was then the capital of the caliphate and outwardly showed him much kindness He even gave the Imam his daughter in marriage and kept him in Baghdad In reality he wanted in this way to keep a close watch upon the Imam from both outside and within his own household The Imam spent some time in Baghdad and then with the consent of Ma'mum set out for Medina where he remained until Ma'mun's death When Mu'taṣim became the caliph he called the Imam back to Baghdad and, as we have seen, through the Imam's wife had him poisoned and killed [88]

The Tenth Imam

Imam Ali ibn Muhammad Naqī (sometimes referred to by the title of Hādī) was the son of the ninth Imam He was born in 212/827 in Medina and according to Shi'ite accounts was martyred through poisoning by Mu'tazz the Abbasid caliph in 254/868 [89]

During his lifetime the tenth Imam was contemporary with seven of the Abbasid caliphs Ma'mun, Mu'taṣim Wathiq Mutawakkil Muntaṣir Musta'īn and Mu'tazz It was during the rule of Mu'taṣim in 220/835 that his noble father died through poisoning in Baghdad At that time Ali ibn Muhammad Naqi was in Medina There he became the Imam through Divine Command and the decree of the Imams before him He stayed in Medina teaching religious sciences until the time of Mutawakkil In 243/857, as a result of certain false charges that were made Mutawakkil ordered one of his government officials to invite the Imam from Medina to Samarrah which was then the capital He himself wrote the Imam a letter full of kindness and courtesy asking him to come to the capital where they could meet [90] Upon arrival in Samarrah the Imam was also shown certain outward courtesy and respect Yet at the same time Mutawakkil tried by all possible means to trouble and dishonor him Many times he called the Imam to his presence with the aim of killing or disgracing him and had his house searched

In his enmity toward the Household of the Prophet Mutawakkil had no equal among the Abbasid caliphs He was especially opposed to Ali, whom he cursed openly He even ordered a clown to ridicule Ali at voluptuous banquets In the year 237/850 he ordered the mausoleum of Imam Husayn in Karbala and many of the houses around it to be torn down to the ground Then water was turned upon the tomb of the Imam He ordered the ground of the tomb to be plowed and cultivated so that any trace of the tomb would be forgotten [91] During the life of Mutawakkil the condition of life of the descendants of Ali in the Hijaz had reached such pitiful state that their womenfolk had no veils with which to cover themselves Many of them had only one old veil which they wore at the time of the daily prayers Pressures of a similar kind were put on the descendants of Ali who lived in Egypt [92] The tenth Imam accepted in patience the tortures and afflictions of the Abbasid caliph Mutawakkil until the caliph died and was followed by Muntasir Musta'in and finally Mu'tazz whose intrigue led to the Imam's being poisoned and martyred

NEXT ISSUE

and analyzes this chapter of Islamic history, will have no doubt that in those circumstances there was no choice before Imam Husayn but to be killed. Swearing allegiance to Yazid would have meant publicly showing contempt for Islam, something which was not possible for the Imam, for Yazid not only showed no respect for Islam and its injunctions but also made a public demonstration of impudently treading under foot its basis and its laws. Those before him, even if they opposed religious injunctions, always did so in the guise of religion, and at least formally respected religion. They took pride in being companions of the Holy Prophet and the other religious figures in whom people believed. From this it can be concluded that the claim of some interpreters of these events is false when they say that the two brothers, Hasan and Husayn, had two different tastes and that one chose the way of peace and the other the way of war, so that one brother made peace with Mu'awiyah although he had an army of forty thousand while the other went to war against Yazid with an army of forty. For we see that this same Imam Husayn, who refused to pay allegiance to Yazid for one day, lived for ten years under the rule of Mu'awiyah, in the same manner as his brother who also had endured for ten years under Mu'awiyah, without opposing him.

It must be said in truth that if Imam Hasan or Imam Husayn had fought Mu'awiyah they would have been killed without there being the least benefit for Islam. Their deaths would have had no effect before the righteous-appearing policy of Mu'awiyah, a competent politican who emphasized his being a companion of the Holy Prophet, the "scribe of the revelation," and "uncle of the faithful" and who used every stratagem possible to preserve a religious guise for his rule. Moreover, with his ability to set the stage to accomplish his desires he could have had them killed by their own people and then assumed a state of mourning and sought to revenge their blood, just as he sought to give the impression that he was avenging the killing of the third caliph.

The Fourth Imam

Imam Sajjād (Ali ibn Husayn entitled Zayn al-'ābidīn and Sajjad) was the son of the third Imam and his wife, the queen among women, the daughter of Yazdigird the king of Iran. He was the only son of Imam Husayn to survive, for his other three brothers Ali Akbar, aged twenty-five, five year old Ja'far and Ali Asghar (or 'Abdallāh) who was a suckling baby were martyred during the event of Karbala.[71] The Imam had also accompanied his father on the journey that terminated fatally in Karbala, but because of severe illness and the inability to carry arms or participate in fighting he was prevented from taking part in the holy war and being martyred. So he was sent with the womenfolk to Damascus. After spending a period in imprisonment he was sent with honor to Medina because Yazid wanted to conciliate public opinion. But for a second time, by the order of the Umayyad caliph, 'Abd al-Malik, he was chained and sent from Medina to Damascus and then again returned to Medina.[72]

The fourth Imam, upon returning to Medina, retired from public life completely, closed the door of his house to strangers and spent his time in worship. He was in contact only with the elite among the Shi'ites such as Abū Ḥamzah Thumālī, Abū Khālid Kābulī and the like. The elite disseminated among the Shi'ah the religious sciences they learned from the Imam. In this way Shi'ism spread considerably and showed its effects during the imamate of the fifth Imam. Among the works of the fourth Imam is a book called *Ṣaḥīfah sajjādīyah*. It consists of fifty-seven prayers concerning the most sublime Divine sciences and is known as "The Psalm of the Household of the Prophet."

The fourth Imam died (according to some Shi'ite traditions poisoned by Walīd ibn 'Abd al-Malik through the instigation of the Umayyad caliph Hishām[73]) in 95/712 after thirty-five years of imamate.

The Fifth Imam

Imam Muhammad ibn Ali Bāqir (the word *bāqir* meaning he who cuts and dissects, a title given to him by the Prophet)[74] was the son of the fourth Imam and was born in 57/675. He was present at the event of Karbala when he was four years old. After his father, through Divine Command and the decree of those who went before him, he became Imam. In the year 114/732 he died, according to some Shi'ite traditions poisoned by Ibrahim ibn Walid ibn 'Abdallah, the nephew of Hisham, the Umayyad caliph.

During the imamate of the fifth Imam, as a result of the injustice of the Umayyads, revolts and wars broke out in some corner of the Islamic world every day. Moreover, there were disputes within the Umayyad family itself which kept the caliphate busy and to a certain extent left the members of the Household of the Prophet alone. From the other side, the tragedy of Karbala and the oppression suffered by the Household of the Prophet, of which the fourth Imam was the most noteworthy embodiment, had attracted many Muslims to the Imams.[75] These factors combined to make it possible for people and especially the Shi'ites to go in great numbers to Medina and to come into the presence of the fifth Imam. Possibilities for disseminating truths about Islam and the sciences of the Household of the Prophet, which had never existed for the Imams before him, were presented to the fifth Imam. The proof of this fact is the innumerable traditions recounted from the fifth Imam and the large number of illustrious men of science and Shi'ite scholars who were trained by him in different Islamic sciences. These names are listed in books of biographies of famous men in Islam.[76]

The Sixth Imam

Imam Ja'far ibn Muhammad, the son of the fifth Imam, was born in 83/702. He died in 148/765 according to Shi'ite tradition, poisoned and martyred through the intrigue of the Abbasid caliph Manṣūr. After the death of his father he became Imam by Divine Command and decree of those who came before him.

During the imamate of the sixth Imam greater possibilities and a more favorable climate existed for him to propagate religious teachings. This came about as a result of revolts in Islamic lands, especially the uprising of the Muswaddah to overthrow the Umayyad caliphate, and the bloody wars which finally led to the fall and extinction of the Umayyads. The greater opportunities for Shi'ite teachings were also a result of the favorable ground the fifth Imam had prepared during the twenty years of his imamate through the propagation of the true teachings of Islam and the sciences of the Household of the Prophet.

The Imam took advantage of the occasion to propagate the religious sciences until the very end of his imamate, which was contemporary with the end of the Umayyad and beginning of the Abbasid caliphates. He instructed many scholars in different fields of the intellectual and transmitted sciences, such as Zurārah, Muhammad ibn Muslim, Mu'min Ṭāq, Hisham ibn Ḥakam, Abān ibn Taghlib, Hisham ibn Sālim, Ḥurayz, Hisham Kalbī Nassābah, and Jābir ibn Ḥayyān, the alchemist. Even some important Sunni scholars such as Sufyān Thawrī, Abu Hanifah, the founder of the Hanafi school of law, Qāḍī Sukūnī, Qadi Abu'l-Bakhtarī, and others, had the honor of being his students. It is said that his classes and sessions of instruction produced four thousand scholars of hadith and other sciences.[77] The number of traditions preserved from the fifth and sixth Imams is more than all the hadith that have been recorded from the Prophet and the other ten Imams combined.

But toward the end of his life the Imam was subjected to severe restrictions placed upon him by the Abbasid caliph Mansur, who ordered such torture and merciless killing of many of the descendants of the Prophet who were Shi'ite that his actions even surpassed the cruelty and heedlessness of the Umayyads. At his order they were arrested in groups, some thrown into deep and dark prisons and tortured until they died, while others were beheaded or buried alive or placed at the base of or between walls of buildings, and walls were constructed over them.

Hisham, the Umayyad caliph, had ordered the sixth Imam to be arrested and brought to Damascus. Later, the Imam was arrested by Saffāḥ, the Abbasid caliph, and brought to Iraq. Finally, Mansur had him arrested again and brought to Samarrah where he had the Imam kept under supervision, was in every way harsh and discourteous to him, and several times thought of killing him.[78] Eventually the Imam was allowed to return to Medina where he spent the rest of his life in hiding, until he was poisoned and martyred through the intrigue of Mansur.[79]

all opposition, Mu'awiyah had undertaken newer and more severe measures. By force and necessity Imam Husayn had to endure these days and to tolerate every kind of mental and spiritual agony and affliction from Mu'awiyah and his aides—until in the middle of the year 60 A.H. Mu'awiyah died and his son Yazid took his place.[58]

Paying allegiance (bay'ah) was an old Arab practice which was carried out in important matters such as that of kingship and governorship. Those who were ruled, and especially the well-known among them, would give their hand in allegiance, agreement and obedience to their king or prince and in this way would show their support for his actions. Disagreement after allegiance was considered as disgrace and dishonor for a people and, like breaking an agreement after having signed it officially, it was considered as a definite crime. Following the example of the Holy Prophet, people believed that allegiance, when given by free will and not through force, carried authority and weight.

Mu'awiyah had asked the well-known among the people to give their allegiance to Yazid, but had not imposed this request upon Imam Husayn.[59] He had especially told Yazid in his last will that if Husayn refused to pay allegiance he should pass over it in silence and overlook the matter, for he had understood correctly the disastrous consequences which would follow if the issue were to be pressed. But because of his egoism and recklessness, Yazid neglected his father's advice and immediately after the death of his father ordered the governor of Medina either to force a pledge of allegiance from Imam Husayn or send his head to Damascus.[60]

After the governor of Medina informed Imam Husayn of this demand, the Imam, in order to think over the question, asked for a delay and overnight started with his family toward Mecca. He sought refuge in the sanctuary of God which in Islam is the official place of refuge and security. This event occurred toward the end of the month of Rajab and the beginning of Sha'bān of 60 A.H. For nearly four months Imam Husayn stayed in Mecca in refuge. This news spread throughout the Islamic world. On the one hand many people who were tired of the iniquities of Mu'awiyah's rule and were even more dissatisfied when Yazid became caliph, corresponded with Imam Husayn and expressed their sympathy for him. On the other hand a flood of letters began to flow, especially from Iraq and particularly the city of Kufa, inviting the Imam to go to Iraq and accept the leadership of the populace there with the aim of beginning an uprising to overcome injustice and iniquity. Naturally such a situation was dangerous for Yazid

The stay of Imam Husayn in Mecca continued until the season for pilgrimage when Muslims from all over the world poured in groups into Mecca in order to perform the rites of the hajj. The Imam discovered that some of the followers of Yazid had entered Mecca as pilgrims (*ḥājjīs*) with the mission to kill the Imam during the rites of hajj with the arms they carried under their special pilgrimage dress (*iḥrāmi*).[61]

The Imam shortened the pilgrimage rites and decided to leave. Amidst the vast crowd of people he stood up and in a short speech announced that he was setting out for Iraq.[62] In this short speech he also declared that he would be martyred and asked Muslims to help him in attaining the goal he had in view and to offer their lives in the path of God. On the next day he set out with his family and a group of his companions for Iraq.

Imam Husayn was determined not to give his allegiance to Yazid and knew full well that he would be killed. He was aware that his death was inevitable in the face of the awesome military power of the Umayyads, supported as it was by corruption in certain sectors, spiritual decline, and lack of will power among the people, especially in Iraq. Some of the outstanding people of Mecca stood in the way of Imam Husayn and warned him of the danger of the move he was making. But he answered that he refused to pay allegiance and give his approval to a government of injustice and tyranny. He added that he knew that wherever he turned or went he would be killed.[63] He would leave Mecca in order to preserve the respect for the house of God and not allow this respect to be destroyed by having his blood spilled there

While on the way to Kufa and still a few days' journey away from the city, he received news that the agent of Yazid in Kufa had put to death the representative of the Imam in that city and also one of the Imam's determined supporters who was a well-known man in Kufa. Their feet had been tied and they had been dragged through the streets.[64] The city and its surroundings were placed under strict observation and countless soldiers of the enemy were awaiting him. There was no way open to him but to march ahead and to face death. It was here that the Imam expressed his definitive determination to go ahead and be martyred; and so he continued on his journey.[65]

Approximately seventy kilometres from Kufa, in a desert named Karbala, the Imam and his entourage were surrounded by the army of Yazid. For eight days they stayed in this spot during which the circle narrowed and the number of the enemy's army increased. Finally the Imam, with his household and a small number of companions were encircled by an army of thirty thousand soldiers.[66] During these days the Imam fortified his position and made a final selection of his companions. At night he called his companions and during a short speech stated that there was nothing ahead but death and martyrdom. He added that since the enemy was concerned only with his person he would free them from all obligations so that anyone who wished could escape in the darkness of the night and save his life. Then he ordered the lights to be turned out and most of his companions, who had joined him for their own advantage, dispersed. Only a handful of those who loved the truth—about forty of his close aides-- and some of the Banu Hashim remained.[67]

Once again the Imam assembled those who were left and put them to a test. He addressed his companions and Hashimite relatives, saying again that the enemy was concerned only with his person. Each could benefit from the darkness of the night and escape the danger. But this time the faithful companions of the Imam answered each in his own way that they would not deviate for a moment from the path of truth of which the Imam was the leader and would never leave him alone. They said they would defend his household to the last drop of their blood and as long as they could carry a sword.[68]

On the ninth day of the month the last challenge to choose between "allegiance or war" was made by the enemy to the Imam. The Imam asked for a delay in order to worship overnight and became determined to enter battle on the next day.[69]

On the tenth day of Muḥarram of the year 61/680 the Imam lined up before the enemy with his small band of followers, less than ninety persons consisting of forty of his companions, thirty some members of the army of the enemy that joined him during the night and day of war, and his Hashimite family of children, brothers, nephews, nieces and cousins. That day they fought from morning until their final breath, and the Imam, the young Hashimites and the companions were all martyred. Among those killed were two children of Imam Hasan, who were only thirteen and eleven years old; and a five-year-old child and a suckling baby of Imam Husayn.

The army of the enemy, after ending the war, plundered the *ḥaram* of the Imam and burned his tents. They decapitated the bodies of the martyrs, denuded them and threw them to the ground without burial. Then they moved the members of the haram, all of whom were helpless women and girls, along with the heads of the martyrs, to Kufa.[70] Among the prisoners there were three male members: a twenty-two year old son of Imam Husayn who was very ill and unable to move, namely Ali ibn Husayn, the fourth Imam; his four year old son, Muhammad ibn Ali, who became the fifth Imam; and finally Hasan Muthannā, the son of the second Imam who was also the son-in-law of Imam Husayn and who, having been wounded during the war, lay among the dead. They found him near death and through the intercession of one of the generals did not cut off his head. Rather, they took him with the prisoners to Kufa and from there to Damascus before Yazid.

The event of Karbala, the capture of the women and children of the Household of the Prophet, their being taken as prisoners from town to town and the speeches made by the daughter of Ali, Zaynab, and the fourth Imam who were among the prisoners, disgraced the Umayyads. Such abuse of the Household of the Prophet annulled the propaganda which Mu'awiyah had carried out for years. The matter reached such proportions that Yazid in public disowned and condemned the actions of his agents. The event of Karbala was a major factor in the overthrow of Umayyad rule although its effect was delayed. It also strengthened the roots of Shi'ism. Among its immediate results were the revolts and rebellions combined with bloody wars which continued for twelve years. Among those who were instrumental in the death of the Imam not one was able to escape revenge and punishment.

Anyone who studies closely the history of the life of Imam Husayn and Yazid and the conditions that prevailed at that time,

KNOWLEDGE OF THE IMAM

ALLAMAH SAYYID MUHAMMAD HUSAYN TABATABAI

Translated by SAYYID HUSAYN NASR

A BRIEF HISTORY OF THE LIVES OF THE TWELVE IMAMS

PART - 2

***The First Imam* CONT**

In order to quell the civil strife and sedition Ali fought a war near Basra known as the Battle of the Camel against Talhah and Zubayr in which A ishah the Mother of the Faithful was also involved He fought another war against Mu awiyah on the border of Iraq and Syria which lasted for a year and a half and is famous as the Battle of Siffin He also fought against the Khawarij[44] at Nahrawan in a battle known as the Battle of Nahrawan Therefore most of the days of Ali s caliphate were spent in overcoming internal opposition Finally in the morning of the 19th of Ramadan in the year 40 A H while praying in the mosque of Kufa he was wounded by one of the Khawarij and died as a martyr during the night of the 21st [45]

According to the testimony of friend and foe alike Ali had no shortcomings from the point of view of human perfection And in the Islamic virtues he was a perfect example of the upbringing and training given by the Prophet The discussions that have taken place concerning his personality and the books written on this subject by Shi ites Sunnis and members of other religions as well as those simply curious outside any distinct religious bodies are hardly equaled in the case of any other personality in history In science and knowledge Ali was the most learned of the companions of the Prophet and of Muslims in general In his learned discourses he was the first in Islam to open the door for logical demonstration and proof and to discuss the divine sciences or metaphysics (*ma arif i ilahi ah*) He spoke concerning the esoteric aspect of the Quran and devised Arabic grammar in order to preserve the Quran s form of expression He was the most eloquent Arab in speech (as has been mentioned in the first part of this book)

The courage of Ali was proverbial In all the wars in which he participated during the lifetime of the Prophet and also afterward he never displayed fear or anxiety Although in many battles such as those of Uhud Hunayn Khaybar and Khandaq the aides to the Prophet and the Muslim army trembled in fear or dispersed and fled he never turned his back to the enemy Never did a warrior or soldier engage Ali in battle and come out of it alive Yet with full chivalry he would never slay a weak enemy nor pursue those who fled He would not engage in surprise attacks or in turning streams of water upon the enemy It has been definitively established historically that in the Battle of Khaybar in the attack against the fort he reached the ring of the door and with sudden motion tore off the door and cast it away [46] Also on the day when Mecca was conquered the Prophet ordered the idols to be broken The idol Hubal was the largest idol in Mecca a giant stone statue placed on the top of the Ka bah Following the command of the Prophet Ali placed his feet on the Prophet s shoulders climbed to the top of the Ka bah pulled Hubal from its place and cast it down [47]

Ali was also without equal in religious asceticism and the worship of God In answer to some who had complained of Ali s anger toward them the Prophet said "Do not reproach Ali for he is in a state of Divine ecstasy and bewilderment [48] Abu Darda , one of the companions one day saw the body of Ali in one of the palm plantations of Medina lying on the ground as stiff as wood He went to Ali s house to inform his noble wife the daughter of the Prophet and to express his condolences The daughter of the Prophet said My cousin (Ali) has not died Rather in fear of God he has fainted This condition overcomes him often '

There are many stories told of Ali s kindness to the lowly compassion for the needy and the poor, and generosity and munificence toward those in misery and poverty Ali spent all that he earned to help the poor and the needy and himself lived in the strictest and simplest manner Ali loved agriculture and spent much of his time digging wells planting trees and cultivating fields But all the fields that he cultivated or wells that he built he gave in endowment (*waqf*) to the poor His endowments known as the alms of Ali ' had the noteworthy income of twenty four thousand gold dinars toward the end of his life [49]

The Second Imam

Imam Hasan Mujtaba —upon whom be peace —was the second Imam He and his brother Imam Husayn were the two sons of Amir al mu minin Ali and Hadrat Fatimah the daughter of the Prophet Many times the Prophet had said Hasan and Husayn are my children Because of these same words Ali would say to his other children You are my children and Hasan and Husayn are the children of the Prophet [50]

Imam Hasan was born in the year 3 A H in Medina [51] and shared in the life of the Prophet for somewhat over seven years growing up during that time under his loving care After the death of the Prophet which was no more than three or according to some six months earlier than the death of Hadrat Fatimah Hasan was placed directly under the care of his noble father After the death of his father through Divine Command and according to the will of his father Imam Hasan became Imam, he also occupied the outward function of caliph for about six months during which time he administered the affairs of the Muslims During that time Mu awiyah who was a bitter enemy of Ali and his family and had fought for years with the ambition of capturing the caliphate first on the pretext of avenging the death of the third caliph and finally with an open claim to the caliphate marched his army into Iraq the seat of Imam Hasan s caliphate War ensued during which Mu awiyah gradually subverted the generals and commanders of Imam Hasan s army with large sums of money and deceiving promises until the army rebelled against Imam Hasan [52] Finally the Imam was forced to make peace and to yield the caliphate to Mu awiyah provided it would again return to Imam Hasan after Mu awiyah s death and the Imam s household and partisans would be protected in every way [53]

In this way Mu awiyah captured the Islamic caliphate and entered Iraq In a public speech he officially made null and void all the peace conditions[54] and in every way possible placed the severest pressure upon the members of the Household of the Prophet and the Shi ah During all the ten years of his imamate Imam Hasan lived in conditions of extreme hardship and under persecution with no security even in his own house In the year 50 A H he was poisoned and martyred by one of his own household who as has been accounted by historians had been motivated by Mu awiyah [55]

In human perfection Imam Hasan was reminiscent of his father and a perfect example of his noble grandfather In fact as long as the Prophet was alive he and his brother were always in the company of the Prophet who even sometimes would carry them on his shoulders Both Sunni and Shi ite sources have transmitted this saying of the Holy Prophet concerning Hasan and Husayn These two children of mine are Imams whether they stand up or sit down (allusion to whether they occupy the external function of caliphate or not) [56] Also there are many traditions of the Holy Prophet and Ali concerning the fact that Imam Hasan would gain the function of imamate after his noble father

The Third Imam

Imam Husayn (Sayyid al Shuhada the lord among martyrs"), the second child of Ali and Fatimah, was born in the year 4 A H and after the martyrdom of his brother, Imam Hasan Mujtaba, became Imam through Divine Command and his brother's will [57] Imam Husayn was Imam for a period of ten years all but the last six months coinciding with the caliphate of Mu awiyah Imam Husayn lived under the most difficult outward conditions of suppression and persecution This was due to the fact that, first of all, religious laws and regulations had lost much of their weight and credit, and the edicts of the Umayyad government had gained complete authority and power Secondly, Mu'awiyah and his aides made use of every possible means to put aside and move out of the way the Household of the Prophet and the Shi'ah, and thus obliterate the name of Ali and his family And above all, Mu'awiyah wanted to strengthen the basis of the caliphate of his son, Yazid, who because of his lack of principles and scruples was opposed by a large group of Muslims Therefore, in order to quell

And also:

... وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ...

We lay veils upon their hearts lest they understand it (6 25)

... كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ◈

so does God seal the hearts of the unbelievers (7 101)

... فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ ◈

so that their hearts have become hard, and many of them are ungodly (57 16)

All these verses point to the fact that the Quran recommends a sublime, spiritual atmosphere for mankind, and deems it necessary for every individual to strive to keep it clean and unpolluted. In addition, since an unsound social atmosphere renders fruitless the efforts of most individuals to keep pure and wholesome, the Quran recommends that the people should employ all their endeavour in the direction of purification of their social atmosphere The Quran unequivocally propounds the view that the continued existence of all those sublime values, beliefs and ideas, and continued social receptivity to all its moral advice and counsels, depend upon individual and collective struggle to eradicate all types of meanness, sensuality, and lewdness.

Human history itself is a witness to the fact that whenever despotic regimes have wanted to bring other societies under their autocratic rule, they have tried to corrupt their social spirit and pollute their social atmosphere They provided enormous facilities for the people to indulge in licentiousness, and gave them every kind of freedom in this regard. A heart-rending account of this unholy treatment meted out to Muslims of Spain a region which is regarded to have played an effective role in initiating the Renaissance, and had the most advanced culture in Europe throws enough light on this phenomenon. In order to divest Spain out of Muslims hands, the Christians resorted to defilement of the morals of Muslim youth, by providing ample facilities for their debaucheries. They even went to the extent of alluring and enticing the army generals and government officials in topmost ranks. They thus succeeded in diverting Muslims from the path of determination and purpose, and in divesting them of their power, their strength of faith, and purity of soul, converting them into profligate weaklings addicted to drinking and licentiousness. It is obvious that it is not very difficult to subdue such individuals. Christians took revenge on nearly eight hundred years of Muslim rule in such a way that history is ashamed at recounting those deeds The same Christians who, according to the teachings of Jesus Christ ("offer your left cheek if your right cheek is slapped"), were supposed to behave in a different way, surpassed the bloodthirsty tradition of Genghiz Khan by the massacre of Muslims in Spain Nevertheless, the ruin that M[illegible]lims suffered was the result of their own spiritual degeneration and de[illegible], it was their punishment for abandoning the Quranic commands

In our times, also, wherever the evil of colonialism exists, the same practices are vigorously adopted a danger against which the Quran so emphatically warns us. The colonialists try to corrupt the [illegible]rts; when the heart is thus debilitated, reason, too, is not only lost [illegible] fails to function properly, but is itself turned into a terrible bondage. The colonialists and the exploitive powers are not afraid of establishing schools and universities they even advocate popular education; but, on the other hand, they take good care to make arrangements to corrupt and destroy the spirit of students, and of the teachers as well. They are fully aware of the fact that an unhealthy mind and a sickly soul cannot make any decisive move, and readily yield to every type of exploitation and degradation.

That is why the Quran gives ample importance to the idea of exaltation, edification, and purity of the soul of society. In one of its verses, it says.

... وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ...

.And help one another to piety and God-fearing, do not help each other to sin and enmity (5 2)

Men are, firstly, enjoined to pursue piety and are warned against sinning; secondly, they are asked to perform righteous deeds collectively, not individually.

Here I shall mention two or three sayings of the Prophet (S) and the Imams (A) in order to elucidate this point. There is a tradition that once a person came in the presence of the Prophet (S) and told him that he wished to ask certain questions. The Prophet asked him whether he wanted to listen to the answers, or if he wished to ask questions first. He asked the Prophet (S) to give the answers. The Prophet (S) told him that his question was concerned with the meaning of virtue and goodness. The man affirmed that he intended to ask exactly the same question. The Prophet gently knocked the man's chest with his three fingers, saying: "Put this question to your own heart;" then he added: "This heart is so made that it is harmonious with virtue; it is put at ease by virtue and piety, but disturbed by vice and villainy. In the same way, as presence of an alien disharmonious object in the human body causes uneasiness and discomfort, and disturbs its order, the human soul is thrown off its balance and ease on account of faulty behaviour." What is commonly called the pain and torment of the conscience, is the same state of inconformity and alienation of the soul:

إِسْتَفْتِ قَلْبَكَ وَإِنْ أَفْتَاكَ الْمُفْتُونَ

[For an honest insight] ask your own heart, though the masters may have their own (different) opinion.

Rumi has translated this tradition into fine poetry:

گوش کن استفت قلبک از رسول   گرچه مفتی برون گوید فصول

and also in another couplet.

پس پیمبر گفت استفت القلوب   گرچه مفتشان برون گوید خطوب

The Prophet (S) points out the fact that if a person endeavours to seek reality and truth with an open and impartial mind, his heart can never deceive him in this regard; it will always guide him towards the straight path. Basically, as long as man is in search of truth and reality, and treads the path of truth, whatever he encounters in this course is nothing but truth. This is, of course, a very delicate point which is often misunderstood. When someone falls into misguidance and loses his path, it is because he was following a certain direction which was not determined by sincere search of truth. Answering someone who had asked the Prophet, "What is virtue?," he said, "If you really want to know what is virtue, then understand that when your heart is serene and your conscience at rest, whatever has caused them to be such, is virtue. But when you are attracted towards something, and that does not bring peace and serenity to your heart, then you should know that it is vice and sin."

[illegible]where, when the Prophet (S) was asked about the meaning of faith (*imān*), he said "When one performs an ugly deed, and is overwhelmed with the feeling of reproach and displeasure, and when one performs virtuous deeds and feels happy and joyous, it means that he is endowed with faith."

It has been quoted from Imam Ja'far al-Sādiq (A) that when a believer liberates himself from all worldly bondages[1], he feels the delight of nearness to God within his heart, in this state, the whole world appears to him very small and insignificant, he strives with all power to liberate himself from the bondages of the material world. This is a reality attested by the lives of the men of God In the biographies of the Prophet (S), it is written that once after his morning prayers the Prophet (S) went to visit the Aṣḥāb al-Suffah. They were a group of poor men who did not possess any worldly belongings, and used to live by the side of Prophet's Mosque in al Madinah When the Prophet (S) happened to see one of them, Ḥārith ibn Zayd, who looked rather pale and emaciated, his eyes sunk deep inside his skull, he inquired, "How are you " He answered, "I have woken up a man of certain faith." The Prophet asked him what proved his claim. [illegible]ed "I am bereft of sleep at nights and engage in fasting during the days " The Prophet told him that this was insufficient "Tell me more about it," he said Ḥārith said, "O Messenger of God, my condition is such that I can clearly see and hear the people of heaven and those of hell If you permit me, I will inform you about the secret thoughts and inner states of every one of your companions." The Prophet bade him hold his tongue, and say no more, but asked him, "What is your desire?" He said, "To fight in the way of God."

According to the Quran, furbishing of the human heart exalts a human being to such a point that, in the words of Ali (A), even if the veils that conceal the Unseen be removed from in front of him, there is nothing that can enhance his faith. The teachings of the Quran are meant to educate man to become a being equipped with the power of knowledge and reason on the one hand, and possessed of a pure heart and sound feeling on the other. They aim to train a human being who is able to employ his reason and heart in the most proper and exalted fashion. The Imams (S) and their true pupils were examples of such human beings.

Concluded, wal-hamdu lillah

NOTES

In my book *Suyri dar Nahj al balaghah* ("A journey through the *Nahj al Balaghah*"), I have explained the distinction made by Islam between loving the world and being attached and bonded to it

Understanding the Uniqueness of the Qur'ān

Part 3

by Martyr Murtaḍā Muṭahharī

translated from Persian by Mahliqā Qarā'ī

Quranic Outlook Regarding the 'Heart'

Perhaps I need not explain here that in the language of literature and mysticism the term *heart* does not mean the organ situated in the left side of the human body, which pumps blood into the blood vessels What is implied is the sublime and distinguishing faculty of the human soul, as can be readily understood from the following examples from the Quran and verses of Sa'dī

ان فی ذلك لذكری لمن كان له قلب...

Surely in that there is a reminder to him who has a heart (50 37)

دلم رمیده شد و غافلم من درویش
که این شکاری سرگشته را چه آمد پیش

My heart was alarmed [on sensing the coming danger],
While I, a thoughtless dervish,
Do not know what this wandering prey has come across

These two examples make it obvious that the connoted meaning of the *heart* is quite different from the bodily organ Elsewhere, the Quran refers to the ailments of the heart

فی قلوبهم مرض فزادهم الله مرضاً...

In their hearts is a sickness and God has increased that sickness (2 10)

To cure this sickness is beyond the powers of any man of medicine, even the heart specialist, only the doctors of the spirit can diagnose such diseases and suggest proper remedies

Definition of the Heart

What is the definition of this heart then? An answer to this question is to be sought in the reality of human existence Every human being although he is a single individual, possesses myriads of existential dimensions The human self' encompasses myriads of thoughts, desires, fears, hopes and inclinations Like the ocean which links all rivers with one another, all these components of the human personality are related to the same center, which unites them with one another The 'self' itself is the deep and unfathomable ocean whose depths no one can claim to have charted out and to have discovered all its mysteries Philosophers, mystics and psychologists each of them has tried in his own specific way to explore its depths, and has succeeded only to a certain degree in discovering its secrets Perhaps the mystics, a bit more than others, have been successful in this regard What the Quran refers to as the heart, is the reality of that ocean, which includes all that we name as the manifestations of the soul to which all its rivers and tributaries are connected Even reason is one of the various rivers associated with this sea

In places where the Quran speaks of revelation, it does not make any mention of reason rather it is merely concerned with the heart of the Prophet (S) This does not mean an absence of rational and demonstrative reception of the Holy Quran on the part of the Prophet, but it was his heart which, in a state that we cannot imagine, obtained the direct experience and awareness of those transcendental realities The verses of *Surat al Najm* and *Surat al Takwir* describe the state of this union to some extent

وما ينطق عن الهوى * ان هو الا وحى يوحى * علمه شديد القوى * ذو مرة فاستوى *
وهو بالأفق الاعلى * ثم دنا فتدلى * فكان قاب قوسين او ادنى * فاوحى الى عبده ما
اوحى * ما كذب الفؤاد ما راى *

Nor speaks he out of caprice This is nought but a revelation revealed taught him by one terrible in power very strong he stood poised being on the higher horizon then drew near and approached nearer two bow's length away, or nearer then revealed to His servant that He revealed His heart lies not of what he saw (53 3 11)

The Quran mentions all these things to show that these matters are basically beyond the range of rational understanding.

إنه لقول رسول كريم * ذى قوة عند ذى العرش مكين * مطاع ثم امين * وما صاحبكم
بمجنون * ولقد رآه بالأفق المبين * وما هو على الغيب بضنين *

Truly this is the word of a noble messenger having power, of honoured place with the Lord of the Throne obeyed, moreover trusty Your companion is not possessed, he truly saw him on the clear horizon, he is not niggardly of the Unseen (81 19 23)

Muhammad Iqbāl offers a fine interpretation of this subject He says that the prophet is one who, at first, imbibes the entire truth, and later on, in order to enrich the world and to alter the course of history, communicates everything that has reached him by the way of Revelation

Wherever the Quran speaks of the revelation and the heart, although its import transcends the limits of reason and thought, its speech is not irrational or anti rational It expounds a vision which surpasses human reason and sensibility, and enters a domain which is, basically, beyond reason and intellect

Characteristics of the Heart

The Quran regards the heart, also, as an instrument of understanding In fact, the greater part of the Quranic message is addressed to the human heart- a message which is audible to the ears of the heart alone, and is inscrutable to other receptive faculties Accordingly, it attaches great importance to the care, protection, and development of this instrument In the Quran we recurringly come across such notions as purification of the self purity and enlightenment of the heart and purification of the heart

قد افلح من زكيها *

Prosperous is he who purifies it [the self] (91 9)

كلا بل ران على قلوبهم ما كانوا يكسبون *

No indeed but that they were earning has overwhelmed their hearts (83 14)

And about the salvation and enlightening of the heart the Quran says

ان تتقوا الله يجعل لكم فرقاناً..

If you fear God He will assign you [the capacity of] distinguishing (8 29)

والذين جاهدوا فينا لنهدينهم سبلنا

But those who struggle in Our [cause] surely We shall guide them in Our ways (29 69)

Contrarily, the Quran recurringly reminds that indecencies infect and darken the human soul, and deprive the human heart of sublime inclinations and virtuous tendencies At one place, speaking on behalf of the believers, it says

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا

Our Lord make not our hearts to swerve after Thou hast guided us (3 8)

Describing the qualities of the evildoers, the Quran says

كلا بل ران على قلوبهم ما كانوا يكسبون *

No indeed but that they were earning has overwhelmed their hearts (83 14)

The darkness of sin and injustice has engulfed their hearts

فلما زاغوا ازاغ الله قلوبهم..

When they swerved God caused their hearts to swerve (61 5)

About the sealing and hardening of the hearts, it says

ختم الله على قلوبهم وعلى سمعهم وعلى ابصارهم غشاوة..

God has set a seal on their hearts and on their hearing and on their eyes is a covering (2 7)

BASHEER-W-NAZEER
Weekly



نهج البلاغة　　　من كتاب علي الى عثمان بن حنيف

وَلَوْ شِئْتُ لَاهْتَدَيْتُ الطَّرِيقَ إِلَى مُصَفَّى هٰذَا الْعَسَلِ

وَلُبَابِ هٰذَا الْقَمْحِ وَنَسَائِجِ هٰذَا الْقَزِّ، وَلٰكِنْ هَيْهَاتَ

أَنْ يَغْلِبَنِي هَوَايَ وَيَقُودَنِي جَشَعِي إِلَى تَخَيُّرِ الْأَطْعِمَةِ، وَلَعَلَّ

بِالْحِجَازِ أَوِ الْيَمَامَةِ مَنْ لَا طَمَعَ لَهُ فِي الْقُرْصِ وَلَا عَهْدَ لَهُ

بِالشِّبَعِ، أَوَ أَبِيتَ مِبْطَاناً وَحَوْلِي بُطُونٌ غَرْثَى

وَأَكْبَادٌ حَرَّى

If I wished, I could have taken the path of [relishing such pleasures as] pure honey, refined wheat, and silk clothing; but it cannot be that my passions should lead me and my greed should make me enjoy good meals, while there may be people in Ḥijāz or Yamāmah who have no hope of getting bread and who do not get a full meal. Should I lie with a satiated belly in the midst of hungry bellies and thirsty livers?

—'Ali ibn Abi Ṭālib (A)

(In a letter to 'Uthmān ibn Hunayf al-'Anṣarī, who was appointed by 'Alī (A) as governor of Basrah. Nahj al-balāghah, epistle 45)

S. A. ABBAS MOOSVI
EDITOR.

VOLUME 1 NO 4
8th AUGUST 1988
PRICE PER COPY Rs 1/-
YEARLY Subscription Rs 45/-